امریکہ چلیں

حصہ دوم

بہتر ہے کہ پہلے ذرا نیویارک کے بارے میں کچھ موٹی موٹی باتیں سن لیجے۔ نیویارک کے خلاف چاہے جتنے دلائل ہوں لیکن اس کے باوجود اس میں شک نہیں ہے کہ نیویارک واقعی بے حد خوب صورت اور ہیجان انگیز شہر ہے۔ شہر میں پولیس کے سائرن مسلسل اس طرح گونجتے رہتے ہیں جیسے ہمارے ہاں محلوں میں بچوں کے رونے کی آوازیں۔ شروع شروع میں تو ہم گھبرائے تھے کہ یا الٰہی، یہ کس قسم کا شہر ہے جہاں چوبیں گھنٹے پولیس والے سائرن بجاتے ہوئے مجرموں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ کیا اس کے سوا پولیس والوں کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔"

ایک پرانے نیویارکر نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہا "آپ گھبرائیے نہیں، یہ سب کے سب سائرن پولیس کاروں کے نہیں ہوتے۔"

"تو پھر کس کے ہوتے ہیں؟"

"پولیس کاروں کے تو صرف ساٹھ فیصد ہی ہوتے ہیں۔ باقی ایمبولینس کاروں کے ہوتے ہیں۔ یہ ایمبولینس کاریں زخمیوں اور مرنے والوں کو لے کر ہسپتال کی طرف بھاگتی رہتی ہیں۔"

"مگر اتنے بہت سے لوگ زخمی کیوں ہو جاتے ہیں؟"

بولے "لڑائی جھگڑوں میں۔ قتل کی وارداتوں میں، لوٹ مار کے واقعات میں۔"

گویا بات وہی تھی مگر وہ اپنے شہر کی بدنامی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ نیویارک والوں کی یہ وفاداری اور محبت واقعی قابل داد چیز ہے۔

نیویارک میں پولیس کاریں سائرن بجاتی ہوئی یوں دوڑتی رہتی ہیں جیسے کسی ٹی وی فلم کے منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن جان جوکھوں میں ڈال کر بھی لوگ وہاں رہتے ہیں اور بے شمار سیاح اس شہر کو دیکھنے کی خواہش لے کر آتے رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح

نیویارک کی خامیاں اظہر من الشمس ہیں اسی طرح اس کی خوبیاں بھی بہت واضح اور نمایاں ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ اپنی طرز کا بالکل نرالا شہر ہے۔ یہاں کا ماحول اور خصوصیات، مناظر اور لوگوں کی عادات اسے دوسرے شہروں سے ممتاز بنا دیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا شہر ہے جو دیکھنے والوں کو مرعوب کر دیتا ہے۔ بلکہ ان پر اپنی ہیبت طاری کر دیتا ہے۔ اس کی ہر چیز بڑی ہے۔ اتنا اونچا، لمبا چوڑا اور شاندار شہر دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ تو اس کے پھیلاؤ کو دیکھیے۔ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ شہر کاہے کو ہے، پورا ملک ہے بلکہ بہت سے ملکوں سے بھی زیادہ وسیع و عریض ہے۔ یہ شہر پانچ علاقوں میں مشتمل ہے۔ مین ہٹن، بروکلین، کوئنز، وی برونکس اور اسٹیٹن آئی لینڈ۔ کسی زمانے میں یہ سب علیحدہ شہر ہوا کرتے تھے مگر بعد میں پلوں اور سڑکوں کے ذریعے انہیں ایک ہی شہر میں پرو دیا گیا۔ ان علاقوں کی آبادی اسی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اگر آس پاس کی رہائشی بستیوں کو شامل کر لیں تو یہ آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ بنتی ہے۔ لیکن اس کے اردگرد نواحی آبادیاں بھی ہیں جو عملاً نیویارک ہی کا حصہ ہیں۔ ان سب کو ملا کر شہر کی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ صرف نیویارک سٹی تین سو مربع میل کے علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔

شہر نیویارک کی سڑکوں کی لمبائی ساڑھے چھ ہزار میل ہے اور اس کے ساحل اٹھارہ میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ نیویارک میں گیارہ سو سے زیادہ پارک ہیں۔ کھیلوں کے میدان اور بڑے بڑے چوراہے ان کے علاوہ ہیں جو ۳۷ ہزار ایکٹر پر محیط ہیں۔ اس شہر میں ۱۲۰ میوزیم ہیں۔ چار سو آرٹ گیلریاں ہیں۔ تیس ڈیپارٹمنٹل اسٹورز ہیں جن کی بے شمار شاخیں شہر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چار سو کے قریب تھیٹرز ہیں۔ سو سے زیادہ اسکائی اسکریپرز ہیں جو آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نیویارک شہر کے لوگ مذہب سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس شہر میں گرجا گھروں کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔ شہر کے دامن میں ۲۵ ہزار ریستوران بکھرے ہوئے ہیں اور یہاں ٹیکسیوں کی تعداد بارہ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ انڈر گراؤنڈ (سب وے) کا جال بھی بچھا ہوا ہے جن سے ہر روز چالیس لاکھ افراد سفر کرتے ہیں۔ ۲۵ لاکھ سے زیادہ افراد بسوں کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ کاروں پر سفر کرنے والوں کی

تعداد بھی لاکھوں میں ہے۔ دنیا کے دوسرے شہروں میں بھی سیاح سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ دنیا بھر میں اتنے زیادہ سیاح کسی اور شہر میں نہیں آتے۔ یورپ کے مشہور و معروف ملکوں میں جانے والے سیاحوں کی تعداد بھی اتنی نہیں ہے۔ سیاحوں کو تو چھوڑیے، نیویارک میں آباد غیر ملکیوں کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے۔ اسے ایک پناہ گزین کیمپ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک سے لوگ آ کر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والوں کو نیویارک میں دیکھ لیجئے۔ کہاوت مشہور ہے کہ نیویارک میں اٹلی کے شہر وینس سے زیادہ اطالوی رہتے ہیں۔ ہسپانوی، چینی، آئرش، یہودی، مسلمان، ایشیائی بھی بے شمار ہیں۔ ان اعداد و شمار پر نظر ڈالیے اور بتائیے کہ کیا دنیا کے کسی اور شہر میں بھی یہ خصوصیات موجود ہیں؟ نیویارک میں ہر چیز کی بہتات ہے۔ جو چیز ہے وہ حد سے زیادہ ہے۔ دولت ہے تو بے حد و بے حساب، غربت ہے تو مثالی۔ سردی میں برف باری ہوتی ہے اور شدید سردی پڑتی ہے۔ گرمی میں آگ برستی ہے اور حبس سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ اے سی کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے۔

نیویارک کی سب وے میں جو اشتہار چسپاں ہیں ان میں لکھا ہے کہ نیویارک میں رہنے والوں کو تھوڑا سا سنکی ہونا ضروری ہے۔ ایک عام آدمی اس کو انجوائے کر ہی نہیں سکتا۔

نیویارک کو وہاں کے لوگ "نویاک" کہتے ہیں۔ پہلے تو ہم نے جب ایک دو لوگوں کی زبان سے "نویاک" سنا تو سوچا کہ شاید یہ بے چارے تتلاتے ہیں۔ صحیح طرح "نیویارک" نہیں کہہ سکتے مگر بعد میں پتا چلا کہ نیویارک تو یہ غیروں کے لیے ہے۔ جس طرح گھروں میں بچوں کا ایک پیار کا نام ہوا کرتا ہے اسی طرح نیویارک والوں نے اس کا پیار کا نام "نویاک" رکھ چھوڑا ہے۔ یہ شہر مختلف حصوں کے علاوہ تین علاقوں میں بھی تقسیم ہے۔

مڈ ٹاؤن، مین ہٹن کا درمیان کا علاقہ ہے۔ بیشتر ہوٹل یہیں پائے جاتے ہیں۔ اس کے آس پاس بہت سے قابل دید مقامات ہیں جہاں آپ پیدل ہی جا سکتے ہیں۔ مثلاً راک فیلر سینٹر، چینل گارڈنز، ففتھ ایونیو، واشنگٹن اسکوائر، ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ، میڈیسن اسکوائر گارڈن، اقوام متحدہ کے صدر دفاتر۔ گرانڈ سینٹرل اسٹیشن، نیویارک ٹیلی فون کمپنی بلڈنگ، نیویارک پبلک لائبریری۔

ٹائمز اسکوائر اور براڈوے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ٹائمز اسکوائر کا نام نیویارک ٹائمز کے دفاتر کی وجہ سے پڑ گیا۔ یہ علاقہ ۴۲ ویں اور ۴۷ ویں اسٹریٹ کے درمیان ہے۔ یہ بہترین سنیما گھروں، تھیٹروں اور شوبزنس کے کاموں کے لیے مشہور ہے۔ ریستوران، شراب خانے بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں اور سب کے سب نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ دن کے وقت ٹائمز اسکوائر بوری سی جگہ لگتی ہے مگر رات کے وقت اس کی بات ہی اور ہے۔ لگتا ہے دنیا بھر کی روشنیاں اور چاند ستارے زمین پر اتر آئے ہیں۔ اس کے برابر ہی براڈوے کا علاقہ ہے۔ دیکھا جائے تو ٹائمز اسکوائر اور براڈوے میں زیادہ فرق نہیں ہے لیکن عامیانہ اور بے ہودہ قسم کے سنیما گھروں اور فلموں کے سلسلے میں ٹائمز اسکوائر کا نام لیا جاتا ہے اور معیاری اور اعلیٰ درجے کے سنیما گھروں اور پروگراموں کو براڈوے کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت میں ان دونوں مقامات میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

خان صاحب نے اس صورت حال کا خلاصہ اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا کہ ان دونوں کا معاملہ امیر اور غریب رشتے داروں جیسا ہے کہ ہر اچھا کام اور کارنامہ امیر رشتے دار سے منسوب کر دیا جاتا ہے جب کہ برے کاموں کے سلسلے میں صرف غریب رشتے دار کا نام لیا جاتا ہے اور وہ بے چارہ مفت میں بدنام ہو جاتا ہے۔

وال اسٹریٹ کو دنیا میں کون نہیں جانتا۔ اسے دولت، صنعت و تجارت اور کاروبار کی عالمی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں سب سے زیادہ اسکائی اسکریپرز ہیں اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے لگتے ہیں۔ یہ نہایت پر شکوہ اور شاندار علاقہ ہے اور اسے دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ واقعی یہ ساری دنیا کی مالیات کی شہ رگ ہے۔ یہاں دولت کی بارش ہوتی ہے۔ بڑے بڑے بینک، انشورنس کمپنیاں، کاروباری ادارے یہاں اپنے دفاتر قائم کرنا بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔

ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کاروبار تو یہاں دولت کا ہوتا ہے پھر اس کا نام وال اسٹریٹ کیوں رکھا گیا ہے؟ خود وال اسٹریٹ پر کام کرنے والوں میں سے بھی بہت سوں کو اس کا سبب معلوم نہیں ہے۔ "نویاک" کے ایک بزرگ نے بتایا کہ یہ نام آج کا نہیں ہے، صدیوں پرانا ہے۔ سولہویں صدی میں مین ہٹن کے جزیرے پر ہالینڈ والوں کا راج تھا مگر ریڈ انڈین اس علاقے پر چڑھائی کرتے رہتے تھے۔ ان کے حملوں اور لوٹ مار سے بچنے

کے لیے ایک دفاعی حصار بنایا گیا تھا اور لکڑی کی دیوار کھڑی کی گئی تھی مگر وہ زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی کیونکہ شہر کے باشندے سردیوں کے موسم میں لکڑیاں جلانے کے لیے استعمال کر لیا کرتے تھے مگر اس کے حوالے سے اس علاقے کو وال اسٹریٹ کہا جانے لگا اور آج بھی جب کہ یہ دنیا کا سب سے دولت مند ترین علاقہ ہے، اسے وال اسٹریٹ کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں اس کا یہی نام مشہور ہے کون ہے جو وال اسٹریٹ کے نام سے واقف نہیں ہے۔ مگر اس کی وجہ تسمیہ کوئی نہیں جانتا سو وہ ہم نے آج آپ کو بتا دی۔

ہوٹل سے باہر نکل کر ہم نے اپنی سیاحت کا آغاز پیدل چلنے سے کیا۔ نیویارک میں پیدل چلنا صرف اسی وقت تک مفید اور محفوظ ہے۔ جب تک آپ فٹ پاتھ پر چلتے ہیں۔ اگر آپ نے سڑک عبور کرنے کی کوشش کی تو یہ خود آپ کی ذاتی ذمے داری پر ہوگا۔ یوں تو یہاں بھی جگہ جگہ زیبرا کراسنگ ہیں اور یہ سائن بھی نظر آتے ہیں کہ سڑک یہاں سے پار کیجیے لیکن سڑک پار کرنا بجائے خود ایک انتہائی دشوار اور ٹیکنیکل کام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بعض سڑکیں اور بولیورڈ یعنی چوراہے اس قدر چوڑے چکلے ہیں کہ انہیں عبور کرنے کے لیے بھی خاصا وقت درکار ہے۔ ادھر نیویارک کے ڈرائیوروں کے پاس بھی وقت کی کمی ہے وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ جس قدر جلدی ہو اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔ اس ضمن میں وہ پیدل چلنے والوں اور زیبرا کراسنگ کے اصولوں کا بھی کوئی خاص لحاظ نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سڑک عبور کرتے ہوئے ایک ریس سی لگی رہتی ہے۔ پیدل چلنے والے سڑک کے دوسری جانب جانے کے لیے دوڑتے ہیں اور کار والے انہیں کچلنے کے ارادے سے آگے بڑھتے ہیں۔ اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں راہ گیر عموماً منزل پر پہنچ ہی جاتے ہیں مگر اس عالم میں کہ سانس پھولی ہوئی ہے، حلیہ بگڑا ہوا ہے اور ہوش و حواس غائب ہیں۔ کمزور دل اور کمزور جسم و جاں والے لوگ سڑک عبور کرنے کے لیے مناسب موقع ہی تلاش کرتے رہتے ہیں اور بقول خان صاحب کے، اسی انتظار میں بوڑھے ہو جاتے ہیں یا پھر شام کو سڑک عبور کیے بغیر ہی واپس اپنے گھر کو چلے جاتے ہیں۔

یہ تو درمیانی سڑکوں کا حال ہے لیکن جو سڑکیں بہت زیادہ کشادہ ہیں انہیں عبور کرنا واقعی کارے دارد ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک کی تعداد اور رفتار کو دیکھیے تو اس پر ایک سیلاب زدہ دریا کا گمان گزرتا ہے۔ ٹریفک ہے کہ "زن زن" اور "شوں شوں" کی آوازیں سنائی

دیتی ہیں یا پھریوں لگتا ہے جیسے کہ سائے سے گزر رہے ہیں۔ ان سڑکوں کو عبور کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔

"تو پھر ایک طرف کے لوگ دوسری طرف کیسے پہنچتے ہیں؟" بٹ صاحب نے سوال کیا۔

"کسی طرح بھی نہیں پہنچتے" ہم نے انہیں بتایا "جو جس طرف پیدا ہوا ہے اور جس طرف رہتا ہے، بس ساری زندگی اسی طرف گزار دیتا ہے۔"

ان حالات میں سڑکیں عبور کرنے کا ارادہ ترک کرنا ہی بہتر تھا۔ ہمیں خان صاحب اور بٹ صاحب کا تجربہ تھا جب جنیوا اور ایمسٹرڈیم میں انہوں نے سڑکیں عبور کرنے کی کوشش کی تھی اور پولیس ان کے پیچھے لگ گئی تھی مگر فرق یہ تھا کہ وہاں ٹریفک کی ایسی بھرمار نہیں تھی۔ نیویارک کی سڑکیں تو ان کے مقابلے میں سمندر ہیں۔ ان میں شناوری کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

"تو پھر کیا کریں۔ دوسری طرف کیسے جائیں؟" بٹ صاحب نے کہا۔

"بھائی دوسری طرف جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پہلے ایک طرف تو پوری دیکھ لو" خان صاحب نے مشورہ دیا۔

فیصلہ کیا گیا کہ انڈر گراؤنڈ میں سفر کیا جائے چنانچہ جو سب سے پہلا سب وے اسٹیشن نظر آیا اس میں داخل ہو گئے۔ صاف ستھرا اور خوب صورت اسٹیشن تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ بعض اسٹیشن بہت گندے نظر آئے۔ دیواروں پر نقش و نگار بنے ہوئے، یا بے ہودہ جملے لکھے ہوئے تھے۔ سب وے اسٹیشن یہاں بھی بھیک مانگنے والوں کی پسندیدہ جگہ ہیں۔ بھیک مانگنے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ عموماً مانگنے والے (اور مانگنے والیاں) گٹار بجا کر اور گانا گا کر مانگتے ہیں۔ آنے جانے والے ان کے سامنے یا ان کے پھیلائے ہوئے ہیٹ میں یا کوٹ پر نوٹ اور سکے پھینکتے جاتے ہیں۔ ان میں کالے، سفید بھورے، نیلے پیلے کی کوئی تمیز ہے نہ مرد عورت کی تفریق۔ مانگنے والے ہر قسم کے ہیں اور دینے والے بھی بلا سوچے سمجھے دیتے ہیں۔

ایک سب وے میں دو سیاہ فام، لمبے تڑنگے، ہٹے کٹے حضرات انتہائی بھونڈی آواز میں کوئی بے ہنگم سا گانا گا رہے تھے۔ زیر زمین راستوں میں ساز اور آواز کی گونج بہت دور

تک سنائی دیتی ہے اس لیے پوری سب وے ان کے شور سے گونج رہی تھی۔ نزدیک پہنچے تو ان کی شکلیں نظر آئیں۔ سیاہ فام ہونا کوئی برائی نہیں ہے مگر بعض سیاہ فام اپنے حلئے ایسے بناتے ہیں کہ کراہیت سی آتی ہے۔ یہ دونوں صاحبان بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ سر کے بال بکھرے ہوئے، شاید کئی ماہ سے نہیں دھوئے گئے تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی۔ بے حد گندی اور میلی، کپڑے اس سے بھی زیادہ میلے اور گندے، آوازیں بھونڈی، گیت بے سرے، بٹ صاحب کا خیال تھا کہ انہیں تو بھیک کے بجائے سزا ملنی چاہیے مگر ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بہت سے لوگ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کی جانب سکے پھینک رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر انہیں کس بناء پر بھیک دی جا رہی ہے۔ خان صاحب نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ سب لوگ گھر سے بھیک دینے کی نیت کر کے نکلے ہیں اور آنکھیں بند کر کے خیرات بانٹ رہے ہیں۔"

یہاں سب وے میں سفر کرنے والے یورپ کے برعکس زیادہ تر غیر سفید فام تھے۔ کالے، ایشیائی، ہسپانوی، چینی، گندمی رنگ والے، یہ بات بھی خان صاحب کو پسند نہ آئی "یار، ہم تو گوروں کے ملک میں آئے تھے۔ کالے بھورے لوگوں کی تو خود ہمارے ملک میں بھی کمی نہیں ہے۔"

سب وے سے باہر نکلے تو خان صاحب کا جی خوش ہو گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر فٹ پاتھ پر پہنچے تو فٹ پاتھ پر ایک طرف ایک خاتون نظر آئیں۔ بے حد گوری چٹی، شربتی رنگ، شربتی بال، شربتی آنکھیں، جینز اور سفید قمیص میں ملبوس تھیں۔ قمیص بھی اجلی تھی اور اس کا گریبان بھی دور تک کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں ایک ساز تھام رکھا تھا جو گٹار کی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک پلاسٹک کے اسٹول پر وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے تشریف فرما تھیں اور حقیقت میں انتہائی دلفریب نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ہالی ووڈ کی فلم کی ہیروئن شوٹنگ کے لیے تیار ہے۔ صورت شکل، جسم قد و قامت، ہر اعتبار سے وہ بہت سی ہیروئنوں پر بھاری نظر آئیں۔

خان صاحب کی نظر پڑی تو ٹھٹھک کر رہ گئے پھر جیب سے دو ڈالر نکالے اور ان کے قدموں میں رکھ دیے۔ اس بہانے انہوں نے اس فتنہ ساماں کو نزدیک سے دیکھ لیا۔ جب ڈالر زمین پر ڈال کر سر اٹھایا تو ان کی نظر رقیب روسیاہ پر پڑی جو کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ

ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا اور سامنے خلا میں گھور رہا تھا۔ پاس ہی دو بیگ بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے خان صاحب کو دیکھا تو وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" ہم نے پوچھا "بھائی نہ وہ گا رہی ہے' نہ مانگ رہی ہے۔ خاموش بیٹھی ہے تو پھر اسے بھیک دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

بولے "دیکھا نہیں کتنی حسین اور معصوم شکل تھی۔ ایسی لڑکی کو فٹ پاتھوں پر مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو ایک اشارے پر بڑے بڑے دولت مندوں کو غلام بنا سکتی ہے"

بٹ صاحب نے کہا "تو پھر آزما کر دیکھ لو۔ زیادہ دولت مند نہ سہی مگر اس کے بھک منگے ساتھی سے تو ہر لحاظ سے بہتر ہو۔"

خان صاحب نے ایک لمحے اس تجویز پر غور کیا پھر بولے "ارے نہیں۔ اس کم بخت کو سڑکوں پر بھیک مانگنے کا مزہ پڑ گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ نشہ بھی کرتی ہے۔ اپنے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔"

نیویارک کے اسٹور دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دو چار اسٹور ہم نے بھی اندر سے دیکھے۔ وسیع و عریض اور کئی منزلہ تھے' چل چل کر تھک گئے۔ خان صاحب نے کافی غور و خوض کے بعد ایک سگریٹ لائٹر خریدا۔ کہا' کسی کو تحفہ دے دیں گے۔ بٹ صاحب کو اتنے بڑے اسٹور میں سگریٹ لائٹر تک پسند نہیں آیا۔

ہم نے پوچھا "جب خریداری نہیں کرنی تھی تو اسٹور میں اتنا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

بولے "دنیا دیکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ خریدنے کے لیے نہیں۔ مشاہدے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔"

اسٹور ہی کے اندر ایک چھوٹے سے خوب صورت ریستوران میں چائے پینے کے لیے بیٹھے تو یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ نیویارک کو کیسے دیکھا جائے اور وہاں کیا کیا دیکھا جائے۔ نیویارک کی وسعت کے پیش نظر یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ پورے شہر کو چار پانچ دن میں دیکھا جا سکے۔ تین سو مربع میل علاقے میں پھیلے ہوئے شہر کو اگر آپ کار میں سوار ہو کر بھی دیکھنا چاہیں تو اس کے چاروں کونوں تک پہنچنے میں ہی تین چار دن لگ جائیں گے۔ تین سو

میل کا مطلب ہے لاہور سے پشاور تک کا سفر۔ اب اگر آپ چار بار لاہور سے پشاور جائیں تو کتنا وقت لگے گا؟ اور یہ تو اس وقت ہے جب کہ آپ محض کار میں سوار ہو کر سڑکوں پر سے گزر جائیں۔ اگر شاپنگ سینٹر' میوزیم' سینما گھر' تھیٹر اور دوسرے مقامات کو اندر سے جا کر دیکھیں تو اس کے لیے مہینوں چاہئیں۔ یہاں میوزیم کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور ان کے درمیانی فاصلے اتنے ہیں کہ آپ چار پانچ دن کے قلیل عرصے میں ان تمام میوزیم کو باہر سے بھی نہیں دیکھ سکتے' اندر جا کر دیکھنا تو دور کی بات ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسے شہروں میں ہمیں گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے کہ کیا دیکھیں' کیا نہ دیکھیں۔ انہیں تو بس سونگھ کر چھوڑ دینا مناسب ہے۔

خان صاحب نے اعلان کر دیا "کچھ اور دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ براڈوے ضرور دیکھیں گے۔"

"اور وال اسٹریٹ بھی" یہ بٹ صاحب تھے۔

"وال اسٹریٹ کس لیے؟" ہم نے پوچھا۔

خان صاحب نے سنجیدگی سے کہا "بھئی بینکوں میں پیسے جمع کرانے ہیں۔ بہت سے چیک کیش کرانے ہیں۔ ان کا وال اسٹریٹ جانا تو بہت ضروری ہے۔"

"اور آپ براڈوے جا کر کیا کریں گے؟ تھیٹروں میں ناچ گانا؟"

ہم نے جھگڑا بڑھنے سے پہلے ہی فیصلہ کر دیا "بھئی براڈوے بھی چلیں گے اور وال اسٹریٹ سے بھی گزر لیں گے۔"

"اور آزادی کا مجسمہ؟"

بٹ صاحب نے کہا "کتنی بد اخلاقی ہے کہ ہم نے ابرار دہلوی سے اس کا پتا بھی نہیں پوچھا۔ نہ ٹیلی فون نمبر۔ اس بے چارے نے ہم سے ٹیکسی کا کرایہ تک نہیں لیا۔"

ہم نے کہا "وہ مصروف آدمی ہے وقت ملے گا اور مناسب سمجھے گا تو خود ہی ہم سے رابطہ کرلے گا لیکن اس کے پاس اتنی مہلت نہیں ہے کہ آپ کو نیویارک کی سیر کرائے"

☆ ☆ ☆

ایک سوٹڈ بوٹڈ ادھیڑ عمر کے سفید فام بزرگ ہمارے برابر والی کرسی پر آکر فروکش ہو

گئے۔ انہوں نے ویٹریس کو بیئر لانے کے لیے کہا۔ جیب سے سگریٹ کا ایک مڑا تڑا پیکٹ نکال کر اس میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی سگریٹ نکال کر سلگائی اور ایک دو کش لینے کے بعد ہم سے پوچھنے لگے ”آپ کو میری اسموکنگ پر اعتراض تو نہیں ہے؟“

ہم نے کہا ”کوئی بات نہیں۔ آپ سگریٹ پیتے رہئے۔“

کہنے لگے ”آپ یقیناً مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہوں گے؟“

”جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

بولے ”دیکھیے۔ سگریٹ کی اس ڈبیا پر لکھا ہوا ہے کہ سگریٹ صحت کے لیے مضر ہے۔ ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ اس سے دل کی بیماریاں اور کینسر ہو جاتا ہے پھر بھی اگر کوئی سگریٹ پیتا نظر آئے تو دوسروں کی نظروں میں احمق نہیں تو اور کیا ہے؟“

ہم نے کہا ”آپ دل چھوٹا نہ کیجئے۔ اس حماقت میں ہم بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ سگار اور پائپ پی لیتے ہیں۔“

”دل خوش کر دیا“ انہوں نے مسکرا کر ہم سے مصافحہ کیا ”ملاؤ ہاتھ۔ باہر سے آئے ہو‘ ٹورسٹ ہو؟“

ہم نے اقرار کیا اور ان سے سب کا تعارف کرایا۔

”میرا نام ایڈم ہے۔“

”آپ بھی ٹورسٹ ہیں؟“

”بالکل نہیں۔ پیدائشی نویاک کا باشندہ ہوں۔ میری زبان اور لب و لہجے پر نہ جائیے۔ یونیورسٹی میں پڑھا ہوں اس لیے درست انگریزی بھی بول سکتا ہوں ورنہ میری بول چال بھی نویاک والوں جیسی ہے“ وہ کسی کمپنی میں ایڈوائزر وغیرہ تھے۔ خاصے مہذب آدمی معلوم ہوئے۔ ان کے دریافت کرنے پر ہم نے بتایا کہ چار پانچ روز نیویارک میں رہنے کا پروگرام ہے۔

”یہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔ اس سے زیادہ مناسب نہ ہو گا۔“

”مگر آپ تو پیدا ہی یہیں ہوئے ہیں“ ہم نے کہا۔

وہ ہنس پڑے ”اسی لیے تو یہاں رہتا ہوں۔ جس طرح سگریٹ اور شراب کا عادی ہوں اسی طرح نویاک کا بھی عادی ہو چکا ہوں حالانکہ یہ تمام چیزیں نقصان دہ ہیں۔ آپ نے

ان کے دریافت کرنے پر مختصراً تمام قصہ سنایا۔

وہ بولے ”غصہ تھوک دیجئے۔ کم از کم ایک کپ کافی تو پی لیجئے۔ میں نے تو آپ کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔“

ہم نے کہا ”اس شرط پر چلیں گے کہ آپ قونصلر سے ہماری ملاقات کرائیں۔“

انہوں نے فوراً وعدہ کر لیا۔ ہم ان کے کمرے میں پہنچ گئے جو عمارت کے عقبی حصے میں تھا۔ انہوں نے کمرے میں پہنچتے ہی ہم سے معذرت کی کہ وہ ہمیں کافی بعد میں پلائیں گے پہلے قونصلر سے ہمارے بارے میں بات کریں گے۔ انہوں نے فون اٹھایا اور دھیمے لہجے میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ مگر ”زوں...غوں“ کی آوازوں سے ہم سمجھ گئے کہ وہ کسی سے فرنچ زبان میں مخاطب ہیں۔ ویسے بھی فرانس والے اپنی گفتگو اتنی دھیمی آواز میں کرتے ہیں کہ اس پر رومانی بات چیت کا گمان گزرتا ہے یا پھر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی سازش کر رہے ہیں۔ جتنی دیر وہ فون پر بات کرتے رہے۔ وہ ہماری جانب بھی دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ”میخ سی“ کہہ کر فون رکھ دیا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے بولے ”کافی اب آپ قونصلر صاحب کے کمرے میں چل کر پئیں گے۔ آئیے میرے ساتھ۔“

ہم بریف کیس اور بیگم سمیت مختلف راستوں اور گیلریوں سے گزرتے ہوئے قونصلر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ ایک دراز قد خوش شکل اور باوقار ادھیڑ عمر کے بزرگ تھے۔ نہایت خوش اخلاق‘ انتہائی حلیم اور شیریں گفتار۔ انہوں نے اٹھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ ہماری بیگم کی جانب سر جھکایا اور پھر انگریزی میں کہنے لگے ”تشریف رکھئے معلوم ہوا ہے کہ آپ بہت ناراض ہیں۔ اس نوجوان نے مجھے تمام واقعہ سنا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم کافی کے ایک کپ پر یہ مسئلہ حل کر لیں گے۔“

ان کا خیال درست ثابت ہوا۔ کافی بہت لذیذ تھی اور شکر ہے کہ فرنچ اسٹائل نہیں تھی جو بہت گاڑھی اور تلخ ہوتی ہے۔ شاید وہ بھی جیسا دیس‘ ویسا بھیس کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ انہوں نے ہمارے دو تین موٹے تازے پاسپورٹ لے کر دیکھے اور مسکرا کر بولے ”اوہ آپ تو پہلے بھی کئی بار فرانس جا چکے ہیں۔“

ہم نے کہا ”مگر مسٹر شہناز نے تو ہمارا پاسپورٹ کھول کر دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ آپ نے ایسے لوگ کیوں رکھے ہیں جو ویزا لینے کے لیے آنے والوں سے افسروں

جیسا برتاؤ کرتے ہیں؟"

وہ مسکرائے اور کہنے لگے "وہ آپ کے ہم وطن ہیں" ہم نے کہا "دراصل ہمیں ابھی لمبی غلامی سے آزاد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اس لیے ہمارے بہت سے ہم وطن ابھی تک دوسروں کے ساتھ غلاموں جیسا برتاؤ ہی کرتے ہیں۔ بہرحال ہمیں شکایت یہ نہیں ہے کہ ہمیں ویزا کیوں نہیں دیا گیا۔ شکایت یہ ہے کہ انہوں نے فضول اعتراض کر کے ہمیں ویزا فارم تک دینے سے انکار کر دیا۔ ہمارے ہی ملک میں آپ ہم لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔" ہمیں پھر غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔

وہ بھانپ گئے۔ تھوڑا سا مسکرائے۔ پھر نرمی سے بولے "آپ خفا نہ ہوں تو یہ کہوں کہ ہم لوگوں نے مجبور ہو کر یہ رویہ اختیار کیا ہے۔"

ہم نے کہا "لیکن کم از کم لوگوں کے درمیان امتیاز تو کرنا چاہیے۔ یہ تو مناسب نہیں ہے کہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا جائے۔"

جواب میں انہوں نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور پھر کہا "مجھے بتانا تو نہیں چاہیے مگر کیونکہ میں آپ کو واقعی مطمئن کرنا چاہتا ہوں اس لیے یہ واقعات بیان کر رہا ہوں۔" پھر انہوں نے ہمیں ایک کے بعد ایک کہانی سنانی شروع کر دی۔ بڑے بڑے دولت مند' معزز حضرات ویزا لے کر گئے اور واپس لوٹ کر نہ آئے۔ یا تو فرانس ہی میں ناجائز کاموں میں پڑ گئے یا پھر وہاں سے غیر قانونی طور پر یورپ کے دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ ایک صاحب جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے پر تھے' وہ فرانس سے ناجائز طور پر جرمنی پہنچ گئے۔ ایک اور معزز بزرگ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہو گئے۔ چھ سات واقعات سنانے کے بعد وہ کہنے لگے "اب آپ ہی بتائیے کہ ہم' لوگوں میں کس طرح تمیز کریں؟"

ہم لاجواب تو ہو گئے مگر پھر بھی خاموش رہنا گوارا نہیں کیا۔ آخر کج بحثی بھی کوئی چیز ہوتی ہے جس میں ہم لوگ ماہر ہیں۔ ہم نے کہا "دیکھیے چند واقعات یہ ظاہر نہیں کرتے کہ لوگوں کی اکثریت ایسی ہے۔"

انہوں نے مسکرا کر بات رفع دفع کر دی۔ پھر بولے "آج تو دفتر کا وقت ختم ہونے والا ہے۔ آپ کل ویزا لے لیجیے۔"

ہم نے کہا "افسوس کہ ہم آج ہی شام واپس لاہور جا رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ہم

اس بار پیرس نہیں جائیں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے "میں پیرس کو ایک مداح سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔ آپ جیسے لوگوں کا پیرس پر بہت حق ہے۔ آپ ایک گھنٹے بعد آ کر اپنے ویزے لے سکتے ہیں۔ دفتر تو بند ہو جائے گا مگر اسی کاؤنٹر پر آپ کو مسٹر شہناز ویزے دے دیں گے۔"

ہم نے کہا "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمیں مسٹر شہناز کا سامنا نہ کرنا پڑے؟"

وہ ہنس پڑے' بولے "ٹھیک ہے کوئی اور وہاں موجود ہو گا۔"

ان کا شکریہ ادا کر کے اور خدا حافظ کر کے ہم رخصت ہوئے تو انہوں نے چلتے چلتے ہمیں بتایا کہ ان دنوں پیرس میں کون کون سی قابل دید فلمیں لگی ہوئی ہیں۔ موسم کس قدر خوشگوار ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایک گھنٹے بعد ویزوں کے ساتھ ہمارے پاسپورٹ واپس مل گئے۔ ان کے وعدے کے مطابق مسٹر شہناز کی جگہ ایک فرنچ خاتون نے ہمارے پاسپورٹ ہمارے حوالے کیے اور کافی دیر تک مسکراتی رہی۔ شہناز صاحب ہمیں اندر والے ایک کمرے میں نظر آئے۔ وہ ہمیں وہیں سے بیٹھے گھور رہے تھے۔ جواب میں ہم نے بھی انہیں تھوڑی دیر تک گھورا۔ فرنچ خاتون نے "میغ سی موسیو" کہہ کر مداخلت کر دی ورنہ دور دور سے گھورنے کا یہ مقابلہ کافی دیر تک جاری رہتا۔

لاہور سے کراچی اور کراچی سے پیرس۔ یہ ہمارا فضائی راستہ تھا۔ درمیان میں بیروت اور روم میں بھی کچھ دیر کے لیے رکنا تھا۔ اس زمانے میں مسافروں کو ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ وہ اس وقفے میں نہ صرف ائرپورٹ پر جاکر آزادی سے گھوم پھر سکتے تھے بلکہ ڈیوٹی فری شاپس سے اپنی پسند کی سستی چیزیں بھی خرید سکتے تھے اس لیے راستے میں مختلف ائرپورٹس پر مختلف قیام بھی ایک اضافی تفریح اور دلچسپی تھی بعد میں تو رفتہ رفتہ وہ زمانہ آگیا جب مسافروں کو تمام وقت ہوائی جہاز کے اندر ہی بیٹھنا پڑتا ہے اور اس دوران میں طیارے کی صفائی وغیرہ بھی جاری رہتی ہے۔ اس لیے یہ وقفہ کافی بدمزہ اور بورنگ لگتا ہے۔

"ائر فرانس" کے ذریعے سفر ہمارے لیے نیا تجربہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی ہم ایک دو بار اس فضائی کمپنی کے ذریعے سفر کرچکے تھے اور اس کی میزبانی' حسن سلوک اور نفاست کے قائل بھی تھے۔ اس بار بھی ویسا ہی تجربہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ ائر ہوسٹس زیادہ خوش شکل نہیں تھیں۔ جب ہم نے اپنی بیگم کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا تو وہ بولیں "مگر کس قدر اسمارٹ ہیں۔"

واقعی اس پہلو پر ہم نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ صرف شکل دیکھ کر رائے قائم کرلی تھی حالانکہ جسم بھی انسان کی شخصیت میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ ان خواتین کی اسمارٹ نس اور مستعدی واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انتہائی متناسب جسم' لمبی لمبی ٹانگیں اور چال بے حد تیز۔ جیسے پرواز کررہی ہیں۔ ان میں سے کسی کو ہم نے ایک جگہ ساکت نہیں دیکھا۔ یوں لگتا تھا رنگین اور خوشبودار تتلیاں ہوائی جہاز کے اندر اڑتی پھر رہی ہیں۔ ان کی تیز رفتاری دیکھ کر ہمیں اپنی پنجابی فلموں کی ایک ہیروئن شیریں یاد

آگئیں۔ شیریں کو شباب کیرانوی نے اپنی پنجابی فلم "تیس مار خاں" میں متعارف کرایا تھا اور وہ پہلی فلم ہی سے مقبول ہوگئی تھیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھیں یا بہت اچھی فنکارہ تھیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبصورتی ان کی لمبی لمبی ٹانگیں تھیں۔ ان کا چہرہ اور بالائی جسم کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کی ٹانگیں اتنی سڈول ہوں گی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بہت تیز بھاگتی تھیں۔ گانے گاتے ہوئے وہ میدانوں' کھیتوں اور کھلیانوں میں ایک طرف سے دوسری طرف تیزی سے دوڑتی ہوئی نظر آتی تھیں اور ڈانس کرتے ہوئے بہت اونچی اور لمبی چھلانگیں لگاتی تھیں۔ ان کی کامیابی اور مقبولیت کا راز ان کی ٹانگوں اور چھلانگوں ہی میں پوشیدہ تھا۔ انہوں نے ایسی زقندیں بھریں کہ کچھ عرصے کے لیے دوسری تمام ہیروئنوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ مگر صرف چھلانگوں کے سہارے کوئی ہیروئن کب تک چل سکتی ہے۔ چنانچہ وہ جس تیزی سے دوڑتی بھاگتی اور چھلانگیں لگاتی ہوئی فلمی دنیا میں داخل ہوئی تھیں' اسی تیزی سے کودتی پھاندتی رخصت ہو گئیں اور تھوڑے عرصے بعد لوگ ان کا نام تک بھول گئے۔ پتا نہیں اس روز ائر فرانس کی فضائی میزبانوں کو دیکھ کر ہمیں شیریں کیوں یاد آگئیں۔ ہم کافی دیر تک سوچتے رہے کہ اگر یہ خواتین ہماری پنجابی فلموں میں ہیروئنوں کے طور پر کام کریں تو کتنی اچھی اور اونچی چھلانگیں لگائیں گی اور کتنی زیادہ مقبولیت حاصل کریں گی؟

کھانے کے بارے میں ہم نے پہلے ہی ہدایات جاری کردی تھیں اس لیے نہایت نفاست کے ساتھ ابلی ہوئی سبزی ترکاری پیش کی گئی جس کے ہمراہ بہت خوش ذائقہ پنیر بھی تھا۔ مکھن اور ڈنر رول بھی بہت مزیدار تھے اور خالص فرنچ پیسٹری سوئٹ ڈش کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ کھانا تو خیر جیسا بھی تھا مگر کٹلری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ نہایت نازک اور خوب صورت کانٹے' بیضوی چمچے جن کے ہینڈل گہرے کتھئی رنگ کے پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے۔ ہم نے اور ائرلائنز میں بھی سفر کیا ہے مگر ایسی خوبصورت اور نازک کٹلری کسی اور فضائی کمپنی میں دیکھنے کو نہیں ملی۔ یورپ' امریکا' ایشیا' مشرق وسطیٰ کسی فضائی کمپنی کو ایسی نفیس اور خوب صورت کٹلری مسافروں کو فراہم کرنا نصیب نہیں ہوئی' اور کیوں نہ ہو' فرانس والوں کی لطافت طبع اور نزاکت خیال تو ہمیشہ سے مشہور ہے۔ اب ہم آپ کو ایک نہایت راز کی بات بھی بتا دیتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ائر فرانس کی کٹلری خصوصاً کانٹے اور

چمچے ہمیں اتنے پسند آئے کہ جی للچا گیا اور ہم نے ایک عدد چھوٹا چمچہ اور ایک عدد کانٹا اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ لبنیٰ نے ہمیں بہت گھورا اور آس پاس والوں کی آنکھ بچا کر برا بھلا بھی کہا

"کیا کرتے ہیں، کچھ تو خیال کیجئے اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟"

ہم نے کہا "کوئی نہیں دیکھتا۔ شاید وہ سب اسی کام میں مصروف ہیں۔"

"مگر یہ تو بہت بری بات ہے۔ یہ تو چوری ہے۔"

ہم نے سمجھایا "چوری نہیں یہ دراصل ائر فرانس کی یادگار ہے۔ سوونیئر!" مگر عورتوں کو اللہ میاں نے سمجھنے کی صلاحیت کچھ کم دی ہے۔ ان کی جہاں سوئی اٹک گئی، بس اٹک گئی۔ لبنیٰ نے مستقل ہمیں کہنیاں مار مار کر گھورنا شروع کر دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتی رہیں کہ وہ چمچہ اور کانٹا واپس ٹرے میں رکھ دیں۔

تنگ آکر ہم نے کہا "دیکھو یہ جو برتن ہوتے ہیں نا، ائر لائنز والے استعمال کے بعد انہیں دوبارہ استعمال نہیں کرتے۔"

"کیوں؟"

"کیا آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ ان برتنوں کو دھو کر، ابال کر دوبارہ مسافروں کو پیش کرتے ہوں گے؟ جی نہیں ہرگز نہیں، ان چیزوں کو یہ ردی میں ڈال دیتے ہیں جہاں سے غریب لوگ اٹھا کر لے جاتے ہیں یا پھر گرجے والوں کو خیرات کر دیتے ہیں، دے دیتے ہیں۔"

ان کو ہماری اس وضاحت پر یقین تو نہیں آیا مگر یہ جان کر چپ ہو گئیں کہ اب ہم ان چمچوں اور کانٹوں سے محروم ہونا پسند نہیں کریں گے۔ جب اسمارٹ ائر ہوسٹس برتن اٹھانے کے لیے آئیں تو لبنیٰ کی تو سانس ہی رک گئی تھی مگر ان خدا کی بندیوں نے برتنوں کی ٹرے میں ایک نگاہ غلط انداز تک ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ ٹرے کو اٹھا کر ٹرالی میں رکھ لیا تب کہیں جا کر ان کے دم میں دم آیا۔

بچیوں کی خاطر مدارات بہت مناسب طریقے سے ہو رہی تھی۔ پہلے تو ائر ہوسٹسوں نے انہیں کچھ تحفے تحائف لا کر دیے۔ پھر کلر پنسلیں اور ڈرائنگ بکس پیش کیے۔ اس کے بعد کچھ چاکلیٹ اور ٹافیاں انہیں دی گئیں۔ سب سے بڑی دلکشی یہ تھی کہ ہوائی جہاز میں ایک جگہ ایک ٹرالی رکھی ہوئی تھی جس میں ہر قسم کے کولڈ ڈرنکس اور بیئر وغیرہ موجود

تھیں۔ یہ تمام اشیا مسافروں کے لیے بالکل مفت تھیں۔ بچوں کی تو عید ہو گئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جاتے اور کوک، پیپسی، سیون اپ یا لیمن کی ایک بوتل اٹھا کر لے آتے۔ بوتلیں پینے سے زیادہ انہیں اس بات میں دلچسپی تھی کہ نہ تو کوئی انہیں روکتا تھا اور نہ ہی ان چیزوں کے لیے انہیں ماں باپ سے پیسے مانگنے پڑتے تھے۔ اس سے بڑی لگژری اور کیا ہو سکتی ہے؟

خود ہمارا سفر بھی کافی دلچسپ گزر رہا تھا۔ آس پاس اکثریت غیر ملکیوں کی تھی۔ اس لیے شور و غل سے نجات ملی ہوئی تھی۔ غیر ملکیوں، خصوصاً یوروپین اقوام میں ہم نے یہ خوبی دیکھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنا استحقاق نہیں جتاتے بلکہ انہیں درگزر کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ماحول اور روزمرہ زندگی پرسکون رہتی ہے۔ البتہ جہاں ان کے شہری حقوق کا سوال پیدا ہوتا ہے وہ ان سے کسی صورت میں بھی محروم ہونا گوارا نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر فضائی سفر ہی کو دیکھ لیجیے: ہمارے پاکستانی مسافر ہوائی جہاز میں اور خاص طور پر پی آئی اے کے طیارے میں قدم رکھتے ہی یہ فرض کر لیتے ہیں جیسے انہوں نے پی آئی اے کو خرید لیا ہے اور ان کے اشارہ ابرو پر رقص کرنا عملے کا فرض اولین ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑھا چڑھا کر مسئلہ بنا دیتے ہیں اور پھر بات کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ خود بھی تماشا بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے سفر تک ہی محدود نہیں ہے عام زندگی میں بھی ہمارا یہی رویہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بنیادی شہری حقوق کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلوس نکال کر بسوں کو آگ لگا کر اور قومی املاک کو توڑ پھوڑ کر ہم مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ سفر کے دوران میں ائر ہوسٹس کو کم سے کم زحمت دی جائے اور بلا وجہ شکوہ شکایت کا دفتر نہ کھولا جائے جیسا کہ اکثر حضرات و خواتین کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا یہ اصول ہے کہ دوران سفر پی آئی اے کے عملے کے گلے پڑنے کی بجائے آس پاس کے ماحول اور ہم سفروں پر توجہ دی جائے۔ یہ تجربہ خاصا دلچسپ اور خوشگوار ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح آپ اپنے اردگرد کے لوگوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ نئے دوست بنا سکتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر کسی وقت ہوائی جہاز خراب موسم سے دو چار ہو جائے تو ایک المناک موت کا انتظار کرنے کے بدلے ہمسایوں کی باتوں میں پناہ لے سکتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا یہ دستور ہے کہ ذرا سا موسم خراب ہو جائے تو وہ اپنی ہم

نشین خاتون کے نرم و نازک شانے پر سر رکھ دیتے ہیں اور لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگتے ہیں اور عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ عارضہ قلب میں مبتلا ہیں اس لیے ایسے حالات میں ان کا یہی حال ہو جاتا ہے۔ یوروپین خواتین عام طور پر دلاور اور ہمدرد ہوتی ہیں اس لیے وہ فوراً دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اس طرح فریقین کا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ وہ ہمیں بھی یہی مشورہ دیتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ تاکید کرنا نہیں بھولتے کہ ہم نشین کا شانہ تلاش کرنے سے پہلے یہ بھی ضرور دیکھ لیں کہ

۱: وہ خوب صورت ہے۔

۲: غیر ملکی' خاص طور پر یوروپین ہے۔

۳: آپ کے ساتھ آپ کی بیگم موجود نہیں ہیں۔

ہم نے پوچھا۔ آخر الذکر دو شرطیں تو خیر سمجھ میں آتی ہیں لیکن شرط اول کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ اس میں کیا مصلحت ہے؟

جواب دیا "بھائی میرے دراصل شرط اول ہی خشت اول ہے۔ اگر آپ کی ہمسایہ خاتون خوش شکل نہیں ہیں تو پھر اس ترکیب پر عمل کرنا گناہ بے لذت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہم ان کی مشاقی اور تجربہ کاری کے قائل ہو گئے۔

اس سفر میں صورت یہ تھی کہ شرط اول تو موجود تھی مگر اس کے ساتھ کی شرط سوئم بھی ہمارے ساتھ ہی براجمان تھی۔ دیکھئے ہم پہلے بھی بارہا بتا چکے ہیں کہ ہماری بیگم للہی خدا کے فضل و کرم سے بہت روشن خیال اور سمجھدار واقع ہوئی ہیں۔ عورتوں خصوصاً بیویوں میں شک و شبہ کی جو بیماری ہوتی ہے وہ اس سے محفوظ ہیں۔ ہماری اکثر حرکتوں کو بے ضرر شوخی سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ بہت ہوا تو گھور کر دیکھ لیا یا پھر کہنی مار کر متوجہ کر لیا۔ زور سے "ہوں" کہنے کی نوبت تو بہت کم ہی آتی ہے بلکہ آتی ہی نہیں ہے۔ اسی لیے ہم یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ خدا اپنے تمام نیک بندوں کو ایسی ہی بیویاں نصیب کرے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بیوی کے ہوتے ہوئے کسی دوسری خاتون کے کندھے پر سر رکھنا اور ان سے ہمدردی کی توقع کرنا ویسے بھی معقول بات نظر نہیں آتی۔ اس لیے ہم تو ایسے موقع پر موسم خراب ہونے کی صورت میں کندھا تلاش کرنا ہی بے مقصد سمجھتے ہیں۔

خیر کندھے پر سر رکھنا تو الگ بات ہے لیکن بات چیت اور ہنسی مذاق کرنے کے سلسلے میں ہماری بیگم کی جانب سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس لیے ہم بڑی دیدہ دلیری سے آس پاس کے لوگوں سے تعلقات بہتر بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس وقت بھی صورت حال کم و بیش ایسی ہی تھی۔ ہمارے پاس تو ہماری فیملی ہی تھی مگر اگلی اور پچھلی سیٹوں پر خاصے دلچسپ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کی سیٹوں پر ایک جرمن فیملی تھی مع دو عدد بچوں کے۔ وہ بھی ہماری بچیوں کے ہم عمر ہی تھے اس لیے بہت جلدی آپس میں دوست بن گئے۔ طیارے کے اندر بھاگ دوڑ میں تو وہ شریک تھے ہی مگر سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بھی ان کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ بار بار سیٹ پر کھڑے ہو کر نادیہ اور پارو سے تبادلہ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان کے ماں باپ کو یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی اور وہ انہیں مستقل جرمن زبان میں ہدایات جاری کرتے رہے۔ ہم نے جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں بچے بھی جرمن زبان ہی بول رہے تھے۔ یہ اطلاع بھی ہمیں نادیہ اور پارو ہی نے فراہم کی تھی کہ وہ دونوں جرمن زبان بولتے ہیں اور انگریزی بالکل نہیں جانتے۔

پارو نے اس پر تبصرہ کیا کہ "بے چارے بالکل ان پڑھ ہیں۔"

ہم نے پوچھا "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

جواب ملا "پاپا انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔"

دیکھا آپ نے! ہمارے ملک کے بچے بچے کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ جو شخص انگریزی نہیں جانتا وہ جاہل مطلق ہے۔ ہم نے خواہ مخواہ بچوں سے بحث کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ سوچا کہ جب بڑے ہوں گے تو خود ہی جان جائیں گے۔

پچھلی سیٹ پر مختلف اقسام کے لوگ تشریف فرما تھے۔ ایک خاصی بڑی عمر کی خاتون تھیں جو نک سک سے درست اور پورے میک اپ میں تھیں اور تھوڑی دیر کے بعد اپنا میک اپ چیک بھی کرتی رہتی تھیں۔ ان کے برابر ایک انگریزی جوڑا تھا جن کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ ان دونوں نے تمام سفر کے دوران میں مشکل سے دس پندرہ منٹ آپس میں بات کی ہو گی۔ ورنہ بیشتر وقت وہ میگزینوں کے مطالعے' فلم بینی یا موسیقی سننے میں مصروف رہے۔ کھانے کے بعد انہوں نے اپنی آنکھوں پر سیاہ پٹی نما چیز جمائی اور خواب خرگوش کے

مزے لینے لگے۔ صبح ناشتے کے وقت بڑی مشکل سے ائر ہوسٹس نے انہیں پکار پکار کر بیدار کیا۔ مسز تو دس بارہ آوازوں کے بعد بیدار ہو گئیں مگر ان کے شوہر پھر بھی نہ جاگے۔ ائر ہوسٹس انہیں جگانے کا فرض ان کی بیگم کے سپرد کر کے رخصت ہو گئیں۔ اب انہوں نے دبی دبی آواز میں پکارنا شروع کر دیا "جارج، اٹھو آنکھیں کھولو، جارج اٹھو آنکھیں کھولو جارج ...."

وہ طوطے کی طرح یہ الفاظ بار بار دہراتی رہیں مگر کیا مجال جو ایک بار بھی جارج کو ہاتھ لگایا ہو یا جھنجوڑنے کی کوشش کی ہو۔ اس قدر رسمی تکلف اور ادب آداب کا مظاہرہ صرف انگریز میاں بیوی ہی کر سکتے ہیں۔ خدا خدا کر کے وہ اپنے شوہر کو جگانے میں کامیاب ہوئیں۔ انہوں نے آنکھیں کھولتے ہی بہت بلند آواز میں جمائی لی اور پھر "اوہ سوری ڈالنگ" دوسرے کو "گڈ مارننگ" کہا۔ جارج نے آنکھیں مل کر اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولے "اومائی گڈ نس۔ اتنی دیر ہو گئی!" ائر ہوسٹس ان کے نزدیک سے ناشتے کی ٹرے لیے ہوئے گزری تو انہوں نے بڑے ادب سے اسے روکا اور کہا "مجھے بیڈ ٹی مل سکتی ہے؟"

ائر ہوسٹس نے حیران ہو کر انہیں دیکھا پھر شاید پھر جان گئی کہ بے چارہ کوئی انگریز ہے۔

مسکرا کر بولی "اطمینان رکھیے ہم لوگ ناشتہ پیش کر رہے ہیں۔"

انہوں نے کہا "مگر میں تو بیڈ ٹی کی درخواست کر رہا ہوں۔"

ائر ہوسٹس بھی بڑی پکی تھی کہنے لگی "معاف کیجیے ہم لوگ ہوائی جہاز کے سفر کے دوران میں بیڈ ٹی پیش نہیں کرتے۔"

مسز جارج نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولیں "مداخلت کی معافی چاہتی ہوں مگر بدقسمتی سے جارج صبح بیدار ہوتے ہی بیڈ ٹی لینے کا عادی ہے۔"

ائر ہوسٹس نے طنزیہ انداز میں کہا "حیرت ہے کہ مسٹر جارج بیڈ اور نائٹ سوٹ کے بغیر سو کیسے گئے؟"

مسز جارج اس طنز کو نہ سمجھ سکیں اور سنجیدگی سے کہنے لگیں "یقین کیجیے ساری رات بے آرام رہے ہیں۔ گہری نیند سو بھی نہیں سکے۔"

ائر ہوسٹس نے مضحکہ خیز انداز میں اردگرد کے مسافروں کو دیکھا اور شانے اچکا دیے۔

بیڈ ٹی کی بحث شاید کچھ دیر اور جاری رہتی مگر ان کے پڑوس میں تشریف فرما بزرگ خاتون نے دخل در معقولات کرتے ہوئے مسٹر جارج کو یہ مشورہ دیا کہ ناشتہ آئے تو وہ بیڈ ٹی سمجھ کر پہلے چائے نوش فرمالیں اور اس کے بعد باقی ناشتہ تناول کریں۔ یہ تجویز مسٹر اور مسز جارج کو بہت پسند آئی اور اس طرح یہ بحث ختم ہوئی۔

مسٹر اور مسز جارج کے پہلو والی کرسی پر ایک میکسیکو سے تعلق رکھنے والے حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہر ایک سے اپنا تعارف کرا چکے تھے۔ پڑوس میں بیٹھنے والے مسافروں کے علاوہ نزدیک سے گزرنے والی ائر ہوسٹس سے بھی وہ فوراً اپنا تعارف کرا دیتے تھے "ایکسکیوزمی۔ میرا نام ولیم ہے، میں میکسیکو سے تعلق رکھتا ہوں۔" جب ایک نئی ائر ہوسٹس ناشتے کی ٹرالی لے کر ان کے نزدیک پہنچی تو انہوں نے حسب معمول مسکراتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا "ایکسکیوزمی........"

ائر ہوسٹس نے فوراً ان کی بات کاٹ دی "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ آپ کا نام ولیم ہے اور آپ میکسیکو سے تعلق رکھتے ہیں۔"

وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے "مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

وہ بولی "میں علم غیب جانتی ہوں" اور ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے رکھ کر رخصت ہو گئی۔ وہ کچھ دیر غور فرماتے رہے پھر شانے ہلا کر بولے "حیرت انگیز۔ بے حد حیرت انگیز!"

نادیہ نے ہم سے پوچھا "پاپا! مسٹر ولیم ہر ایک کو زبردستی اپنا نام کیوں بتا رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "بیٹا دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیا کرتے۔" ظاہر ہے ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے؟"

پیرس کے اورلے ائرپورٹ پر پہنچے تو موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ ہمیں یہاں تین چار دن قیام کرنا تھا۔ پیرس ہم پہلے بھی جا چکے تھے مگر ہمیشہ گاردو نارد کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی قیام کیا۔ خدا جانے ہمیں اس جگہ کی عادت پڑ گئی تھی یا بلاوجہ کسی نئے ہوٹل اور نئے علاقے کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہی فیصلہ کیا کہ وہیں چلنا چاہیے۔ ائر فرانس کی کوچ نے ہمیں پیرس کے ٹرمنل تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد گاردو نارد تک کا سفر ہم نے ٹیکسی کے ذریعے طے کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک سیاہ فام تھا۔ یہ شخص یا تو بولتا ہی نہیں تھا یا اگر بولتا تھا تو صرف فرنچ میں گفتگو کرتا تھا جو ہمارے پلے نہیں پڑتی تھی اس لیے اس کا نہ بولنا ہی بہتر تھا۔ گاردو نارد کے چوک پر پہنچے تو ہر چیز مانوس سی لگ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے لوٹ کر اپنے گھر آ گئے ہیں۔ ہوٹل ٹرمنس پہنچ کر ہم ٹیکسی سے اتر گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی بے زاری سے ہمارا سامان نکال کر باہر رکھا اور ہماری شکل دیکھنے لگا۔ ہم نے ٹیکسی کے میٹر پر نظر ڈالی۔ مشکل یہ ہے کہ ہر قسم کا میٹر ہمارے لیے گورکھ دھندے سے کم نہیں ہے۔ وہ تو پھر پیرس کی ٹیکسی کا میٹر تھا جس پر فرنچ زبان میں ہی کچھ تحریر تھا۔ کافی غور سے پڑھنے کے باوجود کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آیا تو ٹیکسی ڈرائیور نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ زبان تو ہمارے لیے ناقابل فہم تھی مگر یہ اندازا ہو سکتا تھا کہ وہ ہماری جہالت اور لاعلمی پر تبصرہ کر رہا ہے اور اپنی زبان میں کہہ رہا ہے "ہنہ آجاتے ہیں منہ اٹھا کر پیرس دیکھنے۔ جاہل کہیں کے!"

لاچار ہم نے دس پونڈ کا ایک نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا کیونکہ کرنسی تبدیل کرانے کی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے نوٹ ہمارے ہاتھ سے جھپٹا اور باقی کی رقم ہمارے ہاتھ پر رکھ کر یہ جا وہ جا۔ اس کا اندازا نہایت گستاخانہ تھا مگر ہم

مجبوراً خاموش رہے۔ اس لیے کہ اول تو اس سے کچھ کہنا بے کار تھا کیونکہ وہ انگریزی سے قطعاً نابلد تھا۔ دوسرے ڈانٹ ڈپٹ کرنا قرین مصلحت بھی نہ تھا کیونکہ وہ بہت اونچا لمبا اور باکسر نما آدمی تھا اور اس سے جھگڑا مول لینا سراسر گھاٹے کا سودا تھا مگر جب ہم اس کو نمٹا کر اپنے سامان کے پاس پہنچے تو نادیہ نے ہم سے کہا "پاپا آپ نے اسے ڈانٹا کیوں نہیں؟"

ہم نے حیران ہو کر اس آٹھ سالہ بچی کی طرف دیکھا جو ہمیں بلاوجہ تشدد پر اکسا رہی تھی۔

"ڈانٹنے کی کیا ضرورت تھی؟"

کہنے لگی "اس نے اتنی بدتمیزی سے آپ سے نوٹ چھین لیا اور منہ بناتا ہوا چلا گیا۔ لاہور میں تو آپ بے چارے رکشہ والوں کو خوب ڈانٹتے ہیں۔"

بات نہایت معقول تھی اور اسباب اور وجوہات بتانے کا موقع نہ تھا اس لیے ہم نے "سوری" کہہ کر بات رفع دفع کر دی۔ دراصل بچوں کو اس قدر پیچیدہ باتیں سمجھانا کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا۔ مصلحت بھی آخر کوئی چیز ہے۔

سامنے ہی ہمارا پرانا "ہوٹل ٹرمنس" نظر آ رہا تھا۔ ہم کسی بچھڑے ہوئے پرانے دوست کی طرح بے تابی سے آٹومیٹک دروازے میں داخل ہوئے۔ سامنے استقبالیہ پر کوئی نئی صورت جلوہ گر نظر آئی۔ ادھیڑ عمر مگر خوش شکل اور نک سک سے درست خاتون تھیں اور ہمیں پہلی بار شرف ملاقات حاصل ہوا تھا مگر انہوں نے اس قدر تپاک اور گرمجوشی سے مسکرا کر دیکھا کہ ہم اپنے حافظے کو ٹٹولنے لگے کہ ہم ان سے کہاں ملے تھے بلکہ شیر و شکر ہوئے تھے؟ بہرحال جواباً مسکرانا تو خیر واجب ہو گیا تھا۔ جب اس رسم سے فارغ ہوئے تو عرض کی کہ ہمیں ایک بڑا یا دو چھوٹے کمرے درکار ہیں۔

انہوں نے ایک کان سے دوسرے کان تک اپنی نازک گردن کو جنبش دی اور بولیں "سوری موسیو" پھر یاد آیا تو پوچھا "کیا آپ کی بکنگ ہو چکی ہے؟"

اس بار ہماری گردن ہلانے کی باری تھی۔ اس کے جواب میں انہوں نے پھر گردن ہلا دی بلکہ اس بار تو دونوں شانے بھی اچکا دیے گویا اب اور کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔

ہم نے باہر نکل کر آس پاس کے ہوٹلوں کا رخ کیا۔ سامان اور فیملی کو فٹ پاتھ پر چھوڑا اور مختصر سی مدت میں کئی ہوٹل بھگتا دیے۔ یہ دراصل سیاحوں کے موسم کا زمانہ تھا

اور ان ملکوں میں اس زمانے میں ہوٹل میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ ہم چار انسانوں کی گنجائش کہاں نکلتی؟ مگر پھر بھی بزرگ کہہ گئے ہیں کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ ہوٹل کا کمرا کیا چیز ہے۔ چنانچہ مزید نصف گھنٹے کی تگ و دو کے بعد ہمیں اس گردو نواح میں ایک ہوٹل میں جگہ مل گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ بیس پچیس کمرے ہوں گے مگر تھا بہت نفیس اور خوبصورت۔ آخر پیرس کا ہوٹل تھا۔ اس کی مالکہ ایک خاصی موٹی تازی خاتون تھیں اور ان کے شوہر ان سے بھی زیادہ صحت مند تھے مگر بعد میں پتا چلا کہ دونوں انتہائی اسمارٹ اور چست و چالاک تھے۔ اتنی تیزی سے چلتے تھے کہ لگتا تھا کوئی بڑے سائز کی فٹ بال گول کی جانب جا رہی ہے۔ ہم نے استقبالیہ پر خاتون سے کمروں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے انگوٹھے سے برابر میں بیٹھے ہوئے شوہر کی طرف اشارہ کر دیا اور بولیں "ہی اسپیک انگلش ویری گڈ"

ہم ان کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ مسکرائے اور پوچھا "ہاؤ مچ؟"

عام طور پر یہ سوال دکانداروں سے کیا جاتا ہے کہ اس چیز کی قیمت کیا ہے یا کتنا کرایہ بنتا ہے مگر ان کی زبان سے یہ سوال سن کر ہم حیران رہ گئے۔ شاید اللہ میاں نے عورتوں کو زیادہ عقل دی ہے، لنبی ان کا مدعا سمجھ گئیں اور بتایا کہ ہمیں دو ڈبل کمرے یا ایک بڑا کمرہ درکار ہے۔ انہوں نے اپنی بیگم سے مشورہ کیا۔

پھر ہم سے پوچھا "فار ہاؤ مچ؟"

ہم تو چکرا گئے مگر اس بار بھی لنبی نے جواب دیا اور بولیں "تین دن کے لیے۔"

انہوں نے پھر بیگم سے مذاکرات کیے اور پھر مسکرا کر بولے "اوکے مادام یو ٹیک ٹورمز یعنی آپ کو دو کمرے مل جائیں گے۔ کرایہ انہوں نے فرانکس میں بتایا جس کو ان کی بیگم نے فوراً ڈالروں میں تبدیل کر کے بتا دیا۔ چابیاں ہمارے حوالے کیں اور شوہر کو اشارہ کیا کہ جاؤ ان کے ساتھ۔ وہ نہایت تابعداری سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی سے لڑھکتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھے۔ ہم تو ان کی پھرتی اور تیزی رفتاری دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ابھی ہم اپنا سامان ہی اٹھا رہے تھے کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر پہنچ گئے۔ گیلری میں تھوڑا سا آگے چلنے کے بعد آمنے سامنے دو کمرے تھے جو انہوں نے ہمارے حوالے کر دیے۔ اندر داخل ہو کر کمرے دکھائے۔ بہت صاف ستھرے اور آرام دہ کمرے تھے، ٹی

وی بھی تھا۔ پھر انہوں نے ایک کمرے کے اندر سے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "ہیرو، دیئر کڈز، نو پرابلم" مطلب یہ تھا کہ یہ آپ لوگوں کا کمرا ہے سامنے والا کمرا بچوں کے لیے ہے۔ دونوں آمنے سامنے ہیں بڑی آسانی سے بچوں پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔ اتنا کہہ کر انہوں نے دونوں ہاتھ جھاڑے اور "مینخ سی" کہہ کر رخصت ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہاتھ جھاڑنا ان کی عادت تھی۔

بچیوں نے فوراً اپنے کمرے میں جا کر ٹی وی آن کر دیا اور مختلف چینل بدلنے شروع کر دیے۔ ہم نے ایک کونے میں رکھی ہوئی جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ ابھی رات ہونے میں کچھ دیر تھی اس لیے باہر جانے کا موقع تھا لیکن ٹی وی پر کارٹون دکھائے جا رہے تھے اس لیے بچیاں ٹی وی کے سامنے سے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ ہم انہیں چھوڑ کر دوبارہ نیچے چلے گئے اور ریستوران کا جائزہ لیا۔ چھوٹا سا سجا ہوا ہال تھا۔ خوش رنگ میز پوش، اور ہلکی پھلکی کرسیاں۔ ہمیں دیکھ کر میڈم تشریف لے آئیں۔ انہیں ہم نے پہلی بار حرکت میں دیکھا تھا اور وہ بھی تیزی اور پھرتی میں اپنے شوہر سے کم نہ تھیں۔ آتے ہی انہوں نے بڑی تیزی سے فرنچ میں کچھ کہنا شروع کر دیا "غوں غوں اور ژوں ژوں" کے سوا ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر ایک بار پھر لنبی نے مترجم کے فرائض ادا کیے اور بتایا کہ شاید یہ ہم سے پوچھ رہی ہیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہے؟ ہم نے چائے کی فرمائش داغ دی۔ چائے اور دودھ کا فرنچ ترجمہ ہمیں زبانی یاد تھا۔

"تے وو لے"

یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا مگر جب ہم نے کہا "ہاٹ" تو وہ گڑ بڑا گئیں۔ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہیں پھر دہرایا "ہاٹ" اور مشورہ کرنے اپنے شوہر کے پاس چلی گئیں۔ وہ کیونکہ انگریزی میں ایکسپرٹ تھے۔ اس لیے ہمارا مطلب جان گئے۔

چائے خلاف توقع اچھی تھی۔ ہم نے اس دوران میں یہ پروگرام بنایا کہ کچھ دیر بعد شانزے لیزے کا ایک چکر لگایا جائے اور کھانا وہیں کسی ریستوران میں کھائیں۔ اسی اثناء میں چند اور لوگ بھی ریستوران میں آ گئے۔ سبھی غیر ملکی تھے لیکن کوئی نہ کوئی فرنچ جانتا تھا اس لیے کوئی پرابلم نہ تھی۔ یہ سب اسی ہوٹل کے مہمان تھے۔ ہمیں دیکھا تو دستور کے مطابق مسکرائے۔ ایک نوجوان خاتون کو لنبی کی شلوار قمیص اور دوپٹہ بہت پسند آیا۔ پاس

آئیں اور معذرت کے بعد پوچھا کہ یہ ڈریس کہاں ملتا ہے؟ ہم نے بتایا کہ یہ پاکستانی ڈریس ہے تو آنکھیں گھمائیں اور مسکرا کر انگریزی میں کہنے لگیں "اوہ پھر تو بہت دور جانا پڑے گا۔"

کارٹون ختم ہو چکے تھے مگر بچیوں کو شانزے لیزے یا پیرس کی سیر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے منت سماجت کر کے' چاکلیٹ وغیرہ کا لالچ دے کر ہم نے انہیں رضا مند کیا۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین کا اسٹیشن سامنے ہی تھا مگر پیرس میں مختصر قیام ہو اور زیر زمین سفر کیا جائے' اس سے بڑھ کر بدذوقی اور کیا ہو گی؟ لہذا بس کے ذریعے یہ فاصلہ طے کیا۔ شانزے لیزے کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ یہ سڑک پیرس کا سنگھار ہے۔ ہر طرح کی دکانیں' سینما گھر' تھیٹر ہاؤس' نائٹ کلب' شوروم یہاں موجود ہیں اور سجاوٹ ایسی کہ بس دیکھتے رہیے۔ ایک جانب تاریخی "فتح کی محراب" ہے۔

یہ بہت کشادہ سڑک ہے لیکن دونوں جانب فٹ پاتھ اس سے بھی زیادہ چوڑے چکلے ہیں۔ ریستوران جو فٹ پاتھوں پر بھی پھیلے ہوئے ہیں اس سڑک کی نمایاں چیز ہیں۔ رونق اور چہل پہل' حسن و جمال اور خوشبو کی یہاں بہتات ہے۔ اس زمانے میں یہاں ایشیائی اور پاکستانی خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کالے البتہ جابجا نظر آجاتے تھے مگر سیاحوں کی کثرت تھی۔ شاپنگ وغیرہ تو یہاں بہت کم لوگ کرتے ہیں بس سیر تماشے اور رونق دیکھنے کی غرض سے فٹ پاتھوں پر ایک طرف سے دوسری طرف تک مٹرگشت کرتے رہتے ہیں یا پھر رنگا رنگ فٹ پاتھ کے ریستورانوں میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ شاپنگ کے بجائے ونڈو شاپنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ موسم بہت خوشگوار تھا اور ہر چیز روشن روشن اور صاف شفاف نظر آرہی تھی۔ فضا میں گرد و غبار کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یوروپی ملکوں میں یہ خوبی عام ہے۔ اس کے علاوہ سبزہ و گل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ درودیوار تک سرسبز بیلیں اور خوب صورت پھولوں کے گملے نظر آتے ہیں۔ پیرس ہماری تو کمزوری ہے مگر مشکل یہ تھی کہ بچیوں کو اس شہر میں کوئی کام کی چیز نظر نہیں آئی۔ زیادہ دیر پیدل چلنے کے لیے بھی وہ تیار نہیں تھیں۔ ہر دو منٹ کے بعد یارو "تھک گئے" کا نعرہ بلند کر دیتی تھیں بلکہ فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ جاتی تھیں۔ ایسے میں بھلا پیرس کا لطف کوئی خاک اٹھا سکتا ہے پھر بھی' جیسے تیسے کچھ وقت وہاں گزارا۔ ایک فٹ پاتھ والے

ریستوران میں فش فنگر اور ٹماٹر سوپ کا ڈنر کیا' آئس کریم کھائی۔ اس اثناء میں روشنیاں جل گئی تھیں اور پیرس کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔ بچیوں کا اصرار تھا کہ ٹیکسی کی جائے مگر ہم نے دوبارہ بس کا سفر اختیار کیا اور ہوٹل پہنچ گئے۔ بچیوں نے لباس تبدیل کیا اور باتیں کرتے کرتے ہی سو گئیں۔ ابھی تو رات کے دس ہی بجے تھے اور ہم روشنیوں کے شہر میں تھے۔ بھلا کمرے میں ٹھہرنے یا سونے کا کیا سوال تھا مگر بچیوں کو کمرے میں تنہا چھوڑنا بھی ممکن نہ تھا۔ انہیں گہری نیند میں چھوڑ کر ہم ہوٹل کے دروازے میں جا کر کھڑے ہو گئے اور حسرت بھری نگاہوں سے پیرس کی منظم ٹریفک دیکھنے لگے اور سوچا کہ کچھ دیر سامنے والے فٹ پاتھ کے ریستوران میں جا کر بیٹھتے ہیں۔

یکایک ہمارے شانے پر کسی نے انگلی سے دستک دی۔ مڑ کر دیکھا تو ہوٹل کا مالک کھڑے ہوئے تھے۔ مسکرا کر بولے "میخ سی موسیو۔ یو وانٹ تو سی پیرس؟"

ہم نے اقرار میں گردن ہلا دی اور کہا کہ بچیاں کمرے میں سو رہی ہیں اس لیے انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ انہوں نے فوراً تجویز پیش کر دی۔ وہ ان کی بے بی سٹنگ کریں گے۔ آپ لوگ دو تین گھنٹے گھوم پھر آئیں مگر بارہ بجے تک ضرور واپس آجائیں۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد ہم رضامند ہو گئے۔ صبح تک بچیوں کے بیدار ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور یہ پیش کش مسترد کرنا بھی کفران نعمت سے کم نہ ہوتا۔ پیرس میں وقت گزارنا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ وقت نہ گزارنا مسئلہ ہے۔ تھوڑے فاصلے پر سینما میں ایک فرنچ کامیڈی فلم لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک خاص فرنچ کامیڈی تھی اور بے حد دلچسپ تھی۔ سینما ہال میں آئس کریم اور کافی بے حد لذیز تھی۔ جب ہم واپس ہوٹل پہنچے تو بارہ بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔ استقبالیہ پر میڈم تشریف فرما تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر دیکھا اور کمرے کی چابی ہمارے حوالے کر دی۔ ان سے کچھ دریافت کرنا فضول تھا اس لیے ہم "میخ سی میخ سی" کے بعد تیزی سے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ بچیوں کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھا تو ہماری روح فنا ہو گئی۔ دھڑکتے ہوئے دل سے لپک کر وہاں پہنچے تو عجیب و غریب قسم کی آوازوں نے ہمیں مزید پریشان کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں کپڑا سینے کی مشین چل رہی ہے یا ریڈیو میں کوئی خرابی ہوئی ہے۔ بیڈ پر بچیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ کونے میں رکھی ہوئی راکنگ چیئر پر ہوٹل کے مالک خواب خرگوش کے مزے لے

رہے تھے اور یہ آوازیں ان کے خراٹوں کی تھیں۔ اس قدر دھماکہ خیز خراٹوں کے شور کا بچیوں پر مطلق اثر نہ تھا۔ ہمیں ہنسی بھی آئی اور ان صاحب پر پیار بھی آیا۔ مغربی ملکوں میں اس قسم کے جذبات کا مظاہرہ بہت کم ہی دیکھنے میں آتا ہے یا شاید فرانس کے لوگ کچھ زیادہ ہی روایت پسند اور جذباتی ہیں۔

ہم نے انہیں جگانے کے لیے آہستہ سے پکارا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لبنیٰ کا خیال تھا کہ ان کی نیند خراب نہ کی جائے مگر ہمیں یہ ڈر تھا کہ اگر یہ صاحب اسی طرح خراٹے لیتے رہے تو ہم لوگوں کی نیند حرام ہو جائے گی۔

ابھی ہم باہمی مشاورت میں مصروف تھے کہ میڈم بم کے گولے کی طرح کمرے میں داخل ہوئیں۔ ایک ہی نظر میں وہ صورت حال بھانپ گئیں۔ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور پھر اپنے شوہر کی طرف بڑھیں۔ ایک لمحہ انہیں دیکھتی رہیں اور پھر اپنا ہاتھ ان کے کھلے ہوئے منہ پر رکھ دیا۔ وہ فوراً ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ہی ان کے خراٹوں کو بھی بریک لگ گیا۔ بیگم کو دیکھ کر انہوں نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ کیا۔ غالباً روز کا معمول تھا۔ بہرحال ہم نے ان کا بہت زور و شور سے شکریہ ادا کیا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ صبح بچیوں کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہم انہیں ہوٹل میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ایک "خراٹے بردار" ان کی حفاظت پر مامور تھا۔

ریستوران میں پہنچے تو کافی لوگ موجود تھے۔ ایک طرف سے مانوس سی آوازیں سنائی دیں۔ دیکھا تو ایک میز پر ایک سردار جی اپنی مسز کے سات تشریف فرما تھے اور دونوں میں بحث جاری تھی۔ ان کے سامنے میڈم حیران و پریشان اور منتظر کھڑی تھیں۔ سردار جی اور سردارنی ٹھیٹ پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اپنی دانست میں وہ بہت مدھم آواز میں بول رہے تھے مگر سب لوگ مڑ مڑ کر انہیں دیکھنے پر مجبور تھے۔ ہم پر نظر پڑی تو سردار جی فوراً اٹھ کر ہمارے پاس آ گئے۔

"تسی کون ہو جی؟" انہوں نے پوچھا۔ نہایت عجیب سوال تھا۔ ہم ان کی شکل دیکھنے لگے۔

کہنے لگے "مطلب یہ کہ تسی ہندوستانی ہو کہ پاکستانی؟"

"پاکستانی"

"کوئی گل نہیں۔ بڑی خوشی ہوئی۔" انہوں نے ہمیں گلے لگا لیا۔ پھر پوچھا "کوئی خدمت ہو تو فرماؤ جی؟"

ہم نے کہا "بڑی مہربانی آپ کی۔ تسی سناؤ؟"

بولے "اسیں تے چنگے بھلے آں۔ یہ ان ہوٹل والیاں دی سمجھ نہیں پئی آندی" مسئلہ یہ تھا کہ وہ ناشتے میں ابلے ہوئے انڈے کھانا چاہتے تھے مگر یہ بات میڈم کو سمجھانے سے قاصر تھے "تسی مدد کرو بادشاہو" انہوں نے اپیل کی۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہم تو خود فرنچ کے معاملے میں پیدل ہیں مگر سامنے والی میز پر بیٹھی ہوئی خوش رو خاتون سے مدد لی جا سکتی تھی۔ انہوں نے بڑی خوشی سے مترجم کے فرائض سرانجام دیے اور میڈم کو فرنچ میں سردار جی کی ضروریات سے مطلع کر دیا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئیں۔

اب سردار جی اس امریکی خاتون سے مخاطب ہوئے "تہاڈی بڑی مہربان سوہنیو' سانوں کوئی خدمت دسو" یہ کہہ کر ان کی طرف اس طرح بڑھے کہ ہمیں ڈر ہوا کہ کہیں ہماری طرح ان سے بھی بغلگیر نہ ہو جائیں۔ مگر انہوں نے صرف مصافحہ کرنے پر اکتفا کیا۔ دوبارہ ہمارا شکریہ ادا کیا اور اپنی میز پر چلے گئے۔

پیرس میں ہمارا قیام تین روزہ تھا۔ یہ تو نہیں کہ ہمارا پیرس ہی میں رہ جانے کو جی چاہتا ہے۔ پیرس کتنا ہی حسین و جمیل اور رنگینیوں اور روشنیوں کا مرقع سہی، کچھ دن بعد جی اوب جاتا ہے اور پھر اپنا وطن اور لاہور یاد آنے لگتا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں کبھی بے زاری اور اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ نہ ہی یکسانیت کا احساس ہوتا ہے حالانکہ شہر میں غصہ دلانے والی بے شمار چیزیں ہیں مگر ان سے جی نہیں اکتاتا جب کہ دنیا کے دوسرے شہروں میں تھوڑے دن بعد ہی گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے مگر پیرس ان شہروں میں شامل ہے جہاں بار بار جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ نرالا شہر ہے۔ اس کی خوب صورتی اور شان انوکھی ہے۔ اس کی سڑکیں، باغات، بازار، عمارتیں، ریستوران، فٹ پاتھ، چائے خانے، نائٹ کلب سبھی چیزیں ایک مخصوص انداز کی حامل ہیں مگر اس شہر کی ایک سب سے بڑی خصوصیت اس کے شہری ہیں۔ یورپ کے لوگ بظاہر دیکھنے میں ایک جیسے لگتے ہیں مگر ان کے مزاج اور عادات و اطوار میں تو فرق ہے ہی، ان کی شکل و صورت میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔ یہ بات ذرا غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ اپنے نقش و نگار، رنگت، بالوں اور آنکھوں کی رنگت کے اعتبار سے ان تمام یوروپی اقوام میں کافی فرق ہے۔ جرمن، فرانس کے لوگوں سے مختلف ہیں۔ اٹلی والے انگلستان کے لوگوں سے نہیں ملتے۔ اسپین اور اسکنڈے نیویا کے باشندوں میں کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ غرض تمام اقوام اپنی مخصوص خصوصیات اور عادات و مزاج کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ آپس میں میل جول کی وجہ سے ان میں بہت سی چیزیں مخلوط بھی ہو گئی ہیں۔ پھر بھی ان سب کی انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فرانس کے لوگ اپنی نفاست، شائستگی، رومان پسندی اور فنکارانہ مزاج کے باعث دوسری تمام یوروپین اقوام سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ خوش لباسی اور خوش بیانی

ان پر ختم ہے۔ سلیقہ اور فن کارانہ اپج، خوشبو اور رنگوں سے محبت ان کی ایسی صفت ہے جو دوسری اقوام میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ یہ زندہ دلوں کا ملک ہے۔ کسی حال میں بھی مایوس اور اداس ہونا گوارا نہیں کرتے۔ دوسرے جنگ عظیم کے دنوں میں فرانس والوں نے اپنا دارالحکومت پیرس چپکے سے اور بڑے اطمینان سے جرمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس میں ان کی بزدلی یا کم ہمتی کا دخل نہیں تھا بلکہ وہ اپنے خوب صورت اور دلارے شہر کو جنگ کی تباہ کاریوں کا نشانہ بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے پیرس کے تاریخی اور ثقافتی مانگ کا سہاگ اجڑتے ہوئے دیکھنے کی ان میں تاب نہ تھی۔ زمانہ امن ہو یا جنگ، وہ اپنے شہروں اور خاص طور پر پیرس کو دلہن کی طرح سجا بنا کر رکھتے ہیں۔ پیرس کا ہر شہری اس شہر کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتے کو اپنے بچوں کی طرح چاہتا ہے۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت، پودے اور پھول کو توڑنا تو درکنار اگر دو دن تک۔ اسے پانی سے غسل نہ دیا جائے تو سامنے والا فرنچ فوراً بلدیہ کو فون کرتا ہے کہ "میرے درخت کو دو دن سے نہلایا نہیں گیا" یہی وجہ ہے کہ اس شہر کے درختوں کا پتا پتا سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ درختوں کی تو یورپ اور امریکا کے دوسرے شہروں میں بھی کمی نہیں ہے مگر جس نفاست، ترتیب اور تراش خراش کے ساتھ پیرس میں درخت لگے ہوئے نظر آتے ہیں وہ بات کہیں اور نظر نہیں آتی۔

پیرس کے لوگ انتہائی رومان پرست ہیں۔ ایک انگریز خاتون صحافی جب پہلی بار پیرس گئیں اور انہیں کسی ہوٹل میں جگہ نہ مل سکی تو انہوں نے سوچا کہ کسی پولیس والے سے مدد لی جائے۔ دیکھا کہ ایک پولیس کانسٹیبل صاحب فٹ پاتھ پر جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑے ہیں اور نوٹ بک پر کچھ لکھنے میں مصروف ہیں۔ یہ خاتون اس کانسٹیبل صاحب کے پاس گئیں اور بڑی آسان انگریزی میں انہیں مخاطب کر کے دریافت کیا "کانسٹیبل، ہم آج ہی پیرس میں آئے ہیں مگر رہنے کی جگہ نہیں مل سکی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہمیں رہنے کی جگہ کہاں مل سکتی ہے؟"

کانسٹیبل نے نوٹ بک پر سے نظریں اٹھا کر انہیں کھوئے کھوئے انداز میں دیکھا اور پھر کہا "میڈم ظاہر ہے کہ آپ کو رہنے کے لیے کمرا کسی ہوٹل میں ہی مل سکتا ہے اور پیرس میں ہوٹلوں کی کمی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر نوٹ بک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ خاتون یہ سمجھیں کہ جرائم کے بارے میں کوئی بات نوٹ کر رہے ہیں مگر کانسٹیبل صاحب بہت غور و فکر میں مبتلا تھے اور کسی طرح نگاہ اٹھانے پر آمادہ نہ تھے۔

انہوں نے ایک بار پھر انہیں مخاطب کیا تو وہ فرمانے لگے "میڈم میخ سی مگر میں اس وقت شعر بنا رہا ہوں۔ بڑی مہربانی ہو گی اگر مجھے کچھ دیر ڈسٹرب نہ کریں۔"

"لیکن ہمیں کہیں کمرا۔۔۔" انہوں نے اپنا مسئلہ بیان کرنا شروع کیا۔ کانسٹیبل نے خوابیدہ انداز میں انہیں دیکھا' پھر ہاتھ سے سامنے والی عمارت کی جانب اشارہ کر کے دوبارہ "شاعری" میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے اس عمارت میں جا کر دیکھا وہ ایک ہوٹل تھا اور انہیں وہاں کمرا بھی مل گیا۔ مطلب یہ کہ کانسٹیبل صاحب شاعری میں تو مصروف تھے مگر اپنے فرائض سے بھی غافل نہ تھے۔ انگریز صحافی نے لکھا 'بھلا ایسے پولیس والے آپ کو پیرس کے سوا کہاں ملیں گے؟"

دراصل یہ شہر ہی ایسا ہے کہ ہر ایک کو رومانس اور شاعری پر اکساتا ہے۔ یہاں عجائب گھروں' میوزیم اور باغوں کی کمی نہیں ہے۔ سڑکوں اور گلیوں میں بھی مصور تصویریں بنانے میں مصروف نظر آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے ریستوران ہیں جہاں دنیا کے نامی گرامی ادیب' شاعر' فنکار اور انقلابی دانش ور بیٹھا کرتے تھے۔ یہ جگہیں آج بھی ان کے حوالوں سے مشہور ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیرس ہمیشہ سے دنیا بھر کے فن کاروں' دانش وروں' شاعروں اور انقلابیوں کی پناہ گاہ رہا ہے۔ دنیا کے کون سے ملک کا نامور فن کار ایسا نہیں ہے جس نے زندگی کا کچھ حصہ یہاں بسر نہیں کیا۔ موسیقار' مصور' اداکار' دانشور' ناول نگار' ڈرامہ نویس ہر بڑا نام پیرس کی فضاؤں میں سانس لیتا رہا ہے۔

پیرس کی ایک امتیازی خصوصیت اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس شہر نے اپنے آپ کو تبدیل نہیں کیا ہے۔ نہ صورت شکل میں اور نہ ہی مزاج' ماحول اور کردار کے اعتبار سے۔ پیرس میں بھی نئی عمارتیں تعمیر تو ہوئی ہیں مگر ایسا نہیں ہے کہ پورے کے پورے علاقے بالکل ہی بدل گئے ہوں اور پہچانے ہی نہ جائیں۔ اس کے برعکس پیرس کے بیشتر علاقے بالکل پہلے جیسے ہیں۔ اگر کہیں جدید اور اونچی عمارتیں بنی بھی ہیں تو یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ تاریخی اور ثقافتی اہمیت کی عمارتوں کی شخصیت برقرار رہے۔ اس لیے پیرس جانے والوں کو

کبھی نا آشنائی کا شکوہ نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ فضا میں آلودگی اور ثقافت میں اضافے کے باعث خوب صورت درختوں کی تازگی اور شادابی میں کچھ فرق آگیا ہے مگر یہ تو جدید عہد کے لوازمات ہیں جن سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ پیرس کے کچھ پرانے علاقے واقعی غائب ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ نئی عمارتوں' پلازوں اور شاپنگ سینٹروں نے لے لی ہے خاص طور پر "لاہالی" کا قدیم علاقہ اب دیکھنے کو نہیں آتا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پیرس کے مخصوص کھانے سستے دستیاب ہو جاتے تھے۔ پیاز کا سوپ خاص طور پر بہت مشہور تھا اور دور دور سے لوگ یہاں سوپ نوش کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے ہمارے ہاں لوگ بندو خاں کے کباب' نہاری یا سری پائے کھانے کے لیے شہر کے پرانے علاقوں میں جاتے ہیں اسی طرح یہاں فرنچ اونین سوپ پینے کے شوقین آیا کرتے تھے مگر ان چھوٹی موٹی تبدیلیوں سے شہر کے مجموعی تاثر پر بہت زیادہ اثر نہیں پڑا ہے۔ شاید پیرس والے اور فرانس کی حکومت بھی یہ جانتی ہے کہ دنیا بھر میں یہ شہر بے مثال اپنی انفرادیت کے باعث مشہور ہے اور قدیم پیرس کو دیکھنے اور وہاں کی فضا میں سانس لینے کے لیے دنیا بھر سے لاکھوں افراد بے اختیار کھنچے چلے آتے ہیں۔ اگر پیرس کی یہ انفرادیت ہی قائم نہ رہی تو پھر یہ بھی دنیا کے بہت سے جدید شہروں میں سے ایک شہر ہو کر رہ جائے گا۔ آج سے پچیس تیس سال پہلے جب ہالی ووڈ میں میوزیکل اور رومانی فلمیں کافی تعداد میں بنا کرتی تھیں۔ اس وقت پیرس کے حوالے سے بھی بہت سی فلمیں بنائی گئی ہیں۔ دنیا بھر کے فلم ساز پیرس میں فلم بندی کرنا بہت بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔ جن لوگوں نے مشہور زمانہ فن کار اور گلوکار موریس شیولیئر کا گانا سنا ہے وہ آج بھی اس کو دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس گانے کے بول یہ تھے

پیرس' پلیز بدل نہ جانا۔

مگر کون جانتا ہے کہ آنے والی صدی کے آخر تک پیرس کتنا بدل جائے گا؟

ہم نے پیرس میں تین دن خاصے دلچسپ گزارے۔ بچیوں کو بھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ جس باغ میں انہیں جھولے نظر آجاتے تھے بس وہ وہیں پسر جاتی تھیں اور جب تک ایک دو گھنٹے جھولا نہ جھولیں آگے قدم نہیں بڑھاتی تھیں۔ اتنی دیر ہم بھی پابند ہو کر وہیں بیٹھے رہتے تھے۔ آس پاس کا نظارہ کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ پیدل

چلنے سے پارو نے پہلے ہی صاف انکار کر دیا تھا اور پیرس وہ شہر ہے جو پیدل چل کر ہی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی کھینچ تان کر ہم انہیں چلنے پر مجبور کر ہی دیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس کے لیے وہ خاصی بلیک میلنگ بھی کرتی تھیں۔ مثلاً گڑیاں دلادیں' آئس کریم کھلادیں' چاکلیٹ دلا دیں' جوتا اور فراک دلا دیں وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے ہوتے ہوئے ہم میوزیم وغیرہ میں نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں بھلا میوزیم یا آرٹ کے شاہکاروں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ آج کل بچے بھی کس قدر بدذوق ہوتے ہیں؟ لیکن شام کے وقت ہوٹل کی مالکہ اور ان کے شوہر کی "بے بی سٹنگ" ہمارے لیے کافی سود مند ثابت ہوئی۔ ان دونوں محسنوں کا نام ہمیں یاد نہیں رہا۔ دراصل ہم نے پوچھا بھی نہیں تھا۔ ہاں اگر بٹ صاحب ہمارے ہم سفر ہوتے تو سب سے پہلے ان کا نام ہی دریافت کرتے۔ ویسے بھی ان کی انگریزی کی قابلیت خاصی "تشویشناک" تھی۔ میڈم کا خیال تھا کہ ان کے شوہر انگریزی زبان کے ماہر ہیں اور ان کی مہارت کا جو عالم تھا وہ ہم بیان کر چکے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ دونوں بے حد مہربان' ہمدرد' خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ اس میں غالباً ان کی اپنی کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا۔ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ موٹے لوگ عام طور پر ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوتے ہیں اور یہ دونوں میاں بیوی جی بھر کے موٹے تھے۔ آپس میں بھی فقرے بازی کر کے ہنستے رہتے تھے۔ ان کے فقرے ہماری سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن اخلاق بھی آخر کوئی چیز ہے۔ جب وہ قہقہہ مار کر ہنستے تو ہم بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے ہنسنے لگتے۔ یورپ اور امریکا میں ہم نے یہ پہلے اور آخر میاں بیوی دیکھے جو مشرق کے لوگوں کی طرح شفیق اور گھریلو ٹائپ کے تھے ورنہ کسی گورے کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کے چھوٹے بچوں کی نگرانی کا ذمہ لے؟

پہلے روز تو جو ہوا سو ہوا مگر دوسرے دن جب ہم رات کو ڈنر کھانے کے بعد لاؤنج میں پہنچے تو میڈم نے دیکھ لیا کہ بچیاں ہمارے ساتھ نہیں تھیں۔ انہوں نے فوراً اپنے شوہر کو متوجہ کیا اور وہ ہماری طرف دیکھ کر سرہلانے اور مسکرانے لگے۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے پوچھا:

"گوئنگ آؤٹ؟"

ہم نے اقرار میں سرہلایا تو انہوں نے اوپر کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا "نو کڈز؟"

مطلب یہ کہ بچیوں کو نہیں لے جا رہے؟

ہم نے بتایا کہ وہ سو گئی ہیں۔ اس کے آگے ہمیں کچھ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ انہوں نے خود ہی کہا "یو گو' یو کم بیفورمڈ نائٹ!" اس کا ترجمہ یہ تھا کہ آپ لوگ خوشی سے جائیں مگر ازراہ کرم یہ خیال رکھئے کہ رات کو بارہ بجے تک واپس آجائیں۔ ہم نے بڑی گرمجوشی سے انہیں "میخ سی میخ سی موسیو" کہہ کر شکریہ ادا کیا۔ باہر جانے لگے تو لبنیٰ نے کہا "ان سے کہئے کہ انہیں بچیوں کے کمرے میں سونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"خواہ مخواہ ان کے خراٹوں سے ان کی نیند خراب ہو گی۔"

دیکھا آپ نے! ناشکری کی انتہا اسی کو کہتے ہیں۔ یعنی نیکی برباد گناہ لازم۔ مگر عورتوں خصوصاً بیویوں کے سامنے فلسفہ جھاڑنا لاحاصل ہوتا ہے اس لیے ہم نے کہا "فکر نہ کریں بچیوں کی نیند بہت گہری ہوتی ہے۔ ان کے خراٹے تو کیا بہت سے سائرن بھی ان کی نیند خراب نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد تو ہمارا یہ روز کا معمول ہو گیا۔ ہم پیرس کی سیر کے لیے چلے جاتے اور ہوٹل میں بچیوں کو مسٹر ہوٹل والا اور ان کے خراٹوں کے حوالے کر جاتے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی نے کبھی شکایت نہیں کی۔ نہ تو بڑے میاں نے یہ کہا کہ آپ لوگوں نے تو یہ روز کا معمول بنا لیا ہے کہ بچوں کو ہمارے حوالے کر کے سیر سپاٹے پر نکل جاتے ہیں اور نہ ہی بچیوں نے کبھی صبح اٹھ کر بتایا کہ خراٹوں سے ان کی نیند خراب ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ دونوں فریق گھوڑے بیچ کر سونے کے عادی تھے۔ بچیوں کو سونے کے بعد دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی تھی اور بڑے میاں راکنگ چیئر پر بیٹھتے ہی خراٹے لینے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ہم نے ان کا نام ہی "خراٹوں والا بابا" رکھ دیا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کی وجہ سے ہمیں بچیوں کی فکر سے آزادی مل گئی تھی۔

• سردار جی سے ہماری عموماً ناشتے کے وقت ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ہمیں یہ پتا چلا کہ ان بے چاروں کو نہ انگریزی آتی تھی اور نہ فرنچ۔ پتا نہیں پیرس میں کیسے گزارا کرتے تھے۔ شاید اشاروں کی زبان بولتے ہوں گے۔ ہوٹل میں ناشتے کے وقت وہ ہمارے منتظر رہا کرتے

تھے۔ ہم جب ہال میں داخل ہوتے تو وہ اپنی بیگم کے ساتھ ایک کونے والی میز پر بیٹھے نظر آتے۔ ہوٹل والوں کے ساتھ ان کی بات چیت اکثر ہمارے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ تیسرے دن ہم ناشتے کے لیے پہنچے اور سرگرمی سے پیرس میں اپنے آخری دن کے پروگرام بنانے میں مصروف ہو گئے۔ دیکھا تو سردار جی بھی اپنی سردارنی کے ساتھ اپنی مخصوص میز پر تشریف فرما ہیں۔ دراصل وہ دونوں ہنی مون پر تھے۔ دہلی میں ان کے گھر والوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ان کی شادی ہوئی تو باپ اور بھائیوں نے دولہا دلہن کو ہنی مون کے لیے یورپ بھیج دیا۔

ہم نے پوچھا "سردار جی! آپ کو تو یورپ کی کوئی زبان نہیں آتی پھر انہوں نے آپ کو کیوں بھیجا اور آپ کیوں چلے آئے؟"

بولے "بھاجی' ہمارے خاندان وچ کدی کوئی ولایت نئیں آیا سی ایس لئی۔" گویا گھر والوں نے اپنی ناآسودہ حسرتوں کی تکمیل کی خاطر سردار مہندر پال سنگھ اور ان کی دلہن کو یورپ بھیج دیا تھا کہ جا بچہ رام بھلی کرے گا۔ ویسے سردار جی خاصے وجیہہ اور خوبصورت آدمی تھے۔ لمبا قد' متناسب جسم' مناسب ناک نقشہ' بڑی بڑی آنکھیں' سیاہ داڑھی اور مونچھیں۔ نادیہ کا خیال تھا کہ سردار جی کے جسم میں سب سے اچھی چیز ان کی داڑھی ہے۔

"اس میں کیا خوبی ہے؟"

"پاپا' آپ نے دیکھا نہیں کیسے کس کے باندھتے ہیں۔ ایک بال بھی کھلا نظر نہیں آتا۔"

سردارنی بھی قدوقامت میں سردار جی سے کم نہیں تھیں۔ بلکہ وزن میں کچھ زیادہ ہی ہوں گی مگر گوری چٹی' مضبوط اور خوش شکل خاتون تھیں۔ اس ڈیل ڈول کے باوجود ان کے چہرے پر بڑی معصومیت اور سادگی تھی۔ شرمیلی بھی تھیں۔ نظر ملا کر بات نہیں کرتی تھیں اور زیادہ بولنے کی بھی قائل نہیں تھیں۔ گہرے اور شوخ رنگوں کے شلوار قمیص سوٹ پہن کر اچھی لگتی تھیں۔ کم گو ہونے کی وجہ سے انہوں نے کبھی لبنیٰ سے بھی باتیں کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ایک روز ہم ناشتہ کرنے کے بعد ہوٹل سے باہر نکلنے لگے تو یکایک پیچھے سے پکارنے کی آواز آئی "بھاجی ایک منٹ!"

مڑ کر دیکھا تو سردار جی افتاں و خیزاں چلے آ رہے تھے۔ سردارنی جی کچھ فاصلے پر شرمائی شرمائی سی کھڑی تھیں۔ سردار جی نے ہمارے قریب پہنچ کر پہلے لبنیٰ کی طرف دیکھا' پھر بچیوں پر نگاہ ڈالی اور جھجکتے ہوئے بولے "اک گل کرنی سی بھاجی' پردے والی گل اے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور پھر ان کے ساتھ ایک طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔ سردار جی سے ہماری جو گفتگو ہوئی اس کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے۔

"بھاجی یہاں تو کوئی اپنی بات ہی نہیں سمجھتا۔ چنگا پیرس ہے جی!"

ہم نے کہا "یہ شکایت تو ہم کو بھی ہے۔"

بولے "بھاجی' کیا پیرس کے لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ کسی کو بھی انگلش نہیں آتی؟"

ہم نے کہا "ہاں اس معاملے میں تو جاہل ہی ہیں۔"

کہنے لگے "بھاجی' آپ نے اچھا کیا جو انگریزی سیکھ لی۔ ہم تو انگریزی میں بھی پیدل ہیں۔"

ہم خاموش رہے۔

کہنے لگے "اپنی دو پرابلمز ہیں۔ ہمارا یہاں کون بیٹھا ہے آپ کے سوا۔ آپ ہی مدد کریں۔ آخر کسی واقف کار سے مشورہ بھی تو لینا چاہئے۔"

ان کی پرابلم نمبر ایک تو یہ تھی کہ وہ کسی نائٹ کلب میں جانا چاہتے تھے مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سے نائٹ کلب میں جائیں "یہاں تو جگہ جگہ پان سگریٹ کی دکانوں کی طرح نائٹ کلب ہیں۔ کوئی بتانے والا بھی نہیں ہے کہ کہاں جائیں؟"

ہم نے انہیں "لیڈو" جانے کا مشورہ دیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ بولے "آپ نے تو بڑی مشکل آسان کر دی مگر یہ بتائیں کہ وہاں کوئی بے شرمی والی بات تو نہیں ہو گی؟"

ہم نے کہا "ہرگز نہیں بس اتنا ہے کہ وہاں بے شمار لڑکیاں ہوں گی مگر کپڑے کی کمی نظر آئے گی۔"

"کیا مطلب جی؟"

"مطلب یہ کہ لباس برائے نام ہی ہو گا۔"

بولے "اس کی کوئی بات نہیں ہے بھاجی۔ کپڑے تو یہاں کی عورتوں سڑکوں بازاروں

میں بھی نہیں پہنتیں۔ اس لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب ہمیں بھی ننگے پن کی عادت ہو گئی ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "تو کیا آپ بھی......؟"

جھینپ کر بولے "آپ غلط سمجھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں بھی ایسی عورتوں کو دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ مگر ایک بات اور بتا دیں۔"

"پوچھیں؟"

"کیا نائٹ کلب میں شو دیکھنے والوں کو بھی کپڑے اتارنے پڑتے ہیں؟"

ہم ان کی سادگی بلکہ بے وقوفی پر حیران رہ گئے۔ پھر انہیں سمجھایا "ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ کپڑے پہن کر آنے والوں کو وہ کچھ نہیں کہتے۔ کوئی اور خدمت؟"

انہوں نے کنکھیوں سے کچھ فاصلے پر کھڑی للی کو دیکھا اور پھر اپنی آواز کو مزید مدھم کرتے ہوئے بولے "ایک بات اور پوچھنی ہے مگر شرم بہت آرہی ہے۔"

ہم نے کہا "کوئی بات نہیں۔ شرماتے ہوئے پوچھ لو۔"

"ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"ارے نہیں سردار جی۔ آپ حکم تو کریں۔" ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں ادھار نہ مانگ بیٹھیں۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پھر کان کے پاس منہ لا کر پوچھا "سنا ہے یہاں ننگے سینما بھی ہیں؟"

ہم نے کہا "ننگے سینما تو کوئی نہیں ہیں۔"

"ہیں جی، بہت ہیں اور ان میں ننگی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔"

"اوہ ہاں آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ بڑی بے ہودہ فلمیں ہوتی ہیں۔"

کہنے لگے "کسی سینما کا پتا ہمیں بھی بتا دیں۔ ہمیں تو کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ نہ ہی فلم کا نام پڑھ سکتے ہیں، پھر پتا کیسے چلے؟"

ہم نے کہا "بہت آسان ترکیب ہے۔ آپ فلم کا نام پڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ سینما ہال کے باہر لگی ہوئی تصویریں دیکھ لیں خود ہی پتا چل جائے گا۔"

سردار جی بہت خوش ہوئے "ارے یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ بھاجی، آپ بہت تعلیم یافتہ لگتے ہیں۔" ہم ان کی اس تعریف پر انکساری کے مارے مسکرا دیے۔

پوچھنے لگے "کیا وہاں پاسپورٹ بھی دیکھتے ہیں؟"

ہم ان کی "معصومیت" پر حیران رہ گئے۔ ہم نے کہا "سردار جی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاسپورٹ تو نہیں دیکھتے مگر بالغوں کے سوا کسی اور کو سینما کے اندر نہیں جانے دیتے۔"

پریشان ہو کر بولے "پھر تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔"

"وہ کیوں"

"ہمارے پاس تو کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ہم بالغ ہیں۔ انہوں نے پوچھا تو ہم کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا "سردار جی آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اتنی گھنی داڑھی جو ہے آپ کے منہ پر۔ آپ دونوں میں سے کوئی بھی دیکھنے میں نابالغ نظر نہیں آتا۔"

وہ مطمئن ہو گئے۔ مگر کچھ سوچ کر پوچھا "بھاجی، اس سینما میں تو بھیس بدل کر جانا چاہیے۔"

"وہ کس لیے؟"

کوئی جاننے والا مل گیا تو پہچان لے گا؟"

"تو پھر کیا ہوا۔ آپ بھی اسے پہچان لینا۔ حساب برابر ہو جائے گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ مگر یہ بھی بتا دیں کہ ٹکٹوں پر خرچہ کتنا آئے گا؟ بلیک میں کتنے کا مل جائے گا؟"

ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی فلموں کے لیے سینماؤں پر بہت رش ہوتا ہو گا۔ ٹکٹ بھی مہنگے ہوں گے اور شاید بلیک مارکیٹ سے خریدنے ہوں گے۔

ہم نے بتایا کہ آپ فکر نہ کریں۔ بالکل رش نہیں ہو گا بلکہ وہاں تو ہاؤس فل بھی نہیں ہوتا۔ وہ بہت حیران ہوئے اور بے یقینی سے ہمیں دیکھنے لگے "یہ کیسے ہو سکتا ہے بھاجی۔ اپنے انڈیا میں تو ایسی فلم کے ٹکٹ دو مہینے میں بھی نہیں مل سکتے۔"

بڑی مشکل سے ہم نے انہیں یقین دلایا۔ وہ بہت شکر گزار ہوئے اور کہا کہ آپ اپنا پتا ہمیں ضرور بتا دینا۔ آپ کو خط لکھیں گے۔ جاتے جاتے اچانک رک گئے۔ اور پوچھنے لگے "بھاجی، ایک بات اور بتا دیں۔ وہاں دو ہٹی کو لے کر جاؤں یا نہیں؟"

ہم نے تنگ آکر جواب دیا "یہ بات تو آپ اپنی بیوی سے دریافت کریں سردار جی' ساری باتیں ہم ہی سے نہ پوچھیں۔"

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ہم نے پیرس میں اپنا آخری دن گھومنے پھرنے میں گزارا۔ شانزے لیزے پر فٹ پاتھ کے ریستوران میں فرنچ بریڈ اور مکھن کھایا۔ آئس کریم اور کافی سے دل بہلایا۔ ایفل ٹاور کو دور ہی سے دیکھا کیونکہ وہاں تک جانے کے لیے کافی پیدل چلنا پڑتا ہے اور بچیوں نے پیدل چلنے سے انکار کر دیا تھا تو لیریز گارڈن میں جا کر بیٹھے اور حسین و خوش رنگ پھولوں کو الوداع کہا۔ اس جگہ رات اور دن کے کسی بھی وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ گروپوں اور جوڑوں کے علاوہ تنہا لوگ بھی نظر آجاتے ہیں۔ خاص طور پر خوب صورت لڑکیوں کو تنہا گھومتے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ کوئی صاحبہ بنچ پر بیٹھی سگریٹ پی رہی ہیں۔ کوئی ایک کونے میں اکیلی بیٹھی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ بعض ٹہلنے میں مصروف ہیں اور کچھ نہیں تو گھاس پر لیٹی کروٹیں بدل رہی ہیں مگر خاص بات یہ ہے کہ کوئی انہیں پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ چھیڑنے یا آواز کسنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' نہ ہی ان کے آس پاس نوجوان منڈلاتے ہیں۔ پیرس میں ہم نے خاص طور پر محسوس کیا کہ مقامی لوگ ان تفریح گاہوں میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ یہ لڑکیاں البتہ راہ چلتے لوگوں کو اپنا کیمرہ دے کر ان سے تصویر بنانے کی درخواست کرتی ہیں۔ ان تفریح گاہوں میں پیشہ ور فوٹو گرافر بھی موجود رہتے ہیں۔ آپ بے خبر کھڑے ہیں۔ اچانک کھٹ کی آواز آئے گی۔ پلٹ کر دیکھیں گے تو ایک فوٹو گرافر صاحب فوراً ہی اپنے پولو رائیڈ کیمرے سے ایک عدد تصویر نکال کر آپ کے حوالے کریں گے اور معاوضے میں خاصی رقم کا مطالبہ کردیں گے۔ آپ لاکھ انکار کریں مگر وہ آپ کی جان کو آجائیں گے اور ہر طرح سے یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ یہ تصویر تاریخی حیثیت رکھتی ہے جو آپ کی آئندہ نسلوں کے لیے بھی یہ شہادت پیش کرے گی کہ آپ کسی زمانے میں پیرس گئے تھے۔

تولیریز گارڈن میں ہم بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بچیاں بھاگتی پھر رہی تھیں۔ اتنی دیر میں ایک بہت خوش لباس اور خوش اطوار خاتون آکر ہمارے برابر بینچ پر بیٹھ گئیں۔ بہت مسکرا کر "میخ سی موسیو' میخ سی مادام" کہا اور پھر انگریزی میں یہ تصدیق چاہی کہ کیا ہم ٹورسٹ ہیں؟ ہمارے اقرار پر انہوں نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔ وہ دراصل گائیڈ تھیں۔ جب ہم نے معذرت طلب کی تو انہوں نے فوراً اپنی فیس میں آدھی رعایت کر دی اور کہا "آج کل دکانوں پر ہر جگہ سیل لگی ہوئی ہے مگر آپ نے کبھی کسی گائیڈ کی خدمات سیل میں حاصل نہیں کی ہوں گی۔"

پھر ہمارے جواب دینے سے پہلے فرمانے لگیں "پیرس تو آپ نے شاید دیکھ لیا ہو گا لیکن آپ کو میں تولوز دکھا سکتی ہوں۔"

ہم نے کہا "تولوز واقعی دیکھنے کے لائق ہے مگر....."

"دیکھنے کے لائق نہیں' دیکھنا ضروری ہے۔ بہت خوب صورت شہر ہے۔ آب و ہوا نہایت حسین اور معقول ہے۔ وہاں ساتھ سو سالہ پرانی یونیورسٹی ہے۔ فن و ثقافت کا مرکز ہے۔ تھیٹر عجائب گھر اور بہت قدیم اور تاریخی گرجا۔ آپ دیکھیں گے تو بس حیران رہ جائیں گے۔"

ہم نے کہا "لیکن ....."

"یقین کیجئے ایک بار دیکھیں گے تو زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ اسے بنفشہ کے پھولوں والا شہر بھی کہا جاتا ہے بنفشہ آپ جانتے ہیں نا؟"

"جی ہاں ہمارے ہاں پرانے حکیم اس کے ذریعے علاج بھی کرتے ہیں۔ ہم جب چھوٹے تھے تو شربت بنفشہ پیا کرتے تھے۔" ہم نے کہا۔

"بس تو پھر تو آپ کو تولوز بہت پسند آئے گا۔ آپ نے بنفشہ کے کھیت کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ جس طرف دیکھئے بس بنفشہ کے پھولوں کی بہار نظر آتی ہے اور یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ عمارتیں گلابی رنگ کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ جب سورج کی کرنیں ان عمارتوں پر پڑتی ہیں یا شفق کی روشنی کا عکس ان کو اپنی رنگین روشنی سے نہلاتا ہے تو حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ جہاں سے فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "آپ درست کہتی ہیں' مگر مشکل یہ ہے کہ آج ہمارا پیرس میں آخری دن

ہے۔"

وہ مایوس ہو گئیں "اوہ' کس قدر بدنصیبی ہے یہاں سے آپ کہاں جائیں گے؟"

ہم نے کہا "امریکا"

"اوہ" انہوں نے بڑی بے زاری سے منہ بنایا "خدایا' یہ دنیا بھی کتنی عجیب و غریب ہے۔ ایک طرف فرانس اور پیرس ہے اور دوسری طرف امریکا۔" انہوں نے بہت برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "مگر یہ بھی خدا کی قدرت ہے۔ اچھی بری سبھی طرح کی چیزیں بنائی ہیں اس نے۔"

انہوں نے امریکا کا ذکر اتنی حقارت سے کیا جیسے کوئی دولت مند اپنے غریب رشتے دار کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ "میخ سی" کہہ کر فوراً رخصت ہو گئیں۔ شاید ہم جیسے بدذوق شخص کے پاس ٹھہرنا بھی انہیں گوارا نہیں ہو سکا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یورپ کے اہل ذوق لوگ امریکا کو بالکل گھاس نہیں ڈالتے۔ اپنے مقابلے میں امریکیوں کو تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے بہت کمتر سمجھتے ہیں۔ ان کی دولت مندی اور ترقی ان کے نزدیک قابل اعتنا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح ایک زمانے میں شرفا نئے دولت مندوں کو دیکھ کر منہ بنایا کرتے تھے۔ یہی حال یورپ والوں کا بھی ہے۔ امریکا میں ان کے نزدیک دولت مندی اور مادی ترقی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یورپ کے تمام ملکوں کے باسیوں کا یہی نقطہ نظر ہے۔ پھر فرانس والے تو سب سے بڑھ کر ہیں۔ وہ تو اپنے مقابلے میں انگریزوں اور جرمنوں کو اجڈ اور بدذوق گردانتے ہیں بھلا امریکیوں کو کہاں خاطر میں لائیں گے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ امریکا کے بارے میں اپنے ان تاثرات کو چھپانا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

خود امریکی یورپ کی قدیم ثقافت اور تہذیب سے بری طرح مرعوب ہیں اور ان کی تہذیبی' تاریخی اور ثقافتی برتری کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ امریکی یورپ والوں کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہیں۔ بڑے بڑے ممتاز اور مشہور امریکی' فرانس اور آئرلینڈ سے اپنے اجداد کا رشتہ نکال کر بڑے فخر سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

ہوٹل سے رخصت ہونے سے پہلے ہم نے تہہ دل سے ہوٹل کے مالک اور ان کی بیگم کا شکریہ ادا کیا۔ اس بات کا ہمیں ہمیشہ افسوس رہا کہ ان کا نام کیوں نہ دریافت کیا تھا لیکن اپنے مشرقی انداز اور مہر و مروت کے باعث وہ دونوں ہمیشہ یاد آتے رہے۔ ہمیں

الوداع کہتے ہوئے میڈم نے تو فرنچ میں بے نقط سنائیں' اسے آپ محاورے کے معنوں میں نہ لیجئے گا۔ مطلب یہ کہ انہوں نے ہمیں برا بھلا نہیں کہا مگر بہت لمبی تقریر کی جس کا مفہوم بھی ہم نہ سمجھ سکے۔ جب وہ چپ ہوئیں تو ان کے گول مٹول شوہر نے مسکرا کر ہم سے معذرت طلب فرمائی اور کہا کہ آپ میری مسز کے جذبات و خیالات سے یقیناً آگاہ نہیں ہو سکے ہوں گے کیونکہ بدقسمتی سے یہ میری طرح انگریزی میں مہارت نہیں رکھتی۔ بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے اور آپ کی بچیوں کے ساتھ ہمارا بہت اچھا وقت گزرا ہے۔

ہم نے ان سے پوچھا "کیا آپ لوگ اس ہوٹل میں قیام کرنے والے تمام مسافروں کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں؟" ہمارا یہ فقرہ بہت مشکل سے ان کی سمجھ میں آیا حالانکہ ہم نے مختلف انداز میں بہت آسان انگریزی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ ہماری بات سمجھ گئے تو انہوں نے بہت زور زور سے اپنا سر اور دونوں ہاتھ ہلانے شروع کر دیئے اور اپنی بہترین انگریزی میں فرمایا "نو نو' یور فیملی اونلی فیملی۔ ایٹ سیٹرا' ایٹ سیٹرا نو کوئیچن" پہلے تو ہم بھی حیران ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگے۔ بہت غور و فکر کے بعد ان کا فقرہ ہماری سمجھ میں آیا تو بہت دیر تک ان کی انگریزدانی پر عش عش کرتے رہے۔ مطلب یہ تھا کہ "صرف آپ ہی کی فیملی کے ساتھ ہم نے یہ سلوک کیا ہے ورنہ ایرے غیرے کو ہم منہ لگائیں یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ان کی انگریزی کا یہ عالم تھا اس پر انہیں یہ خوش فہمی تھی کہ انگریزی زبان پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے۔ ان کی میڈم تو انہیں شیکسپیئر اور جارج برناڈ شاہ سے کم نہیں سمجھتی تھیں۔ اپنے مجازی خدا کی اعلیٰ انگریزی پر انہیں مکمل اعتماد تھا۔ ایسی خوش اعتقاد بیویاں فرانس تو کیا ہمارے پاکستان میں بھی مشکل ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔

ہوٹل سے ائرپورٹ تک کا سفر بے حد خوشگوار اور دلچسپ تھا۔ ہمارے ارد گرد پیرس کا حسن و جمال پھیلا ہوا تھا۔ پیرس ایسا شہر ہے جس کو چھوڑتے ہوئے شاید ہر ایک کو تھوڑا سا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ کم از کم ہمارے ساتھ تو یہی معاملہ ہے۔ پیرس سے بچھڑنا ہمارے لیے ایک دکھ بھرا تجربہ ہے مگر نادیہ اور پارو کو امریکا جانے کی خوشی تھی۔ نہ صرف یہ کہ پیرس انہیں ایک آنکھ بھی نہیں بھایا تھا بلکہ انہیں اس سے بغض سا ہو گیا تھا اور وہ بار بار

پوچھا کرتی تھیں۔ پاپا ہم یہاں سے کب چلیں گے؟

اس ناپسندیدگی کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہاں انہیں بہت زیادہ پیدل چلنا پڑتا تھا' دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ وہاں کوئی ان کی زبان سمجھتا تھا اور نہ انہیں کسی کی بات سمجھ میں آتی تھی۔ ان کی اپنی زبان تو ایک طرف وہاں تو انگریزی بولنے اور سمجھنے والا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے تو یہ دیکھا تھا کہ معمولی سی بات سمجھانے کے لیے بھی خاصی مغزماری کرنی پڑتی تھی۔ ہم لندن گئے اور پھر چند روز کے بعد دوبارہ نیویارک کے لیے پیرس پہنچ گئے۔

اورلے ائرپورٹ پر حسب معمول خوب گہما گہمی اور رونق تھی۔ ملک ملک کے لوگ' بھانت بھانت کی بولیاں' طرح طرح کے لباس' ایک تو یورپ اس پر فرانس کے ذوق اور تہذیب کا تڑکا۔ اس خوبی نے اورلے ائرپورٹ کو ایک بے حد دلچسپ' خوشگوار اور خوشبودار جگہ بنا دیا ہے۔ ہم نے ٹرالیوں پر سامان لادا' بچیاں خود ہی لد گئیں اور چیک ان ہونے کے لیے "ائر فرانس" کے کاؤنٹر پر قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ائرپورٹ پر ہجوم کی وجہ سے کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا مگر ہمارے خان صاحب کا فلسفہ یہ ہے کہ یورپ میں تو دھکے کھانا بھی ناگوار نہیں گزرتا۔ بلکہ خواہ مخواہ دھکے کھانے کو جی چاہتا ہے۔ اس کا سبب انہوں نے یہ بتایا تھا کہ اگر نرم و نازک' خوش لباس اور خوشبو میں بسے ہوئے وجود آپ سے ٹکراتے رہیں تو بلاوجہ شاعری کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بورڈنگ کارڈ حاصل کرتے وقت ہم نے بطور خاص یہ وضاحت کر دی کہ ہمیں "کوشر فوڈ" فراہم کیا جائے۔ اس وقت تک یورپ میں فضائی سفر کے دوران میں "حلال" کھانا سپلائی نہیں کیا جاتا تھا اس لیے "ویجی ٹیرین فوڈ" کہہ کر کام چلانا پڑتا تھا۔ "کوشر" دراصل یہودیوں کے لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی گوشت کھانے کے لیے جانور کو حلال کرتے ہیں۔ جھٹکا یا مشین کے ذریعہ ذبح کیا ہوا گوشت نہیں کھاتے۔ آج کل تو یورپ' امریکا ہر جگہ حلال گوشت دستیاب ہو جاتا ہے مگر اس زمانے میں حلال گوشت کھانے کے لیے یہودیوں کے "کوشر" فوڈ کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ ائرپورٹ پر ہی منحصر نہیں تھا' شہروں میں بھی اگر آپ گوشت کھانا چاہیں تو پھر یہودیوں کا ریستوران تلاش کر لیں۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ ویسے تو ہمیں یہودی ایک آنکھ نہیں بھاتے ہیں مگر کھانے کے لالچ میں یہودیوں کے ریستوران پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی رسومات اور عقائد کے معاملے میں یہودی بہت کٹر ہوتے

ہیں۔ مذہبی امور پر وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔

چیک ان ہونے کے بعد جب اندر پہنچ گئے تو ڈیوٹی فری شاپس کی تلاش ہوئی۔ لیڈی اور بچیوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر ہم نے ریستوران کا رخ کیا۔ ایک شعلہ جوالہ سفید بلاؤز اور نیلا اسکرٹ پہنے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ مقام شکر ہے کہ ائرپورٹ پر مامور عملہ انگریزی سے واقف ہے اور مترجم کی خدمات تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ خوب صورت چہرے قدم قدم پر نظر آتے ہیں اور بقول خان صاحب کے یورپ کے لوگ حسن کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ شاید اس لیے کہ حسن کی بہتات ہے۔ ہم مشرقی لوگوں کو تو وہاں جا کر یوں لگتا ہے جیسے کسی مقابلہ' حسن یا فیشن پریڈ میں شرکت کر رہے ہیں۔ نت نئے ملبوسات ایک سے ایک طرح دار خاتون' نئے سے نیا فیشن' خوش ادائی' نزاکت اور نفاست سبھی فرانس کے لوگوں پر ختم ہے۔ اس پر طرہ ایک سے ایک نئی خوشبو۔

ہم نے کافی کا آرڈر دیا اور وہ ہمارے آگے گرم کافی کی پیالی رکھ کر غائب ہو گئیں۔

یکایک ایک آواز نے ہمیں مخاطب کیا "میخ سی موسیو کیا آپ اردو بولتے ہیں؟" پلٹ کر دیکھا تو درمیانہ عمر کے ایک صحت مند اور چست و چالاک صاحب ہمیں دیکھ رہے تھے۔ لہجے اور گندمی رنگ سے اندازہ ہوا کہ برصغیر کے رہنے والے ہیں۔

ہم نے اردو میں جواب دیا "جی بالکل"

وہ مسکرانے لگے۔ اس بار اردو میں سوال کیا "انڈیا سے آئے ہیں یا پاکستان سے؟"

ہم نے کہا "پاکستان سے" اور مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے ہمارا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگے "ایسے نہیں گلے ملے بغیر کام نہیں چلے گا۔"

بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے۔ ہم نے پوچھا "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

بولے "جی ہم تو کوپن ہیگن سے آئے ہیں۔"

"مطلب یہ کہ انڈین ہیں یا پاکستانی؟"

بولے "بڑے افسوس کی بات ہے۔ کہیں آپ کی ناک تو بند نہیں ہے؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "جی؟"

"ارے بھائی۔ آپ کو اب تک ہمارے پاس سے پاکستان کی خوشبو نہیں آئی؟ ہمیں تو

دور ہی سے خوشبو نے بتا دیا تھا کہ وہاں اسٹول پر کوئی پاکستانی بیٹھا ہے۔"

انہوں نے اپنے لیے بھی ایک کافی کا آرڈر دے دیا۔ ویٹرس نے کافی سامنے رکھی تو مسکرائے اور بولے "سچی بات ہے۔ فرانس کی عورتوں میں بڑی صباحت اور دلکشی ہوتی ہے۔ ہمارے ڈنمارک کی عورتیں تو زیادہ تر پھیکے کدو جیسی نظر آتی ہیں۔"

"اچھا۔ تو آپ ڈنمارک میں رہتے ہیں؟"

"اجی رہنا کیا ہے۔ بس زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور وہ اتنے لمبے ہیں کہ کٹنے میں نہیں آتے۔"

"اتنے بیزار ہیں؟"

"بیزار نہیں ہوں گے تو کیا خوش ہوں گے۔ ارے صاحب وہاں کی تو ہر چیز ہی بے تکی ہے۔ عورتیں دیکھیے تو بانس کی طرح لمبی' مردوں سے زیادہ تگڑی۔ نسوانیت اور نزاکت تو ان کے پاس سے ہو کر نہیں گزری۔ موسم دیکھیے تو برفیلا۔ ان کی تو گرمی بھی ہمارے ہاں کی سردی سے زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہے۔ جب دیکھو برف پڑ رہی ہے۔ سرد ہوا چل رہی ہے۔ ہر چیز برف کی تہہ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ بس مہینے دو مہینے کو سورج کی شکل نظر آتی ہے اور برفباری سے چھٹکارا ملتا ہے مگر دھوپ میں گرمی نام کو نہیں ہوتی۔ ہاں شاعروں کے مزے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی شاعر بے چارے تو ہجر اور فرقت کی لمبی راتوں کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ وہاں یہ آرام ہے کہ راتیں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ رات کیا ہوتی ہے بس رات کا ٹریلر سمجھ لیجیے' بہت لمبی ہوئی تو دو ڈھائی گھنٹے کی۔ پلک جھپکنے میں گزر جاتی ہے۔ اس لیے شاعروں کو چاہیے کہ ڈنمارک میں آکر آباد ہو جائیں۔ کم از کم ایک پرابلم سے تو نجات مل جائے گی۔"

"بہت عجیب سا لگتا ہوگا!"

"عجیب و غریب کہیے' یوں سمجھیے کہ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک کو مغرب کا سماں رہتا ہے۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے اندھیرا ہوتا ہے مگر دو ڈھائی بجے پھر صبح ہو جاتی ہے اور فجر کا وقت ہو جاتا ہے۔ نماز کا بھی حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے۔ رات اتنی چھوٹی اور

دن کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اکیس بائیس گھنٹے کا دن ہوتا ہے۔ بندہ کرے تو کیا کرے۔ بس اوازار ہو جاتے ہیں اور رمضان المبارک میں روزہ واقعی ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ خیر چھوڑے' یہ بتائیے آپ کہاں رہتے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "ہم تو پاکستان میں رہتے ہیں۔ اس وقت امریکا جا رہے ہیں۔"

"کیوں جا رہے ہیں؟ گرین کارڈ کی تلاش میں؟"

"جی نہیں ایسے ہی گھومنے پھرنے۔ کچھ عرصہ رہنے کا ارادہ ہے۔"

"پھر تو ٹھیک ہے مگر میری بات یاد رکھئے گا۔ اپنے ملک سے بڑھ کر کوئی دوسرا ملک اور اپنے پاسپورٹ سے زیادہ اہم کوئی دوسرا پاسپورٹ نہیں ہوتا۔ جو لوگ ہماری طرح دوسرے ملکوں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اب پچھتا رہے ہیں۔ پہلے تو چمک دمک اور روشنیوں سے بہک گئے تھے۔ اب مسائل سامنے آ رہے ہیں۔ پاکستان کے مقابلے میں کمائی زیادہ ہے اور عیش و آرام بھی ہے مگر دوسرے درجے کے شہری ہیں بلکہ جو لوگ سالہا سال سے وہاں رہتے ہیں وہ بھی خود کو مہمان اور غیر ملکی ہی سمجھتے ہیں۔ کسی چیز کا مزہ نہیں ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ گرین کارڈ کے لالچ میں پاکستانی دیوانے ہو رہے ہیں۔ اللہ رحم کرے ان سب پر۔"

ہم نے کہا "بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر بس ایک بھیڑ چال ہے جیسے ایک زمانے میں "گولڈ رش" شروع ہوا تھا اور ہر شخص سونے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔"

ہم نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ تھوڑا بہت تو جانتے تھے کیونکہ پندرہ سولہ سال سے ڈنمارک میں بس رہے تھے۔ پاکستان آمدورفت بھی ہوتی رہتی تھی اس لیے اپنے ملک اور اس کے حالات سے یکسر ناآشنا نہیں تھے۔

"اب آپ اپنے بارے میں بتائیے؟" ہم نے کہا۔

"کیا عرض کروں۔ دل سے پاکستانی ہوں۔ ویسے ڈنمارک کا شہری ہوں۔ وہاں نوکری چاکری کر کے کما لیتا ہوں۔ جوانی کے نشے میں جب ڈنمارک پہنچے تو یوں لگا جیسے جنت میں آ گئے ہیں اور جنت میں حوریں بھی ہوتی ہیں۔ ڈنمارک کی حوریں بھی ہمیں بہت بھائیں۔ عشق و محبت سے تو ان کا واسطہ ہوتا نہیں ہے' میل ملاپ البتہ ہو جاتا ہے۔ ہم نے بھی خوب بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ پھر بے وقوفی یہ ہوئی کہ مغرب کی ایک حور سے شادی کر

بیٹھے۔"

"ماشاء اللہ" ہم نے کہا "بھئی ہمیں تو آپ پر رشک آ رہا ہے۔ ایک میم کے شوہر ہیں۔"

"ہیں نہیں۔ تھے۔" وہ ہنسنے لگے "بھائی جان۔ میموں کے ساتھ گزارا کرنا ہم پاکستانیوں کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ تو خود ان کے ملک کے گورے بھی گزارا نہیں کر سکتے۔ اس لیے شادیاں بس عارضی ہوتی ہیں مگر نہ تو شوہر کو پروا ہوتی ہے اور نہ بیوی کو۔ "بائی بائی" کہہ کر ایک منٹ میں اپنا راستہ پکڑ لیتے ہیں۔ بچے ادھر ادھر رلتے رہتے ہیں۔ وہ بھی اسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ کسی نہ کسی طرح پرورش پا کر بڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں ہوتی۔ نہ بیوی کو شوہر سے' نہ شوہر کو بیوی سے۔ نہ بچوں کو ماں باپ اور نہ ہی ماں باپ کو بچوں سے۔ شکایت تو وہ کرے جو محسوس کرے۔ وہاں تو مشینیں چل رہی ہیں۔ روبوٹ گھومتے پھرتے ہیں۔" پھر انہوں نے سرد آہ بھری اور کہا "ہمارے ملک میں تو دوستوں اور ملنے والوں سے گلے شکوے ختم نہیں ہوتے اور یہاں جنم دینے والی ماں کو اپنے بچھڑ جانے والے بیٹے سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ جیسے نارتھ پول اور ساؤتھ پول بالکل الگ الگ اور بے انتہا دور ہیں بس اسی طرح ہم مشرق کے لوگ بھی مغرب والوں سے دور ہیں۔ بس دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔" وہ کچھ اداس سے ہو گئے۔ پھر بتایا کہ وہ بھی امریکا جا رہے ہیں۔ نیویارک اور سان فرانسسکو میں ان کے کچھ دوست اور رشتے دار ہیں۔ چھٹی لے کر گھومنے چلے ہیں۔

"مگر آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟" ہم نے کہا۔

بولے "کیا بتاؤں۔ خیر' آپ کو بتانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے مگر عورتوں کو بتاتے ہوئے بہت شرم آتی ہے۔"

میں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "بھئی ایسا کون سا نام ہے جو شرم کے قابل ہے؟"

کہنے لگے "خادم کو سرتاج کہتے ہیں۔ پورا نام سرتاج صدیقی ہے مگر سب کو صرف صدیقی بتاتا ہوں۔ اب دیکھئے ناپرائی عورتیں کسی غیر مرد کو بھلا "سرتاج" کیوں کہیں گی؟ مجھے بھی شرم آتی ہے اور وہ بھی شرماتی ہیں۔ بس ایک میری بیوی کو شرم نہیں آتی تھی۔"

ہم نے کہا "وہ تو ظاہر ہے اس کے تو آپ سچ مچ سرتاج ہیں۔"

وہ زور سے ہنسے اور کہنے لگے "ارے صاحب' ہماری بیوی کو تو "سرتاج" کے معنی بھی نہیں معلوم۔ نہ اسے یہ پتا کہ "سرتاج" کسے کہتے ہیں۔ ہمارے بچپن میں تو بیویاں اپنے شوہر کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ "اے جی" یا "منے کے ابا" کہہ کر کام چلاتی تھیں مگر ہماری بیوی تو بس "تُو جی" کہنا کافی سمجھتی تھی۔"

"بڑی دلچسپ بات ہے۔ ویسے آپ کی بیوی کا نام کیا ہے؟"

"ہے نہیں' تھا۔"

"اوہ تو کیا ان کا انتقال ہو گیا؟"

بولے "ایک طرح سے انتقال ہی سمجھئے۔"

ہم نے پھر حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ کہنے لگے "دراصل اب وہ میری بیوی نہیں رہیں۔ ایکس وائف ہو چکی ہیں۔"

"اور بچے؟"

"ارے صاحب بچوں سے تو ان میموں کو خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ شروع شروع میں مجھے بہت شوق تھا کہ گود میں بچہ کھلاؤں مگر اب تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ بچہ نہیں ہوا ورنہ وہ الگ برباد ہوتا اور ہم الگ زندگی بھر روتے رہتے۔"

اتنی دیر میں نادیہ اور پارو بھاگتی ہوئی آگئیں "پاپا دیکھئے ہم نے کیا خریدا ہے!" چاکلیٹ' ٹافی اور گڑیاں ان کی شاپنگ تھی۔

سرتاج صاحب نے بڑی حسرت سے انہیں دیکھا "آپ کی بچیاں ہیں؟"

"جی۔ اور یہ ہماری بیگم ہیں۔ لبنیٰ۔" ہم نے لبنیٰ کو ان سے متعارف کرایا..... "یہ سرتاج صاحب ہیں۔"

وہ جلدی سے بولے "بھابھی آپ مجھے صرف صدیقی کہئے۔"

سرتاج صدیقی صاحب کافی دلچسپ آدمی تھے۔ پندرہ سولہ سالہ ڈنمارک کے قیام نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ ویسے کے ویسے خالص پاکستانی تھے جیسے اپنے ملک میں رہنے والے ہوتے ہیں۔ عادات بھی وہی اور مزاج بھی۔ ہم ایسے لوگوں کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ بے چارے کس مشکل سے یورپ اور امریکا میں گزارا کرتے ہوں گے۔

ہم سب لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے۔ صدیقی صاحب نے بتایا کہ وہ نیویارک تک ہمارے ساتھ جائیں گے کیونکہ "کافی لمبا سفر ہے اتنی دیر کا ساتھ بھی بہت ہے۔ ارے صاحب یہاں تو میاں بیوی بھی اتنی دیر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہتے۔"

ابھی فلائٹ میں تھوڑا وقت تھا۔ سرتاج صاحب یکایک باتیں کرتے کرتے رک گئے اور ادھر ادھر دیکھ کر بولے "اُفوہ یہاں تو کوئی کوک فروخت کرنے والی مشین بھی نہیں ہے۔"

"کیوں آپ کو ایک دم کوک کا خیال کیوں آگیا؟" ہم نے پوچھا "کوک تو آپ کو ریستوران سے بھی مل سکتا تھا۔"

مسکرائے اور کان کے پاس منہ لا کر بولے "دراصل باتھ روم جانا ہے۔"

"باتھ روم میں کوک کی کیا ضرورت ہے؟"

کہنے لگے "یہ بھی ایک مصلحت ہے۔ مشین میں سکے ڈال کر کوک کا ایک ٹین نکالتا ہوں۔ کوک پی لیتا ہوں اور خالی ٹین کو لوٹے کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ کیا کروں۔ یہاں تو طہارت کے لیے پانی وانی کا سسٹم ہی نہیں ہے۔"

ہم ان کی اس ترکیب سے بہت متاثر ہوئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔

سرتاج صدیقی اٹھ کر کھڑے ہو گئے' بولے "مشین تلاش کرتا ہوں ورنہ پھر کوئی اور ترکیب نکالیں گے۔"

ہم نے فوراً پیشکش کی۔ "ٹھہریے ہمارے پاس شیو کرنے کے لیے ایک پلاسٹک کا ڈونگا ہے۔ کام چل جائے گا؟"

"لیجئے آپ نے تو مسئلہ حل کر دیا۔ ذرا جلدی کیجئے ورنہ ماحولیات والوں کو شکایت پیدا ہو جائے گی۔"

ہم نے دستی بیگ میں سے شیونگ کا ڈونگا نکال کر ان کے حوالے کیا اور وہ تیزی سے رخصت ہو گئے۔ نادیہ نے کہا "پاپا" آپ نے انکل کو شیونگ کا دوسرا سامان تو دیا ہی نہیں۔"

ہم نے ٹالنے کے لیے کہا "باقی سامان ان کے پاس موجود ہے۔"

اب خواتین نے اپنی شاپنگ ہمیں دکھانی شروع کر دی۔ لبنیٰ نے ایک دو پرفیومز خریدی تھیں۔ ہمارے لیے ایک بال پین بھی تھا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ پچیس تیس ڈالر کی خریداری میں ہمارے حصے میں صرف ایک آدھ ڈالر ہی آیا تھا اور پھر عورتیں مساوی حقوق کی باتیں کرتی ہیں۔ اندھیر نہیں تو اور کیا ہے؟

"پاپا! انکل کہاں گئے ہیں؟" پارو نے سوال کیا۔

"ریسٹ روم تک گئے ہیں۔"

"کیا وہ تھک گئے ہیں؟" نادیہ نے کہا۔

"یہاں صوفے پر لیٹ جاتے۔" پارو نے تجویز پیش کی۔ ہم دل ہی دل میں اہل مغرب کی جدت طرازی کی داد دینے لگے۔ غسل خانے کو باتھ روم یا ٹوائیلٹ کہنا تو خیر سمجھ میں آتا ہے مگر اسے "ریسٹ روم" کہنے کی بھلا کیا تک ہے۔ باتھ روم میں ریسٹ کرنے کا کیا سوال ہے؟ ویسے ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جن کی زندگی میں باتھ روم کو واقعی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جب تک دو تین گھنٹے باتھ روم میں قیام نہیں فرماتے ان کی زندگی نامکمل رہتی ہے۔ وہیں اخبار پڑھتے ہیں' کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں' معمے حل کرتے ہیں' چائے نوشی کرتے ہیں' سگریٹ نوشی کرتے ہیں' شیو کرتے ہیں' غسل فرماتے ہیں' ورزش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک باتھ روم کا صحیح مقصد یہی ہے اور پھر لگے ہاتھوں اخلاقاً حوائج ضروریہ سے بھی فارغ ہو لیتے ہیں مگر یہ محض رسمی کارروائی سمجھ لیجئے۔

سرتاج صاحب واپس تشریف لائے تو ہم نے اس قدر جلد واپسی پر بہت حیرت کا اظہار کیا۔ بولے "میں باتھ روم کو صرف باتھ روم کے طور پر ہی استعمال کرتا ہوں۔" انہوں نے چاکلیٹ کا ایک ایک پیکٹ بچیوں کو پیش کر دیا۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا "باتھ روم میں چاکلیٹ بھی ملتے ہیں؟"

ہنسنے لگے۔ بولے "ارے نہیں صاحب یہ تو میں کاؤنٹر سے لایا ہوں۔ ابھی یورپ والوں نے اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ چاکلیٹ اور کھانے کا سامان باتھ روم میں فروخت کریں۔"

ہمیں ان کے ساتھ بحراوقیانوس کو پار کرنا تھا۔ کافی طویل سفر ہے اور ہے بھی نان اسٹاپ۔ ایک بار جب ہم اپنے دوستوں' خان صاحب اور بٹ صاحب کے ساتھ ہالینڈ میں

گھوم رہے تھے تو کسی نے مشورہ دیا کہ امریکا کی بھی سیرو سیاحت کر لیجئے۔ بہت اچھا اور سستا ملک ہے۔

خان صاحب نے کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ کہنے لگے "وہ دور بہت ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ آپ کو پیدل تو نہیں جانا ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ سارا سفر سمندر کے اوپر ہوتا ہے۔ اور ہوائی جہاز کسی جگہ اسٹاپ بھی نہیں کرتا۔"

ہم نے کہا "خان صاحب' ظاہر ہے کہ سمندر پر ہوائی جہاز اسٹاپ نہیں کر سکتا۔"

بولے "یار یہ کولمبس بھی بے کار ہی آدمی تھا۔"

ہم نے کہا "امریکا کے ہوائی سفر سے کولمبس غریب کا کیا تعلق ہے؟"

بولے "پتا نہیں کہاں کہاں مارا پھرا اور پھر امریکا پہنچ گیا۔ یہ توفیق نہ ہوئی کہ کوئی خشکی کا راستہ تلاش کر لیتا۔"

ہم نے کہا "خاں صاحب' سمندر کے بیچ میں خشکی کا راستہ تو اللہ میاں نے صرف حضرت موسیٰ کے لیے بنایا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ فرعون کی فوج ان کے تعاقب میں تھی۔ کولمبس کے لیے یا آپ کے لیے تو رحمت خداوندی ایسے کرم کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔"

کہنے لگے "توبہ کیجئے توبہ۔ نعوذ باللہ۔ اللہ میاں کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے وہ کسی پر بھی رحمت نازل کر سکتا ہے۔"

بٹ صاحب نے فرمایا "تو آپ دعا کیجئے کوئی وظیفہ یا چلہ کاٹئے۔ آپ کے ساتھ اور بہت سوں کا بھی بھلا ہو جائے گا۔"

سرتاج صدیقی صاحب کو سمندر کے اوپر طویل فضائی سفر کرنے سے ڈر تو نہیں لگتا تھا مگر پھر بھی وہ احتیاطاً خواب آور گولیاں کھا کر سو جاتے تھے۔

"احتیاط کس بات کی؟" ہم نے پوچھا۔

کہنے لگے "ارے بھائی۔ ان ہوائی جہازوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ سمندر میں گرے گا تو ہمیں خبر تک نہ ہو گی مگر آج میں سلیپنگ پلز نہیں کھاؤں گا۔ باتیں کریں گے آپ کے ساتھ۔"

ہم نے ان کا سیٹ نمبر پوچھا۔ وہ ہم سے کافی دور تھے۔

"تو پھر ہم راستے میں باتیں کیسے کریں گے۔" ہم نے پوچھا "کوئی لاؤڈ اسپیکر وغیرہ استعمال کریں گے؟"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے "اللہ مالک ہے۔ دیکھا جائے گا کسی سے سیٹ بدل لیں گے۔"

دیکھا آپ نے، پندرہ سولہ سال ڈنمارک میں قیام فرمانے کے باوجود ان کی سوچ کس قدر پاکستانی تھی؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ پاکستانی چاہے کہیں چلا جائے، اندر سے پاکستانی ہی رہتا ہے۔ یہ بات انہیں بھی معلوم تھی کہ ہم لوگ ایک غیر ملکی فضائی کمپنی کے ذریعے سفر کر رہے تھے جس میں تمام مسافر بھی قریب قریب غیر ملکی ہوتے ہیں۔ پی آئی اے میں تو یہ منظر عام ہے کہ لوگ بڑی فراخدلی سے سیٹیں بدل لیتے ہیں مگر "ائر فرانس" کے مسافروں سے یہ توقع؟ مگر امید پر دنیا قائم ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اس مقولے کی صداقت کا ثبوت اس وقت ملا جب ہم لوگ ائر فرانس کے روشن اور خوشبودار ہوائی جہاز میں داخل ہوئے۔ ہماری سیٹیں سرتاج صاحب کی سیٹ سے کافی فاصلے پر تھیں بلکہ ان کا تو پورشن ہی علیحدہ تھا۔ مگر وہ بڑے اعتماد سے مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ جس جگہ ہمیں بیٹھنا تھا وہیں ہمارے دستی سامان کے ساتھ اپنا سامان رکھ دیا اور پھر اپنی سیٹ تلاش کرنے چل دیے۔ ہمیں تو یہ ڈر تھا کہ کہیں زبردستی برابر والی سیٹ پر نہ بیٹھ جائیں مگر انہوں نے یہ حرکت نہیں فرمائی۔

ہماری سیٹوں سے متصل سیٹ پر ایک بہت موٹے تازے امریکن آکر بیٹھ گئے۔ انہوں نے گوروں کی عادت کے مطابق بیٹھتے ہی ہمیں مسکرا کر دیکھا "ہائی" کہا اور جیب سے چیونگم نکال کر چبانے لگے۔ نادیہ اور پارو نے بڑی حسرت سے ان کو چیونگم چباتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے بچیوں کو متوجہ پایا تو فوراً مسکرائے اور جیب سے چیونگم کا پیکٹ نکال کر ان دونوں کو پیش کر دیا۔ اس طرح ان کی تو آپس میں دوستی ہو گئی مگر ہمارا دھیان سرتاج صدیقی صاحب کی طرف لگا رہا۔

ہوائی جہاز کا ماحول خالص یوروپین اور مغربی تھا۔ بیشتر مسافر اسمارٹ اور نہایت معقول تھے۔ ائر ہوسٹس بھی خوب صورت اور چاق و چوبند تھیں۔ پتا نہیں ان کی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں یا اسکرٹ کی وجہ سے لمبی نظر آتی ہیں۔ ہماری پی آئی اے کی ائر ہوسٹس تو شلوار میں ملبوس ہوتی ہیں اس لیے شاید ان کی ٹانگوں کی لمبائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ تو آپ بھی تسلیم کریں گے خواہ کچھ بھی کہیں، اس میں شک نہیں کہ مغربی لباس بہت اسمارٹ ہوتا ہے۔ ویسے بھی دوسروں کی چیزیں انسان کو بھلی لگتی ہیں۔ ایک یوروپین محاورہ ہے کہ اپنی تحریر اور دوسرے کی بیوی سبھی کو اچھی لگتی ہے۔ اس طرح پاکستانی مسافروں کو بھی یوروپین فضائی کمپنیوں کی ائر ہوسٹس اچھی لگتی ہیں۔ مسکرانے میں بھی مغربی خواتین شیر ہوتی ہیں۔ ہماری میزبان مسکراتی تو ہیں مگر دل سے نہیں مسکراتیں۔ بس فرض ادا کرنے کے لیے مسکراتی ہیں جب کہ مسکرانا مغربی خواتین کی عادت میں داخل ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی اوپر طور پر مسکراتی ہیں مگر یوں لگتا ہے جیسے آپ کو دیکھ کر سچ مچ نہال ہو گئی ہیں۔ یا پھر شاید مغرب سے ہماری مرعوبیت اور احساس کمتری کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے پڑوسی امریکی چیونگم اس قدر شوق اور ذوق سے چبا رہے تھے جیسے شاید اس

کے بعد ان کا پیٹ بھر جائے گا اور کھانے پینے کی بالکل حاجت نہیں رہے گی۔ انہوں نے
سیٹ بیلٹ تلاش کرنے کی کوشش میں جب ادھر ادھر ہاتھ مارے تو آس پاس والوں میں
کھلبلی مچ گئی۔ بیلٹ ان کے نیچے دب گئی تھی اس لیے وہ دوبارہ بمشکل کھڑے ہوئے تو ان
کے دائیں بائیں بیٹھنے والوں میں پھر کھلبلی سی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر بیلٹ
تلاش کرنی شروع کر دی مگر بڑی سی توند کے باعث جھک نہیں سکتے تھے اس لیے ادھر ادھر
ہاتھ مارتے رہے۔ نادیہ نے فوراً بیلٹ اٹھا کر ان کے حوالے کر دی۔ وہ شکریہ ادا کر کے
دوبارہ سیٹ پر بیٹھے تو ایک بار پھر افراتفری سی مچ گئی۔ ہمیں اب باقاعدہ تشویش ہونے لگی
تھی کہ یہ زلزلہ نما صاحب ہمارے برابر میں ہی تشریف فرما رہے تو سفر کیسا گزرے گا۔
انہوں نے سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ باندھنے کی کوشش شروع کر دی، کافی دیر تک ناکام جدوجہد
میں مصروف رہے اور پھر بیلٹ کو اپنی توند پر رکھ کر بیٹھنے میں ہی عافیت جانی کیونکہ بیلٹ
صرف مسافروں کی کمر کے لیے بنائی گئی تھی، گنبدوں کے لیے نہیں۔ بیلٹ کی طرف سے
فرصت پانے کے بعد انہوں نے سیٹ سے پشت ٹکا کر لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیے۔
ہر سانس کے ساتھ ان کے منہ سے آہیں بھی برآمد ہونے لگیں۔ نادیہ اور پارو بہت غو
سے انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر بڑی تشویش سے پوچھا "انکل! کیا آپ کی طبیعت خراب
ہے؟"

وہ بولے "نہیں، یہ تو عام روٹین ہے۔ ویسے تم مجھے والٹرٹر گاف کہہ سکتی ہو۔"

اتنا مشکل نام سن کر ہم بھی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ وہ ہم سب کی مشکل بھانپ گئے۔
مسکرا کر کہنے لگے "تم مجھے "والی" کہہ سکتی ہو۔"

یکایک سرتاج صدیقی صاحب ایک طرف سے نمودار ہوئے۔ مسکرا کر ہمیں دیکھا او
پھر انجان بن گئے۔ ایک لمحے کھڑے ہو کر مسٹر والٹر کو دیکھتے رہے پھر جھک کر انگریزی م
ان سے مخاطب ہوئے "آپ تو یہاں بہت مشکل میں مبتلا ہیں۔"

انہوں نے حیران ہو کر دیکھا "آئی بیگ یور پارڈن؟"

"مطلب یہ کہ یہ جگہ آپ کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے ک
لائن کے اسٹاف نے آپ کی ضرورت کا بالکل لحاظ نہیں رکھا۔ ویسے آپ چاہیں تو و
پچھلی نشستوں پر دو سیٹیں خالی ہیں، آپ بڑے آرام سے بیٹھ سکتے ہیں اور آس پاس وا

بھی ڈسٹرب نہیں ہوں گے۔"

"واقعی؟" انہوں نے پوچھا۔

"بے شک، یقین نہ ہو تو خود چل کر دیکھ لیجئے بلکہ میں اپنی سیٹ بھی آپ کو دے دوں
گا۔"

"تو کیا آپ نے سفر کا ارادہ تبدیل کر دیا ہے؟"

"جی نہیں۔ میں مجبوراً آپ کی سیٹ پر بیٹھ جاؤں گا۔"

"مگر یہ تو"

"بالکل نہیں بلکہ مجھے آپ کی خدمت کر کے بہت خوشی ہو گی۔ اگر مناسب سمجھیں تو
آجائیے۔"

مسٹر والٹر نے کچھ سوچا۔ پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مگر یہ مرحلہ کافی مشکل سے طے
ہوا۔ بہرحال وہ بڑی مشکل سے اپنی سیٹ سے باہر نکلے اور جھومتے جھامتے صدیقی صاحب
کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ کچھ دیر بعد صدیقی صاحب مسکراتے ہوئے واپس آئے "دیکھا
آپ نے اسے کہتے ہیں سیلز مین شپ یعنی کہ دکانداری۔"

وہ بڑے اطمینان سے مسٹر والٹر کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

ہوائی جہاز میں یوں تو بہت دلچسپیاں تھیں مگر سب سے زیادہ دلچسپ چیز سرتاج صدیقی
تھے۔ ان کی باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ
سنجیدہ مسائل کے بارے میں بھی بہت نپی تلی رائے رکھتے تھے۔ عالمی سیاست کے بارے
میں ان کی معلومات تازہ ترین تھیں اور یورپ کے معاملات پر تو انہیں عبور حاصل تھا ہی۔
وہ ان پاکستانیوں میں سے تھے جو یورپ میں طویل عرصے تک قیام کرنے کے باوجود یورپ کو
سخت ناپسند کرتے تھے۔ یورپ والوں کی خوبیوں کے وہ معترف تھے لیکن ان کی جو عادتیں
مشرق کے نقطہ نظر سے بری تھیں وہ ان کے سخت مخالف تھے۔ مگر ہر خرابی میں وہ بھلائی کا
کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے تھے جو کہ اللہ کے نیک اور صالح بندوں کی صفت ہے۔ مثلاً وہ
یہ تسلیم کرتے تھے کہ ایک ڈینش لڑکی سے شادی کر کے انہوں نے حماقت کی تھی مگر اس
بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ ڈھائی تین سال کی ازدواجی زندگی کے باوجود وہ صاحب
اولاد نہ ہوئے ورنہ زندگی بھر کے لیے روگ لگ جاتا۔

ہم نے کہا "صدیقی صاحب آپ یورپ سے اتنے بے زار ہیں تو وہاں گئے کیوں تھے اور اب تک وہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

کہنے لگے "گیا تو اس لیے تھا کہ گھر والوں کے لیے پیسہ کمانا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ یورپ کی تعریفیں سن سن کر جی بھی چاہتا تھا کہ اس دنیا کو دیکھوں۔ شروع کے دو تین سالوں میں سب کچھ اچھا لگتا تھا اور اپنے ملک کی ہربات زہر لگتی تھی۔ اس بات کی خوشی تھی کہ وہاں کی زندگی سے نجات مل گئی۔ ڈنمارک مجھے دنیا میں جنت لگتا تھا۔ خوب صورت شہر، حسین نظارے۔ ہرچیز میں سلیقہ اور نظم و ضبط صاف ستھرے خوب صورت شہر، اونچی اونچی خوب صورت عمارتیں، نظر فریب ماحول، روشن سڑکیں اور سب سے بڑھ کر کم سے کم لباس میں گھومتی پھرتی گوری گوری خوب صورت میمیں۔ اس وقت تک میرے لیے حسن کا معیار محض گورا رنگ تھا اور ڈنمارک میں ہر طرف گورے گورے لوگ اور سنگ مرمر سے تراشی ہوئی لڑکیاں ہی نظر آتی تھیں۔ جاڑوں میں بھی وہاں زندگی مصروف رہتی ہے اور سردی سے محفوظ رہنے کے لیے ہر قسم کی سہولت موجود ہے۔ یہ بات بھی بہت بھلی لگتی تھی اور موسم گرما یا بہار کا موسم تو وہاں دیوانہ کرنے والا ہوتا ہے۔ پھول، سبزہ، پانی اور روشن چمکدار ماحول، بس ان چیزوں نے دیوانہ بنا دیا۔ اسی دیوانگی میں خوب صورت لڑکیوں کی محفلوں میں رسائی ہو گئی۔ اپنے ملک میں تو معمولی شکل کی لڑکی بھی دور دور ہی سے صرف جھلک دکھاتی تھی مگر یہاں ایک سے ایک گوری چٹی بے باک لڑکی میل جول کرنے کے لیے موجود تھی۔ اس چکر میں ایک لڑکی سے شادی بھی کرلی۔ گھر والوں کو خبر بھی نہیں دی۔ پتا تھا کہ اماں ابا کو بہت رنج ہو گا۔ سوچا تھا، ایک دو سال بعد بیوی کو تھوڑا سا پاکستانی بنا کرلے جائیں گے تو ماں باپ قصور معاف کردیں گے مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ڈھائی سال کے اندر ہی طلاق ہو گئی۔ گھر والوں کو نہ شادی کی خبر ہوئی، نہ طلاق کی۔"

سرتاج کی کہانی بھی وہی تھی جو بیرون ملک جانے والے ہمارے بیشتر لوگوں کی ہوتی ہے۔ بی اے پاس کرلیا مگر نوکری نہیں مل رہی تھی۔ ملتی بھی تو عارضی اور بہت کم تنخواہ پر جس میں گزارہ مشکل تھا۔ ماں باپ اور بھائی بہنوں کی ذمے داری بھی کاندھوں پر تھی کیونکہ ان کے والد جو معمولی سی ملازمت کرتے تھے، ریٹائر ہو گئے تھے۔ ان حالات میں

ایک دوست نے ڈنمارک جانے کا مشورہ دیا اور بندوبست بھی کر دیا۔ وہاں پہنچے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ کہاں وہ غربت، بے روزگاری، اندھیرے اور مایوسیاں اور کہاں ڈنمارک کی رنگینیاں اور روشنیاں، پھر کمائی بھی اتنی تھی کہ پاکستان میں تو اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خوب محنت مزدوری کی، خود بھی آرام سے رہے اور گھر والوں کو بھی معقول رقم بھیجتے رہے۔ جب کراچی سے اماں ابا کے، دعاؤں سے بھرپور خط آتے اور بہن بھائی محبت بھرے پیغام بھیجتے تو ان کی خوشی دوبالا ہو جاتی تھی۔ ہر وہ چیز جس کی کوئی انسان پاکستان میں خواہش کر سکتا ہے یہاں فراوانی سے مہیا تھی۔ رہنے کے لیے ایک کمرے کا خوب صورت، آرام دہ اور سجا ہوا فلیٹ، سواری کے لیے کار، پہننے کے لیے عمدہ کپڑے اور خرچ کرنے کے لیے جیب میں وافر رقم۔ بس ایسا نشہ چڑھا کہ پاکستان ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس جنت میں حوریں بھی دستیاب ہو گئیں اور زندگی مکمل ہو گئی۔

"تو پھر خرابی کیا ہوئی؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہو گا کہ ایک صاحب مرنے کے بعد آسمان پر پہنچے تو فرشتوں نے پوچھا کہ آپ کہاں رہنا پسند کریں گے؟ جنت میں یا جہنم میں؟"

انہوں نے کہا "قبلہ، کیا میں اپنی مرضی کی جگہ رہ سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت رحیم و کریم ہے۔ تم اپنی خواہش بتاؤ۔"

وہ بولے "کیا فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ممکن ہے کہ مجھے جنت اور دوزخ کی ایک جھلک دکھادی جائے؟"

فرشتوں نے فوراً اس کا بندوبست کر دیا۔ ایک جانب کی کھڑکی کھولی تو انہوں نے دیکھا کہ باریش اور نورانی چہروں والے لوگ عبادت میں مصروف ہیں۔ نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف ہیں۔ نہایت پاکیزہ ماحول ہے مگر انتہائی خشک، دوسری طرف کی کھڑکی کھولی گئی تو وہاں کا منظر دیکھ کر یہ ہکا بکا رہ گئے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھا کہ ان کے پسندیدہ فنکار گھومتے پھر رہے ہیں۔ ناچ گانا ہو رہا ہے، تاشوں کی محفل جمی ہوئی ہے۔ قسم قسم کے کھیل تماشے جاری ہیں۔ بڑا ہی رنگین اور رومان انگیز سماں ہے۔ یہ تو بس لٹو ہو گئے۔ بولے "جناب عالی بس مجھے دوزخ میں بھیج دیجئے۔"

فرشتے نے کہا "دیکھو میاں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ ایک بار جہاں جاؤ گے تو بس وہیں

رہو گے۔ واپس نہیں آسکو گے۔"

یہ تو بے اختیار ہو رہے تھے بولے "جی بس سوچ لیا ہے۔ مجھے جہنم ہی پسند ہے۔"

فرشتے نے اشارہ کیا۔ ایک جانب دروازہ نمودار ہوا اور کسی غیبی ہاتھ نے ان صاحب کو کھینچ کر دروازے کے اندر پہنچا دیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی آگ کے شعلوں نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر جو دیکھا تو ہر طرف آہ و بکا میں مبتلا لوگ نظر آئے جنہیں طرح طرح کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔ خوف ناک شکل کے لوگ گرز رسید کر رہے تھے۔ کہیں آگ سے داغا جا رہا تھا' کہیں خون اور پیپ کی نہروں میں گناہ گاروں کو غوطے دئے جا رہے تھے۔ ان کے تو ہوش اڑ گئے۔ سامنے کھڑے ہوئے ایک داروغہ جہنم سے پوچھا:

"حضور' یہ کون سی جگہ ہے اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے بڑے رعب سے کہا "جانتے نہیں' یہ دوزخ ہے۔ گناہ گاروں کو عذاب دیا جا رہا ہے۔"

یہ گھبرا کر بولے "مگر میں نے کھڑکی سے جو دیکھا تھا وہ کیا تھا؟"

داروغہ ہنسا اور کہنے لگا "وہ؟ وہ تو ہمارے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کا کارنامہ تھا۔ ورنہ دوزخ تو ویسی ہی ہوتی ہے جیسی آپ کو بتائی گئی ہے۔"

سرتاج صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "بس یوں سمجھئے کہ میں بھی پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے بہکائے میں آگیا تھا۔ جب اس دوزخ کی حقیقت کھلی تو پھر بہت پچھتائے' روئے گائے مگر جہنم کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہیں جہنم کا کندہ بن کر رہ گئے۔"

سرتاج عزیز نے باتوں کا ایسا آبشار رواں کیا کہ ادھر ادھر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ ان کی تقریر کے موضوعات مختلف تھے۔ مثلاً انہوں نے ائر فرانس کی ائر ہوسٹس لڑکیوں' دوسری ائر لائنز کی میزبانوں کے ساتھ موازنہ شروع کر دیا۔ کہنے لگے "پی آئی اے کی سروس کے مقابلے میں ائر فرانس ۸۰ فیصد اچھی ہے لیکن ہمارا کھانا اس سے سو فیصد اچھا ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا "اس لیے کہ پاکستانی کھانا ہوتا ہے؟"

"یہ بات نہیں۔ غیر ملکی بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ البتہ ہماری فضائی میزبانیں ان کے مقابلے میں پچاس فیصد ہوتی ہیں۔"

"یار' یہ تو زیادتی ہے۔" ہم نے کہا۔

جلدی سے کہنے لگے "اس کی وجہ ان کا لباس ہے۔ لڑکیوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہماری ائر ہوسٹسیں غیر ملکی لڑکیوں کے مقابلے میں کم مسکراتی ہیں اور مسافروں سے بے تکلف ہو کر اور مسکرا کر بات نہیں کرتیں۔"

ہم نے پوچھا "یہ تعریف ہے یا شکایت؟"

"دونوں۔ ڈنمارک کی لڑکیوں کے مقابلے میں ہماری لڑکیاں بیس فیصد زیادہ دلکش ہوتی ہیں۔ کم از کم لڑکیاں تو نظر آتی ہیں۔" پھر انہوں نے ایک یوروپین مسافر خاتون کی طرف اشارہ کیا جو سامنے سے گزر رہی تھیں "آپ ان کو دیکھ رہے ہیں' کتنی لمبی تڑنگی ہیں؟" ہم نے غور سے دیکھا تو واقعی وہ قدوقامت میں ہم سے کچھ زیادہ ہی تھیں۔ کہنے لگے "اس میں ساٹھ فیصد اور اضافہ کر لیجئے تو ڈنمارک کی عورت بن جائے گی۔ اسی لیے وہ بہت اچھی اتھلیٹ ہوتی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی صنف نازک کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں نزاکت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بس اللہ میاں کی بنائی ہوئی عورتیں ہیں اور خدا کی قدرت میں کسی کو دخل نہیں ہے۔"

ہم نے پوچھا "آپ کہتے ہیں کہ وہاں رات صرف دو یا ڈھائی گھنٹے کی ہوتی ہے تو پھر سوتے کب ہیں؟"

بولے "بس اٹکل سے سو جاتے ہیں۔ آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں اور کمرے میں بالکل اندھیرا کر لیتے ہیں۔ شروع دنوں میں تو عجیب سا لگتا تھا۔ بالکل نیند نہیں آتی تھی۔ پھر دل کو سمجھایا کہ آخر یہاں کے لوگ بھی تو سوتے اور جاگتے ہیں۔ ہم آخر ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ اس طرح خود کو ٹریننگ دینی پڑی۔ ہم لوگ تو گھڑی دیکھ کر سوتے اور جاگتے ہیں۔ ورنہ ذرا غور فرمائیے کہ آپ سونے کے لیے رات ہونے کا انتظار کر رہے ہیں اور رات ہے کہ آنے کا نام نہیں لیتی۔ اور جب آتی بھی ہے تو دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں رہتی اور دوبارہ دن نکل آتا ہے۔"

ہم نے کہا "بھئی آپ لوگوں کے ساتھ تو بہت ٹریجڈی ہے۔ جب سورج ہی غروب نہیں ہوتا تو پھر چاند کیسے نکلتا ہو گا اور چاندنی راتوں کا کیا مزہ ہو گا؟"

"یہ باتیں تو بس خواب و خیال ہو گئی ہیں.... مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ان حالات میں

بھی اسکنڈے نیویا کے ملکوں نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ ان لوگوں کی ہمت' حوصلہ اور جفا کشی کی داد دینی پڑتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگوں کو موسم کی شکایت کرتے ہوئے نہیں سنا کہ بھئی کیسا فضول موسم ہے۔ ہم لوگ تو ہر وقت شکایتیں ہی کرتے رہتے ہیں کہ دیکھئے کتنی گرمی ہے۔ توبہ توبہ 'کتنا حبس ہے' میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے۔ بارش نہ ہو تو شکایت اور اگر ہو جائے تو بھی شکایت۔ سردی نہ پڑے تو شکایت اور اگر زیادہ سردی پڑ جائے تو اس سے بھی ناراض۔ آخر یہ شکایت کرنے کی عادت ہم لوگ کب چھوڑیں گے؟"

ہمارے سامنے والی سیٹ پر ایک خاتون میگزین پڑھتے پڑھتے سو گئی تھیں۔ ایک ائر ہوسٹس کی نظر پڑی تو لپکتی ہوئی آئی اور اوپر سے ایک تکیہ نکال کر ان کے سر کے نیچے رکھ دیا اور پھر ان کی سیٹ کو پیچھے کی جانب کر دیا تاکہ وہ آرام سے سو جائیں۔ ہم اس خدمت گزاری سے بہت متاثر ہوئے مگر بعد میں پتا چلا کہ اٹلانٹک کے سفر کے دوران میں تمام کمپنیاں مسافروں کو خوش کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر خدمت کرتی ہیں کیونکہ اس راستے پر مقابلہ بہت سخت ہے۔ اس لیے عام طور پر کرایوں میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ ہر کمپنی کی کوشش ہوتی ہے کہ مسافروں کو سستے سے سستا ٹکٹ اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرے۔ بیئر وغیرہ تو مفت ہی پیش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مسافروں کو مختلف قسم کے تحائف بھی دیے جاتے ہیں۔ خاص طور پر بچوں پر ائر ہوسٹسیں بہت زیادہ مہربان نظر آتی ہیں۔

ہماری پرواز لگ بھگ سات گھنٹے کی تھی اور ہوائی جہاز کے عملے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مختصر سی مدت میں ہماری کس طرح خدمت گزاری کرے۔ کھانا' پلانا' فلم دکھانا' موسیقی سنانا سبھی کچھ جاری تھا۔ ائر ہوسٹس کا یہ عالم تھا کہ اشارے کی منتظر تھی۔ ادھر کسی مسافر نے بٹن دبایا اور ادھر الف لیلیٰ کی پری کی طرح نمودار ہو گئی۔ ہمیں تو فضائی سفر کے دوران میں سونے کی عادت نہیں ہے لیکن سرتاج صدیقی صاحب کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہوں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی' جیب سے ایک سیاہ پٹی نکال کر آنکھوں پر باندھی اور ہم سے معذرت کر کے سو گئے۔ ہم نے کچھ دیر فلم دیکھنے کی کوشش کی۔ کوئی پرانی ویسٹرن تھی۔ اداکار بھی معروف نہیں تھے۔ البتہ ریڈ انڈین کافی تعداد میں مر رہے تھے ہماری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ کیا ریڈ انڈین واقعی اتنے ہی بے وقوف ہوا

کرتے تھے جتنے کہ امریکی فلموں میں دکھائے جاتے ہیں یا پھر یہ مبالغہ آرائی ہے؟ اب تو کاؤ بوائے اور ویسٹرن فلموں کا رواج ہی نہیں رہا ہے مگر ایک زمانے میں یہ بہت مقبول تھیں۔ کہانی عام طور پر یہ ہوا کرتی تھی کہ بے چارے معصوم اور مظلوم یوروپین کسی جگہ پر آباد ہونے کے لیے بستی بناتے ہیں اور ریڈ انڈین ان پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ ریڈ انڈین عام طور پر نیم برہنہ دکھائے جاتے تھے۔ چہروں اور جسموں پر عجیب سے نقش و نگار بنے ہوئے' سروں میں پرندوں کے پر سجے ہوئے' ہاتھوں میں بھالے' انتہائی بے وقوف بلکہ عقل سے بالکل پیدل۔ ان کا رہن سہن بھی جنگلیوں سے بدتر دکھایا جاتا تھا۔ عادات بھی وحشی جانوروں جیسی ہوا کرتی تھیں مگر کیسا ہی جنگلی ریڈ انڈین کیوں نہ ہو' ان میں انگریزی بولنے اور سمجھنے والے ضرور ہوتے تھے جو خالص امریکی لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔ ان کے لڑنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ لڑائی کے سین اکثر اوقات ایسے ہوا کرتے تھے کہ سینکڑوں ہزاروں ریڈ انڈین' گھوڑوں پر سوار' نیزے لہراتے ہوئے معصوم گوروں پر حملہ کرتے ہیں اور حملہ کرنے سے پہلے ہی دور سے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں تاکہ دشمن خبردار ہو جائے۔ پھر وہ نیزے اور تیر کمان لے کر معدودے چند انگریزوں کی آبادی پر ٹوٹ پڑتے ہیں مگر ان کے پستولوں اور بندوقوں کے آگے ان کی ایک پیش نہ چلتی۔ اس لیے درجنوں بلکہ سینکڑوں لوگوں کو مروانے کے بعد جس طرح شور مچاتے ہوئے آئے تھے' اسی طرح شور مچاتے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے گھر ہی سے مرنے کا ارادہ لے کر نکلے تھے۔

ہم نے ایک بار ایک امریکی سے پوچھا تھا کہ "بھائی' آپ ریڈ انڈین لوگوں کو جس قدر احمق دکھاتے ہیں اتنے بے وقوف تو جانور بھی نہیں ہوتے۔ شیر اور چیتے بھی گھات لگا کر شکار کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ دور ہی سے دہاڑنا شروع کر دیں تاکہ شکار ہوشیار ہو جائے اور پھر ہم نے کسی لڑائی میں ریڈ انڈین لوگوں کو فتح حاصل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بس گھوڑوں پر بیٹھ کر شور مچاتے رہتے ہیں اور بے شمار ساتھیوں کو مروانے کے بعد اسی طرح "ہو ہو ہو" کرتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں۔ تو کیا امریکا کے ریڈ انڈین جانوروں سے بھی کم عقل ہوتے ہیں؟"

امریکی نے ایک لمحہ سوچا' پھر مسکرائے اور کہا "اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو ہم سفید فام

آج آپ کو امریکا میں نظر نہیں آتے۔"

بات تو ٹھیک ہے۔ آج امریکا میں ہر طرف سفید فام ہی راج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ریڈ انڈین محض نمونے کے طور پر بچا کر رکھے گئے ہیں تاکہ دنیا والوں کو بتایا جا سکے کہ دیکھئے' ریڈ انڈین جو اس ملک کے اصل مالک تھے' ایسے ہوا کرتے تھے۔ امریکی بچوں کو کتابوں میں بھی ریڈ انڈینز کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔ ان کی جھونپڑیاں' ان کے ہتھیار اور ان کے طور طریقے بتائے جاتے ہیں۔ اس سرزمین کے اصل مالک اب محض کتابوں اور فلموں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہوائی جہاز میں رات ہو گئی تھی۔ چند فلم دیکھنے والوں کے سوا سبھی سو چکے تھے۔ یا پھر ہم جیسے لوگ میگزین یا کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ فلم کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی کیونکہ وہ ہیڈ فون کے ذریعے صرف کانوں میں ہی سنائی دیتی ہے۔ گویا پورا ہوائی جہاز ایک بڑا سا بیڈ روم بن کر رہ گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ سونے والے بستروں کی بجائے کرسیوں پر سو رہے تھے۔ کیبن کی روشنیاں بھی بجھا دی گئی تھیں۔ عجیب پر اسرار سا سماں تھا۔ لبنیٰ اور بچیاں بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ ہمیں بے اختیار مادام نورجہاں کا نغمہ یاد آ گیا۔

جگ سوئے' ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں
ہو' چاندنی راتیں ....

فرق صرف اتنا تھا کہ نہ تارے تھے اور نہ ہی چاند نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ائر ہوسٹس کا چاند سا چہرہ بھی غائب تھا۔ کچھ دیر بعد اسکرین پر سے فلم بھی غائب ہو گئی۔ ہمیں مشیر کاظمی یاد آ گئے جو اس گانے کے خالق تھے۔ بڑے دلچسپ اور زندہ دل آدمی تھے مگر معاشی بدحالی کا شکار۔ اس زمانے میں پاکستان میں فلمیں بہت کم بنا کرتی تھیں اس لیے فلمی صنعت سے وابستہ لوگ تنگ دست رہا کرتے تھے۔ "چاندنی راتیں" والا گانا سبطین فضلی صاحب کی مشہور فلم "دوپٹا" کے لیے مشیر کاظمی نے لکھا تھا۔ اس کی شان نزول انہوں نے یہ سنائی تھی کہ جیب بالکل خالی تھی۔ دو وقت کا فاقہ تھا۔ رات کا وقت تھا اور مشیر کاظمی اپنے گھر کے صحن میں لیٹے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ایک تو مفلسی اور بھوک' اس پر چاندنی

رات۔ بس یوں ہی کروٹیں بدلتے ہوئے اشعار موزوں ہونے لگے اور صبح تک یہ گیت مکمل ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی وہ فضلی صاحب کے دفتر پہنچ گئے تاکہ موسیقار کو گیت سنا کر پیسے کھرے کریں۔ موسیقار فیروز نظامی نے گیت سنا تو فوراً پسند کر لیا۔ گیت فلم کی سچویشن کے عین مطابق تھا اور مشیر کاظمی کی سچویشن کے مطابق بھی تھا اس گیت کا معاوضہ انہیں پچاس روپے ملا جو اس وقت کے حالات میں ایک معقول رقم تھی۔ اور کئی دن تک اس سے پیٹ بھرنے کا بندوبست کیا جا سکتا تھا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا؟

مشیر کاظمی کا خیال آیا تو ساتھ ہی اس زمانے کی اور بھی بہت سی باتیں قطار در قطار ذہن پر دستک دینے چلی آئیں۔ کیسے رنگین دن تھے اور کیسے حسین لوگ۔ ایک کے بعد ایک شخص اور واقعہ یاد آنے لگا۔ ماضی کی یادیں بھی خوب ہوتی ہیں۔ ایک شاعر نے لکھا ہے کہ

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مگر ہمارا تجربہ شاعر صاحب سے بالکل مختلف ہے۔ ماضی کی یادیں ہمارے لیے بڑی فرحت بخش ہیں۔ جب بات بے بات یاد آتی ہے تو یادوں کا ایک حسین چمن سا کھل اٹھتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ان لوگوں میں دوبارہ جان پڑ جائے اور وہ زمانہ ایک بار پھر لوٹ آئے مگر کسی شاعر نے یہ بھی تو کہا ہے کہ

گزرا ہوا زمانہ آتا نہیں دوبارہ

یہ شاعر تنویر نقوی تھے۔ تنویر نقوی کا خیال آتے ہی بے شمار جھروکے سے کھل گئے اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی خیالوں کی دنیا میں چلے آئے۔ علاؤ الدین سنتوش کمار' ریاض شاہد' نعمان' رشید عطرے' خورشید انور غرض کس کس کا ذکر کیا جائے۔

نہ جانے ہم کتنی دیر تک ان خیالوں میں کھوئے رہے۔ اس وقت چونکے جب ہوائی جہاز کی روشنیاں جل اٹھیں اور دن سا نکل آیا۔ روشنی بھی عجیب چیز ہے۔ انسان کا انداز فکر ہی بدل جاتا ہے۔ اندھیرا موت ہے اور روشنی زندگی۔ ایک ایک کر کے مسافر بیدار ہونے لگے۔ سامنے والی خاتون بھی انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھ بیٹھیں۔ صبح ہوتے ہی ایک ہلچل سی مچ گئی اور مسافروں نے ٹوائیلٹ جانے کے لیے قطاریں بنانی شروع کر دیں۔ سرتاج

صاحب نے بھی جھرجھری لی، آنکھوں سے سیاہ پٹی ہٹائی اور مسکراتے ہوئے بیدار ہو گئے۔ آنکھیں کھولتے ہی انہوں نے آس پاس کے لوگوں پر رواں تبصرہ کرنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اچانک سوئچ آن کر دیا ہے۔

غسل خانہ اور ناشتا صبح کے لوازمات ہیں۔ اکثر مسافروں کا حلیہ تو زیادہ اچھا نہ تھا مگر ائر ہوسٹسیں نمودار ہوئیں تو بالکل ترو تازہ اور شگفتہ نظر آ رہی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی دیگر مسافر خواتین نے بھی اپنے میک اپ کی طرف توجہ دی۔ شیشے اور کنگھے نکل آئے۔ بالوں میں برش پھیرے جانے لگے۔ لپ اسٹک درست ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوائی جہاز کے اندر کی دنیا ہی بدل گئی۔ ائر ہوسٹسوں نے بہت پھرتی سے ناشتا لگانا شروع کر دیا۔ ہم نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ نیچے سمندر بدستور موجود تھا۔ نادیہ نے جھانک کر دیکھا اور پوچھا "پاپا! یہ سمندر کب ختم ہو گا۔"

سرتاج عزیز نے جواب دیا "بیٹے یہ تو نیویارک پہنچ کر ہی ختم ہو گا۔"

پارو نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا "یہ امریکا کا سمندر ہے اس لیے بہت بڑا ہے۔"

پتا نہیں۔ بچے بچے کو امریکا کی بڑائی کا احساس کس طرح ہو جاتا ہے؟

کچھ دیر بعد اعلان کیا گیا کہ تھوڑی دیر بعد ہوائی جہاز نیویارک کے ہوائی اڈے پر لینڈ کرے گا اور اس اعلان کے ساتھ ہی مسافروں نے کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ پارو کو سب سے زیادہ فکر پڑی ہوئی تھی "پاپا! اب کیا ہو گا؟" انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہمارا ہوائی جہاز نیویارک کے ہوائی اڈے پر اتر جائے گا۔" ہم نے جواب دیا۔

"اور اگر کسی بلڈنگ سے ٹکرا گیا تو؟ آپ کو پتا بھی ہے نیویارک میں کتنی اونچی اونچی بلڈنگیں ہوتی ہیں!" ان کی تشویش کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ ہم نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی "بیٹے آپ فکر نہ کریں۔ ان لوگوں کو یہاں ہوائی جہاز اڑانے کی عادت ہے۔"

پارو کی فکر مندی بے جا بھی نہیں تھی۔ پہلے اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو سمندر ہی سمندر نظر آیا۔ اب جو دیکھا تو اونچی اونچی عمارتیں زمین میں کیلوں کی طرح ٹھکی ہوئی نظر آئیں۔ پہلے اسے ڈر تھا کہ کہیں جہاز سمندر میں نہ اتر جائے۔ اب یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اونچی بلڈنگوں سے نہ ٹکرا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ اپنی جان سب کو پیاری

ہوتی ہے۔ خواہ وہ بچہ ہو یا جانور۔ بلکہ اب تو سائنس دانوں نے تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جانور بھی انسانوں کی طرح سوچتے ہیں، سمجھتے ہیں بلکہ ایک دانش ور نے تو یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اگر سکھانے کی کوشش کی جائے تو وہ انسانوں کی زبان بھی سیکھ سکتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ پالتو کتے اور دوسرے جانور مالک کی ہدایات کو سمجھتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کی بات سمجھ رہے ہیں۔ اب اگر انہیں باقاعدہ تربیت دی جائے تو وہ ہماری زبان بول بھی سکتے ہیں۔ انہیں یوں تو بے زبان کہا جاتا ہے مگر بات دراصل یہ ہے کہ ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے۔ حالانکہ وہ ہماری زبان سمجھ لیتے ہیں۔ یہ قصور کس کا ہے؟ ظاہر ہے انسانوں کا۔ اگر انسان ان کی زبان سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں تو ان پر "بے زبانی" کا الزام عائد نہ کریں۔ کتوں کو دیکھ لیجیے جب بولنے پر آتے ہیں تو کسی طرح چپ ہونے کا نام نہیں لیتے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے مذاکرہ ہو رہا ہے یا محفل مشاعرہ سجی ہوئی ہے پطرس بخاری صاحب کے خیال میں تو کتوں کا مشاعرہ بڑے زور شور سے ہوتا ہے اور کئی شاعر بڑی طویل نظمیں اور دو غزلے' سہ غزلے سناتے ہیں اور کسی طرح خاموش ہونے کا نام نہیں لیتے۔ باقی حاضرین داد دینے میں یا ہوٹنگ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ آخر انسانوں کے مشاعروں میں بھی تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ جانوروں کی سمجھ داری کا ثبوت یہ ہے کہ خطرہ دیکھتے ہی ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ اپنی جان بچانے کی انہیں بھی اتنی ہی فکر ہوتی ہے جتنی کہ ہم کو اور آپ کو۔

دن کا وقت تھا اس کے باوجود نیویارک کی بعض بلند و بالا عمارتوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ امریکا میں ہر چیز کی فراوانی ہے۔ بجلی کی بھی کمی نہیں ہے۔ رات ہو یا دن' عمارتوں میں روشنیاں جگمگاتی رہتی ہیں۔ رات کے وقت بھی دن کا سماں نظر آتا ہے۔ عمارتوں کو دیکھئے تو وہاں بھی روشنیاں نظر آتی ہیں حالانکہ دفاتر بند ہو چکے ہوتے ہیں۔ امریکیوں کی فضول خرچی اور اسراف بے جا کا تفصیلی تذکرہ آگے چل کر ہو گا۔ اونچی اونچی عمارتوں کا سلسلہ اچانک ختم ہو گیا اور بڑے آرام سے طیارہ رن وے پر اتر گیا۔

سرتاج صاحب نے پائلٹ کی تعریف شروع کر دی "دیکھا آپ نے کس قدر نزاکت اور خوب صورتی سے ہوائی جہاز اتارا ہے۔ آخر فرنچ ہے نا۔"

ہم نے کہا "سرتاج صاحب' جہاز کی لینڈنگ کا تعلق قوم اور نسل سے نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک تکنیک ہے جو ہوا باز ماہر ہوتا ہے وہ اچھی لینڈنگ کرتا ہے۔ ہمارے پی آئی اے کے پائلٹ بھی ایسی ہی خوب صورت اور نازک لینڈنگ کر لیتے ہیں بلکہ گلگت کے پہاڑوں کے درمیان سے جس طرح ہمارے پائلٹ ہوائی جہاز اڑا کر لے جاتے ہیں وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔"

سرتاج مسکرائے "ویری گڈ! یہ بات ہوئی نا۔ بڑی خوشی ہوئی آپ کی باتیں سن کر۔ واقعی ہمارے اندر ایسا ہی جذبہ ہونا چاہئے۔ بھئی مزہ آگیا۔"

نیویارک پہنچنے پر وہ تمام اعلانات کیے گئے جو کیے جاتے ہیں۔ مسافروں کا شکریہ ادا کیا گیا۔ انہیں ہدایات دی گئیں کہ جہاز کے بالکل رک جانے کے بعد دروازے کھل جانے تک وہ اپنی جگہوں پر بیٹھے رہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر جیسے ہی جہاز نے رن وے کو چھوا' مسافروں میں بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے اپنا دستی سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ دھکم

پیل تو نہیں ہوئی مگر کسی خاص نظم و ضبط کا مظاہرہ بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہم نے سوچا کہ ہم بلا وجہ اپنے پاکستانیوں کو الزام دیتے ہیں۔ اس حمام میں تو سبھی ایک جیسے ہیں۔

ٹڈے یا ٹل یا کیپسول کے راستے ائرپورٹ پر پہنچے تو جے ایف کے ائرپورٹ سے تعارف ہوا۔ نیویارک کا ائرپورٹ تھا۔ ظاہر ہے بہت شاندار' روشن اور خوب صورت تھا۔ لمبے لمبے راستوں سے گزرتے ہوئے ہم امیگریشن میں پہنچ گئے۔ بہت سی میزیں لگی ہوئی تھیں جن پر بہت سے حضرات و خواتین تشریف فرما تھے۔ یہ امیگریشن آفیسر تھے۔ خواتین تو خیر یورپ میں ہی کافی تعداد میں نظر آتی ہیں مگر یہاں سیاہ فام حضرات اور خواتین بھی خاصی بڑی تعداد میں تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سفید فاموں کے مقابلے میں سیاہ فام زیادہ نرم دل اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ ہم اس قطار میں جا کھڑے ہوئے جس کے دوسرے کنارے پر ایک سیاہ فام خاتون پاسپورٹ اور ویزے چیک کرنے پر مامور تھیں۔ مسافر بیشتر بلکہ تمام تر یوروپین تھے اس لیے ان سے نہ کوئی پوچھ گچھ ہوئی' نہ شکوک و شبہات کا اظہار ہوا۔ اس لیے بہت جلد ہماری باری آگئی۔ ہم نے اپنے تندرست پاسپورٹ ان کے حوالے کر دئے۔ انہوں نے پاسپورٹ کا رنگ دیکھا پھر ہمیں دیکھا' پاسپورٹ کے صفحات الٹے اور پھر ہماری طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"آپ فلم پروڈیوسر ہیں؟" انہوں نے بڑی خوش دلی سے پوچھا۔

"جی"

"یہاں فلم بنانے آئے ہیں؟"

"جی نہیں' فی الحال تو سیرو سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ آپ کا ملک بہت خوب صورت ہے۔ یہاں لوکیشنز دیکھیں گے۔"

وہ گرمجوشی سے مسکرائیں اور بولیں "ٹھیک کہا آپ نے مگر ہمارا ملک بہت بڑا ہے۔ کافی وقت لگے گا گھومنے پھرنے میں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

انہوں نے پاسپورٹ پر ٹھپا لگایا اور بولیں "میں نے فی الحال پانچ مہینے کا ویزا لگا دیا ہے۔ ضرورت پڑے تو آپ اس میں توسیع کرا سکتے ہیں۔ نو پرابلم" ہم نے شکریہ ادا کیا اور لاؤنج کی جانب چل پڑے۔ سرتاج صاحب کو بھی جلد چھٹی مل گئی کیونکہ ان کے پاس

نمارک کا پاسپورٹ تھا۔ یہاں سے ہمارے راستے جدا ہو رہے تھے۔ ہمیں واشنگٹن جانا تھا ر ان کا سفر نیویارک پر ختم ہو گیا تھا۔ ائر فرانس کی ایک نہایت اسمارٹ، وردی پوش خاتون نے پہلے بتا دیا تھا کہ جو مسافر آگے سفر کرنا چاہتے ہیں وہ اس طرف آجائیں۔ چنانچہ ہم بھی اس طرف چلے گئے۔ سرتاج صاحب نے بہت خلوص کے ساتھ الوداع کیا۔ گلے ملے، ہمارا شنگٹن کا پتا اور فون نمبر لیا اور ملاقات کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی ڈنمارک آنے کی دعوت بھی ے دی اور یہ خاص طور پر کہا کہ آپ لوگ میرے مہمان ہوں گے۔ مختصر سے سفر میں ہم ئر ہونے کے بعد وہ اس قدر جذباتی ہو رہے تھے۔ یہ ہم مشرقی لوگوں کی فطرت ہے ورنہ ورے تو سالہا سال تک زندگی کے سفر میں ایک ساتھ رہنے کے بعد بھی جذباتی نہیں وتے۔ "ٹاٹا۔ بائی بائی" کہہ کر ایک منٹ میں تعلق توڑ لیتے ہیں۔

ہم انہیں الوداع کہنے میں مصروف تھے کہ اچانک خوشبو کا ایک جھونکا سا ہمیں مہکا گیا۔ اس جھونکے ... ساتھ ہی ایک نہایت شیریں آواز بھی سنائی دی "مینخ سی موسیو۔ آپ واشنگٹن جائیں گے نا؟"

مڑ کر دیکھا تو وہی وردی پوش شعلہ جوالہ کھڑی دمک رہی تھی۔ بعض یورپی خواتین کا رنگ تو بے مثال ہوتا ہے۔ ان کا سرخ و سفید مکھن اور شہد جیسے رنگ کا روشن چہرہ اور نیلی آنکھیں اتنے قریب سے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو ہم واقعی سٹپٹا کر رہ گئے۔ وہ ہماری بوکھلاہٹ کو بھانپ گئیں اور اس کا سبب بھی جان گئیں، بڑی تمکنت سے مسکرائیں گویا خراج حسن وصول کر لیا۔ پھر نہایت رواں انگریزی میں مخاطب ہوئیں "آپ واشنگٹن جائیں گے نا؟"

ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ لوگ میرے ساتھ آئیے تاکہ آپ کو کنکٹنگ فلائٹ تک پہنچا دیا جائے۔"

ہم فوراً ان کے ساتھ ہو لیے۔ ائرپورٹ پر خاصی رونق اور ہجوم تھا۔ مسافر اپنے اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے، کوئی ادھر جا رہا ہے تو کوئی ادھر، وہ کبھی کبھی نگاہوں سے اوجھل بھی ہو جاتی تھیں اور ہم سوچتے رہ جاتے تھے کہ وہ اب کس طرف گئی ہیں مگر لیلی بازو تھام کر ہماری رہنمائی کرتی تھیں اور ہم دوبارہ انہیں تلاش کر لیتے تھے۔ ہم نے لیلی سے پوچھا "اس ہجوم میں آپ انہیں کس طرح تلاش کر لیتی ہیں؟"

بولیں "خوشبو کے ذریعے۔ ان کی خوشبو یاد رکھیے بس جس طرف سے یہ خوشبو آرہی ہے اسی طرف چلتے رہیے۔"

کمال ہے۔ ان عورتوں کا حساب کتاب بھی نرالا ہوتا ہے۔ لباس، زیورات، جوتے اور خوشبو پر کتنی گہری نظر رکھتی ہیں۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہر خوشبو ایک جیسی لگتی ہے۔ اتنی باریکی میں جانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

ہم نے پوچھا "یہ خوشبو کون سی ہے؟"

انہوں نے جواب میں ایک خوشبو کا عجیب سا نام لیا اور ساتھ ہی فرمایا "کتنی بار آپ سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے یہ پرفیوم لا دیجئے۔"

"بھئی آپ خود خرید لیجئے۔"

"خریدوں کیسے۔ ملتی ہی نہیں ہے۔ ڈیوٹی فری شاپ میں بھی نہیں نظر آئی۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ ایسی ہوتی ہیں بیگمات۔ ان کا فرض صرف شکایت کرنا ہوتا ہے بے چارے شوہر کو الزام دینا ہوتا ہے۔

حسینہ ائر فرانس کا پیچھا کرتے ہوئے جب ہم ایک جگہ رکے تو معلوم ہوا کہ وہ ہمیں ائرپورٹ ٹرمینل کے بیرونی حصے میں لے آئی ہیں۔ بہت پریشان ہوئے، خدایا کیا یہ ہمیں ائرپورٹ سے باہر نکالنا چاہتی ہیں؟ یا پھر ائر فرانس کے خرچے پر ہمیں نیویارک کے کسی ہوٹل میں مہمان رکھنے کا پروگرام ہے لیکن بہت جلد سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ جب ہماری رہبر نے ایک ائر کنڈیشنڈ بس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہمیں مطلع کیا کہ وہ رہی آپ کی کوچ۔

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "آپ ہمیں کہاں بھیج رہی ہیں؟"

فرمایا "آپ کی فلائٹ پر۔ وہ ائرپورٹ کے دوسرے حصے سے جائے گی۔"

یہ عقدہ بعد میں کھلا کہ نیویارک کا کینیڈی ائرپورٹ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ ایک حصے سے دوسرے حصے تک جانے کے لیے مسافروں کو بس کے ذریعے لے جانا پڑتا ہے۔ ہم چپ چاپ بس میں سوار ہو گئے جس میں اور بھی بہت سے مسافر سوار تھے۔ یہ بس ائرپورٹ والوں کی تھی اور یہ مسافر کسی ایک ائر لائن کے نہیں تھے بلکہ مختلف فلائٹس سے تعلق رکھتے تھے جن کی پروازیں ائرپورٹ کے دوسرے حصوں سے روانہ ہونے والی تھیں۔ یہ

بس مسافروں کو مختلف مقامات پر ڈراپ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ہماری باری بھی آ گئی۔

پارو بے چاری کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا "پاپا! کیا ہم بس سے واشنگٹن جائیں گے؟"

ہم نے اسے سمجھایا کہ ہم بس کے ذریعے ائرپورٹ جا رہے ہیں۔

"مگر یہ بھی تو ائرپورٹ ہے۔"

"مگر ہمارا جہاز بہت دور سے جائے گا۔"

ہمارا سفر کافی دیر تک جاری رہا۔ اس اثنا میں ہم نے نیویارک کا جتنا حصہ دیکھا وہ ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی، صفائی بھی ناقص، بارش ہو چکی تھی اس لیے سڑک اور بھی زیادہ گندی نظر آ رہی تھی۔ بہت فاصلے پر کچھ اونچی اونچی عمارتیں ضرور نظر آ رہی تھیں۔ نیویارک کے بارے میں ہم نے جو سنا اور پڑھا تھا اس کے مطابق جو دیکھ رہے تھے وہ خلاف توقع نہیں تھا۔ پھر بھی عجیب طرح کی مایوسی ہوئی اور خوشی بھی۔ مایوسی اس بات کی کہ امریکا جیسے ملک کا اتنا بڑا اور مشہور شہر اور سڑکوں کا یہ حال، خوشی اس لیے ہوئی کہ اگر ہمارے شہروں کا برا حال ہے تو ایسی کون سی قیامت ہے۔ شاید آپ نے بھی محسوس کیا ہو کہ بعض اوقات دوسروں کی خراب حالت دیکھ کر افسوس کے بدلے خوشی ہوتی ہے کہ یہ بھی ہماری طرح ہیں۔ ہم پاکستانی ابھی اسی مرحلے میں ہیں کہ دوسروں کی حالت زار دیکھ کر مطمئن ہوتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ کوئی اور بھی ہمارے جیسا ہے۔

ایک خاصا لمبا چکر کاٹ کر ہماری بس ایک اور ٹرمینل پر پہنچ گئی۔ ہماری رہبر نے مسکراتے ہوئے ہمیں اترنے کا اشارہ کیا۔ اس جگہ ہمارے علاوہ چند اور مسافر بھی اترے۔ سواریاں اتارنے کے بعد بس آگے روانہ ہو گئی۔ ٹرمینل کا یہ حصہ بھی کافی متاثر کن تھا۔ ماننا پڑا کہ شہر جیسا بھی تھا مگر ائرپورٹ واقعی نیویارک کے شایان شان تھا۔ ہمارے مجسم خوشبو تیزی سے رواں دواں تھیں اور ہمیں ان کا ساتھ دینے میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔ ہمارے پاس دستی سامان کے سوا کچھ اور نہ تھا اس لیے ان کے قدم سے قدم ملانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر انہوں نے ہم سے پاسپورٹ طلب کیا اور ایک سیاہ فام موٹی تازی خاتون کے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے سب پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور گردن کے اشارے سے لائن کلیئر دے دیا۔ ایک

کے زینے پر سے گزر کر ہم دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ گیلریاں، لاؤنج سب کچھ بہت پرشوکت تھا۔ ایک نمایاں فرق یہ نظر آیا کہ یہاں یورپ کے مقابلے میں کالے اور گندمی رنگ کے لوگ کافی تعداد میں تھے۔ امریکا میں کالے تو خیر ہیں ہی مگر سانولے لوگوں کی آبادی بھی کم نہیں ہے۔ یورپ کے علاوہ ایشیا، جنوبی امریکا، چین، جاپان، ویت نام اور فلپائن کے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اسپین اور جنوبی امریکا کے لوگ بھی گورے نہیں ہوتے۔ ایک اور بات جو مختلف نظر آئی وہ لوگوں کا بے تکلفانہ انداز تھا۔ لباس بھی غیر رسمی سا تھا۔ گوروں کی ریل پیل نہیں تھی اس لیے کچھ اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔

ائرپورٹ کے ایک لاؤنج میں ہمیں پہنچانے کے بعد ہماری رہبر نے بتایا کہ اب آپ یہاں اپنی فلائٹ کا انتظار کیجئے۔ آپ "ڈیلٹا ائر لائن" کے ذریعے سفر کریں گے۔

یہ امریکن ائر لائن ہے اور بہت بڑی ائر لائن ہے۔ اس کی ایک ہزار سے زائد پروازیں روز اندرون اور بیرون ملک جاتی ہیں۔ ہمیں یہ اطلاع دینے کے بعد انہوں نے مسکرا کر ہمیں خدا حافظ کیا اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ بھی ملایا جس کی خوشبو کچھ دیر تک ہمارے ہاتھ میں رہی۔ ان کے رخصت ہونے کا افسوس تو ہوا مگر دنیا میں سدا کون کسی کا ساتھ دیتا ہے؟ یہ سوچ کر صبر کیا۔ اب ہم نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ فرنیچر اور کرسیاں وغیرہ پلاسٹک کی تھیں مگر بہت خوب صورت اور آرام دہ۔ ماحول بہت روشن اور دوستانہ تھا۔ جو بھی پاس سے گزرتا، مسکراتا ہوا گزرتا تھا اور محض مسکرانے پر ہی اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ "ہائی" بھی ضرور کہتا تھا۔ بیشتر حضرات و خواتین کو چیونگم چباتے ہوئے پایا۔ یہ بھی امریکیوں کی کمزوری ہے۔ یعنی چیونگم۔

ہم کچھ دیر تو ادھر ادھر گھومتے رہے پھر ایک اچھی سی جگہ منتخب کر کے وہاں بیٹھ گئے۔ بچیوں نے دوڑنا بھاگنا شروع کر دیا۔ کچھ اور بچے بھی دوڑ بھاگ میں مصروف تھے۔ یہ فرق بھی نمایاں تھا۔ یورپ میں اول تو بچے بہت کم نظر آتے ہیں اور جو دیکھنے کو ملتے ہیں وہ انتہائی باضابطہ قسم کے ہوتے ہیں۔ بچوں سے زیادہ بوڑھی روحیں معلوم ہوتے ہیں لیکن یہاں کے بچے مختلف تھے۔ تکلفات اور ڈسپلن کے زیادہ پابند نہیں تھے۔ ہنستے بولتے ہوئے کھیلتے پھر رہے تھے۔ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے جب کہ یورپ، خاص طور پر انگلستان کے تو بچے بھی تعارف کے بغیر ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کرتے۔ سرد مہری کی جگہ

گرمجوشی کا مظاہرہ دیکھنے میں آ رہا تھا۔ بڑوں کا بھی یہی حال تھا۔ قطعاً بے تکلف اور غیررسمی انداز تھا۔ یورپ اور امریکا کا فرق ہمیں محسوس ہونا شروع ہو گیا۔ کوٹ پتلون، سوٹ بوٹ اور بناؤ سنگھار بھی زیادہ نظر نہیں آیا۔ گرمیوں کا موسم تھا اس لیے پتلون، قمیص، شرٹس اور جینز زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ ایک نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ نوجوان لڑکیاں بھی مختصر سے بلاؤز اور نیکر میں ملبوس نظر آ رہی تھیں۔ امریکی اس نیکر کو "شارٹس" کہتے ہیں۔ بوڑھا، جوان عورت، مرد، بچہ، بڑا، سبھی شارٹس بڑی آزادی سے استعمال کرتے ہیں اور بڑے مزے میں سینڈل پہن کر گھومتے پھرتے ہیں۔ پنجابی میں ہم جس چیز کو "کھلا ڈلا" کہتے ہیں امریکی بھی اسی انداز کے قائل ہیں۔

یورپ میں، خصوصاً انگلستان میں آپ کسی اجنبی سے ماچس مانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سب جانتے ہیں کہ اس بے تکلفی کو انگریز پسند نہیں کرتے مگر یہاں کی فضا میں ایسی بے تکلفی تھی کہ ہم نے سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا "معاف کیجئے، آپ کے پاس ماچس ہو گی؟" تو وہ جواب میں باچھیں پھیلا کر مسکرائے اور بڑے زور سے فرمایا "شیور شیور" اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیب سے لائٹر نکال کر وہیں بیٹھے بیٹھے ہماری طرف اچھال دیا۔ ہم اس حرکت کے لیے بالکل تیار نہیں تھے مگر خود بخود دونوں ہاتھ اٹھ گئے اور ہم نے اسے کیچ کر لیا۔ یہ سوچئے کہ اگر کوئی کرکٹ سے ناآشنا شخص ہوتا تو کیسے کیچ کرتا؟ دیکھا آپ نے۔ اسپورٹس مین ہونا بعض اوقات کتنا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

ہم نے جیب سے سگار نکال کر سلگایا اور پھر لائٹر ان کی جانب اچھال دیا۔ انسان ماحول کا اثر کتنی تیزی سے قبول کرتا ہے۔

ایک شرٹ اور پتلون میں ملبوس سانولے رنگ کے صاحب ہماری برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ دیکھنے میں ہندوستانی یا پاکستانی نظر آتے تھے۔ مگر جب بولے تو خالص امریکی لب و لہجے میں، معلوم ہوا کہ پانامہ کے ہیں مگر اب امریکی بن چکے ہیں۔

انہوں نے مسکرا کر پوچھا "آپ انڈین ہیں؟"

ہم نے بھی مسکرا کر جواب دیا "نہیں ہم پاکستانی ہیں۔ کیا آپ انڈین ہیں؟"

مسکرا کر بولے "نہیں میں امریکن ہوں۔ اور بنیادی میرا تعلق پانامہ سے ہے۔"

اس کے بعد گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں پتہ چلا کہ مسکرانا ان کی عادت ہے بلکہ ان کا چہرہ مسکراتا ہوا ہے۔ وہ بھی واشنگٹن جا رہے تھے۔

پوچھنے لگے "آپ پہلی بار واشنگٹن جا رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "جی ہاں، ہم پہلی بار امریکا آئے ہیں۔"

بولے "خوش آمدید مگر کالوں سے بچ کر رہنا۔ واشنگٹن میں ۷۵ فیصد آبادی کالوں کی ہے۔ جب سے انہیں مساوی حقوق ملے ہیں یہ ہمارے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔ آبادی کے تناسب سے انہیں ہر جگہ نمائندگی دی جاتی ہے۔ ہمارا تو پولیس چیف بھی کالا ہے۔ کیا مصیبت ہے؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ وہ خود بھی کوئی گورے نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ سانولے سمجھ لیجئے۔ مگر کالوں سے اس قدر نفرت اور بے زاری کا اظہار کر رہے تھے۔ کوئی گورا یہ بات کہتا تو شاید حیرت نہ ہوتی۔

ہم نے کہا "آپ کالوں کے خلاف نظر آتے ہیں؟"

"خلاف؟ میرا بس چلے تو .....تو ....." وہ دانت پیس کر رہ گئے۔ پھر کہا "بہت غلط قسم کے لوگ ہیں۔ بڑا گند پھیلایا ہوا ہے انہوں نے امریکا میں۔ میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں؟"

ہم نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "ضرور بتائیے!"

بولے "دیکھ لینا، امریکا جب بھی برباد ہو گا ان کالوں ہی کی وجہ سے ہو گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ انہیں ایک ریاست بنا کر وہیں آباد کر دینا چاہیے۔ وہاں جو چاہیں، جیسی مرضی آئے کریں ہماری تو جان چھوٹ جائے۔"

"کیا کرتے ہیں کالے؟" ہم نے پریشانی سے پوچھا۔

"یہ پوچھیے کیا نہیں کرتے۔ چوری، ڈاکا، قتل، راہزنی، بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی کون سی واردات ہے جو یہ نہیں کرتے۔ انتہائی کند ذہن اور کام چور لوگ ہیں مگر خود کو دوسرے سے برتر سمجھتے ہیں۔ ہنہ، اگر کسی قابل ہوتے تو کیا کرتے؟"

ہم نے اردو میں کہا "یعنی اللہ نے گنجے کو ناخن ہی نہیں دیئے!"

"بیگ یور پارڈن!"

"یہ ہماری زبان کا ایک محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو قدرت نے زیادہ نہیں نوازا ہے ورنہ وہ دوسروں کا جینا محال کر دیتے۔"

"بالکل صحیح محاورہ ہے۔ سو فیصد ان پر صادق آتا ہے۔" پھر سامنے سے آتے ہوئے

ایک سیاہ فام جوڑے کو دیکھ کر بولے "ذرا انہیں دیکھیے، کوئی خوبی نظر آتی ہے ان میں؟ نہ صورت، نہ شکل، نہ عقل اور نہ انداز دیکھیے۔"

واقعی وہ بڑے شاہانہ انداز میں ٹہلتے ہوئے آ رہے تھے۔ نوجوان نہیں تو جوان ضرور تھے۔ مرد کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ یعنی ایک قوی ہیکل آدمی تھا۔ بہت گہرے رنگوں کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ہیٹ تھا اور گردن اس طرح تنی ہوئی تھی جیسے اپنے سامنے دوسروں کو ہیچ سمجھتا ہے۔ عورت بھی اس کی ہم عمر تھی۔ خاصی لمبی ترنگی مگر نہ موٹی نہ دبلی۔ وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی جس کی وجہ سے سفید موتیوں جیسے دانت بہت نمایاں اور چمکدار نظر آ رہے تھے۔ ہم نے بعد میں بھی مشاہدہ کیا کہ کالوں کا رنگ جتنا سیاہ ہوتا ہے، دانت اتنے ہی شفاف اور چمکدار ہوتے ہیں۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزر گئے۔ عورت نے اسکرٹ اور بلاؤز پہنا ہوا تھا مگر انتہائی گہرے اور شوخ رنگوں کا۔ ان کے سیاہ رنگ پر وہ لباس اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر گہرے شوخ اور چیختے چنگھاڑتے رنگ کے ملبوسات کالوں کی کمزوری ہیں۔ ان کے فیشن بھی گوروں سے مختلف ہیں۔ مردوں کے بال تو بہت زیادہ گھنگریالے ہوتے ہی ہیں مگر عورتیں بھی اپنے بالوں کو مخصوص انداز میں بناتی ہیں اور مینڈھیاں بھی بناتی ہیں۔ یہ ان کے فیشن کی انتہا ہے۔ کالے عام طور پر کالوں ہی سے میل جول رکھتے ہیں، گوروں کے ساتھ بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔

ہم نے ان سے پوچھا "آپ نیویارک میں رہتے ہیں؟"

بے زاری سے بولے "خدا نہ کرے۔ نیویارک بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ شریفوں کا تو یہاں گزارا ہی نہیں۔

ہم نے کہا "تو پھر واشنگٹن میں قیام ہے آپ کا؟"

"خدا بچائے واشنگٹن سے۔ کالوں کی حکمرانی ہے وہاں تو۔ وہاں تو گورے بھی کالوں سے ڈرتے ہیں۔ ہماری اور آپ کی کیا حیثیت ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "تو پھر کہاں قیام ہے آپ کا؟"

بولے "لاس اینجلز میں رہتا ہوں، ریاست کیلی فورنیا میں۔ امریکا میں رہنے کے لیے سب سے معقول جگہ ہے پوچھیے کیوں؟" مگر ہمارے پوچھنے سے پہلے ہی بتانے لگے "ایک تو

کیلی فورنیا کا موسم بہت اچھا ہے۔ نہ سردی' نہ گرمی۔ بارہ مہینے یکساں رہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کالوں گوروں' دونوں سے محفوظ ہے۔ کالوں کی آبادی زیادہ نہیں ہے اور یوروپین سفید فام لوگوں سے زیادہ ہسپانوی' جنوبی امریکی اور ایشیائی لوگ نظر آتے ہیں۔ بہت خوب صورت جگہ ہے۔"

پتا چلا کہ وہ کالوں اور گوروں دونوں سے یکساں طور پر بے زار اور ناراض ہیں۔ پوچھا

"آپ کب سے رہتے ہیں وہاں؟"

"پانچ سال کا تھا جب میرے والد لانچ کے ذریعے اسمگل ہوئے تھے۔ بس پھر وہیں گم ہو گئے۔

ہمارے ملک کے اور بھی بہت سے لوگ رہتے ہیں وہاں پر۔ ساحلی علاقوں میں غائب ہو جانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ سب لوگ ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ گوروں کو خبر ہی نہیں لگنے دیتے۔ آپ دیکھ لیجئے گا' بیس پچیس سال کے بعد اس ریاست میں گورے دیکھنے کو نہیں ملیں گے اگر اللہ نے چاہا تو۔ میکسیکو' کیوبا' پاناما' برازیل' چلی' ارجنٹائن' اسپین' اٹلی' ویت نام' چائنا' تھائی لینڈ ان ملکوں کے لوگوں کی یہاں بہت بڑی تعداد ہے۔ اب تو انڈین اور پاکستانی بھی آنے لگے ہیں۔ بس ان گوروں کو اسی طرح نکال باہر کریں گے جیسے انہوں نے ریڈ انڈینز کو بے دخل کر دیا ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل بالکل" ہم نے کہا۔

"ابھی تو یہ بہت خوش ہیں کہ کام کرنے کے لیے مزدور مل جاتے ہیں۔ باہر سے آنے والے تھوڑا بہت پیسہ بھی ساتھ لاتے ہیں چھوٹے موٹے کاروبار کرتے ہیں اور ان کی معیشت کو بہتر بناتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو روزگار بھی دیتے ہیں۔ مگر جس تیزی سے ان کی آبادی بڑھ رہی ہے اس حساب سے تو گورے بہت جلد اقلیت بن جائیں گے۔ بچے پیدا کرنا تو یہ گناہ سمجھتے ہیں۔ انہیں تو اس وقت پتا چلے گا جب دوسروں کے مقابلے میں اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ ابھی تو یہ بنئے اور یہودی خوب بغلیں بجا رہے ہیں۔"

ہم نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ امریکا کے بھی خلاف تھے۔ یہودیوں کے دشمن تھے۔ کالوں کو ناپسند کرتے تھے اور گوروں سے بھی متنفر تھے۔ تو پھر کیسے امریکی تھے اور امریکا میں

رہتے کیوں تھے؟

اس کے جواب میں فرمایا "کیوں نہ رہیں؟ انہوں نے بھی تو دوسروں کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب ہماری باری ہے۔ غیر امریکیوں کی۔"

بھئی یہ شخص تو باغی ہے۔ ہم نے سوچا۔ کیسے کھلم کھلا ملک کے خلاف بغاوت کی باتیں کر رہا ہے "آپ کا نام کیا ہے اور آپ لاس اینجلز میں کیا شغل کرتے ہیں؟"

"میرا نام ڈیگو کارنیل ہے' کچھ عجیب سا نام ہے نا؟"

"ہاں' اس کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ اور خدا جانے کچھ مطلب ہے بھی یا نہیں۔ نام رکھنے میں مطلب کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے ان گوروں کے نام نہیں سنے؟ گولڈ اسمتھ' اسٹیل' ووڈیہ بھی کوئی نام ہیں؟"

ہم حیرانی سے انہیں دیکھتے رہے۔ امریکا کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں پہلا باغی نظر آ گیا تھا۔ "میں کمپیوٹر کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ دفتر کے کام سے ہی واشنگٹن جا رہا ہوں ورنہ لعنت بھیجتا ہوں واشنگٹن پر۔ وہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے؟ جہنم ہے جہنم۔"

کچھ دیر تک وہ اسی طرح کی جلی کٹی باتیں کر کے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے' شکوے شکایتیں کرتے رہے۔ ہم نے کہا "معاف کیجئے' اگر یہ ملک آپ کو اتنا برا لگتا ہے تو آپ یہاں رہتے کیوں ہیں؟"

بولے "ملک برا نہیں لگتا۔ یہاں رہنے والے برے لگتے ہیں۔ کالوں اور گوروں دونوں پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔ خیر ایک نہ ایک دن ان سے بھی نجات مل جائے گی۔"

بڑے خطرناک ارادے اور نہایت خوف ناک خیالات تھے مسٹر ڈیگو کے۔

یکایک ایک دراز قد' سیاہ بالوں' سیاہ آنکھوں اور کھلتے ہوئے گندمی رنگ کی صاحبہ نمودار ہوئیں اور بلند آواز میں سب کو مخاطب کرنے لگیں "ہیلو ہیلو ایوری باڈی" سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ڈیلٹا ائر لائنز کی واشنگٹن والی فلائٹ تیار ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔"

ہم اناؤنسمنٹ کے اس انوکھے طریقے پر حیران رہ گئے۔ واشنگٹن کے مسافر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ہم نے ان خوش شکل خاتون کو دیکھا جو اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس تھیں' نہ یونیفارم'

نہ کوئی ٹوپی یا نشانی۔ بہرحال سب ان کے پیچھے چل پڑے۔ لمبے سے ہال سے گزر کر وہ ایک جانب بڑھیں۔ اس گوشے میں سے سیڑھیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگیں۔ ان کے جلو میں مسافروں کا قافلہ تھا۔ بلکہ عام سی سیڑھیاں تھیں۔ تھوڑی سی سیڑھیوں سے گزر کر ہم لوگ ایک چھوٹے سے ہال میں پہنچ گئے۔ دروازے سے باہر جانے سے پہلے سامان کی چیکنگ ہوئی۔ پھر گیٹ پر کھڑی ہوئی ایک کالی خاتون نے وہ بورڈنگ کارڈ ملاحظہ فرمائے جو ائر فرانس والی خاتون سارے مسافروں کو دے گئی تھیں۔ یونیفارم انہیں بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس چھوٹے سے ہال میں ڈیلٹا ائر لائنز کے عملے کے چھ سات افراد موجود تھے مگر سب کے سب عام لباس میں تھے۔ نہ کوئی وردی' نہ کوئی نشانی' نہ کوئی پہچان۔ بچیاں بھی یہ منظر دیکھ کر حیران تھیں "پاپا ہم سب کہاں جا رہے ہیں؟ ائرپورٹ کہاں چلا گیا؟"

ہم نے کہا "یہی ائرپورٹ ہے۔ یہ لوگ ائر لائن کے اسٹاف کے ہیں۔"

جس ہوائی جہاز میں ہم نے قدم رنجہ فرمایا وہ درمیانے سائز کا بوئنگ تھا۔ بس واجبی سا ہوائی جہاز تھا۔ فرش پر قالین کی جگہ میٹنگ ٹائپ کی کوئی چیز بچھی ہوئی تھی۔ سیٹوں کا رنگ بھی کتھئی تھا۔ گویا ہر چیز ہی نرالی تھی۔ عملے کا بھی یہی حال تھا۔ ایک بھی ائر ہوسٹس یونیفارم میں نہیں تھی۔ زیادہ اسمارٹ اور خوب صورت بھی نہیں تھیں۔ ان کا انداز بھی غیر رسمی سا تھا۔ پرواز کا اعلان ہوا۔ نیویارک سے واشنگٹن کا فضائی سفر ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے بلکہ کچھ کم ہی ہو گا۔ جیسے ہی جہاز نے پرواز شروع کی اور ضروری ہدایات کا اعلان ختم ہوا' ایک ائر ہوسٹس نے مسافروں کی خدمت میں کوکا کولا کا ایک ایک گلاس پیش کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ تو مدارات کی تمہید ہے۔ کھانے پینے کا اصل سامان بعد میں آئے گا کیونکہ اس زمانے میں لاہور سے اسلام آباد تک کی پرواز پر پی آئی اے چائے اور ایک پیسٹری سے تواضع کیا کرتا تھا مگر ڈیلٹا والوں نے ایک ایک گلاس کوک پر ٹرخا دیا۔ ہم لوگوں نے آپس میں خوب برائیاں کیں اور پی آئی اے کی دریا دلی کو یاد کرتے رہے۔ سچ پوچھیے تو یہ سفر ہمیں فضائی سفر ہی نہیں لگتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بس میں سفر کر رہے ہیں۔ ائر ہوسٹس خواتین کوکا کولا کے گلاس مسافروں کے ہاتھوں میں تھما کر غائب ہو گئی تھیں اور جب تک ہوائی جہاز کے لینڈ کرنے کا اعلان نہیں ہوا وہ لاپتا ہی رہیں۔

"شاید پارٹ ٹائم کام کرتی ہیں!" لبنیٰ نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

جواب ملا "جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں' کیا ہو سکتا ہے؟"

"غالباً یہ کسی کنجوس یہودی کی ائر لائن ہے۔ امریکا کا نام بدنام کر دیا۔"

مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ امریکا والوں کو اس چھوٹی موٹی بدنامی کی کوئی پروا نہیں

واشنگٹن پر جہاز کے اترنے کا اعلان ہوا تو ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ اب ہم واشنگٹن کی زمین پر قدم رکھنے والے تھے۔ دنیا کے سب سے امیر اور طاقتور ملک کے دارالحکومت میں لینڈ کرنے والے تھے جو ساری دنیا کی نگاہوں‘ امیدوں اور ناامیدوں کا مرکز ہے۔

ہوائی جہاز براہ راست ائرپورٹ کی عمارت تک جانے کے بجائے کافی فاصلے پر ایک جگہ رن وے پر رک گیا۔ کم سے کم امریکا کے دارالحکومت میں ہمیں ایسے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ ہوائی جہاز سے باہر نکلے تو ایک بہت بڑے سائز کی چیز سامنے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ نہ تو ہوائی جہاز تھا اور نہ ہی بس۔ یوں سمجھیے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی چیز تھی۔ ایک بے وردی ائرہوسٹس مسافروں کو اس میں بیٹھنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس کے اندر داخل ہوئے تو حیران رہ گئے۔ یہ ایک بے حد کشادہ اور تین چار بسوں کے برابر ایک ہی بس تھی۔ بالکل نئی چمکتی ہوئی۔ اندر قالین کا فرش تھا۔ سیٹیں بہت اچھی تھیں۔ مسافروں کے کھڑے ہونے اور سامان رکھنے کے لیے بھی کافی کھلی جگہ تھی۔ ہم نے ایسی بس پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس میں سوار ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک یقین نہیں آیا کہ ہم کسی بس میں سوار ہیں۔ اب کافی رات ہو چکی تھی کیونکہ نیویارک سے ہماری فلائٹ رات ہونے کے بعد ہی روانہ ہوئی تھی۔ موسم کافی خوش گوار تھا حالانکہ یہ گرمی کا زمانہ تھا۔ بس میں سوار مسافروں نے چپٹ چپٹ باتیں شروع کر دیں۔ اس میں ہنسی مذاق اور اونچی آواز میں گفتگو ہوتی رہی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ یہ جہاز نما بس ائرپورٹ ٹرمینل کے سامنے جا کر رک گئی۔

ائرپورٹ کی عمارت کے اندر داخل ہوئے تو جی خوش ہو گیا۔ بہت شاندار اور خوب صورت لاؤنج تھا اور واشنگٹن کے شایان شان۔ یہاں امیگریشن کا جھگڑا نہیں تھا۔ مسافر

سامان کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ ہم نے لاؤنج کا جائزہ لیا۔ فرش سے لے کر چھت تک ہر چیز چمک رہی تھی۔ اسٹاف بھی بہت چاق و چوبند تھا اور دستور کے مطابق وردیوں میں ملبوس تھا۔ سامان آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہمارے سوٹ کیس اور بیگ بھی بیلٹ پر گھومتے ہوئے پہنچ گئے مگر جب گنتی کی تو معلوم ہوا کہ ایک بیگ کم ہے۔ کچھ دیر انتظار کیا‘ یہاں تک کہ سارا سامان ختم ہو گیا۔ ہمیں بہت پریشانی ہوئی۔ ہمارے لیے امریکا میں سامان گم ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ نزدیک کھڑی ہوئی ایک خاتون کو ہم نے بیگ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔

وہ بڑے اطمینان سے بولیں "اوہ‘ کوئی بات نہیں۔ آپ میرے ساتھ آئیے۔"

ہال کے ایک کونے میں ایک لمبے قد اور بڑی سی توند والے امریکن ایک میز کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ خاتون نے ہماری پرابلم بتائی مگر ان کے چہرے پر تشویش یا شرمندگی کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے۔

انہوں نے ہم سے پوچھا "آپ کا بیگ کس شکل و صورت کا تھا؟"

اب ہم انہیں کیا بتاتے۔ ہم مصور تو تھے نہیں کہ تصویر بنا دیتے۔ پھر بھی مقدور بھر انہیں بتانے کی کوشش کی۔ وہ مسکرائے اور دراز میں سے کاغذ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کاغذ پر مختلف شکلوں کے سوٹ کیسوں اور بیگوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

"آپ کا بیگ ان میں سے کس شکل کا ہے؟" انہوں نے دریافت کیا۔

ہو بہو ہمارے بیگ کی شکل کا تو کوئی بیگ ان تصویروں میں موجود نہیں تھا۔ پھر بھی ہم نے بہت غور و خوض کے بعد ایک بیگ کی تصویر پر نشان لگا دیا۔

لبنیٰ اور بچیوں نے آپس میں کھسر پھسر کی اور لبنیٰ نے ہمارے کان میں کہا کہ یہ بیگ ہمارے بیگ سے مختلف ہے۔

"تو پھر۔ اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟"

ہم سب سوچ میں پڑ گئے۔ بار بار کاغذ پر بنے ہوئے خاکوں کا جائزہ لیتے رہے۔ توند والے امریکن مسکرائے اور پوچھا "کیا آپ اپنے بیگ کی صورت ہی بھول گئے ہیں؟"

"دراصل اسے دیکھے ہوئے بھی تو کافی وقت گزر گیا ہے اس لیے ذرا مشکل پیش آرہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں" انہوں نے ہمیں دلاسہ دیا "جو خاکہ اس سے زیادہ مشابہ ہے اس پر نشان لگا دیجئے۔"

کافی سوچنے کے بعد متفقہ طور پر ایک خاکے پر ہم نے نشان لگا دیا۔

"کوئی بات نہیں" وہ مسکرائے "اب ایسا کیجئے کہ اس بیگ کے تالے کی ایک چابی بھی مجھے عنایت کر دیجئے۔"

ہم ان کی صورت دیکھنے لگے۔

"آپ کے بیگ کی تلاشی بھی تو ہوگی نا۔ اس کے لیے چابی کی ضرورت ہوگی ورنہ تالا توڑنا پڑے گا۔"

ہم نے چابی ان کے حوالے کر دی۔

لیلٰی نے کہا "ایسے کہہ رہے ہیں جیسے ہمارا بیگ مل ہی جائے گا۔"

"کیوں نہیں ملے گا آخر یہ امریکا ہے۔" ہم نے مریل آواز میں کہا۔

"امریکا میں بھی سامان گم ہوتا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں یہ اس میں سے سامان ہی نہ نکال لیں۔"

توند والے صاحب ہماری گفتگو کا موضوع بھانپ گئے۔ بڑے وثوق سے کہنے لگے "کوئی بات نہیں۔ نیویارک ائرپورٹ پر سامان ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔ فکر نہ کیجئے۔" ان کا مشورہ نہایت معقول تھا۔ فکر نہ کرنا ہی ہمارے حق میں بہتر تھا کیونکہ فکر کرنے سے بھی کچھ حاصل نہ تھا۔

ہم نے اپنا باقی سامان ٹرالیوں پر لادا اور باہر کی طرف چل پڑے جہاں ہمارے دوست اکمل علیمی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی آگے بڑھ کر بڑے زور شور سے ملے، لیلٰی اور بچیوں کی خیریت دریافت کی۔ پوچھا "سفر تو اچھا گزرا؟"

"سفر تو اچھا گزرا مگر ایک بیگ گم ہو گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ نیویارک میں سامان گڑبڑ ہو ہی جاتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں" شاید امریکا والوں کا تکیہ کلام تھا۔

امریکا کا پہلا تاثر خاصا مایوس کن تھا۔ وہی مثل تھی کہ نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ کہاں امریکا' دنیا کا سب سے طاقتور سپر حیثیت رکھنے والا ملک جس کے بارے میں اگر جھوٹ بھی بولا جائے تو سچ ہی معلوم ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ امریکا کے بارے میں خوب جی بھر کے جھوٹ بولتے ہیں اور کوئی انہیں ٹوکتا بھی نہیں۔ ٹوکے بھی کیسے' آخر امریکا ہے' کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ وہ ایسا ملک ہے جہاں سب کچھ ممکن ہے۔ اچھائی اور برائی کی انتہا اسی خطہ زمین پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر پہلے ہی سفر میں ہمارا ایک سفری بیگ گم ہو جانا خاصا حیران کن تھا۔ انتظار حسین ہمارے ساتھ ہوتے تو اس پر یوں تبصرہ کرتے کہ "سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ بات بھی ٹھیک ہی تھی۔ امریکا جیسے ملک کے واشنگٹن یا نیویارک جیسے شہروں کے ائرپورٹ پر اگر کسی غریب الوطن کا سامان غائب ہو جائے تو اسے اندھیر نہیں تو اور کیا کہیں گے؟

حد تو یہ ہے کہ ہم کسٹم سے نکل کر باہر کی طرف جا رہے تھے تو ہماری بڑی بیٹی نادیہ نے ہم سے پوچھا "پاپا' امریکا ایسا ہوتا ہے؟"

"اور کیا!" ہم نے جواب دیا "ہوتا ہے نہیں' یہ امریکا ہی ہے۔ بلکہ امریکا ہی ایسا ہوتا ہے" ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ ائرپورٹوں کی چمک دمک اور شان و شکوہ کے رعب میں آگئی تھی۔

کہنے لگی "پھر ہمارے پاکستان میں کیا برائی ہے؟"

گویا اب وہ گہری سیاسی گفتگو فرمانے لگی تھی۔ ہم نے غور سے نادیہ کی طرف دیکھا اور کہا "کوئی برائی نہیں ہے ہمارے پاکستان میں' کون کہتا ہے کہ برائی ہے؟"

بولی "تھوڑی بہت تو ہے۔ وہاں تو ائرپورٹ پر سامان گم ہو جاتا ہے۔ دو تین بار آپ

کا سامان بھی گم ہو گیا تھا مگر یہ تو امریکا ہے اور ہم تو پی آئی اے سے بھی نہیں آئے۔"

اس نادان لڑکی کی معنی خیز باتوں نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کتنی ہی معصوم سہی، کم از کم اتنا ضرور جانتی تھی کہ پی آئی اے کے مسافروں کا سامان تو گم ہوتا رہتا ہے اور یہ کوئی فکر مندی کی بات نہیں ہے لیکن امریکا جیسے ملک میں ایک غیر ملکی ائر لائن میں سفر کرتے ہوئے مسافروں کا سامان گم ہو جانا واقعی حیرت انگیز بات تھی۔

بہرحال، ہم نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کر دیا کہ سامان تو ہر جگہ اور ہر ائر لائن میں گم ہو جاتا ہے۔ پی آئی اے تو بلا وجہ بدنام ہے۔ یہ بات قابل اطمینان تھی کہ واشنگٹن ائر پورٹ نے بچیوں کو مایوس نہیں کیا تھا۔ البتہ نیویارک اور واشنگٹن ائر پورٹ پر انہیں مختلف رنگوں، مختلف نسلوں اور مختلف شکلوں کے جو لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہوئے نظر آ رہے تھے وہ ایک نیا تجربہ تھا کیونکہ یورپ میں یہ منظر دیکھنے میں نہیں آتا۔ زیادہ تر گورے ہی ہوتے ہیں۔ اب جرمن گوروں کے بول چال کا انداز بھی ایسا ہوتا ہے کہ نہ جاننے والوں کے نزدیک وہ انگریزی ہی میں باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تھوڑے بہت کالے یا بھورے رنگ کے ایشیائی باشندے کبھی کبھار آٹے میں نمک کی طرح نظر آتے ہیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا مگر نیویارک پہنچتے ہی انہیں بھانت بھانت کی بولیاں اور رنگ رنگ کے لوگ نظر آئے تو بہت حیران ہوئیں۔ امریکا میں بھی گورے ہوتے ہیں مگر سب کے سب یورپی گوروں کی طرح نہیں ہوتے۔ مختلف ملکوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں آئے اور پھر آپس میں شادیاں کرتے رہے ہیں جس کے نتیجے میں ان میں اور یورپ کے گوروں میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ صورت شکل کے علاوہ بول چال اور عادت کے لحاظ سے بھی یہ ان سے مختلف ہیں۔ مثلاً یہاں لوگ بچیوں کو دیکھ کر مسکراتے بھی تھے اور "ہائی" کہہ کر مخاطب بھی کرتے تھے مگر یورپ میں یہ رواج نہیں ہے پھر کالے، سفید، سرخ، ہرے، براؤن، بادامی غرضیکہ مختلف رنگوں میں مل جاتے ہیں۔ کالے رنگ کے بال عام ہیں۔ آنکھوں کی رنگت کے سلسلے میں بھی یہی معاملہ ہے۔ بال آنکھوں والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اسی طرح بول چال میں بھی نمایاں فرق ہے۔ سب سے پہلی بات امریکیوں کی بے تکلفی اور رسمی انداز سے دوری ہے پھر ان کا لب و لہجہ اور تلفظ بھی یورپ والوں سے مختلف ہے۔ ہم جیسے لوگ جو ہوش سنبھالنے کے بعد تک

آکسفورڈ کی انگریزی یا انگلستان کے لب و لہجے کو حرف آخر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ان کے لیے امریکی لب و لہجہ بالکل مختلف ہے ویسے جناتی تو دونوں ہیں۔ انگریز اپنی انگریزی کو اٹک اٹک کر بولتے ہیں اور اسی طرح ٹکڑے کرتے ہیں کہ سمجھنا دشوار ہے۔ ادھر امریکی کون سے کم ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اور بولنے کا انداز انگریزوں سے قطعی مختلف ہے۔ مگر اتنا ہی ناقابل فہم بھی ہے۔ کئی مہینے تو ان کا تلفظ سمجھنے میں لگ جاتے ہیں۔ انگریزی اگر فقروں اور لفظوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے قیمہ بناتے ہیں تو یہ لوگ فقروں اور جملوں کو اس طرح لٹا دیتے ہیں کہ لگتا ہے استری کر دی ہے۔ ہر لفظ اور فقرہ لمبا اور لیٹا ہوا۔ اس پر ستم یہ کہ اکثر لوگ ناک سے غنغنی آواز نکالتے ہیں۔ ناک سے خارج ہونے والی یہ آواز کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تھوڑے دن بعد یہ انگروں کے مقابلے میں زیادہ بھلی لگنی شروع ہو جاتی ہے مگر پوری طرح سمجھ میں پھر بھی نہیں آتی۔ امریکیوں کی انگریزی سمجھنے کے لیے کسی کا محض انگریزی پڑھ لینا اور انگلستان میں چند ماہ رہ لینا کافی نہیں ہوتا۔ اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے ایک عمر نہیں تو نصف عمر ضرور درکار ہوتی ہے بلکہ ہم تو حیران ہوتے ہیں کہ امریکا کی مختلف ریاستوں اور علاقوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے کس زبان میں بات کرتے ہیں کہ گفتگو سمجھ سکیں۔ خیر، یہ مشکل تو انگلستان میں بھی کم نہیں ہے۔ اتنا چھوٹا سا ملک ہے لیکن تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد زبان اور لہجہ یوں بدل جاتا ہے جیسے گرگٹ رنگ بدلتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لیے اشاروں کی زبان استعمال کرتے ہیں، شاید!

ہماری اور بچیوں کی خوش قسمتی ہی سمجھئے کہ اللہ نے ہمارے ملک پر اپنا کرم کیا ہے اور امریکی فلمیں عرصہ دراز سے ہمارے سینما گھروں میں دکھائی جا رہی ہیں بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا جب اردو سینما گھروں میں بھی امریکی فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی سے قطعی نابلد، جاہل لوگ تو امریکیوں کی بے تکلفی، لڑکیوں کے فیشن، بے حیائی اور خوب صورت مناظر دیکھ دیکھ کر بالغ نظر ہو گئے اور انگریزی پڑھے لکھے حضرات سو ڈیڑھ سو فلمیں دیکھنے کے بعد اس قابل ہو گئے کہ کسی منظر کا مفہوم سمجھ سکیں۔ امریکی فلمیں دیکھنے کے فوائد کا احساس ہمیں امریکا جا کر ہوا۔ جن لوگوں نے ہماری طرح دور اندیشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور امریکی فلموں سے محروم رہے تھے وہ غریب چار چھ

مہینے تک تو اپنے مخاطب کا چہرہ ہی دیکھنے پر اکتفا کرتے ہیں اور ہونٹوں کی حرکت' ہاتھوں اور کاندھوں کی جنبش کو جمع تفریق کر کے مطلب اخذ کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں پھر رفتہ رفتہ کچھ نہ کچھ سمجھنے یا اندازہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ فلموں کے ذریعے تعلیم نہیں دی جا سکتی!

ہمارے سفری بیگ کے گم ہو جانے کا ہمیں اتنا غم نہیں تھا کیونکہ ہمیں یاد ہی نہیں تھا کہ اس میں کون کون سا سامان رکھا ہوا تھا لیکن بچیوں کو یہ بات بھلائے نہیں بھولتی تھی کہ ان کی گڑیاں' بالوں کے برش' اور ٹوتھ پیسٹ' برش اسی بیگ میں رکھے تھے۔ وہ بار بار ان گمشدہ اشیا کا تذکرہ کر کے امریکا کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھیں اور لیلیٰ انہیں بار بار یقین دلا رہی تھیں کہ فکر نہ کرو یہ تمام چیزیں امریکا میں بھی مل جاتی ہیں۔

واشنگٹن ائرپورٹ پر ہمیں امیگریشن والوں نے ذرا بھی تنگ نہیں کیا اس کے برعکس نہایت خوش دلی' خندہ پیشانی اور میزبانی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ہمارے پاسپورٹ کی موٹائی دیکھی پھر ہمارے دبلے پن کو ملاحظہ کیا۔ اس کے بعد دیکھا کہ ملک ملک کے ٹھپے ان پاسپورٹ پر لگے ہوئے ہیں اور امریکی قونصل نے ہمیں پانچ سال کا بار بار آمد و رفت کا ویزا بھی عنایت کر دیا ہے تو انہیں یقین آ گیا کہ یہ لوگ ہمارے ملک میں داخل ہو جانے کے بعد لاپتا ہونے اور برتن مانجھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور نہ ہی غالباً چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد گرین کارڈ طلب فرمانے لگیں گے لیکن سب سے حوصلہ افزا بات جو ہمارے حق میں گئی وہ ہمارا "فلم پروڈیوسر" ہونا تھا۔ ہمارے ملک میں فلم پروڈیوسر کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اب تو ہر ایرا غیرا فلم پروڈیوسر بن بیٹھا ہے مگر مغربی ملکوں اور امریکا میں ایسا نہیں ہوتا۔ فلم پروڈیوسر ہونا وہاں انتہائی عزت اور احترام کی نشانی ہے۔ معاشرہ ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ حکومت انہیں وی آئی پی سمجھتی ہے۔ اور تو اور' بڑے بڑے فلم اسٹار بھی ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ ان ہی دنوں ہم نے یہ خبر پڑھی تھی کہ جب امریکی صدر کو پتا چلا کہ ان کے ایک محبوب فلم پروڈیوسر (نام بتانا غیر ضروری ہے) شوٹنگ کے سلسلے میں واشنگٹن تشریف لائے ہیں تو وہ تڑپ اٹھے اور فوراً ہرکارے دوڑا دیے کہ مجھے ملاقات کا شرف ضرور بخشیں۔ پروڈیوسر بہت کم وقت کے لیے گیا تھا اور مصروفیات بہت زیادہ تھیں اس لیے عذر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صدر امریکا نے ان سے فون پر خود

بات کی اور کہا کہ حضرت' اگر بہت زیادہ مصروفیت ہے تو کم از کم صبح کا ناشتا ہی میرے ساتھ تناول فرمالیں۔ چنانچہ صبح ساڑھے چھ بجے ناشتے پر فلم ساز اور امریکی صدر کی ملاقات ہوئی۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ امریکا' امریکا ہے۔

خیر ہمیں امریکی صدر نے تو ملاقات کی دعوت نہیں دی مگر امیگریشن آفیسر نے ضرور خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پوچھا کہ کب تک قیام فرمانے کا ارادہ ہے؟ پھر یہ سوچتے ہوئے کہ اتنے بڑے ملک کو دیکھنے میں بھی کافی وقت لگے گا' کہے بغیر ہی ایک طویل المدت قیام کرنے کا ویزا عنایت فرما دیا۔

باہر ہمارے دوست اکمل علیمی ہمارے منتظر تھے۔ اکمل علیمی کو اس وقت امریکا میں قیام کیے ہوئے سترہ اٹھارہ سال گزر چکے تھے۔ جن دنوں ہم روزنامہ "آفاق" میں کام کرتے تھے اسی زمانے میں اکمل علیمی بھی اس اخبار میں وارد ہوئے تھے۔ انتظار حسین، ضیاء الاسلام انصاری اور برہان الدین حسن بھی ہمارے ساتھی تھے۔ برہان الدین حسن بعد میں ریڈیو پاکستان میں چلے گئے اور وہاں سے ٹیلی وژن کا رخ کر لیا تخلیقی شعبے سے تو وہ دور ہی رہے مگر انتظامیہ میں کافی بڑے عہدے حاصل کیے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ برہان الدین حسن نے اسی زمانے میں تازہ تازہ انگریزی ایم اے کیا تھا اور کسی دیسی آدمی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ویسے لباس وہ کرتہ پاجامہ اور شیروانی ہی زیب تن کرتے تھے اور پان بھی بڑے ذوق و شوق سے کھایا کرتے تھے مگر اس کے آگے ان کی انگریزیت کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ انتظار حسین اس وقت بھی بہت معروف افسانہ نگار تھے مگر برہان الدین حسن ان کے تذکرے پر بھی ناک بھوں ہی چڑھاتے رہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ اردو کے افسانہ نویس تھے۔ برہان الدین حسن میں ایک عدد خوبی یہ تھی کہ ان کے انداز بہت بزرگانہ اور مشفقانہ تھا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ چھوٹوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ انہیں بات بات پر ٹوکتے اور مشورے بھی دے دیا کرتے۔

"ارے بھائی، تمہیں نہیں معلوم" وہ مسکراتے ہوئے کہتے "یہ تم ہم سے پوچھو!"

جب اکمل علیمی "آفاق" کے عملہ ادارت میں شامل ہوئے اور برہان الدین حسن کو معلوم ہوا کہ وہ بھی ایم اے ہیں تو خاصے مرعوب اور متفکر سے ہو گئے جب پتا چلا کہ وہ اردو میں ایم اے ہیں تو طنزیہ انداز میں مسکرائے اور ایک لمبی سی "اونہہ" کر کے رہ گئے۔ برہان الدین حسن کو ان کے بزرگانہ رکھ رکھاؤ کے پیش نظر ہم نے "ماموں" کا خطاب دے

دیا تھا اور سارا دفتر انہیں "ماموں" ہی کہا کرتا تھا۔ اس پر وہ کبھی مسکرا کر چپ ہو جاتے اور کبھی شدید ناراضی کا اظہار بھی فرماتے لیکن دفتر کا چپڑاسی تک انہیں "ماموں" برہان الدین حسن صاحب کہا کرتے تھے۔ اسی طرح انتظار حسین کو ہم نے "چچا" کا لقب دیا تھا۔ ہر کوئی انہیں چچا یا چچا انتظار حسین کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ "چچا" کا لفظ ہر ایک کے منہ پر اتنا چڑھ گیا تھا کہ بعض اوقات ایڈیٹوریل اسٹاف کی انتہائی سنجیدہ میٹنگ میں بھی لوگ انہیں "چچا" کہہ کر مخاطب کر لیا کرتے تھے مگر انتظار صاحب نے کبھی اس بات کا برا نہیں مانا۔

۱۹۵۷-۵۶ کی بات ہے۔ انہیں اس چچا کے لفظ سے نفرت ہو گئی جب وہ دس سال بعد "مشرق" کے دفتر میں پہنچ گئے جہاں لڑکیاں بھی کام کرتی تھیں اور لڑکیوں نے بھی بے خیالی یا روانی میں انہیں "چچا" کہنا شروع کر دیا۔ اس وقت انہوں نے ہمیں بہت برا بھلا کہا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ واشنگٹن کے ائرپورٹ پر ماموں اور چچا کے تذکرے کا کیا محل ہے؟ بات یہ ہے کہ اکمل علیمی صاحب جو ہمیں ریسیو کرنے آئے تھے "آفاق" کے دنوں میں بہت سوچ سمجھ کر ہم نے انہیں "چھوٹے ماموں" کا خطاب دے دیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھوٹے ماموں مشہور ہو گئے۔ بعد میں ہم نے فلمی دنیا کی راہ لی، آفاق بند ہو گیا اور اکمل علیمی "امروز" میں اور پھر "پاکستان ٹائمز" میں چلے گئے۔ یہاں تک کہ وائس آف امریکا سے منسلک ہو کر واشنگٹن پہنچ گئے۔ ابھی تک اسی سے وابستہ ہیں اور اردو سروس میں ایک سینئر عہدے پر فائز ہیں۔ اکمل علیمی کئی بار پاکستان آئے اور ہم سے ملاقات بھی ہوئی۔ بعد میں ملاقات کم ہو گئی مگر ابتدائی زمانے کی دوستیوں کا نشہ پرانی شراب کی مانند ہوتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید نشہ آور ہو جاتی ہے۔

علیک سلیک اور گلے ملنے ملانے کے بعد خیریت دریافت کی گئی۔ رات ہو چکی تھی اور اکمل علیمی کافی دور سے ہمیں لینے کے لیے آئے تھے۔ یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا مکان ریاست ورجینیا کی پرنس چارلس کاؤنٹی میں "وڈ برج" میں تھا جو واشنگٹن ائرپورٹ سے لگ بھگ پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔

"سفر تو خیریت سے گزرا؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں مگر ہمارا ایک بیگ گم ہو گیا ہے۔"

"اوہو۔ خیر کوئی بات نہیں، نیویارک میں سامان اکثر گڑبڑ ہو جاتا ہے" انہوں نے

سرسری انداز میں کہا اور ٹرالی سمیت ہمیں لے کر ایک طرف چل دیے۔

ایک امریکی شہری کی زبان سے یہ سن کر ہماری خود اعتمادی بحال ہونے لگی کہ نیویارک میں بھی ائرپورٹ پر سامان گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ دراصل جب اپنی جیسی خرابیاں دوسروں میں بھی نظر آتی ہیں تو ایک نامعلوم سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ پتا نہیں یہ انسانی فطرت ہے یا ہم پاکستانیوں کی عادت ہے۔

اب ہم نے اکمل علیمی کی قیادت میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد بچیوں نے آہ و فغاں شروع کر دی تو ہمیں بھی احساس ہوا کہ ہم کافی دیر سے پیدل چل رہے ہیں۔

ہم نے اکمل علیمی سے پوچھا "کیا پیدل ہی جائیں گے؟"

بولے "ہاں۔ جانا ہی پڑے گا۔"

ہم نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا "کیا مطلب، یعنی آپ کے گھر تک؟"

وہ ہنسنے لگے "ارے نہیں، بس پارکنگ تک چلیں گے، زیادہ دور نہیں ہے۔"

ہمیں مغربی ملکوں کو پارکنگ کا علم ہو چکا تھا۔ یہ لوگ بھی خاصے فضول خرچ اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ کئی کئی منزلہ عمارتیں بنا کر انہیں محض کار پارکنگ کے لیے ضائع کر دیتے ہیں۔ کم از کم امریکیوں سے ہمیں اس اسراف کی توقع نہ تھی۔ ان سے زیادہ کفایت شعار اور سمجھ دار تو ہم لوگ ہیں۔ شہروں کی سڑکوں پر کاروں کا طوفان آیا ہوا ہے مگر پارکنگ کے لیے علیحدہ عمارتیں تعمیر کرنا تو ایک طرف، سڑکوں پر بھی پارکنگ کے لیے جگہ فضول ضائع نہیں کرتے۔ اتنی جگہ تجاوزات یا کسی دوسرے مفید مقصد کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے اور پلازا ...... ؟ پارکنگ کے لیے پلازا بنانے سے بہتر ہے کہ دوکانوں اور دفتروں کے لیے پلازا بنا دیا جائے۔ ضابطے کی رو سے اس پلازہ میں بھی زیر زمین کار پارکنگ تعمیر کرنی ضروری ہے مگر قاعدہ قانون کون پوچھتا ہے؟ نقشے میں تو کار پارکنگ بھی موجود ہوتی ہے مگر پلازہ کی تعمیر مکمل ہوتی ہے تو یہ جگہ بھی دکانوں اور ریستورانوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ البتہ فائلوں میں یہ بدستور کار پارکنگ ہی رہتی ہے۔ ایسی خیالی کار پارکنگ بلکہ بے شمار خیالی پلازے، سڑکیں، عمارتیں اور شہر وغیرہ ہمارے ملک میں قدم قدم میں پائے جاتے ہیں بقول شاعر

ہر چند ہیں کہ ہے، نہیں ہے

مختلف راستوں اور لفٹوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک جگہ پہنچ گئے جو کار پارکنگ تھی۔ نہایت معقول اور خوب صورت عمارت تھی۔ نظم و ضبط بھی خوب تھا اور صفائی ایسی کہ کاروں کے سوا گندگی نام کی کوئی چیز دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔

اکمل علیمی ہمیں ایک پک اپ ٹائپ کی کار کے پاس لے گئے۔ ایسی کاروں میں آسانی یہ ہے کہ بہت سارا سامان بھی سما جاتا ہے اور مسافر بھی جتنے چاہو بھر لو۔ امریکا میں یہ دستور ہے کہ ہر گھر میں پک اپ ضرور ہوتی ہے کیونکہ ان بے چاروں کو اپنا سامان وغیرہ بھی خود ہی ڈھونا پڑتا ہے۔ گڈے، ریڑھے وغیرہ وہاں ہوتے نہیں ہیں اور باربرداری کے لیے بہت زیادہ کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے بلکہ بعض حالات میں تو ڈھوئے جانے والے سامان کی قیمت سے زیادہ گاڑی کا بل بن جاتا ہے۔ وہ جو آپ نے سنا ہے کہ امریکا میں ایک ایک گھر میں کئی کئی گاڑیاں ہوتی ہیں تو کچھ غلط نہیں سنا۔ بات دراصل یہ ہے کہ گھر میں سبھی لوگ کام کرتے ہیں۔ شوہر اپنے کام پر جاتا ہے، بیوی بھی کام پر جاتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں اپنے کام پر جاتے ہیں۔ ٹین ایجر طلباء اپنے سکول جاتے ہیں۔ ہر ایک کو مختلف سمتوں میں جانا ہوتا ہے اور وقت مقررہ پر پہنچنا بھی لازم ہے۔ اس لیے کار کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہے۔ کار قسطوں پر مل جاتی ہے۔ پٹرول بھی قرض مل جاتا ہے۔ ڈرائیونگ لائسنس البتہ ذرا مشکل سے ملتا ہے مگر بالآخر مل ہی جاتا ہے۔ کار اور پٹرول کیا، وہاں تو سوئی سے لے کر مکان تک ہر چیز قرضے پر مل جاتی ہے۔ امریکیوں کی اس طرز زندگی کو دیکھ کر مرزا غالب صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا تو صرف مے ہی قرض لے کر پیتے تھے، یہاں امریکی تو ہر چیز ہی ادھار لے کر جیتے ہیں۔ ہم دیسی لوگوں نے وہ جو کہاوتیں بنائی ہوئی ہیں کہ "قرض محبت کی قینچی ہے" "آج نقد کل ادھار" وغیرہ، وہ سب امریکا پہنچ کر بے معنی لگتی ہے۔ امریکا ایک ایسا ملک ہے جس کا گزارا ہی ادھار لے کر اور ادھار دے کر ہوتا ہے۔ امریکیوں سے "ادھار" چھین لیا جائے تو یہ بے پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر مرجائیں گے۔ جیسے پرانے زمانے کی کہانیوں

میں جادوگروں کی جان کسی طوطے یا مرغ میں ہوتی تھی اسی طرح امریکیوں کی جان "قرض" میں ہے۔ بڑی قابل رحم حالت ہے اس قوم کی۔

واشنگٹن ائرپورٹ سے اکمل علیمی کے گھر تک کا راستہ کافی لمبا تھا۔ ہم آپس میں باتیں بھی کرتے رہے اور آس پاس کے مناظر بھی دیکھتے رہے۔ یہ راستہ ایکسپریس وے' انٹر اسٹیٹ اور اسی قسم کی بڑی شاہراہوں سے ہو کر گزرتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ ہم شہر کے ہنگاموں اور رونق سے دور تھے۔ امریکا میں سڑکوں کا نظام غالباً دنیا کا بہترین نظام ہے۔ یورپ میں بھی اب اسی قسم کی سڑکیں نظر آتی ہیں مگر غالباً یہ امریکا کی دین ہے۔ یعنی پہلے امریکا جانے والے یورپ کا علم اوز تجربہ لے کر امریکا گئے اور پھر امریکا کی دیکھا دیکھی یورپ والوں نے بہت سی کام کی باتیں اس نئے ملک سے سیکھ لیں۔ اس وقت تو خیر رات کا وقت تھا پھر بھی ان بڑی سڑکوں پر بھی ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ ٹریفک چار اور پانچ قطاروں میں چل رہا تھا۔ درمیان میں لوہے کی حد فاصل تھی اور دوسری جانب بھی ایسی ہی سڑک تھی۔ گویا دو رویہ ٹریفک تھا' نہایت قاعدے اور قرینے کا۔ اگر کسی کو دوسری قطار میں جانا ہو تو وہ پہلے اشارہ دیتا اور پھر جب دوسری کاریں فاصلے پر ہوتیں تو دوسری لین میں چلا جاتا۔ انٹر اسٹیٹ کو ہائی ویز بھی کہا جا سکتا ہے' یورپ میں انہیں موٹر ویز کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ان شاہراہوں پر عام سڑکوں کی مانند روشنیاں نہیں ہوتیں۔ سڑک کے ایک جانب خاصا چوڑا سڑک نما حصہ ہوتا ہے جس کا رنگ دیکھنے میں ہی عام سڑک سے مختلف نظر آتا ہے۔ اسے "شولڈر" کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ کندھا کر لیجیے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی ڈرائیور طویل سفر سے تھک جائے' آرام کرنا چاہے' طبیعت خراب ہو جائے یا پھر کار میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اپنی کار کو "شولڈر" پر کھڑی کر دے۔ شولڈر پر ٹریفک بالکل نہیں چلتا۔ انتہائی رش کے اوقات میں بھی شولڈر پر کار چلانا بہت بڑا جرم ہے۔ سڑک کے اس حصے کو ہنگامی حالات کے لیے وقف رکھا جاتا ہے۔ انتہائی رش کے عالم میں بھی اگر پولیس کار کو ایمرجنسی میں کہیں جانے کی ضرورت پیش آجائے تو وسیع و عریض سڑک پر ٹریفک جام ہونے کے باوجود پولیس کی کار بڑے آرام سے ہارن بجاتی ہوئی شولڈر کے راستے گزر کر آگے نکل جاتی ہے۔ شاہراہوں کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹیلی فون بوتھ بھی لگے ہوئے ہیں کوئی کار والا چاہے تو سکے ڈال کر یہاں سے فون کر سکتا ہے۔

اگر کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے یا کار خراب ہو جائے تو اس فون کو استعمال کر سکتا ہے۔ غرضیکہ مسافروں کی سہولت اور آسائش کے لیے کافی اچھا بندوبست کیا گیا ہے۔ ہمارے لیے تو یہ سب چیزیں خواب و خیال ہی تھیں۔ ہمارے ملک میں جس رفتار اور جس طور پر کام ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر ہمیں اس معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی نصف صدی کا وقت درکار ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ کوئی حکومت واقعی خلوص دل سے ایسے کاموں کا آغاز کرے۔ ورنہ جیسا ہے' جہاں ہے' کے اصول پر تو کام ہو ہی رہا ہے۔

رات کا وقت تھا۔ آس پاس خوب صورت لینڈ اسکیپ تھے۔ بلند و بالا درخت تھے' کہیں کہیں دور سے آبادی کی روشنیاں بھی نظر آجاتی تھیں۔ اس کے سوا بالکل خاموشی تھی۔ یہ خاموشی ہم نے اس وقت بھی دیکھی جب یہ دو رویہ سڑکیں کاروں سے ٹھسا ٹھس بھر جاتی تھیں اور ایک میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کیا مجال جو کوئی ہارن بجا دے یا بے تابی کا مظاہرہ کرے۔ سناٹا کوئی اچھی چیز نہیں ہے مگر اپنی سڑکوں کے بے ہنگم شوروغل کے مقابلے میں یورپ اور امریکا کی سڑکوں کا سناٹا بھی بہت بھلا لگتا ہے۔ اس راستے میں ہمیں یورپ کے شہروں کی طرح کوئی سرنگ وغیرہ بھی نظر نہیں آئی۔ ان سڑکوں کا اسرار ہم پر ان کی روشنی میں کھلا۔ رات کے اندھیرے میں اس کی خوبیاں اور باریکیاں ہمیں نظر نہیں آئیں۔ بہرحال اس طویل راستے میں ہمیں بارونق بازار اور چہل پہل سے بھرپور شہر کہیں بھی نہیں ملے اور ملتے بھی کیسے کہ انٹر اسٹیٹ' ایکسپریس وے اور ہائی وے' شہروں کے ہنگاموں سے بالا ہی بالا بنائی جاتی ہیں۔ راستے میں اکمل علیمی ہمیں امریکا اور واشنگٹن کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتے رہے۔ مثلاً انہوں نے یہ بتایا کہ ہم ورجینیا جا رہے ہیں۔

"ورجینیا؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا "مگر ہم تو واشنگٹن کے ائرپورٹ پر اترے تھے؟"

وہ ہنسنے لگے "واشنگٹن ڈی سی امریکا کا دارالحکومت ہے لیکن میں ورجینیا کی ریاست میں رہتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد جب ہم ایک دریا پر سے گزرے تو انہوں نے بتایا کہ اس دریا کا نام "پوٹومک" ہے۔ یہ وہ دریا ہے جس کے ایک جانب واشنگٹن ڈی سی ہے اور دوسری جانب

ریاست ورجینیا ہے۔ اس کے تیسری جانب ریاست میری لینڈ ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ دریائے پوٹومک کے ایک جانب ورجینیا ریاست ہے اور دوسری جانب ریاست میری لینڈ اور درمیان میں دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی ہے۔ وہ جتنی وضاحت سے ہمیں سمجھا رہے تھے ہم اتنا ہی الجھتے جا رہے تھے مگر کچھ عرصے بعد جب واشنگٹن میں ہماری آمدورفت روز مرہ کے معمول میں داخل ہو گئی تو سب کچھ ہماری سمجھ میں آگیا۔ ہم ورجینیا سے واشنگٹن جاتے اور دریائے پوٹومک کو عبور کرتے تو یوں لگتا جیسے لاہور میں مال روڈ جاتے ہوئے گلبرگ سے نہر کو عبور کر رہے ہیں۔ دریائے پوٹومک بھی خوب ہے۔ موسم گرما میں تو اس میں پانی رواں رہتا ہے مگر جاڑوں کے موسم میں اس کا پانی جم جاتا ہے اور برفیلی تہہ پر بچے اسکیٹنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چوڑی چکلی انٹر اسٹیٹ ہائی وے سے گزر کر جب ہم ایک نیم دائرے کی شکل مڑتی ہوئی سڑک سے گزر کر ایک اور عام سڑک پر پہنچے تو آس پاس کچھ عمارتیں شاپنگ سینٹرز اور آبادی نظر آنے لگی لیکن کوئی خاص رونق پھر بھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ دراصل امریکا کے شہروں کے سوا دوسرے نواحی علاقوں میں آبادی کم ہے اور زمین بہت لمبی چوڑی۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ جس طرح امریکی کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری اشیا بلاوجہ ضائع کرنے کے عادی ہیں اسی طرح وہ طویل طویل زمینیں بھی ضائع کرتے ہیں۔ قدرت نے اس ملک کو ایک لمبا چوڑا، نہایت وسیع علاقہ بخشا ہے۔ اس کے مقابلے میں آبادی بہت کم ہے۔ یورپ کے شہروں میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے شہروں کے مقابلے میں وہ ویران نظر آتے ہیں لیکن جب یورپ سے امریکا جاؤ تو پتا چلتا ہے کہ یہاں کے شہر خصوصاً نواحی آبادیاں تو بالکل سنسان ہیں۔

ایک لمبی سی دو رویہ سڑک پر سے گزر کر ہماری گاڑی نے بائیں جانب ٹرن لیا اور پھر ایک بل کھاتی ہوئی وسیع سڑک کا آغاز ہو گیا جس کے دونوں جانب خوب صورت مکان بنے ہوئے تھے۔ جیسے کہ عام طور پر امریکی فلموں میں نظر آتے ہیں۔ امریکا کی نواحی آبادیوں کی شکل و صورت قریب قریب ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ ایک ہی قسم کے مکان، آس پاس سامنے سرسبز لان، خوش رنگ پھول، مکانوں کے گیراجوں میں یا باہر سڑک پر کھڑی ہوئی کاریں مگر نہ آدم نہ آدم زاد۔ ان علاقوں میں سڑکوں پر چلتے پھرتے انسان بہت کم نظر آتے

ہیں۔ کاریں البتہ چلتی پھرتی رہتی ہیں۔ لوگ گھروں سے باہر بہت کم نکلتے ہیں، یہاں تک کہ بچے اور پالتو کتے تک گھروں کے اندر ہی دبکے بیٹھے رہتے ہیں۔ جس طرح بچوں کے کھیلنے کے اوقات مقرر ہیں۔ اسی طرح کتے بھی ہر وقت آوارہ گردی اور مٹرگشت کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ گویا ہر کام ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوتا ہے، خواہ مخواہ انسان ہو یا حیوان۔ سبھی اس اصول کی پابندی کرتے ہیں۔

ہم آس پاس کے پرسکون، خوبصورت اور صاف ستھرے گھروں کو دیکھ رہے تھے اور ان میں رہنے والوں کی قسمت پر رشک کر رہے تھے کہ اچانک کار ایک جگہ رک گئی۔ ہمارے دائیں جانب ایک نہایت خوبصورت اور بلند و بالا مکان نظر آ رہا تھا۔ سامنے دو اونچے اونچے سفید رنگ کے ستون تھے۔ اس طرز تعمیر کو "ہلٹو نین" انداز کہتے ہیں۔ مکانوں کی طرف تعمیر کا یہ فیشن بعد میں پاکستان میں بھی پہنچ گیا اور اب پاکستانی شہروں، خصوصاً لاہور کی نئی آبادیوں میں ایسے اونچے اونچے ستونوں والے "ہلٹو نین" مکانات کافی تعداد میں نظر آنے لگے ہیں۔ یہ مکان چاروں طرف سے سبزہ زار اور خوب صورت درختوں کے باغ سے گھرا ہوا تھا۔ نہایت ہی دلکش منظر تھا۔ آس پاس کوئی دوسرا مکان نہیں تھا اس لیے اور بھی زیادہ پرشوکت اور شاندار لگ رہا تھا۔

"یہ ہے میرا غریب خانہ" اکمل علیمی نے بڑی انکساری سے کہا اور ہم کبھی انہیں اور کبھی اس غریب خانے کو دیکھنے لگے۔ بھئی واہ، کتنا شاندار مکان ہے! مگر اس مکان کی مزید خوبیاں اس وقت آشکار ہوئیں جب کار کو سڑک پر ہی کھڑا کر کے ہم اپنا سامان اٹھا کر اس کے اندر داخل ہوئے۔ سارے گھر میں قالینوں کا فرش تھا۔ ایک راہداری سے گزر کر چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک طرف ڈرائنگ روم اور لاؤنج تھا۔ اس کے ساتھ ہی کھانے کا کمرہ تھا جس کے شیشے کی دیواروں میں سے اردگرد کا خوب صورت منظر نہایت خواب ناک سا لگ رہا تھا۔ ادھر ادھر کے مکانوں کی روشنیاں کھلونوں کی مانند نظر آرہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی خاصا بڑا کچن بھی تھا۔ گرمی کا موسم تھا مگر سارا گھر مکمل ائر کنڈیشنڈ تھا اس لیے بڑی فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ ڈرائنگ روم کے بالمقابل تین بیڈ روم تھے اور یورپ والوں کے مقابلے میں امریکیوں کی فضول خرچی بلکہ خرچی کا ایک ثبوت یہ تھا کہ ہر بیڈ روم کے ساتھ ایک باتھ روم بھی تھا۔ اس عیاشی کا یورپ کے لوگ بھلا کہاں تصور کر سکتے ہیں۔ وہاں تو گھر میں ایک اکلوتا باتھ روم ہوتا ہے جس کو استعمال کرنے والے صبح کے وقت بڑے صبر وسکون کے ساتھ قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔

اکمل علیمی قالینوں سے ڈھکی ہوئی چند سیڑھیوں سے اترنے کے بعد ہمیں مکان کے نچلے حصے میں لے گئے۔ امریکا میں ٹاؤن ہاؤس قسم کے گھروں میں اس تہ خانے کو بیس منٹ کہا جاتا ہے۔ بیس منٹ عام طور پر بچوں کے کھیلنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یا پھر بڑے یہاں ورکشاپ، دفتر یا لائبریری وغیرہ بنا لیتے ہیں۔ اس بیس منٹ میں بھی دو بیڈ روم تھے اور ان کے ساتھ بھی اٹیچڈ باتھ روم تھے۔ ایک ڈرائنگ روم بھی تھا اور گیلری بھی۔ یہ تمام جگہ بھی قالینوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ضرورت کے مطابق تمام فرنیچر بھی یہاں موجود

تھا۔ امریکا میں جب کوئی مکان خریدتا ہے تو فرش پر قالین، کھڑکیوں کے پردے، کچن میں تمام برتن، فریج، کٹلری، چولہا، ڈش واشر، وغیرہ اور ڈرائنگ روم میں فرنیچر عام طور پر گھر کے ساتھ ہی مل جاتا ہے بلکہ اگر مکمل ائر کنڈیشنڈ ہو تو ائر کنڈیشننگ پلانٹ بھی اس کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے۔ اکمل علیمی نے تہ خانے کے دو بیڈ روم ہمارے حوالے کر دیے اور مطلع کیا کہ نیچے کا ڈرائنگ روم بھی ہم اپنے استعمال میں رکھ سکتے ہیں۔ ان کے دو ٹین ایجر بیٹے چند روز پہلے ہی پاکستان سے امریکا پہنچے تھے اور مکان کے بالائی حصے کے تینوں بیڈ رومز ان تینوں کے زیر استعمال تھے۔ کھانا تو ہم نے کھا ہی لیا تھا لیکن چائے کا ایک دور چلنا بہت ضروری تھا۔ بچیوں کو ان کے کمرے میں سونے کے لیے چھوڑا اور ہم لوگ اوپر کے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ اکمل علیمی چائے پیش کر کے ہماری تواضع کرنا چاہتے تھے مگر لبنیٰ نے فوراً کچن کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انہیں مطلع کر دیا کہ دیکھئے جناب، گھر میں ایک مشرقی عورت کے ہوتے ہوئے مردوں کے کھانا پکانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کچن میں ضرورت کا سارا سامان موجود تھا۔ لبنیٰ نے چائے بنانی شروع کی اور ہم دونوں نے باتیں شروع کر دیں۔ اکمل علیمی نے مختصر طور پر مقامی حالات کے بارے میں بتایا اور ہم نے انہیں بتایا کہ ہم کچھ مدت امریکا میں قیام کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ فلموں یا ٹیلی ویژن میں مناسب موقع تلاش کریں گے۔

اکمل علیمی نے ہمیں نہایت معقول مشورہ دیا "آپ ابھی کچھ دن آرام کیجئے اور یہاں کے حالات اور ماحول سے واقفیت حاصل کیجئے۔ یہ ایک نئی سرزمین بلکہ بالکل نئی دنیا ہے۔ امریکا کے طور طریقے جاننے کے لیے بھی کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔"

لبنیٰ نے چائے کے مگ لا کر رکھ دیے تھے۔ ہم لوگ کچھ دیر گپ شپ کرتے رہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ اکمل علیمی کو بہت سخت نیند آرہی ہے اور وہ بار بار چھوٹی جماہیاں لے رہے ہیں۔

"بھئی لگتا ہے کہ آپ کو نیند آرہی ہے، اب جا کر سو جائیے۔"

بولے "لگتا ہے نہیں، واقعی آرہی ہے۔ صبح ساڑھے چار بجے پھر اٹھنا ہے۔"

"نماز کے لیے؟" ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ ہمیں آج تک معلوم نہیں ہوا تھا کہ اکمل علیمی فجر کی نماز بروقت پڑھنے کے عادی ہیں۔

"نماز کے لیے نہیں، دفتر جانے کے لیے" انہوں نے وضاحت کی۔

"دفتر! اور صبح ساڑھے چار بجے!" ہم واقعی حیران ہو گئے۔

کہنے لگے "آفاقی صاحب، مجھے صبح ساڑھے سات بجے دفتر پہنچنا ہوتا ہے۔ یہ امریکا ہے، یہاں دیر سے دفتر یا کام پر پہنچنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر باس بھی دس منٹ لیٹ ہو جائے تو اس کی سیکریٹری ریکارڈ بک میں لکھ دیتی ہے۔ مجھے یہاں سے واشنگٹن ڈی سی جانا ہوتا ہے۔ رش کے اوقات میں دو پونے دو گھنٹے کا سفر ہے۔ صبح اٹھ کر تیار ہوتا ہوں۔ ناشتا کرتا ہوں پھر یہاں سے ایک فرلانگ تک پیدل چل کر بس اسٹینڈ پر جاتا ہوں۔"

"مگر آپ کے پاس تو دو کاریں ہیں!"

وہ ہنسنے لگے "ہیں تو مگر واشنگٹن میں کار پارکنگ ایک بڑا مسئلہ ہے اور چار پانچ ڈالر روزانہ کا خرچہ بھی ہے۔ دوسرے کار سے سفر میں زیادہ دیر لگ جاتی ہے۔ جگہ جگہ ٹریفک جام ہوتا ہے۔ بس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اپنی مخصوص سڑک پر بے روک ٹوک رواں دواں رہتی ہے۔ اس لیے کار کے مقابلے میں جلدی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔"

یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی مگر سوچا کہ مقامی حالات کے بارے میں اکمل علیمی کی معلومات یقیناً ہم سے زیادہ ہیں، وہ کئی سال سے وہاں آباد تھے اور ان کو زمانے بھر کی باتیں معلوم تھیں۔ اس لیے ان کی صداقت پر یقین کرنا لازمی تھا۔

"دیکھیے، آپ آرام سے سوئیے۔ صبح جب جی چاہے اٹھیے۔ گھر میں کھانے پینے کا تمام سامان موجود ہے۔ عاطف اور آصف بھی گھر پر ہی ہوں گے۔ آج کل ان کی اسکول سے چھٹی ہے۔ وہ آپ کو ہر قسم کی معلومات فراہم کر دیں گے بلکہ آس پاس گھما بھی دیں گے۔ انہیں آپ کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ کہا اور جماہیاں لیتے ہوئے، جھومتے جھامتے 'شب بخیر' کہہ کر اپنے بیڈ روم کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈائننگ روم کی شیشے کی دیوار سے باہر کا منظر اتنا حسین تھا کہ ہم کچھ دیر وہیں بیٹھے اس خوابوں کی سرزمین کو دیکھتے رہے۔ خاموشی، ویرانی اور سناٹے کے سوا ہمیں یہاں کی ہر چیز بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اکمل علیمی پاکستان آتے جاتے رہتے تھے اور ان سے ملاقاتیں بھی رہتی تھیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ وائس آف امریکا میں معقول تنخواہ

ملازم ہیں مگر یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے عیش و عشرت میں رہتے ہوں گے۔ دو دو کاریں، پانچ کمروں کا نہایت شاندار گھر جس کے چاروں طرف وسیع باغ تھا۔ گھر میں سجاوٹ کا تمام سامان اور اس پر مکمل ائر کنڈیشنڈ۔ بھئی واہ! کیا ٹھاٹ ہیں! واقعی امریکا، امریکا ہے۔

ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ ذرا گھر سے باہر نکل کر آس پاس گھومیں پھریں۔

"اتنی گھبراہٹ کس بات کی ہے؟" لبنیٰ نے خالص بیویوں کے انداز میں کہا "یہ سب چیزیں کہیں بھاگ تو نہیں جائیں گی۔ صبح بھی آپ کو یہیں مل جائیں گی۔"

بات یہ بھی معقول تھی مگر مارے اشتیاق کے نیند آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔ ہم سونے سے پہلے بہت دیر تک اس ملک کے بارے میں سوچتے رہے جو اپنی دولت مندی اور مہربانیوں کے باعث ساری دنیا میں مشہور ہے۔ دنیا بھر کے لوگ طالع آزمائی کے سلسلے میں اس نئی دنیا میں پہنچ کر خوشحالیاں اور خوشیاں حاصل کرتے ہیں تو پھر ہم نے یہاں پہنچنے میں اتنی دیر کیوں کر دی؟

دوسرے دن بیدار ہوئے تو دن نکل چکا تھا۔ اکمل علیمی حسب معمول دفتر روانہ ہو چکے تھے اور ان کے دو صاحب زادے اوپر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کھڑکیوں سے باہر جھانکنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی مسکرا کر سلام کیا۔ بڑے کا نام عاطف اور چھوٹے کا نام آصف تھا۔ ایک کی عمر چودہ سال اور دوسرے کی بارہ سال ہو گی۔ وہ دونوں بھی کچھ عرصے قبل ہی پاکستان سے امریکا پہنچے تھے مگر اس ملک کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ بہت سے معاملات میں وہ ہمارے لیے رہنما اور گائیڈ ثابت ہوئے۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ ان دونوں نے ناشتا کر لیا تھا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ جب تک ہم لوگ وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں وہ ناشتہ خود نہ بنایا کریں بلکہ ہمارے ساتھ ہی ناشتا کیا کریں۔ ویسے تو وہ دونوں بہت ملنسار اور خوش اخلاق تھے مگر اس دعوت نے انہیں بہت جلدی بے تکلف کر دیا۔ لبنیٰ نے جب پراٹھے اور انڈوں کا آملیٹ بنایا تو ہمارے اصرار پر وہ بہت گرم جوشی سے دوبارہ ناشتہ کرنے پر آمادہ ہو گئے اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہوں نے ہمیں بہت سی معلومات فراہم کیں، خاص طور پر آس پاس کے ماحول اور لوگوں کے بارے میں۔

پھر وہ ہمارے ساتھ گھر سے باہر نکلے۔ دن کی روشنی میں کچھ اور ہی سماں نظر آیا یوں سمجھئے

کہ اگر رات کے وقت وہ سب خواب نظر آرہا تھا تو اب ٹھوس حقیقت میں ڈھل چکا تھا۔ اس وقت ان کا مکان پہلے سے زیادہ خوب صورت اور بارعب نظر آیا۔ آس پاس کے باغ کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ مہینے میں کسی ایک چھٹی کے دن وہ سب مل کر اس کی تزئین اور صفائی کرتے ہیں۔ سوکھے ہوئے پتوں اور کوڑا کرکٹ کو اکٹھا کر کے پلاسٹک کی بوریوں میں بند کرتے ہیں۔ باغبانی بھی خود کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باغ میں پھولوں کی زیادہ بہتات نہیں تھی کیونکہ اکمل علیمی کو باغ کی جانب توجہ دینے کی فرصت بہت کم ملتی تھی اور دونوں لڑکوں کو باغبانی کا خاص شوق نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ امریکا میں رہنے کی قباحتیں ہم پر آشکار ہونے لگی تھیں۔ نوکر نام کی چیز وہاں عنقا تھی۔ کوئی بہت زیادہ دولت مند اور آرام طلب شخص ہی نوکر رکھنے کی عیاشی گوارا کر سکتا تھا' پتا چلا کہ نوکروں کے نخرے اور مطالبات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اسی لیے عام طور پر گھریلو ملازم نام کی چیز سے وہ لوگ آشنا ہی نہیں ہیں۔ ہر کام خود کرنا پڑتا ہے۔ چھٹی کے دن بجائے آرام کرنے کے گھر کی صفائی' سودا سلف کی خریداری' کار کی صفائی اور مرمت' کپڑوں کی درستی' باغ کی آرائش اور ذاتی خطوط لکھنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آرام اور سیر و تفریح کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو جو آسائشیں اور لوازمات حاصل ہیں' ان سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر جب ہم نے اکمل علیمی کو ان کے باغ کی خوب صورتی اور مکان کی خوبیوں کے بارے میں بتایا تو وہ بڑی کاہلی سے مسکرائے اور بتایا کہ ہفتوں تک وہ اپنے گھر کے باغ کو دیکھ تک نہیں سکتے۔ صبح منہ اندھیرے گھر سے نکلتے ہیں اور اندھیرا پھیلنے کے بعد واپس لوٹتے ہیں۔ باغ میں کتنے پھول کھلے ہیں اور خوب صورت درخت اور پودے کس حال میں ہیں' یہ دیکھنے کا موقع انہیں بہت کم ہی نصیب ہوتا ہے' اس سے لطف اندوز ہونا تو دور کی بات ہے۔ اسی طرح اس پانچ کمروں کے وسیع و عریض' خوب صورت سجے ہوئے مکان کا بھی ان کے نزدیک صرف اتنا ہی مصرف تھا کہ رات کو وہاں آکر سو جائیں۔ یہ ساری خوب صورتیاں اور سہولتیں جو ان کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں ان کے لیے بس معمول میں داخل تھیں۔ انہیں انجوائے کرنے کا ان کے پاس وقت تھا نہ مہلت۔ ان ہی کا نہیں' دوسرے لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ بس زندگی مسلسل بھاگ دوڑ' حرکت' محنت اور جاگنے کا نام تھا۔ ان کی نیند بھی

مشکل سے پوری ہوتی تھی۔ اتنے سویرے بیدار ہو کر اتنی لمبی مسافت طے کر کے دفتر پہنچنا' سارا دن پوری توجہ اور تندہی سے کام کرنا اور پھر لمبا سفر طے کر کے رات پڑے واپس گھر پہنچ کر کھانے پینے کا بندوبست کرنا' اس کے بعد مشکل ہی سے وقت بچتا تھا۔ ذاتی ڈاک بھی اسی وقت دیکھی جاتی تھی' گھریلو مسائل حل کرنے کا بھی یہی وقت تھا' گھر کے کام کاج بھی سونے سے پہلے پورے کرنے پڑتے تھے' کسی دوست کا فون آجائے تو گفتگو کرنے کا بھی یہی وقت تھا۔ ضروری چیزوں کی خریداری کے لیے قریبی "سیون الیون" اسٹور یا نزدیکی شاپنگ سینٹر کا چکر لگانے کا بھی اس کے سوا کوئی دوسرا وقت نہیں تھا۔ کھانا پکا کر کھانا' برتن صاف کرنا' اور اسی دوران میں کچھ دیر کے لیے ٹیلی وژن دیکھ لینا۔ یہاں تک کہ ٹیلی وژن کی خبریں سنتے وقت ان کی آنکھیں قریب قریب بند ہونے لگتی تھیں اور وہ جماہیاں لیتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلے جاتے تھے۔

ہم نے دیکھا کہ "جماہیاں لینا" امریکیوں کا قومی مشغلہ ہے۔ کہیں بھی دیکھ لیجئے منہ پھاڑ پھاڑ کر جماہیاں لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر وقت ایک غنودگی اور نیم خوابی کا عالم ان پر طاری رہتا ہے۔ بس میں' انڈر گراؤنڈ ٹرین میں' کار میں' دکانوں' دفتروں میں' ریستورانوں اور سینما گھروں میں' باغوں میں اور تفریح گاہوں میں جہاں بھی دیکھیے وہ جماہیاں لینے میں مصروف نظر آتے ہیں اور اس میں مرد عورت کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ البتہ ہر ایک کی جماہی لینے کے انداز میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ عورتیں نزاکت کے ساتھ نیم باز اور نیم خواب آنکھوں کو مسکرا کر حرکت دیتی ہیں اور منہ پر بڑی نزاکت سے ہاتھ رکھ کر جماہی لیتی ہیں' مرد حضرات اس قسم کے تکلفات نہیں پالتے۔ اور پھر کسی لاگ لپٹ کی ضرورت بھی کیا ہے جب کہ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ یعنی جسے دیکھیے جماہیاں لینے میں مصروف ہے۔ یہ سب ان کے رت جگوں کا ثمر ہے۔ کام کاج اور مصروفیات کے باعث کسی کی نیند پوری نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صرف ایک ہی کام یا نوکری کرے تو بھی دن کے بارہ تیرہ گھنٹے اس کی نذر ہو جاتے ہیں۔ آٹھ گھنٹے کام میں اور دو تین گھنٹے گھر سے وہاں تک آمد رفت میں لگتے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے آپ ایک سے زائد "جاب" کرتے ہیں یا کرتی ہیں تو پھر اٹھارہ بیس گھنٹے کے بعد تھکے ماندے گھر میں داخل ہو کر اپنے سارے کام خود ہی نمٹانے ہوتے ہیں اور اگلے دن پھر وہی کولہو کے بیل کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی کبھار کچھ دیر

ٹیلی ویژن دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ پسندیدہ فلم یا کوئی من پسند پروگرام آرہا ہو تو نیم باز
آنکھوں سے اسے دیکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

امریکا میں ٹیلی ویژن کے مختلف چینل چوبیس گھنٹے پروگرام نشر کرتے رہتے ہیں پھر ایک
کیبل ٹی وی چینل بھی ہے جس کے ذریعے ہر ماہ گھر بیٹھے آپ تازہ فلمیں بھی دیکھ سکتے
ہیں۔ اس کے لیے ہر ماہ کچھ ڈالر ادا کرنے ہوتے ہیں۔ آس پاس حسن و جمال اور دلچسپیاں
بکھری پڑی ہیں۔ تفریحات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر چیز دیکھنے کے قابل ہے مگر وقت کس
کے پاس ہے۔ نیند ہی پوری نہیں ہوتی۔ لہٰذا جماہیوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کار چلاتے
ہوئے بھی لوگ جماہیاں لینے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ایک نیم خوابیدگی کا سا عالم ہر لمحے
ان پر طاری رہتا ہے۔ دنیا کی ہر نعمت موجود ہے لیکن اسے دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔
یہ ایک عام امریکی کی زندگی کا چلن ہے۔

عاطف نے ہمیں کچھ فاصلے پر واقع "سیون الیون" اسٹور دکھایا۔ اسے آپ ذرا اعلیٰ
قسم کی پرچون کی دکان کہہ سکتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ نہایت صاف ستھری اور سجی ہوئی
ہوتی ہے اور یہاں روزمرہ استعمال ہونے والی چھوٹی موٹی ہر چیز مل جاتی ہے۔ یہ اسٹور
چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ کھانے پینے اور استعمال کی اشیا کے علاوہ ادویات' اسٹیشنری'
سامان' سوئی تاگا' جوتے سبھی چیزیں یہاں دستیاب ہیں۔ اور تو اور گرم کافی اور ڈونٹ
ناشتہ کر لیجیے۔ ڈونٹ ایک خالص امریکی چیز ہے۔ اسے کیک' بسکٹ اور پیسٹری کی مخلوط نسل
کہہ لیجیے۔ اس کا ذائقہ بھی مخصوص ہوتا ہے۔ امریکی بہت ذوق و شوق سے کھاتے ہیں
خصوصاً ناشتے میں اس کا استعمال عام ہے۔ صبح کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو سیون
الیون کی طرف ہو لیے۔ دو ڈونٹ کھائے' ایک کاغذی گلاس میں کافی لے کر نوش کی اور
لیجیے ناشتہ ہو گیا۔ اگر زیادہ جلدی میں ہیں تو کافی کا گلاس ہمراہ لے کر کار میں سوار ہو
جائیے۔ اس سے سستا اور فوری ناشتہ ممکن نہیں ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے سیون
الیون اسٹور امریکیوں کی بنیادی ضرورت بن کر رہ گئے ہیں بلکہ یہ امریکی کلچر کا ایک لازمی
حصہ ہیں۔ اس قسم کے اور اسٹور بھی رفتہ رفتہ عالم وجود میں آگئے ہیں مگر سیون الیون والی
بات کسی اور میں کہاں؟ یہ ضرور ہے کہ سیون الیون میں چیزیں ذرا زیادہ قیمت پر ملتی ہیں
مگر سہولت کے پیش نظر یہ اضافہ کچھ محسوس نہیں ہوا۔ یہ سہولت کیا کم ہے کہ دن رات

میں کسی بھی وقت دور دراز علاقوں میں رہنے والے اپنی کار میں سوار ہو کر زیادہ سے زیادہ
پانچ سات منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اپنی ضرورت کی ہر چیز حاصل کر سکتے ہیں' سیون
الیون مور و ملخ کی طرح امریکا کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر شہر اور آبادی میں سیون
الیون موجود ہیں۔ یہ ایک طویل سلسلہ ہے جسے لامتناہی سمجھ لیجیے۔ شیطان کی طرح یا خضر
کی مانند آپ کا ہر جگہ ان سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔

ہمیں یہ سسٹم بہت پسند آیا۔

آس پاس کے علاقوں میں چہل قدمی کرنے کا موقع ملا تو سڑکیں کشادہ، فٹ پاتھ صاف ستھرے اور مکانوں کے سرسبز و شاداب لان بڑی نفاست سے رکھے ہوئے پائے۔ یہ بات بہت پسند آئی کہ جو بھی سامنے سے گزرا، مسکرا کر "ہائی" کہے بغیر نہیں گزرا۔ اس میں عورت مرد یا بچے کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یورپ خصوصاً انگلستان کے ریزرو اور چپ رہنے والے لوگوں کے مقابلے میں امریکیوں کی یہ بے تکلفی اور گرم جوشی نمایاں طور پر متاثر کرتی ہے۔

ہم گھر کے سامنے والے لان میں کھڑے تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لے رہے تھے، بچیاں لان میں ٹہل رہی تھیں۔ لبنیٰ پھولوں کا جائزہ لے رہی تھیں کہ اچانک ایک کراری سی آواز سنائی دی "ہائی!"

پلٹ کر دیکھا تو ایک اونچی، موٹی تازی سیاہ فام خاتون کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

اس اثنا میں اتنا تو ہم بھی سیکھ گئے تھے کہ جس طرح السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جاتا ہے اسی طرح "ہائی" کے جواب میں "ہائی" کہنا چاہیے۔ یہ بتانا تو شاید ضروری نہیں کہ ہائی ایک طرح سے ہیلو کا مخفف یا بگڑی ہوئی شکل ہے اور امریکا میں ہائی کے جواب میں بھی ہائی کہنا لازمی ہے۔ اس کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا یعنی ہائی کہے اور سنے بغیر۔ شروع شروع میں تو یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے مگر پھر رفتہ رفتہ امریکا کی دوسری چیزوں کی طرح اس کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔

ہم نے بھی جواب میں اٹکتے اٹکتے کہا "ہائی میڈم" مگر کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ انہوں نے مخصوص امریکی لب و لہجے میں اپنی کراری آواز میں پوچھا "آپ لوگ اس گھر میں نئے آئے ہیں؟"

ہم نے انہیں بتایا کہ ہم کچھ دن کے لیے مہمان آئے ہیں۔ مالک یا کرائے دار نہیں ہیں۔

"کہاں سے؟"

"پاکستان سے۔"

"اوہ، خیر۔ کوئی بات نہیں۔ میں آپ کے برابر والے اس مکان میں رہتی ہوں"

انہوں نے بازو والے گھر کی جانب اشارہ کیا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" اس کے سوا ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہیں۔

انہوں نے فوراً مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور ہم سب سے ہاتھ ملایا۔

"میں اپنے کتے کو تلاش کر رہی ہوں۔ بہت شیطان ہے۔ موقع پاتے ہی گھر سے نکل بھاگتا ہے مگر اس کی وجہ سے دل لگا رہتا ہے۔ دراصل میں کوئی جاب نہیں کرتی" انہوں نے جلدی جلدی ہمیں معلومات فراہم کیں پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر نہایت باریک آواز میں پکارا "جیک، جیک۔"

ہم بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ اس امید پر کہ شاید جیک صاحب آسمان کے راستے تشریف لانے والے ہیں مگر ہمیں بائیں جانب سے ایک باریک سی آواز میں جیک کی جوابی پکار سنائی دی۔ اسے آپ بھونکنا تو نہیں کہہ سکتے البتہ زیادہ سے زیادہ بھونکنے کی پیروڈی کہہ سکتے ہیں۔ نہایت باریک سی آواز میں انہوں نے دو بار "بخ بخ" کہا اور دم ہلاتے ہوئے ایک جانب سے برآمد ہو گئے۔ شاید وہ کسی باڑھ وغیرہ میں چھپے ہوئے تھے یا ٹوائلٹ سے فارغ ہو رہے تھے۔ جوں ہی ان کی مالکن نے آسمان کی جانب سر اٹھا کر آواز دی وہ بھاگم بھاگ چلے آئے لیکن آسمان کی جانب منہ اٹھا کر آواز دینے کی مصلحت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

جیک کو دیکھا تو عبرت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ جس طرح ان کے بھونکنے کے انداز پر بھونکنے کی پیروڈی کا گمان گزرا تھا۔ اسی طرح انہیں دیکھ کر بھی یہ خیال آتا تھا کہ ان کو کتے کے بجائے کتا نما کہنا زیادہ مناسب ہے۔ شکل و صورت تو ان کی کتوں جیسی ہی تھی یعنی چار ٹانگیں، دو کان، ایک دم، ایک عدد تھوتھنی لیکن اس کے بعد ان میں اور کتے سے مشابہت ختم ہو جاتی تھی۔ ہم کافی غور کرتے رہے کہ وہ کتے کی کون سی نسل سے ہو سکتے

ہیں۔ یوں سمجھیے کہ وہ بھیڑ، بکری، بلی اور کتے کا ملغوبہ تھے۔ رنگ ان کا اپنی مالکن کی طرح سیاہ تھا۔ قد میں وہ زمین سے پانچ انچ سے زیادہ بلند نہیں تھے۔ خان صاحب ہوتے تو کہتے کہ یہ کتا سطح سمندر سے صرف چار انچ بلند ہے۔ بہرحال، یہ تو ٹیکنیکل معاملہ ہے لیکن ان کی اونچائی پانچ انچ سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ قد میں جو کمی واقع ہوئی تھی اسے پوری کرنے کے لیے قدرت نے انہیں لمبائی میں کچھ زیادہ ہی کھینچ دیا تھا۔ تھوتھنی سے لے کر دم تک ان کی لمبائی ایک فٹ سے زیادہ ہی تھی۔ پتا نہیں وہ درحقیقت کتے ہی تھے یا کسی اور مخلوق سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کے نمودار ہوتے ہی ان کی مالکہ نے فرط محبت سے آگے بڑھ کر انہیں گود میں اٹھا لیا اور انہوں نے بھی اظہار محبت کے طور پر ان کا منہ چاٹنا شروع کر دیا۔ سنا تھا اور کتابوں میں پڑھا بھی تھا لیکن کسی کتے کو انسان کا منہ چاٹتے ہوئے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ واقعی انسان زندگی میں ہر قدم پر کچھ نہ کچھ دیکھتا اور سیکھتا ہی رہتا ہے۔

کتے نے نہایت باریک سروں میں منہ سے کچھ آوازیں نکالیں جنہیں سن کر ان کی مالکہ نے بھی اسی قسم کی آوازوں میں جواب دیا اور پھر ہماری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی اپنے ٹاؤن ہاؤس کی جانب رخصت ہو گئیں۔ اس قسم کے علیحدہ علیحدہ مکانات کو امریکا میں ٹاؤن ہاؤس کہا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ شہری آبادیوں میں کم اور نواحی قصبہ نما آبادیوں میں زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے لیکن چونکہ امریکیوں نے اس قسم کے گھروں کو "ٹاؤن ہاؤس" کا نام دے دیا ہے اس لیے اب دنیا بھر میں ٹاؤن ہاؤس بننے شروع ہو گئے ہیں۔ خود ہمارے شہروں میں آپ کو کافی تعداد میں ٹاؤن ہاؤس نظر آئیں گے۔

ہم نے عاطف سے پوچھا "یہ خاتون کون ہیں اور ان کے شوہر کیا کرتے ہیں؟"

عاطف نے کہا "انکل، ان کے شوہر بلیک ہیں۔ ان کے پاس دو کاریں ہیں۔ کوئی بچہ نہیں ہے۔ شوہر کوئی جاب کرتے ہیں شاید، کیونکہ ہر روز صبح کار میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ کوئی کام کاج نہیں کرتیں گھر ہی میں رہتی ہیں یا پھر ہمارے گھر کے پچھواڑے سے ان کے باغ کا جو حصہ نظر آتا ہے وہاں یہ جھولا جھولتی رہتی ہیں۔ وہ بڑا سا صوفہ نما جھولا آپ نے بھی پچھلے بیک یارڈ میں لٹکا ہوا دیکھا ہوگا۔"

"اچھا اچھا۔ تو وہ ان کا جھولا ہے۔"

"اور کیا، آپ سمجھ رہے تھے کسی بچے کا جھولا ہے۔ ان کے گھر میں تو بچے ہیں ہی نہیں۔ بس یہ کتا ہے جس کا نام جیک ہے۔"

"اچھا۔ تو ان کے شوہر کا نام کیا ہے؟"

"پتا نہیں" عاطف نے سنجیدگی سے کہا۔

"بھئی کمال ہے۔ تمہیں ان کے کتے کا نام تو معلوم ہے مگر شوہر کا نام پتا نہیں؟"

بولے "انکل، کتے کو تو یہ آوازیں دیتی رہتی ہیں۔ کبھی شوہر کو پکارتے ہوئے نہیں سنا" دلیل واقعی نہایت وزنی تھی۔

ہم نے پوچھا "یہاں تو دور دور تک کوئی اسکول بھی نظر نہیں آتا۔ فی الحال نادیہ کو کہاں داخل کریں گے؟"

اس بار آصف نے اطلاع فراہم کی "انکل، یہاں سے ایک میل دور ایک ایلیمنٹری اسکول ہے۔"

"ایلیمنٹری اسکول؟"

"یہاں ہائی اسکول تک پڑھائی مفت ہوتی ہے۔ ہر شہر اور ریاست میں ایک ہی جیسے اسکول بنے ہوئے ہیں۔ جن میں کورس بھی تقریباً ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ ایک جیسی عمارت، ایک جیسا طریقہ۔ ان سکولوں کو ایلیمنٹری اسکول کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جس علاقے میں وہ اسکول قائم ہوتا ہے اس کا نام ساتھ میں لگ جاتا ہے۔ جیسے ہمارے نزدیک والے اسکول کا نام "بیل ائر ایلیمنٹری اسکول" ہے۔

ہم فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے سوچ میں پڑ گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ نادیہ لاہور کے کانونٹ میں دوسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ اسے اسکول سے چھٹی دلائی گئی تھی اور کچھ پتا نہیں تھا کہ امریکا میں ہمارا قیام کب تک کا رہے گا۔ اس لیے کسی اسکول میں فی الحال اسے داخل کرانا بھی ضروری تھا مگر اسکول ہماری قیام گاہ سے ایک میل دور تھا۔ روز بچی کو لانا لے جانا کیسے ہوگا؟

عاطف نے یہ مسئلہ سنا تو کہا "اس کی آپ فکر نہ کیجیے۔ بچوں کو لے جانے اور لانے کے لیے اسکول کی بس آتی ہے۔ بچوں کو بس میں بیٹھنے کے لیے سامنے والی سڑک بھی

کراس نہیں کرنی پڑتی۔"

"مگر ہم اسکول کیسے جائیں گے؟"

"یہ پرابلم تو ہے" وہ سر کھجانے لگا "انکل' بات یہ ہے کہ مجھے کار چلانی تو آتی ہے مگر میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے۔ تین مہینے بعد میں چودہ سال کا ہو جاؤں گا تو ٹیسٹ دینے کے بعد مجھے اسٹوڈنٹ کا ڈرائیونگ لائسنس مل جائے گا۔ آپ کو تو کار چلانی آتی ہو گی؟"

ہم نے کہا "آتی تو ہے۔ ہمارے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس بھی ہے مگر یہاں ٹریفک سیدھے ہاتھ پر چلتا ہے۔ سارا نظام ہی الٹا ہے۔ اس لیے ذرا مشکل ہے۔"

"آپ اگر اسکول جانا چاہتے ہیں تو فون کر کے ٹیکسی منگالیں۔"

ہمیں نادیہ کے اسکول کی فکر پڑی ہوئی تھی اس لیے کہا "ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ تم ذرا فون کر کے ٹیکسی منگادو۔ پلیز۔"

عاطف مسکراتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا اور ہم نے لبنیٰ سے کہا کہ ہم لوگ ابھی اسکول چلیں گے۔ بچیوں کو تیار کرادو۔ احتیاطاً نادیہ کی کتابیں بھی ساتھ رکھ لینا۔

"پاپا' میں بھی سکول جاؤں گی" پارو نے فرمائش کی۔

"ضرور کیوں نہیں۔ تم بھی تیار ہو جاؤ۔"

پارو بھی بھاگ کر اندر چلی گئی۔ اب ہم اور آصف لان کے ساتھ والی فٹ پاتھ پر کھڑے رہ گئے تھے۔ یکایک کوئی چیز ہماری پشت سے ٹکرائی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک فٹ بال تھی۔ ایک بہت لمبی گوری لڑکی ہمارے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا قد ہمارے برابر ہی ہو گا حالانکہ عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال نظر آتی تھی۔

"سوری سر" وہ اپنے دانت نکال کر مسکرائی اور ہمیں پہلی نظر میں معلوم ہو گیا کہ اس کے دانتوں میں کیڑا لگا ہوا ہے۔ امریکا اور یورپ میں بھی ہم نے اکثر بچوں اور نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کے دانت خراب ہی دیکھے۔ حیرت ہوئی کہ جن ملکوں میں حفظان صحت کے اصولوں کا اتنا ڈھنڈورہ پیٹا جاتا ہے اور دانتوں کی صفائی پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ ٹیلی ویژن پر نظر آنے والا ہر چوتھا اشتہار ٹوتھ پیسٹ' ٹوتھ کریم' ٹوتھ برش یا ماؤتھ واش کے بارے میں ہوتا ہے' وہاں بچوں کے دانت اتنے زیادہ خراب کیوں اور کیسے ہو جاتے ہیں؟

اس کا جواب ہے سوئٹ' امریکی بچے بھی چاکلیٹ' میٹھی ٹافیوں' چیونگم' آئس کریم اور دوسری میٹھی چیزیں کھانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ بچے ہی کیا بڑوں کا بھی یہی حال ہے۔ خاص طور پر خواتین کا۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ چوبیس گھنٹے چاکلیٹ اور سوئٹس ہی کھاتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹور میں جائیں تو بلا مبالغہ درجنوں اقسام کی میٹھی چیزیں' چاکلیٹ اور ٹافیاں ڈھیر کی صورت میں رکھے نظر آتے ہیں۔

"ہائی" لڑکی نے فٹ بال اٹھا کر زمین پر مارنی شروع کر دی پھر خالص امریکی لہجے میں ناک سے آواز نکالی "آپ یہاں نئے آئے ہیں؟" پھر ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا "نئے ہی لگتے ہیں' کل شام تک تو نہیں تھے کیوں نہیں تھے نا؟"

ہم نے جواب دیا "ہم رات ہی کو آئے ہیں۔"

"ٹورسٹ ہوں گے" اس نے چیونگم چباتے ہوئے زمین پر فٹ بال مارنے کا سلسلہ جاری رکھا "کیوں اے صیف' تمہارے مہمان ہیں؟"

اے صیف نے کہا "یہ میرے ڈیڈی کے دوست ہیں۔ ان کی فیملی بھی ساتھ ہے۔"

"نظر تو نہیں آتی" اس نے چاروں طرف دیکھا "خیر ہو گی' مجھے کیا۔ تم شام کو پریکٹس پر آؤ گے نا؟"

"ہو سکتا ہے" آصف نے امریکی لہجے میں کہا۔

"اوکے سی یا۔" وہ فٹ بال زمین پر مارتی ہوئی چلی گئی۔

سی یا دراصل "سی یو" کی امریکی شکل ہے۔ جس طرح یس کو وہ لوگ "یا" کہتے ہیں۔ اسی طرح یو کو یا بولتے ہیں۔ انگریزوں کی زبان کا انہوں نے جی بھر کر حلیہ بگاڑا ہے۔

"کیا یہ لڑکی فٹ بال کھیلتی ہے؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں۔ یہ والی بال کھیلتی ہے۔ آپ نے اس کا قد نہیں دیکھا۔"

"واقعی بہت لمبی ہے۔ اسے تو والی بال کھیلنے میں بہت آسانی ہو گی۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس سے بھی لمبی لمبی لڑکیاں ہیں۔ ایک بلیک لڑکی تو اس سے ڈیڑھ گنا لمبی ہے۔ اسے تو بال کو نیٹ میں ڈالنے کے لیے اچھلنا بھی نہیں پڑتا۔ بس یوں ہی کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھا کر فٹ بال کو نیٹ میں ڈال دیتی ہے' وہ ان سب کی لیڈر ہے۔"

"یہ تمہارے اسکول میں پڑھتی ہے؟"

"جی نہیں' پاس ہی کھیلوں کا میدان ہے۔ شام کو اس آبادی کے لوگ وہاں جاتے ہیں کھیلنے کے لیے۔ آپ کو بھی لے جائیں گے۔"

اتنی دیر میں عاطف نے آکر اطلاع دی کہ ٹیکسی کے لیے فون کر دیا ہے' چند منٹ میں آتی ہو گی۔

ہم جوتا اور کوٹ ٹائی زیب تن کرنے کے لیے اندر چلے گئے مگر عاطف نے روک دیا "اس کی ضرورت نہیں ہے انکل' قمیص پتلون ٹھیک تو ہے۔"

ہم نے کہا "ارے بھئی اسکول جا رہے ہیں۔ پرنسپل سے ملنا ہو گا۔ ذرا اچھا امپریشن ڈالنا چاہیے۔ ورنہ وہ لوگ کیا سوچیں گے۔"

"کچھ نہیں سوچیں گے۔ اس موسم میں تو یہاں لوگ جانگئے پہنے پھرتے ہیں۔"

لبنیٰ نے ہم سے کہا "آپ کو تو ہر کام کی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ بھلا اسکول جانے کی کیا تک ہے؟ کل ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔ اسکول والے غیر ملکی بچی کو کیسے داخلہ دے دیں گے۔ پہلے علیمی صاحب سے مشورہ تو لے لیا ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ اسکول جا کر بلاوجہ شرمندگی ہو۔"

بات تو کچھ معقول ہی تھی مگر کیونکہ بیوی نے کہی تھی اس لیے فوراً مان لینا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے کہا "تو پھر کیا ہوا۔ ابھی علیمی صاحب کو فون کر لیتے ہیں۔"

اب فون کا قصہ بھی سن لیجئے۔ فون امریکا میں کوئی پرابلم نہیں ہے۔ چند منٹوں میں مل جاتا ہے۔ بس فون کمپنی کے سامنے منہ کھولنے کی دیر ہے۔

وڈ برج سے واشنگٹن ڈی سی تک کے فاصلے کے لیے اصولاً تو لانگ ڈسٹینس کال ہونی چاہیے۔ یعنی ٹرنک کال۔ کیونکہ ہمارے یاں یہی دستور ہے کہ ایک شہر سے دوسرے شہر کے لیے مقامی کال نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر اگر ہم لاہور میں مال روڈ سے سترہ میل دور کالا شاہ کاکو فون کریں تو یہ مقامی کال نہیں ہو گی۔ ٹرنک کال ہو گی۔ مگر وڈ برج سے چالیس پینتالیس میل کے فاصلے پر واشنگٹن ڈی سی کے نمبر سے ہم مقامی کال میں بات کر سکتے تھے۔ حالانکہ واشنگٹن دارالحکومت ہے اور وڈ برج ریاست ورجینیا میں واقع ہے مگر اس کا راز یہ ہے کہ امریکا میں ٹیلی فون کا سسٹم پرائیویٹ تجارتی کمپنیاں چلاتی ہیں جو لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرتی ہیں جب کہ ملک عزیز میں اس پر حکومت کی اجارہ

داری ہے اور حکومت کے ہر محکمے کا مقصد ہی افسری اور لوگوں کی روح قبض کرنا ہوتا ہے۔

اکمل علیمی کو وائس آف امریکا میں فون کیا جو فوراً مل گیا۔ علیمی صاحب سے بات بھی ہو گئی۔ ہم نے ان سے اسکول کے سلسلے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا "شوق سے جائیے' نادیہ کو داخلہ بھی مل جائے گا۔"

ہم نے کہا "اور اگر انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ امریکی ہیں تو ہم کیا کہیں؟"

"یہی کہ آپ پاکستان سے آئے ہیں۔

"وہ لوگ اعتراض تو نہیں کریں گے؟" ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ عارضی طور پر سیاحت کے لیے آنے والوں کے بچوں کو سرکاری سکولوں میں داخلہ مل جائے گا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں' وہ داخلے سے انکار نہیں کر سکتے۔"

بعد میں ہمیں پتا چلا کہ بعض دوسرے ملکوں کے برعکس امریکی حدود میں رہنے والے تمام بچوں کو اسکول میں داخلہ دینا ہر اسکول پر لازم ہے۔ امریکا میں باہر سے لاکھوں خاندان آتے رہتے ہیں جن میں سے بہت سے غیر قانونی طور پر شہریت حاصل کیے بغیر ہی وہاں بس جاتے ہیں اور قانون کی نظروں سے چھپے رہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی خوش فہمی ہی ہے۔ اسے آپ قانون کی چشم پوشی کہہ لیجیے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ حکومت ان لوگوں کو ملک میں نہ رکھنا چاہے اور وہ حکام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر رہ جائیں گے۔ علیمی صاحب نے ہمیں بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے کیلی فورنیا کے ایک اسکول میں ایک ہسپانوی بچے کو داخلہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اسکول کے منتظمین کا کہنا تھا کہ بچے کے ماں باپ غیر قانونی طور پر امریکا میں مقیم تھے اس لیے ان کے بچے کو داخل نہیں کیا جا سکتا۔ بچے کے والد کی ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ فوراً عدالت میں پہنچ گئے اور ان کے وکیل نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر بچے کے والد ابھی تک امریکی شہریت حاصل نہیں کر سکے ہیں تو اس میں بے چارے بچے کا کیا قصور ہے؟ اب ذرا جج صاحب کی منصف مزاجی دیکھئے کہ انہوں نے دلائل سننے کے بعد ایک تاریخی فیصلہ دیا کہ امریکی سرزمین میں بسنے والے ہر بچے کو اسکول میں داخلہ دینا اس کا آئینی حق ہے۔ امریکی آئین کے مطابق ملک کی حدود کے اندر رہنے والے ہر بچے کو تعلیم دینا لازمی ہے۔ جو والدین ایسا نہیں کرتے وہ جرم کے مرتکب ہوتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں سزا دی جا سکتی ہے۔ اس لیے کسی بھی بچے کو اسکول میں داخلہ دینے سے اس بنا پر

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے والدین ملک کے باقاعدہ شہری نہیں ہیں۔ اس فیصلے کے بعد امریکا کی تمام ریاستوں میں اس پر عمل در آمد شروع کر دیا گیا۔ یہ خیال رہے کہ امریکا کی ہر ریاست کی قانون ساز اسمبلی اور حکومت الگ الگ ہوتی ہے۔ اور بہت سے معاملات میں ان کے قوانین بھی مختلف ہوتے ہیں جن کا تذکرہ آپ آئندہ پڑھیں گے مگر تعلیم کے سلسلے میں تمام ریاستیں اس فیڈرل فیصلے پر عمل کرنے کی پابند ہیں لوگ سچ ہی کہتے ہیں کہ امریکا دنیا سے نرالا ملک ہے۔

کچھ دیر بعد باہر سے کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ یہ ایک ان ہونی سی بات تھی۔ وکٹورین طرز کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایک بہت لمبی چوڑی، شاندار کار گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ ٹیکسی تھی۔ امریکا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں کاریں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ عام لوگ بھی بڑی بڑی کاریں استعمال کرتے ہیں۔ ٹیکسی میں بھی بڑی کاریں استعمال ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ پولیس والوں کی کاریں بھی بہت شاندار اور لمبی لمبی ہوتی ہیں۔ جب مشرق وسطیٰ کے ملکوں نے پٹرول کے معاملے میں مغرب کو آنکھیں دکھائیں تو امریکا میں بھی پٹرول کی بچت کے خیال سے چھوٹی کاریں استعمال کرنے کا رواج شروع ہوا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ امریکیوں کو چھوٹے سائز کی کار ہی بنانی نہیں آتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ بڑی بڑی شاندار اور آرام دہ کاریں بنانے کے عادی تھے۔ موقعے سے فائدہ اٹھا کر جاپانیوں نے فوراً چھوٹی (یعنی درمیانہ سائز والی) کاریں فراہم کر دیں اور یہ مقبول بھی ہونے لگیں تو امریکی کار سازوں کو فکر پڑ گئی۔ مقابلے میں انہوں نے بھی چھوٹی کاریں بنانے پر توجہ دی اور تمام مشہور کمپنیوں نے درمیانہ درجے کی کاریں بنانا شروع کر دیں مگر اس میدان میں اناڑی پن کی وجہ سے کافی عرصے تک کامیابی حاصل نہیں کر سکے اور ان کے مقابلے میں جاپانی کاروں کو فوقیت حاصل رہی۔

ہم ٹیکسی کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ اگلی سیٹ پر کار ہی کے سائز کی ایک لمبی چوڑی، موٹی تازی خاتون تشریف فرما ہیں اور ٹین کے ڈبے سے کوک پی رہی ہیں۔

ہم نے کھڑکی سے اندر جھانکا تو وہ مسکرائیں اور کہا "ہائی ہنی!"

ہم نے بھی جواب میں ہائی کہا کہ یہ آداب کا تقاضا ہے مگر "ہنی" کا لفظ ہمارے منہ سے نہ نکل سکا۔

"کیب تم ہی نے منگائی ہے؟" انہوں نے یوں پوچھا جیسے انہیں اس پر اعتراض ہے۔

"ہاں، منگائی تو ہے۔"

"تو پھر اندر بیٹھو۔ باہر کھڑے منہ کیوں تک رہے ہو؟" انہوں نے بیٹھے بیٹھے ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ ہم نے پچھلا دروازہ کھول کر پہلے لبنیٰ اور بچیوں کو بٹھایا اور پھر کچھ سہمے ہوئے ان کے برابر والی جگہ پر بیٹھ گئے۔

"جانا کہاں ہے؟" انہوں نے ہماری خاموشی سے تنگ آ کر پوچھا "یا صرف کیب میں بیٹھ کر شہر دیکھنے کا ارادہ ہے؟" اندازہ ہوا کہ وہ خاصی زندہ دل خاتون تھیں۔ ویسے تو ان کی موٹائی بھی ان کے ہنس مکھ ہونے کا ثبوت دیتی تھی۔

"دراصل ہمیں بیل ائر ایلیمنٹری اسکول جانا ہے، آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہے؟"

انہوں نے پہلے قدرے حیران ہو کر ہمیں دیکھا اور پھریوں کھلکھلا کر ہنسیں کہ ساری ٹیکسی ہلنے لگی "مجھ سے کہہ رہے ہو، تم کسی بھی جگہ کا نام لے کر دیکھو۔ وہاں پہنچانا میرا ذمہ ہے۔"

ہم نے کہا "فی الحال تو بیل ائر ایلیمنٹری اسکول ہی پہنچا دیجئے۔"

"اوکے ہنی" انہوں نے بہت لاڈ سے کہا اور پھر بائیں ہاتھ سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ کوک کا ڈبا انکے دائیں ہاتھ میں تھا۔ ایک ہی ہاتھ سے انہوں نے اسٹیرنگ گھمایا اور گاڑی اتنی تیزی کے ساتھ جھٹکا لے کر چل پڑی جس طرح امریکی فلموں میں چلتی نظر آتی ہے۔ پہلے تو ہم مین روڈ پر پہنچے۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے بریک لگایا۔ حالانکہ سڑک بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ دونوں طرف دیکھنے کے بعد انہوں نے ٹیکسی کو بائیں جانب موڑ لیا اور پھر اس لمبی سی سڑک پر بہت دور تک جانے کے بعد ایک بار پھر بائیں ہاتھ کو موڑا۔ یہ علاقہ رہائشی تھا قریب قریب اس طرح کے ٹاؤن ہاؤس یہاں بھی بنے ہوئے تھے۔ جیسے علمی صاحب کے محلے میں تھے۔ بس شکل و صورت میں معمولی معمولی سا فرق تھا۔ ایک دو موڑ اور کاٹنے کے بعد انہوں نے ایک نعرہ مارا "وہ رہا بیل ائر ایلیمنٹری اسکول۔"

سامنے ایک منزلہ، لمبی چوڑی، سادہ سی عمارت سر سبز لان اور درختوں میں گھری ہوئی مسکرا رہی تھی۔ اس کے باہر پارکنگ کا باقاعدہ انتظام تھا۔ انہوں نے پارکنگ میں ایک جانب ٹیکسی ایک جھٹکے سے روک دی۔ ہم سب ٹیکسی سے باہر نکلے۔ ہمیں تمام راستے یہ فکر لگی رہی تھی کہ اگر یہ خاتون ہمیں اسکول میں چھوڑ کر رخصت ہو گئیں تو ہم دوسری ٹیکسی کہاں سے حاصل کریں گے۔ یہ سوچ کر ہم نے ٹیکسی ڈرائیورہ سے دریافت کیا "سنئے، کیا آپ تھوڑی دیر یہاں انتظار کر سکتی ہیں کیونکہ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

وہ کھلکھلانے لگیں، بولیں "واپس تو ایک دن ہم سب کو ہی جانا ہے۔ اٹ از آل رائٹ۔"

ہم مطمئن ہو کر اسکول کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ بہت صاف ستھری اور اندر سے خوب صورت عمارت تھی۔ فرش آئینے کی طرح چمک رہے تھے۔ یہ عمارت مکمل ائر کنڈیشنڈ تھی۔ ان دنوں گرمیاں تھیں اس لیے ساری عمارت ٹھنڈک میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بائیں جانب ایک بڑا سا کشادہ کمرا تھا جس میں ہوٹلوں اور اسپتالوں جیسا ایک لمبا سا کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا "آفس۔ اندر آجائیے۔"

ہم اسکول کی عمارت اور ماحول سے بہت متاثر ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہر ایلیمنٹری اسکول کا نقشہ وغیرہ بالکل ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ ہر اسکول کے ساتھ ایک وسیع و عریض لان اور کھیلنے کا میدان ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ عمارت کافی کھلی ہوئی اور کشادہ جگہ پر تعمیر کی جاتی ہے۔ فرنیچر اور کلاس روم بھی ایک ہی جیسے ہوتے ہیں اور کورس بھی یکساں ہے۔

دفتر میں داخل ہوئے تو کاؤنٹر کے عقب میں چند خوب صورت سی میز کرسیاں رکھی

ہوئی تھیں۔ ایک جانب الماریاں تھیں۔ ہر چیز صاف ستھری اور نفیس تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک درمیانہ عمر کی خوش پوش خاتون اٹھ کر مسکراتی ہوئی آئیں "فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

ہم نے کہا "ہمیں پرنسپل سے ملنا ہے۔"

"کیوں نہیں۔ ضرور، کس سلسلے میں؟"

"اس بچی کو داخل کرانا ہے" ہم نے نادیہ کو آگے بڑھا دیا۔

انہوں نے مسکرا کر نادیہ کو دیکھا "ہائی، تمہارا نام کیا ہے؟"

نادیہ کو ان کی بات سمجھنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی "میرا نام نادیہ آفاقی ہے۔"

"کون سی کلاس میں ہو؟"

"میں کلاس سیکنڈ میں پڑھتی ہوں۔"

وہ نادیہ کی حاضر جوابی سے کافی متاثر ہوئیں، کہنے لگیں "آپ کی بچی شرماتی نہیں ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ آپ کو پرنسپل سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ فارم پر کر دیجئے۔"

انہوں نے ایک فارم اور قلم ہمارے سامنے رکھ دیا۔ خاصا لمبا چوڑا فارم تھا۔ آپ کا نام، آپ کی مسز کا نام، آپ کا پیشہ، آپ کی مسز کا پیشہ، آپ کا دفتری پتا۔ آپ کی مسز کا دفتری پتا، آپ کے گھر کا پتا، آپ کی مسز کے گھر کا پتا، آپ کا فون نمبر، آپ کی مسز کا فون نمبر، آپ کا بینک، آپ کی مسز کا بینک، بچی کا نام، کون سی کلاس میں داخلہ مطلوب ہے۔ سابقہ اسکول کا نام اور پتا۔ بچی کے لیے کس قسم کا لنچ پسند کریں گے؟ فری لنچ، نصف ادائیگی یا مکمل ادائیگی؟

ہم نے آخری سطر کی وضاحت چاہی تو انہوں نے بتایا کہ اگر آپ کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ ہے تو لنچ کی مکمل ادائیگی کریں گے۔ ۲۵ ہزار ڈالر سے کم ہے تو نصف ادائیگی کریں گے اور اگر دس ہزار ڈالر سے کم ہے تو فری لنچ ملے گا۔

ہم نے کہا "ہماری آمدنی تو فی الحال بالکل نہیں ہے۔ ابھی ابھی آئے ہیں۔ کوئی کام کریں گے تو پتا چلے گا کہ کتنی آمدنی ہو گی۔"

بولیں "تو پھر آپ آخری سطر پر نشان لگا دیں یعنی فری لنچ۔"

ہم نے پوچھا "لنچ کتنے کا ہوتا ہے؟"

"مکمل ادائیگی والا لنچ ۵۵ سینٹ روزانہ، نصف ۲۵ سینٹ اور اس کے بعد فری تو فری ہی ہوتا ہے۔"

لبنیٰ نے فوراً مشورہ دیا کہ "ہم ۵۵ سینٹ دے دیا کریں گے۔ خواہ مخواہ فری لنچ لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہم نے مکمل ادائیگی والے خانے پر نشان لگا دیا۔ ظاہر ہے کہ پیشے کا خانہ بھی خالی چھوڑنا پڑا۔ اکمل علیمی کا پتا اور فون نمبر البتہ لکھ دیا۔ سابقہ اسکول کے خانے میں ہم نے کونونٹ آف جیسز اینڈ میری۔ لاہور پاکستان لکھا اور فارم ان کے سامنے رکھ دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب وہ ہم سے لاہور کے اسکول کا سرٹیفکیٹ وغیرہ طلب کریں گی مگر انہوں نے فارم کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر نادیہ سے فرمایا "کل صبح آٹھ بجے اسکول بس تمہیں لینے آجائے گی، تیار رہنا۔"

ہم نے پوچھا "اور کتابیں وغیرہ؟"

بولیں "چھوٹی کلاسوں کے لیے کتابوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کاغذ، پنسل وغیرہ اسکول سے مل جائے گا۔"

"کیا اس کے لیے علیحدہ رقم دینی ہو گی؟"

"بالکل نہیں۔"

ہم نے کتابوں کے اس موٹے تازے، بھاری بھرکم بستے کو دیکھا جس میں نادیہ کی کتابیں اور کاپیاں بھر کر ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔ گدھے کے اس بوجھ کے برعکس، وہاں جب نادیہ دوسرے دن اسکول سے واپس آئی تو اس کے گلے میں ایک بہت اسٹائلش بستہ لٹکا ہوا تھا جس کے اندر ایک پنسل، ایک شاپنر اور ایک سادہ کاغذ تھا۔

ہم نے پوچھا "یہ سادہ کاغذ کس لیے ہے؟"

کہا "پاپا، مس نے کہا کہ تمہارا بستہ خالی نہیں رہنا چاہیے، اس لیے یہ کاغذ ہی رکھ لو۔"

چلتے چلتے یہ بھی بتا دیں کہ امریکی اسکولوں میں چھوٹی کلاسوں کے بچوں کو ہوم ورک بالکل نہیں دیا جاتا۔ جو بھی پڑھانا ہوا اسکول ہی میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ کتاب کا بھی دستور

نہیں ہے۔ ایک ایک صفحہ بچوں کو دے دیا جاتا ہے۔ اور پھر ٹیچر اسے لے کر اپنے پاس رکھ لیتی ہے۔ ہم اس بات پر حیران تھے کہ ثبوت کے طور پر اسکول والوں نے ہم سے لاہور کے اسکول کا کوئی سرٹفکیٹ وغیرہ طلب نہیں کیا مگر دو ماہ بعد جب ہم عارضی طور پر واپس لاہور آئے اور نادیہ کو دوبارہ کانونٹ اسکول میں لے کر گئے تو اس کی مس نے بتایا کہ ہمارے پاس امریکا سے نادیہ کے بارے میں استفسار آیا ہے۔ اب ہم اس کا جواب ارسال کریں یا نہ کریں؟ ہم نے کہا کہ ضرور ارسال کریں کیونکہ تھوڑے عرصے بعد ہم دوبارہ امریکا جانے والے ہیں۔

خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ ایک غیر ملکی اور بالکل نووارد اجنبی ہونے کے باوجود چند لمحوں میں ہماری بچی کو اسکول میں داخلہ مل گیا اور کسی قسم کی پریشانی کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا۔

یہ سب کچھ اس قدر سہل تھا کہ ہمیں یقین نہیں آیا کہ واقعی نادیہ کو داخل کر لیا گیا ہے۔

فارم واپس لینے کے بعد خاتون نے مسکرا کر ہم سے کہا "اوکے؟" یعنی اب آپ رخصت ہو جائیے۔ نہ فیس کی ادائی، نہ سیکیوریٹی کی رقم۔ نہ سرٹفکیٹ، نہ سفارش، نہ کتابوں کا بل، نہ ٹرانسپورٹ کی مشکل۔ سچ پوچھئے تو ہمیں بالکل مزہ نہیں آیا۔ ہم پاکستانی لوگ چھوٹے سے چھوٹے کام کے سلسلے میں بھی اتنے بہت سے پاپڑ بیلنے کے عادی ہو چکے ہیں کہ اسکول میں بچی کے داخلے جیسے کوہ گراں کو اتنا ہلکا پھلکا پایا تو یوں لگا جیسے خواب دیکھ رہے ہیں۔

اسکول کی چھب دیکھ کر پارو کا دل بھی للچانے لگا۔ ہم نے اس کے داخلے کے بارے میں دریافت کیا تو جواب ملا "جب آپ پانچ سال کی ہو جائیں تو چلی آنا۔"

ہم نے عادتاً پوچھ لیا "کیا اس بچی کی رجسٹریشن کرانی ہو گی؟"

"رجسٹریشن؟" وہ حیرت سے ہمارا چہرہ دیکھنے لگیں "کیسی رجسٹریشن؟"

"مطلب یہ کہ جب ہم اس وقت بچی کو لے کر آئیں گے تو کیا آپ اسے داخل کر لیں گی؟"

وہ ہنس پڑیں "داخل کیوں نہیں کریں گے، اسکول ہوتے کس لیے ہیں؟"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہمارے ہم وطنوں کے لیے بچوں کو اسکول میں داخلہ دلانا کس قدر مشکل مرحلہ ہے۔ اسے جوئے شیر لانے سے کم نہیں سمجھنا چاہیے۔"

اسکول سے باہر نکلے تو ٹیکسی ہماری منتظر تھی اور ٹیکسی میں تشریف فرما ڈرائیورہ کے منہ سے کوک کا ایک اور ڈبا لگا ہوا تھا۔ کوک کا یہ ذخیرہ انہوں نے کار کی ڈکی میں جمع کر رکھا تھا۔ اور ٹین خالی کرنے کے بعد بھی وہیں جمع کرتی رہتی تھیں۔ خدا جانے وہ دن میں کتنے کوک نوش جان فرماتی تھیں؟

واپسی پر ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "یہ کوک آپ کا وزن نہیں بڑھا دیتا؟"

وہ ہنس کر بولیں "یہ ڈائٹ کوک ہے ہنی۔"

انہوں نے ہمیں اتنی بار "ہنی" کہہ کر مخاطب کیا کہ ہماری بیگم کو ناگوار گزرنے لگا۔

"یہ آپ کو "ہنی" کیوں کہتی ہے؟"

"یہ اس کی عادت ہے" ہم نے تسلی دی۔

"کتنی خراب عادت ہے "ہنی" کی بجائے کچھ اور نہیں کہہ سکتی؟"

"کہہ سکتی ہے مثلاً ڈارلنگ، سوئٹ ہارٹ وغیرہ۔"

نادیہ نے بھی گفتگو میں حصہ لینا ضروری سمجھا اور اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا "ا انگریزی فلموں میں تو ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو "ہنی" کہتے ہیں۔"

ہم نے اسے سمجھایا کہ یہ امریکا ہے۔ یہاں کے دستور الگ ہیں۔ زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ دوسرے کو جو جی میں آئے کہے۔

لبنیٰ نے فرمایا "اول تو عورتوں کا ٹیکسی چلانا ہی بہت برا لگتا ہے۔ یہ موٹی عورت کوئی اور کام بھی کر سکتی تھی۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً...... مثلاً کسی دفتر میں، یا کسی دوکان پر یا کسی اسکول میں یا..."

"یا کوئی بھی کام نہ کرتی۔ آرام سے گھر میں بیٹھتی۔"

اس اثنا میں موٹی خاتون نے کوک کا ڈبا خالی کرنے کے بعد مٹھی بھر چیونگم اپنے منہ میں ڈال کر انہیں چبانا شروع کر دیا تھا۔ یکایک سوال کیا "ہنی، ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟"

"ہاں، ہاں۔ بڑے شوق سے؟"

"یہ تم لوگ کون سی زبان بول رہے ہو۔ یہ اسپینش تو نہیں ہے، نہ جرمن ہے، نہ فرنچ ہے، نہ اٹالین ہے اور انگریزی تو یقیناً نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "یہ اردو ہے۔"

"یہ کہاں کی زبان ہے؟"

"پاکستان کی مگر ساری دنیا میں بولی جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے انڈین لوگوں کو بھی یہ زبان بولتے ہوئے سنا ہے" انہوں نے چیونگم کی دو اور گولیاں منہ میں ڈال لیں "تم ٹورسٹ ہو؟"

"ہاں۔ مگر کچھ عرصے یہاں رہنے کا ارادہ ہے۔"

"یہ اچھی جگہ ہے، تمہیں پسند آئے گی۔ امریکا ایسا ملک ہے جہاں ہر ایک کے لیے جگہ ہے۔ یہ ہر ایک کو خوش آمدید کہتا ہے، اب مجھ ہی کو دیکھ لو۔"

ہم سب نے بڑے غور سے انہیں دیکھا۔

"میرے والدین انگلینڈ سے آئے تھے۔ میں اس وقت بہت چھوٹی سی تھی۔ بالکل دبلی پتلی، یہ تمہاری بچی ہے نا؟"

"ہاں۔"

"بس اسی طرح کی تھی۔ اب میں ایسی ہو گئی ہوں، دیکھ لو، مگر اب میں امریکن ہوں۔"

نادیہ نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا "تو کیا اسی لیے آپ اتنی موٹی ہیں؟"

وہ زور زور سے ہنسنے لگیں اور گاڑی میں بھونچال آ گیا۔

"دیکھو لڑکی، تم اتنی موٹی نہ ہو جانا، سوئٹ کم، کھانا پینا کم، دوڑنا بھاگنا زیادہ۔ بس یہی ترکیب ہے فٹ رہنے کی۔ یہ تمہاری مسز ہیں؟" اس نے لبنیٰ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"ہاں۔"

"ان کے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے۔ امریکا بہت مہربان ملک ہے۔ یہاں سب کو جگہ مل جاتی ہے اور کھانا پینا بھی بہت سستا ہے۔ اسی لیے یہاں کے لوگ خوب کھا کھا کر موٹے ہو جاتے ہیں پھر اس کے بعد دبلے ہونے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں مگر کھانا نہیں

چھوڑتے۔ خیر' ڈاکٹر بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ اللہ انہیں بھی رزق دیتا ہے۔"

اب ہم لوگ گھر پہنچ گئے تھے۔ ٹیکسی کا بل چھ سات ڈالر بن گیا تھا۔ ایک ڈالر انہیں ٹپ دے دی۔ انہوں نے بہت زور دار قہقہ لگایا اور ایک عدد چیونگم نکال کر پارو کو پیش کر دیا۔ "ہنی' بس تمہارے لیے ایک ہی کافی ہے ورنہ میری طرح پھول کر کپا ہو جاؤ گی۔ اوکے' بائی۔"

اور ٹیکسی لے کر یہ جاوہ جا۔

"اچھی دلچسپ عورت ہے" لبنیٰ نے رائے ظاہر کی۔ ان عورتوں خصوصاً بیویوں کی رائے بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

ہم نے کافی مٹرگشت کر لی تھی۔ ایک بہت مشکل اور اہم کام یعنی نادیہ کے داخلے کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ ہم نے گھر میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر مختلف پروگرام دیکھنے شروع کر دیے۔ دن کے اوقات میں عموماً ایسے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جنہیں "سوپ آپرا" کہا جاتا ہے جس طرح ہمارے ہاں گھریلو' جذباتی' رومانی' رونے دھونے کی فلمیں ہوتی ہیں یہ سوپ آپرا بھی اسی قسم کے سلسلہ وار ڈرامے ہوتے ہیں جنہیں فرصت کے اوقات میں گھر میں بیٹھی عورتیں اور بوڑھے بوڑھیاں بہت ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔ کبھی ہنستے ہیں' کبھی روتے ہیں' کبھی آہیں بھرتے ہیں۔ ایسے سوپ آپرا بھی ہیں جو سالہا سال سے چل رہے ہیں اور جن کے اہم کردار کئی بار بدل چکے ہیں۔ کچھ مرکھپ گئے' کچھ کہیں اور چلے گئے۔ ان ڈراموں میں کام کرنے والوں کو بہت معقول معاوضہ ملتا ہے۔

امریکا میں ٹی وی پر کارٹونوں کے لیے بھی وقت مقرر ہے۔ کارٹون صبح سویرے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دن ہم نے صبح چار بجے ٹی وی کھولا تو مختلف چینل کارٹون پیش کر رہے تھے۔ شاید بچوں کو اسکول جانے کے لیے سویرے سویرے اٹھانے کی خاطر ایسا کیا جاتا ہے۔ سات ساڑھے سات بجے کے قریب کارٹون ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ بچے اسکول چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مزاحیہ اور ہلکے پھلکے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ دفتر اور کام پر جانے والے تیار ہوتے ہوئے ان کی جھلکیاں بھی دیکھ لیں۔ جب گھر میں بڑے بوڑھوں اور گھریلو عورتوں کے سوا کوئی موجود نہیں ہوتا تو پھر سوپ آپرا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ درمیان میں وقفے وقفے سے خبریں بھی آتی رہتی ہیں۔ سوال و جواب کے انعامی پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے اور لوگوں کے گھر پہنچنے کا وقت ہو جاتا ہے۔ اس وقت دلچسپ چٹ پٹے پروگراموں کا زور ہوتا ہے۔ کارٹون بھی چلتے رہتے ہیں۔ رات کا وقت فلموں' ڈراموں اور رنگا رنگ پروگراموں کے لیے مخصوص ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چوبیس گھنٹے مسلسل جاری رہتا ہے۔ علی الصباح گڈ مارننگ امریکا جیسے دلچسپ اور معلومات پروگرام بھی ہر روز پیش کیے جاتے ہیں۔ ٹاک شو' اسٹیج شو' انعامی مقابلے اس کے علاوہ ہیں۔ امریکا میں ساڑھے چار سو کے لگ بھگ ٹی وی اسٹیشن ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف چینلز سے مسلسل پروگرام پیش کرتے رہتے ہیں۔ پروگرام اتنے دلچسپ اور ہمہ رنگ ہوتے ہیں کہ دیکھنے والا مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا دیکھے اور کیا نہ دیکھے۔

ہم سب ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک انتہائی رومانی' جذباتی اور دلدوز قسم کا سوپ آپرا دیکھنے میں مصروف تھے کہ لبنیٰ نے آکر اطلاع دی کہ لنچ تیار ہے۔

عاطف اور آصف نے فوراً انکار کر دیا۔ "آنٹی، ہم کو لنچ کھانے کی عادت نہیں ہے۔"

"دیکھو بھئی۔ جب تک ہم اس گھر میں ہیں تمہیں لنچ کھانے کی عادت ڈالنی پڑے گی۔ چلو اب آجاؤ، شاباش۔"

امریکا والوں کے پاس نہ تو لنچ بنانے کا وقت ہوتا ہے، نہ کھانے کا مگر ہم تو امریکی تھے ہی نہیں۔

سہ پہر کے وقت عاطف اور آصف ہمیں پلے گراؤنڈز کی طرف لے گئے۔

دو چار سڑکوں سے مڑتے ہوئے ایک کھلی جگہ پہنچے تو حیران رہ گئے۔ بہت دور تک سر سبز میدان پھیلے ہوئے تھے۔ بڑے، چھوٹے سبھی کے کھیلنے کا سامان موجود تھا۔ لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے اپنی اپنی پسند کے کھیل کھیل رہے تھے۔ ایک گوشے میں جھولوں کا بندوبست بھی تھا۔ سلائیڈز بھی تھے۔ نادیہ اور پارو نے جھولوں کا رخ کیا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو کھیلنے کے بجائے ادھر ادھر بیٹھے گپ شپ کرنے میں مصروف تھے۔

یورپ اور امریکا میں نمایاں فرق یہ نظر آیا کہ یہاں لوگ بے تکلف اور باتونی تھے۔ کسی رسمی تعارف کے بغیر ہی بات چیت شروع کر دیتے تھے۔ ویسے تو امریکا میں کالوں کی کوئی کمی نہیں ہے بلکہ بہت افراط ہے لیکن بعض علاقوں میں یہ برائے نام ہیں۔ جیسے وڈ برج میں کالے بہت کم ہیں۔ اور جو معدودے چند ہیں بھی تو بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب۔ ورنہ عام طور پر ایسا نہیں ہے بلکہ لوگ ایسے علاقوں میں رہنے سے گھبراتے ہیں جہاں کالوں کی اکثریت ہے۔ امریکا میں ہر نسل کے لوگ نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کھلا معاشرہ یا اوپن سوسائٹی کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر بات چیت کرنا اور بات ہے لیکن اس سے زیادہ میل جول بڑھانا انہیں بھی پسند نہیں ہے۔ پاس پاس رہنے کے باوجود دور دور ہی رہتے ہیں ہاتھ ہلا کر "ہائی" کہنے یا پاس سے گزرتے ہوئے مسکرانے سے زیادہ تعلقات استوار کرنے میں یقین نہیں رکھتے۔

برابر رہنے والے بھی ہفتوں، مہینوں، سالوں اور اکثر اوقات کبھی کبھی عمر بھر ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے۔ برابر والے پڑوسی کے پاس جانے کے لیے بھی پیشگی وقت لینا پڑتا ہے جو آسانی سے نہیں ملتا لیکن پھر بھی یورپ، خصوصاً انگریزوں کے مقابلے میں یہ لوگ بہت زیادہ گرم جوشی اور کھلے دل کے محسوس ہوتے ہیں۔

ایک ہنس مکھ، گوری چٹی خاتون نے پارو کو بھاگ کر ہمارے پاس آتے ہوئے دیکھا تو خود بھی چلی آئیں۔ "ہائی" کے بعد انہوں نے دریافت کیا کہ ہم کون لوگ ہیں کیونکہ بالکل نئے نئے لگ رہے ہیں۔ ہمارا کل احوال سننے کے بعد انہوں نے کہا "یہ بچی تو اسکول جاتی نہیں ہے۔ آپ کی پریشانی دور کرنے کے لیے میں یہ پیش کش کر سکتی ہوں کہ چاہیں تو اسے میرے چائلڈ کیئر سینٹر میں چھوڑ دیا کریں" پھر انہوں نے ہمیں اپنے چائلڈ کیئر سینٹر کا پتا بھی بتایا اور ہمیں یاد آیا کہ ابھی پلے گراؤنڈ میں آتے ہوئے راستے میں ہم نے ایک جگہ اس قسم کا سائن بورڈ لگا ہوا دیکھا تھا۔

لبنیٰ نے کہا "یہ تو بہت اچھی عورت ہے، پڑوسیوں کا کتنا خیال ہے اس کو۔"

ہم نے کہا "آپ کا خیال ہے کہ انہوں نے انسانی ہمدردی کے تحت آپ کو یہ پیش کش کی ہے؟"

"اور نہیں تو کیا؟"

"بیگم صاحبہ، یہ امریکا ہے، یہاں باپ اور بیٹا، میاں اور بیوی بھی پیسے کے بغیر ایک دوسرے کے لیے کچھ نہیں کرتے ہیں۔ ماں باپ بچوں سے اگر چھوٹا سا گھریلو کام بھی کراتے ہیں تو وہ پہلے باقاعدہ معاوضہ طے کرتے ہیں۔ پھر انہیں بھلا ہم سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، یقین نہ ہو تو ان سے پوچھ کر دیکھ لیجیے۔"

لبنیٰ نے ان سے پوچھا "کیا آپ چائلڈ کیئر سینٹر کے لیے فیس بھی لیتی ہیں؟"

"ظاہر ہے" انہوں نے دونوں کندھے ہلائے۔ "دیکھئے اس کے باوجود یہ رقم بہت کم ہے۔ صرف دو ڈالر فی گھنٹہ یعنی اگر آپ چار پانچ گھنٹے کے لیے بچی کو میرے پاس چھوڑیں گی تو آپ کو صرف آٹھ یا دس ڈالر ادا کرنے ہوں گے۔ جو آپ کی [illegible] کے پیش نظر کچھ بھی نہیں [illegible] آپ اتنی دیر میں سو ڈیڑھ سو ڈالر کما سکتی ہیں۔ کیوں، کیا خیال ہے؟"

لبنیٰ تو خاموش رہ گئیں مگر ہم نے کہا "آپ کی پیش کش کا شکریہ مگر ہمیں ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میری مسز بھی کوئی جاب نہیں کرتی ہیں۔"

"اوہ.... ہاؤ نائس" وہ مسکرانے لگیں "لیکن اگر کبھی جاب کر لیں تو میرا پتا تو آپ کو یاد ہی ہے" وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔ گویا کھیل کے میدان میں بھی وہ اپنے ڈے

کیئر سینٹر کے لیے گاہک تلاش کر رہی تھیں۔"

اندھیرا ہونے لگا تو چند نوجوان جوڑوں کے سوا سبھی واپس جانے لگے۔

لبنیٰ نے لنچ کے ساتھ ہی ڈنر بھی تیار کر لیا تھا۔ اس لیے گپ شپ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عاطف اور آصف نے ہمیں اپنے تجربات اور مشاہدات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکی زندگی کے بارے میں ابتدائی معلومات ہمیں ان دونوں ہی سے حاصل ہوئی تھیں۔

آٹھ بجے کے قریب ہم اکمل علیمی صاحب کا انتظار کر رہے تھے کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک لمبے تڑنگے امریکن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ شارٹس (نیکر سمجھ لیجئے) اور بنیان پہنے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ و سفید تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی مسکرا دیے اور خالص امریکن لہجے میں بولے "کیا چودہ ہزار آٹھ سو سولہ۔ کلو ورڈیل روڈ یہی ہے؟"

ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمیں حیران دیکھا تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات پر نظر ڈالی اور پوچھا "مسٹر اے ایس آفاقی' یہیں رہتے ہیں؟"

ہم نے کہا "وہ ہم ہی ہیں۔"

بولے "آپ کا بیگ ائرپورٹ پر گم ہو گیا تھا؟"

"جی ہاں" ہم نے انہیں دیکھا کہ یہ نجومی کہاں سے آ گیا۔ بولے "آکر وصول کر لیجئے۔"

ہم خوشی خوشی ان کے ساتھ سامنے کھڑی ہوئی ویگن نما گاڑی کی جانب چل پڑے جو پیچھے سے بند تھی۔ انہوں نے ویگن کا پچھلا دروازہ کھولا اور ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ہمارے استقبال کے لیے باہر نکل آیا۔ ویگن میں سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا اور کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔ اسی میں ہمارا گمشدہ بیگ بھی تھا۔

"یہی ہے آپ کا بیگ؟"

اتنی جلدی اور آسانی سے گمشدہ بیگ مل جانے پر ہمیں خوشی سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی "ہاں' یہی ہمارا بیگ ہے۔"

انہوں نے بیگ اٹھا کر ہمارے حوالے کیا اور اس کے ساتھ ہی وہ چابی بھی دے دی جو ہم ائرپورٹ پر کسٹم والوں کو دے آئے تھے۔ انہوں نے ہم سے وصولیابی کے ایک کاغذ پر

دستخط کرائے اور وین میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ ہم بیگ لے کر گھر میں داخل ہونے لگے تو اچانک خیال آیا کہ ذرا گھر کا نمبر بھی دیکھ لیں۔ دیکھا تو مکان کے دروازے پر ۱۴۸۱۶ نمبر لکھا ہوا تھا۔ کسی مکان کا اتنا بڑا نمبر دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور ایسا شاید امریکا ہی میں ممکن تھا۔

اکمل علیمی صاحب رات کو تھکے ہارے آئے۔ نہا کر تازہ دم ہوئے۔ کھانا کھایا اور ٹی وی کے سامنے خبریں دیکھنے بیٹھ گئے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ خبروں سے فارغ ہوئے تو باتیں شروع ہو گئیں۔ ان کے اس قدر باقاعدگی سے خبریں دیکھنے پر ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ وہ دن بھر تو وائس آف امریکا میں رہتے تھے جہاں دنیا بھر سے خبریں آتی تھیں۔ امریکا ایسا ملک بھی نہیں ہے جہاں اچانک کوئی ان ہونی بات ہو جائے۔ ایمرجنسی ڈیکلیئر ہو جائے یا مارشل لاء لگ جائے۔ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اور سیاسی سازشوں سے بھی وہ ملک بدقسمتی سے محروم ہے۔ تو پھر ایسی کون سی خبر ہے جسے سننے کے لیے وہ سارے کام چھوڑ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں؟

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا "بس یار' عادت سے مجبور ہوں۔"

واقعی صحافی اپنی عادت سے مجبور ہوتے ہیں۔ جو شخص ایک بار صحافی بن جاتا ہے وہ ساری عمر ہر شے کو صحافی کی نگاہ سے دیکھتا اور اس کا تجزیہ کرتا رہتا ہے۔ دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے مثلاً ایک ڈاکٹر صاحب تصویروں کی نمائش میں گئے۔ مصور نے ایک نہایت خوبصورت فن پارے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ اس تصویر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر صاحب کچھ دیر بہت غور سے اس تصویر کو دیکھتے رہے پھر بولے "مجھے تو یہ نمونئے کا کیس معلوم ہوتا ہے۔"

یہی حال صحافیوں کا بھی ہے۔ وہ چاہے جو بھی بن جائیں' ہر چیز میں خبریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اسی تصویر کو اگر صحافی کو دکھا کر اس کی رائے طلب کی جاتی تو وہ فرماتے کہ یہ سب حکومت کی اقتصادی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔

اکمل علیمی کو ہم نے اپنی دن بھر کی روداد سنائی اور انہوں نے ہمیں اپنی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ اکمل علیمی بہت ہمدرد' دردمند اور مخلص دوست ہیں۔ یہ نہیں کہ صرف

ہمارے ساتھ رہے ہیں بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ بے
چارے عادت سے مجبور ہیں۔ انہوں نے دفتر میں سارا دن دو کام کیے تھے۔ ایک تو ہم
اپنے ساتھیوں کو ہماری آمد کے بارے میں مطلع کیا تھا اور دوسرا یہ کہ امریکا میں ہمارے
مستقبل کے بارے میں غور کرتے رہے تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے ٹیلی ویژن کے
بارے میں دریافت کیا اور معلوم ہوا کہ اس وقت تک امریکا میں خصوصاً واشنگٹن اور
ورجینیا کے علاقے میں ہمارے لیے ٹیلی ویژن فلمیں یا پروگرام مرتب کرنے کا کوئی امکا
نہیں تھا۔ امریکا میں ٹیلی ویژن کے لیے فلمیں اور دستاویزی فلمیں بنانا بہت ٹیکنیکل قسم
کام ہے اور کسی غیر امریکی کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رہ گئی فلم' تو امریکا
فلم سازی کا انداز بالکل مختلف ہے' ان کی ضروریات' ماحول' طریقہ کار' مالی وسائل ک
فراہمی' یہ سب کچھ ہمارے لیے بالکل اجنبی اور نامانوس ہے۔ ہمارا تعلق تو اردو فلموں سے
رہا تھا۔ یعنی انگریزی فلمیں بنانے کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ نہ ہی ہم وہاں کے حالات
مسائل اور ضروریات سے آگاہ تھے۔ ان کے ہدایت کار الگ' موضوعات مختلف' اداکار
بہت مہنگے اور فلموں کے بجٹ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ہم لوگوں کے لیے اس بارے میں
سوچنا بھی حماقت ہے۔ ایک عام امریکی فلم پر جتنی لاگت آتی ہے اتنا سرمایہ ہماری ساری
فلمی صنعت کو خریدنے کے لیے کافی ہے۔

"ٹیلی ویژن اور فلم میں تو فی الحال کوئی امکانات نہیں ہیں" انہوں نے کہا۔

"اور ابو' انکل تو یہاں ویسے بھی فلمیں نہیں بنا سکتے" آصف نے کہا جو بہت غور سے
یہ باتیں سن رہے تھے۔

"کیوں نہیں بنا سکتے؟"

"یہاں کی فلمیں تو اتنی بے ہودہ ہوتی ہیں۔ ننگے ننگے لباس' سوئمنگ' کسنگ۔ انکل یہ
سب کیسے کریں گے؟"

علیمی صاحب ہنسنے لگے "انکل کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ
ایکٹر لوگ کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو صحیح ہے" آصف صاحب فوراً مان گئے پھر کہنے لگے "مگر انکل کو شرم نہ
آئے گی؟"

بات ان کی معقول تھی اس لیے ان کی رائے سے اتفاق کر لیا گیا۔
سوال یہ تھا کہ ابھی یہ فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ہمیں امریکا میں کرنا کیا ہے۔ دوسری
طرف وہاں کے اخراجات بے پناہ تھے۔ کچھ نہ کچھ کرنا بہت ضروری تھا مگر کریں تو کیا
کریں؟ ہم نے ساری زندگی میں دو ہی کام کیے تھے۔ صحافت یا فلم۔ اس کے سوا کوئی تیسرا
کام نہیں کیا اور نہ ہی اس بارے میں کوئی تجربہ یا علم ہے۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اور بھی بہت سے کام ہیں جو کیے جا سکتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً ہوٹل یا ریسٹورنٹ لے سکتے ہیں۔ گفٹ شاپ خرید سکتے ہیں۔ گوگو کلب حاصل
کر سکتے ہیں' کوئی چھوٹی سی دکان یا لانڈریٹ لے سکتے ہیں۔"

"مگر ان کاموں کا ہمیں مطلق تجربہ نہیں ہے۔"

"جب کریں گے تو ہو جائے گا' دنیا میں کوئی کام مشکل نہیں ہے۔"

طے یہ پایا کہ سب سے پہلے تو کسی ریالٹر سے رابطہ قائم کیا جائے۔

"ریالٹر؟"

"جس طرح ہمارے ہاں پراپرٹی ڈیلرز ہوتے ہیں۔ یہاں ریالٹرز ہوتے ہیں۔ یعنی
پراپرٹی کی خرید و فروخت کرنے والے۔"

ہم نے کہا "ہمارے ملک میں تو پراپرٹی ڈیلرز کے دفتر پان سگریٹ کی دکانوں سے زیادہ
نظر آتے ہیں۔"

بولے "یہاں بھی کچھ کمی نہیں ہے۔ بس ذرا اسٹائل مختلف ہے۔"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔

اکمل علیمی نے کہا "یہ سب تو ہوتا رہے گا پہلے آپ واشنگٹن تو دیکھیں۔ یہاں کی
زندگی اور حالات سے واقفیت تو حاصل کریں۔ کل آپ میرے ساتھ واشنگٹن چلیں۔
دوستوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور ممکن ہے وہ کوئی اچھا مشورہ بھی دیں۔ واشنگٹن
اور ورجینیاں میں کچھ اور دوست بھی رہتے ہیں۔"

ان کا فقرہ ختم ہونے سے پہلے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی۔ علیمی صاحب
نے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو ہیلو" کہا اور پھر کہا "ہاں ہاں' کل رات ہی آئے ہیں۔ بھائی میں

کیسے بتاتا۔ وہ تو بس اچانک ہی آ گئے۔ لیجئے بات کریں" انہوں نے ریسیور ہماری طرف بڑھا دیا۔ ہم بہت حیران ہوئے۔ وڈ برج کے علاقے میں ہمیں ٹیلی فون کرنے والا بھلا کون ہو سکتا تھا؟

"آفاقی صاحب' میں نغمی بول رہا ہوں۔ ابوالحسن نغمی' پہچانے؟"

ہم فوراً پہچان گئے' نغمی صاحب روزنامہ "آفاق" میں ہمارے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے بچوں کے پروگرام میں "بھائی جان" بھی تھے۔ دس بارہ سال پہلے ابوالحسن وائس آف امریکا سے وابستہ ہو کر امریکا گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

"حضور والا! میں ورجینیا میں رہتا ہوں۔ آج کل انشورنس کرتا ہوں' اچھا آپ ذرا قلم اٹھائیے اور میرا فون نمبر لکھئے۔"

ہم نے قلم اٹھا کر ان کا فون نمبر لکھا' بولے "علیمی صاحب کا نمبر میرے پاس ہے۔ ان کو بھی جانتا ہوں' کل شام آپ سے ملنے آؤں گا۔ باقی باتیں زبانی ہوں گی۔ خدا حافظ" انہوں نے فون بند کر دیا۔ علیمی صاحب نے حسب معمول اپنی انسائیکلوپیڈیا کی مدد سے کام لیا اور بتایا کہ نغمی صاحب کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں' تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کے باپ ہیں جن میں سے ایک بیٹی کی شادی ہو گئی جو ورجینیا میں ہی رہتی ہے۔ اتنے عرصے تک امریکا میں رہنے کے باوجود نغمی صاحب امریکی طرز زندگی سے سخت ناخوش اور بے زار ہیں۔

علیمی صاحب کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگی تھیں اس لیے وہ ہمارے اصرار پر جماہیاں لیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ہم نے ٹیلی فون ڈائریکٹری تلاش کرنی شروع کر دی تاکہ ریالٹرز کے فون نمبر نوٹ کر لیں۔ نہیں ملی تو آصف سے دریافت کیا جو ٹی وی پر ایک جنگ و جدل سے بھرپور فلم دیکھنے میں کھوئے ہوئے تھے۔

"آصف' ٹیلی فون ڈائریکٹری کہاں رکھی ہے؟"

"وہ سامنے ہی تو رکھی ہے" آصف نے موٹی موٹی کتابوں کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کر دیا۔ ہم نے نزدیک جا کر غور سے دیکھا۔ ہمارے ہاں جس سائز کی ٹیلی فون ڈائریکٹری ہوتی ہے' اس سے تین چار گنا موٹی' چھ سات تندرست کتابیں ایک کونے میں ڈھیر کی صورت میں رکھی ہوئی تھیں۔ ہر ایک کا وزن دو چار سیر سے کم نہیں تھا۔

"یہ ٹیلی فون ڈائریکٹری ہے' اتنی بہت سی؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"انکل' یہ ڈائریکٹریاں تو صرف ورجینیا اور واشنگٹن ڈی سی کی ہیں۔"

یہ عجیب و غریب ڈائریکٹریاں دیکھ کر ہمیں بچپن میں سنا ہوا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک ڈائریکٹر صاحب نے اپنے دیہاتی نوکر سے کہا کہ گھر جا کر ڈائریکٹری لے آؤ۔ وہ بھاگا بھاگا ان کے گھر پہنچا اور زبردستی ان کی بیوی کو اٹھا کر دفتر لے گیا۔ ڈائریکٹر صاحب بہت ناراض ہوئے کہ بدتمیز' یہ کیا اٹھا لئے؟

نوکر دوبارہ گھر گیا اور ان کی باقی تین بیویوں کو بھی لے کر دفتر پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ ڈائریکٹر صاحب کی چار بیویاں تھیں۔ خیر' ان کی تو صرف چار ہی "ڈائریکٹریاں" تھیں۔ ہمارے سامنے چھ سات ڈائریکٹریاں پڑی ہوئی تھیں اور ان میں سے ہر ایک ہماری تین چار ڈائریکٹریوں پر بھاری تھی۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے بڑی احتیاط سے ایک ڈائریکٹری اٹھالی۔ صفحات الٹ کر دیکھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ٹی وی پروگرام کے قتل عام میں اشتہاروں کا وقفہ ہوا تو آصف اٹھ کر ہمارے پاس آیا "انکل' آپ کو کہاں کی ڈائریکٹری چاہیے؟"

ہم نے کہا "وڈ برج یا ورجینیا کی۔"

اس نے چھانٹ چھانٹ کر دو ڈائریکٹریاں ہمارے سامنے رکھ دیں "اب آپ ان میں سے اپنی پسند کا نمبر دیکھ لیجئے۔"

اور دوبارہ ٹی وی کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ ہم نے ایک ڈائریکٹری کھولی اور ریالٹر کے نمبر تلاش کرنے لگے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں نمبر موجود تھے۔ ہم نے اندازے سے چند اچھے اچھے ناموں والے نمبر پسند کر کے نوٹ کر لیے۔ ہمارے ہاں تو پراپرٹی ڈیلرز کے اداروں کے نام خاصے کرخت اور غیر رومانی ہوتے ہیں مگر وہاں ایک سے بڑھ کر ایک دلکش نام موجود تھا۔

ہمیں صبح سویرے علیمی صاحب کے ہمراہ جانا تھا اور وہ ساڑھے پانچ بجے گھر سے نکل پڑتے تھے' لہٰذا سو گئے۔

صبح ساڑھے چار بجے لبنیٰ نے ہمیں جگا دیا۔

"کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟" ہم گھبرا گئے۔

"بالکل نہیں ہے، آپ کو علیمی صاحب کے ساتھ واشنگٹن جانا ہے۔"

شیو کیا، نہائے اور لباس پہن کر جب بیس منٹ بعد ہم بیس منٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو باورچی خانہ پراٹھوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ انڈوں کا آملیٹ بھی تھا اور شامی کباب بھی موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ شامی کباب لنچ کے لیے تھے۔

علیمی صاحب بہت تیزی سے کچن میں داخل ہوئے۔ ان کا معمول تھا کہ جلدی جلدی ایک دو عدد "ڈونٹ" یا ڈبل روٹی کے سلائس مکھن لگا کر کھاتے، چائے یا کافی کا مگ منہ میں انڈیلا اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اب جو یہ اہتمام دیکھا تو حیران رہ گئے ناشتا بڑے اہتمام سے کیا گیا۔ باقاعدہ پیالیوں میں چائے پی گئی۔ شامی کباب اور پراٹھے کا پیکٹ بھی مل گیا۔ گھڑی دیکھی تو ساڑھے پانچ نہیں بجے تھے۔ علیمی صاحب نے کہا "آج ذرا آرام سے ٹہلتے ہوئے جائیں گے۔"

ہم نے سوچا، آج ذرا امریکا کی صبح بھی دیکھیں، کیسی ہوتی ہے۔ گھر سے باہر نکلے اور مین روڈ کی جانب چل پڑے۔ امریکی سحر خیز ہوتے ہیں۔ منہ اندھیرے اٹھ کر سویرے سویرے کاموں پر جانے کے لیے گھروں سے نکل جاتے ہیں۔ اس وقت سیر یا ورزش کرنے کا وقت کس کے پاس ہوتا ہے۔ اس لیے امریکیوں کا رواج یہ ہے کہ جس کو جس وقت فرصت ملے جوگنگ کرنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سڑکوں پر دن کے کسی بھی وقت جوگنگ کرنے والے مرد اور خواتین نظر آجاتی ہیں۔ اور تو اور بازاروں میں بھی لوگ جوگنگ کرتے ہیں۔ ہمارے اور علیمی صاحب کی طرح پیدل بس اسٹینڈ پر جانے والا کوئی اور

نظر نہیں آیا۔ ہر کوئی کار پر سوار تھا۔ البتہ کچھ بوڑھے مرد اور عورتیں کتوں کو ٹہلاتے ہوئے مل گئے۔ پاس سے گزرتے ہوئے "ہائی" کا نعرہ ضرور بلند کرتے تھے۔ ان کے کتوں کی وضعداری یہ ہے کہ جس شخص کو مالک یا مالک ہائی " کہتا ہے وہ اس پر بھونکنا ضروری سمجھتے ہیں۔ شاید یہ ان کے "ہائی" کہنے کا انداز ہے۔ کچھ ریٹائر قسم کے حضرات جوگنگ میں مصروف نظر آئے مگر انہوں نے مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ انہوں نے کانوں میں "واک مین" لگا رکھے تھے۔

جس جگہ بس سے ملاقات ہونی تھی وہاں ہم پونے چھ بجے سے ایک منٹ پہلے پہنچ گئے۔ دو حضرات اور ایک نوجوان خاتون بھی بس کے انتظار میں تھیں۔ علیمی صاحب کو دیکھا تو بہت گرم جوشی سے ملاقات ہوئی۔ ٹھیک پونے چھ بجے بائیں جانب سے بس نمودار ہوئی اور ہمارے سامنے آکر رک گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ دن کے وقت صرف دو ہی بسیں واشنگٹن ڈی سی کے لیے روانہ ہوتی ہیں اس لیے کافی رش اور دھکم پیل ہوگی مگر خلاف توقع بس میں بہت کم مسافر نظر آئے۔ سب نے علیمی صاحب سے "ہائی ہائی" کیا۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔

دراصل یہ سب لوگ ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ وڈ برج کا یہ اسٹاپ بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ یہاں سے روانہ ہو کر یہ سیدھی واشنگٹن پہنچ کر دم لیتی تھی۔ چونکہ سڑک کے درمیانی "فاسٹ لین" میں سفر کرتی تھی اس لیے ٹریفک جام اور ٹریفک کی رنگین روشنیوں کی روک ٹوک سے آزاد تھی۔ اس فاسٹ لین میں پرائیویٹ کاریں بھی سفر کر سکتی تھیں مگر شرط یہ ہے کہ ایک کار میں چار مسافر ہوں۔ اس کا علاج لوگوں نے یہ تلاش کیا ہے کہ چار افراد مل کر طے کر لیتے ہیں کہ ہر ہفتے کسی ایک کی کار استعمال ہوگی۔ اس طرح یہ کار بھی فاسٹ لین کے ذریعے ایک گھنٹے پہلے منزل پر پہنچ جاتی ہے۔

ہمارا زیادہ تر سفر تو ہائی وے پر طے ہوا۔ اس کے بعد جب واشنگٹن ڈی سی کی حدود کا آغاز ہوا تو امریکی معاشرت اور سیاست کے نقوش بھی اجاگر ہونے لگے۔ پہلی بات تو یہ دیکھی کہ یہ سارا علاقہ نہایت سرسبز اور خوب صورت تھا۔ ہائی وے کے دونوں جانب کسی جگہ بھی بے رونقی، اجڑا پن، یا گندگی نظر نہیں آئی۔ زمین کو اونچے نیچے ٹیلوں کی شکل میں ترتیب دے کر بڑے سلیقے سے گھاس لگائی گئی تھی یا پھر بلند درختوں کے ذخیرے تھے۔

درختوں پر امریکی بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں کیونکہ ماحول اور فضا میں آلودگی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا توڑ کھلی فضا' سبزہ زار' باغات اور درخت ہی ہو سکتے ہیں۔ ان چیزوں کی نگہداشت بھی وہ بہت توجہ سے کرتے ہیں۔ جہاں بھی گنجائش ہوتی ہے درخت ضرور لگاتے ہیں۔ وڈ برج میں علیمی صاحب کے گھر کے گرد نواح میں بھی درختوں کے سلسلے موجود تھے لیکن جس بات نے ہمیں حیران کر دیا وہ یہ تھی کہ یہاں گرمی اور حبس کچھ کم نہیں ہے۔ اس کے باوجود حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑے برساتی پروانے' مکھیاں اور مچھر بالکل نا پید ہیں۔ سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ چھپکلی جو ہمارے شہروں میں خاندانوں کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ امریکا میں ہمیں کہیں نظر نہ آئی حالانکہ چاروں طرف درخت' سبزہ اور پودے موجود ہیں۔ اسی طرح مکھی اور مچھر بھی عنقا ہیں۔ حالانکہ موسم کا تقاضا یہ ہے کہ کافی تعداد میں ان کی افزائش ہونی چاہیے لیکن جراثیم کش ادویات کے مسلسل اور باقاعدہ استعمال کی وجہ سے امریکی شہران مصائب سے پاک ہیں۔ ایک دن علیمی صاحب نے اپنے گھر کے باہر دروازے پر ہمیں ایک عجیب و غریب شکل کی اڑنے والی مخلوق دکھائی۔ اس کا سائز شہد کی مکھی سے بڑا تھا۔ ٹڈے اور پروانے کی مخلوط اولاد نظر آتا تھا مگر علیمی صاحب نے بتایا کہ یہ مچھر ہے۔

ہم نے حیران ہو کر اس مبینہ مچھر کو اور پھر علیمی صاحب کو دیکھا۔ مچھر تو یہ کسی صورت بھی نظر نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ اڑتا تھا۔ اڑنے والی چیزیں تو اور بھی بہت سی ہیں مگر انہیں مچھر تو نہیں کہا جاتا۔

اس کے سائز کو دیکھ کر ہم ڈر گئے' کہا "اس کے کاٹنے سے تو انسان مرجاتا ہو گا؟"

علیمی صاحب مسکرائے "آپ کی اطلاع کے لیے یہ بالکل نہیں کاٹتا۔ یہ بالکل بے ضرر چیز ہے۔ نہ کسی کو منہ لگاتا ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے ملیریا جیسی بیماریاں پھیلتی ہیں۔"

ہم نے کہا "وہ مچھر ہی کیا جو مخلوق خدا کو زخمی نہ کرے اور ملیریا نہ پھیلائے۔"

بولے "کم از کم امریکا میں تو ایسا ہی مچھر ہوتا ہے۔ یہ بہت انسان دوست چیز ہے۔ آدمیوں سے دور دور ہی رہتا ہے۔"

"تو پھر اسے مچھر کہنا مچھروں کی توہین ہے" ہم نے کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ نہ شکل و صورت مچھروں جیسی نہ ہی مچھروں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ ملیریا بھی نہیں پھیلاتا'

تف ہے ایسے مچھر پر۔"

امریکی قوم پر یہ قدرت کی مہربانی ہی تو ہے کہ اس سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے مچھروں سے محفوظ رکھا ہے ورنہ تیسری دنیا کے ملکوں میں مچھر جو غضب ڈھاتا ہے وہ کوئی راز نہیں ہے۔ ہمیں بے اختیار احمد ندیم قاسمی صاحب کی کہانی یاد آگئی۔ قاسمی صاحب نے لکھا کہ وہ اپنے ایک دوست کے ہمراہ سرگودھا یا میانوالی کے کسی دور دراز علاقے میں گئے۔ انہیں پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ دیکھیے۔ مچھروں سے ہوشیار رہیے گا۔ یہاں کے مچھر بہت خوفناک جان لیوا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب رات ہوئی تو سونے سے پہلے انہوں نے کمرے کی تمام کھڑکیاں' دروازے اور روشن دان بند کر دیے۔

چارپائی کے اردگرد مچھردانی کا خیمہ لگایا اور مطمئن ہو کر سو گئے۔ رات گئے کسی وقت بھن بھناہٹ کی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی جل رہی تھی۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو یہ دیکھ کر روح فنا ہو گئی کہ دو مچھر نما چیزیں دروازے میں کھڑی تھیں۔ ان کا قد چار پانچ فٹ ہو گا (دروغ برگردن راوی) حلیہ سو فیصد مچھروں جیسا تھا۔ کمرے کا دروازہ ان حضرات کے لیے ایک کھلونا ہی ثابت ہوا کیونکہ انہوں نے ایک دھکے سے دروازہ کھول دیا تھا اور اندر داخل ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان ظالموں کے سامنے مچھردانی کی بھلا کیا حیثیت تھی؟

ان میں سے ایک مچھر نے بھرائی ہوئی آواز میں دوسرے سے پوچھا "بھائی جان' یہ بتائیں کہ اس شکار کو ہم یہیں کھائیں یا گھر لے جائیں؟"

بھائی جان نے چھوٹے بھائی کو غصے سے گھورا اور ڈانٹ کر بولے "ارے احمق' اسے یہیں کھا لینا چاہیے۔ اگر ہم اسے گھر لے جائیں گے تو بڑے مچھر چٹ کر جائیں گے اور ہمارے حصے میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔"

یہ ڈائیلاگ سن کر راوی ڈر کے مارے بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہ کسی اسپتال میں تھا۔ اور دو تین دن کے بعد ہوش میں آیا تھا۔ خدا جانے یہ اس نے خواب دیکھا تھا یا واقعی حقیقت تھی۔ اگر حقیقت تھی تو ان دونوں مچھر بھائیوں نے اس کی جان بخشی کیوں کر دی تھی؟ ان سوالوں کے جواب راوی نے قارئین پر چھوڑ دیے تھے۔

دیکھیے ہم واشنگٹن اور ورجینیا کے درختوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بھٹک کر سرگودھا کے

جنگلوں میں پہنچ گئے۔ یہ بھی انسانی ذہن اور خیال کی کرشمہ سازی ہے۔ ایک لمحے میں انسان کا خیال ہزاروں لاکھوں میل کا سفر طے کر کے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے سائنس دانوں نے بھی اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ نگاہ اور آواز کی رفتار سے چلنے والے میزائل اور ہوائی جہاز تو ایجاد کرنا سائنس دانوں کے بس سے باہر ہے۔ ذرا خود ہی تصور فرمائیے کہ کون سا میزائل ایسا ہو گا جو ایک لمحے میں امریکا سے لاہور پہنچ جائے گا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!

جب ہم واشنگٹن کے گرد و نواح میں پہنچے تو وہ چیزیں دیکھنے کو ملیں جن کا ساری دنیا میں چرچا ہے۔ مثلاً واشنگٹن کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ایک وسیع و عریض عمارت نظر آئی جو حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد کار پارکنگ میں سینکڑوں ہزاروں کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ سبزہ زار بھی تھے۔ علمی صاحب نے مطلع فرمایا کہ یہ "پینٹاگون" یعنی امریکا کا دفاعی مرکز۔ یہ وہ جگہ ہے جو امریکی فوجی قوت اور ذہنوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ دنیا بھر میں جنگ چھیڑنے یا بند کرنے کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے اسی کی مدد لینی پڑتی ہے۔ یہ امریکی محکمہ دفاع کا دماغ ہے یا اعصابی مرکز سمجھ لیجیے۔ پینٹاگون ایسا نام ہے جس کی ہیبت سے دنیا لرزہ براندام ہے مگر جب ہم اس عمارت کے نزدیک سے گزرے تو کسی ہم سفر نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ قطعی اہمیت نہیں دی۔ پہلے دن تو ہم بھی بہت حیران ہوئے مگر جب اس راستے سے گزرنا معمول بن گیا تو ہم نے بھی پینٹا گون پر توجہ دینا بند کر دی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان کا ذہن چند لمحوں کے لیے ہی کوئی تاثر قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔

کینیڈی سینٹر، کیپیٹل ہل جو امریکی سیاست اور حکومت کا مرکز ہے۔ جہاں سینیٹ اور کانگریس کے اجلاسوں میں دنیا والوں کی قسمت کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ خوب صورت اور پر شکوہ عمارتیں ہیں مگر واشنگٹن میں رہنے والوں کے نزدیک ایک عام عمارت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ کیپیٹل ہل کے آس پاس خوب صورت پارک بہت دور تک پھیلا ہوا ہے یہاں سے لوگ گزرتے رہتے ہیں کوئی کیپیٹل ہل کو گھاس تک نہیں ڈالتا۔ یعنی بے توقیری کی انتہا ہے!

"آرلنگٹن کا قبرستان" واشنگٹن کی شہری حدود میں داخل ہوتے ہی نظر آ جاتا ہے۔

بڑا تاریخی قبرستان ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر اور امریکی ہیروز اس جگہ دفن ہیں۔ جنگوں میں وطن اور قوم کے لیے جانیں دینے والے گمنام سپاہیوں کی قبریں بھی یہاں تعمیر کی گئی ہیں۔ امریکا کے طول و عرض سے امریکی واشنگٹن کی سیاحت کرنے آتے ہیں تو اس قبرستان پر بھی حاضری ضرور دیتے ہیں۔ سیاحوں کے لیے بھی یہ بہت اہم ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ان لوگوں نے اپنے قبرستانوں کو بھی دنیا والوں کی زیارت گاہ اور مرکز نگاہ بنا دیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفے یہ ہوا کہ امریکا میں مقیم ایک پاکستانی نے کئی سال کی کوشش اور جدوجہد کے بعد اپنی بیگم کو امریکا بلایا تو واشنگٹن کے قابل دید مقامات دکھانے لے گئے۔ سب سے پہلے وہ انہیں آرلنگٹن لے گئے۔ سادہ لوح بیگم کو ان کی یہ حرکت بالکل پسند نہ آئی' انہوں نے اپنی والدہ کو خط لکھا "امی' یہ شخص جان بوجھ کر مجھے پاگل کرنا چاہتا ہے۔ آپ مجھے فوراً بلالیں ورنہ میرا انجام بہت برا ہو گا۔ اپنے داماد کی یہ حرکت ملاحظہ فرمائیے کہ واشنگٹن کی سیر کے بہانے مجھے قبرستان میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اگر تھوڑے دن اور میں یہاں رہی تو ایک دن اسی قبرستان میں پہنچ جاؤں گی۔"

لیجیے صاحب' ہم نے دریائے پوٹومک کو عبور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے امریکا کے دارالحکومت اور دنیا کی سب سے طاقتور اور بااختیار مملکت کے سربراہ کے ہیڈ کوارٹر ہمارے سامنے نمودار ہو گیا۔ واشنگٹن ایک حسین و جمیل شہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ مختلف انتہائی کشادہ سڑکوں سے گزر کر ہماری بس ایک جگہ رک گئی۔ یہ ہماری منزل تھی۔ سب لوگ خاموشی سے اترے اور اپنی اپنی راہ لی۔ ہمارا خیال تھا کہ اب علمی صاحب ٹیکسی کو پکاریں گے مگر انہوں نے کہا "وہ سامنے تو انڈی پینڈنس ایونیو نظر آ رہا ہے' آیئے پیدل چلتے ہیں۔"

یقین کیجیے' امریکی شہروں میں پیدل چلنا یورپ کے شہروں سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ایک تو یہاں کا ٹریفک بائیں کی بجائے دائیں جانب چلتا ہے۔ اس کے بعد سڑکوں پر نظر ڈالیے تو ہزار کشادہ' خوب صورت اور پر نظم سہی مگر ہمیں تو گورکھ دھندہ ہی معلوم ہوتی ہیں۔ کئی مقامات پر بے شمار سڑکیں یکجا ہو جاتی ہیں۔ خدا جانے کس حساب سے بنائی گئی ہیں۔ ہر دم تیز رفتار ٹریفک رواں دواں رہتا ہے۔ کس وقت کون سی سڑک کا ٹریفک رک جائے گا اور کس سڑک پر جاری ہو جائے گا' یہ جاننے کے لیے ایک عمر عزیز درکار ہے' کم از

کم ہم جیسے شخص کے لیے۔ مگر علیمی صاحب خضر کی صورت میں ہمارے رہنما تھے۔ اس لیے بے خوف و خطر ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ آپ نے عید، بقر عید کی نمازوں کے موقعے پر دیکھا ہو گا کہ امام صاحب کے بار بار بیان کرنے کے باوجود بہت سے لوگوں کو زائد تکبیروں کا حساب یاد نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ اپنی یاداشت پر بھروسہ کرنے کے بجائے کن انکھیوں سے آس پاس والوں کو دیکھتے رہتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ انہوں نے ہاتھ کانوں تک لے جا کر چھوڑ دیے تو انہوں نے بھی چھوڑ دیے۔ وہ رکوع میں یا سجدے میں گئے تو یہ بھی چلے گئے۔ انہوں نے سلام پھیرا تو انہوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قدر اعتماد کے ساتھ اتنی اندھی تقلید ہماری قوم صرف عید اور بقر عید کے موقعے پر ہی کرتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ آنکھیں بند کر کے آس پاس والوں کے پیچھے چل پڑتی ہے۔ ہمارا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ سڑکوں پر بے انتہا ٹریفک تھا، درجنوں سڑکوں پر بیسیوں ٹریفک، روشنیاں باری باری سبز، سرخ اور پیلی ہو رہی تھیں مگر قسم لے لیجیے جو ہم نے ٹریفک لائٹ پر توجہ دی ہو۔ ہماری نگاہ روشنیوں یا ٹریفک کے بجائے اکمل علیمی پر جمی ہوئی تھی۔ ہم نے گویا دل ہی دل میں کہہ لیا تھا کہ سڑک پر چلنے کے معاملے میں جو نیت اکمل صاحب کی، سو ہماری۔ یہ حکمت عملی بہترین ثابت ہوئی اور ہم بڑے اطمینان اور مکمل خیریت کے ساتھ اس ٹریفک کی بھول بھلیوں سے گزر کر بالآخر ایک بلند و بالا دور دور تک پھیلی ہوئی عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ علیمی صاحب نے مطلع فرمایا کہ یہ رہا ہمارا دفتر۔ یعنی وائس آف امریکا کا ہیڈ کوارٹر۔ یہ ایک سادہ مگر پر شکوہ اور باوقار عمارت تھی۔ یہاں تمام سرکاری عمارتوں کو ہم نے ایسا ہی پایا۔ سادہ مگر باوقار اور شاندار معلوم ہوا کہ اس لمبی چوڑی عمارت میں داخل ہونے کے مختلف راستے ہیں۔

وائس آف امریکا والوں کے لیے جو راستہ مخصوص تھا ہم کشادہ سیڑھیاں چڑھ کر اس میں داخل ہوئے اور ایک وسیع لاؤنج میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک جانب کاؤنٹر پر ایک سیاہ فام وردی پوش صاحب تشریف فرما تھے۔ یہ سیکیورٹی افسر تھے۔ امریکا میں ہم نے ہر عمارت میں سیکیورٹی افسر کو ضرور دیکھا اور سیکیورٹی افسر بھی آنے جانے والوں کو محض دیکھنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ پوری چھان بین اور اطمینان کیے بغیر پرندہ بھی اندر پر نہیں مار سکتا۔ علیمی صاحب نے ان صاحب کو بڑی بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ کیوں نہ کرتے آخر روز کے

آنے والے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے پرس میں سے اپنا سیکیورٹی کارڈ نکال کر انہیں پیش کرنا ضروری سمجھا۔ انہوں نے بھی کارڈ کو بہت غور سے دیکھا اور پھر واپس لوٹا دیا۔ اس کے بعد علیمی صاحب نے ان سے ہمارا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ صحافی اور فلم ساز ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ ان کے لیے ایک عارضی کارڈ درکار ہے۔ ان صاحب نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور خالص سیاہ فاموں کے لہجے میں بولے "مین۔ یو فرام پاکستان۔ گڈ فرینڈ۔"

اس طرح ہمیں امریکا کی دوستی کا زبانی سرٹیفکیٹ عطا کرنے کے بعد انہوں نے دراز میں سے ایک کارڈ نکالا۔ اس پر ہمارا نام لکھا اور اسے ہماری قمیص پر ٹانک دیا۔ کوئی اجنبی شخص اس شناخت کے بغیر عمارت کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر اندر پہنچ بھی جائے تو عمارت میں ہر وقت گشت لگانے والے کسی سیکیورٹی افسر کی نظروں سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

وائس آف امریکا کا ہیڈ کوارٹر کئی منزلہ ہے اور اس قدر بڑا ہے کہ ہم تو چلتے چلتے تھک گئے۔ پہلے تو ہم لفٹ سے اوپر گئے۔ پھر اس مربع نما عمارت کی وسیع و عریض گیلری میں چلنا شروع کر دیا۔ سارے کمرے ایک ہی جیسے نظر آئے۔ مختلف زبانوں کی نشریات کے لیے علیحدہ علیحدہ کمرے مخصوص تھے۔ کافی دیر تک ہم گیلریوں میں سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک جگہ پہنچ کر علیمی صاحب نے خوش خبری سنائی کہ ان کا کمرا آگیا ہے۔ باہر سے دیکھنے میں یہ کمرا بھی دوسروں سے مختلف نہیں تھا۔ ان سارے ایک جیسے کمروں کے اندر بیٹھنے والے الگ الگ تھے۔ مثال کے طور پر اس کے برابر والے کمرے میں بنگالی سروس کا دفتر تھا۔ کچھ فاصلے پر ہندی سروس کا کمرا تھا۔ جتنی زبانیں، اتنے ہی کمرے اور یہ تو آپ شاید جانتے ہوں گے کہ وائس آف امریکا دنیا بھر کی اہم زبانوں میں پروگرام نشر کرتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ دن رات چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے۔

اردو سروس کے اندر داخل ہوئے اور بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اکثر سے غائبانہ شناسائی تھی۔ ہمارے واشنگٹن پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی مگر انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ دوسرے ہی دن ہم ان کے دفتر میں پہنچ جائیں گے۔ امریکا میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ لوگ دفتر میں بیٹھ کر گپ شپ کے لیے وقت نکالیں لیکن صحافی اس اصول سے مبرا

ہیں۔ اکمل علیمی نے فوراً اپنی مصروفیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسٹوڈیو میں چلے گئے اور ان میں سے جو حضرات فرصت پاتے رہے وہ باری باری ہم سے مصروف گفتگو رہے چائے اور کافی صحافیوں کی خوراک ہے چنانچہ اس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ہم پاکستان کا احوال سناتے رہے وہ امریکا کے بارے میں بتاتے رہے۔ کچھ دیر بعد علیمی صاحب اسٹوڈیو سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے ہمارے نام سے بینک آف واشنگٹن میں اکاؤنٹ کھول دیا تھا اور اب ہمیں بنفس نفیس بینک میں لے جانا چاہتے تھے۔ دراصل ان کے ہمراہ دفتر جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ امریکا میں یہ دستور ہے کہ لوگ نقد رقم اپنے پاس نہیں رکھتے۔ چیک بک رکھتے ہیں اور سارے کام چیک بک کے ذریعے ہی انجام پاتے ہیں۔ ہر جگہ چیک کے ذریعے ادائی کی جاسکتی ہے لیکن اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔ یہ نہیں کہ کسی نے بھی چیک کاٹ کے کسی دکاندار کو دیا اور اس نے شکریہ ادا کر کے سامان خریدار کے حوالے کر دیا۔ جی نہیں' امریکی اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ کم از کم روپے پیسے کے معاملے میں تو ہرگز نہیں ہیں۔ چیک قبول کرنے سے پہلے وہ چیک دینے والے کی شناخت ضرور دیکھتے ہیں۔ شناخت کے طور پر عموماً دو چیزیں یعنی سوشل سیکیوریٹی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس ضروری ہوتے ہیں۔ ہم ان دونوں ہی سے محروم تھے۔ سوشل سیکیوریٹی کارڈ تو امریکا میں رہنے والوں کو ہی ملتا ہے اور علیمی صاحب نے ہمیں سادہ فارم مہیا کر دیے تھے۔ جو ہم نے پُر کر کے ڈاک کے ذریعے روانہ کر دیے تھے۔ ایک مہینے بعد ہمیں اور ہماری بیگم کو گھر بیٹھے ہی سوشل سیکیوریٹی کارڈ مل گیا۔ رہا ڈرائیونگ لائسنس تو وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ ہم نے ڈرائیونگ لائسنس کیسے حاصل کیا یہ داستان آگے سنائیں گے۔

ہم علیمی صاحب کے ہمراہ بینک روانہ ہوئے تو سیکیوریٹی افسر نے ہمارا شناختی کارڈ واپس لے لیا۔ بینک دفتر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تین چار منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم بینک میں پہنچ گئے۔ کشادہ اور خوب صورت عمارت تھی۔ بڑے سے ہال میں خوب صورت فرنیچر سجا ہوا تھا اور سبھی لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ بائیں جانب ایک بڑی سی چمکدار میز کے پیچھے ایک بلیک خاتون تشریف فرما تھیں اور کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ یہ بینک آفیسر تھیں۔ امریکی بینکوں میں عملہ زیادہ تر خواتین پر مشتمل ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے ہر عہدے پر عام طور پر خواتین ہی فائز ہوتی ہیں۔ خاص طور پر نچلا اسٹاف خالص زنانہ ہوتا ہے۔ مرد ہوتے بھی ہیں تو محض نمونے کے طور پر۔

علیمی صاحب ہمیں لے کر ان خاتون کی میز کے پاس چلے گئے۔ ان کا نام غالباً جینی یا جرمین تھا۔ کہنے کو وہ سیاہ فام تھیں مگر اس سیاہی میں بھی ایک ملاحت تھی۔ ناک نقشہ انتہائی موزوں' جسم متناسب' قد میں وہ ہم سے کچھ لمبی ہی ہوں گی مگر بہت دلکش شخصیت تھیں۔ ہم تو انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔ علیمی صاحب سے ان کی اچھی جان پہچان تھی۔ انہوں نے ہمارا تعارف کرایا اور بتایا کہ پاکستان سے آئے ہیں۔ میں نے ان سے سفارش کی ہے کہ آپ کے بینک میں اکاؤنٹ کھولیں۔ مس جینی تو یہ سن کر نہال ہو گئیں۔ علیمی صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ پھر ہم سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور شکر گزاری کا اظہار کیا۔ اس کے بعد فوراً ایک فارم ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کوئی مشکل ہو تو بلا جھجک بتائیے گا۔ بلکہ اگر آپ کہیں تو یہ فارم میں پُر کر دیتی ہوں۔

علیمی صاحب نے کہا "شکریہ۔ مگر انہیں بینک کا فارم بھرنا آتا ہے۔ یہ پاکستان سے آئے ہیں اور وہاں بھی بینکوں میں اکاؤنٹ رکھنے کے عادی ہیں۔"

"اوہ" وہ بڑی شرمندگی سے مسکرائیں پھر انہوں نے بتایا کہ وہ انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں سے واقف ہیں۔ انڈین فلمیں بہت شوق سے دیکھتی ہیں۔ پھر پوچھا "آپ کی پاکستانی فلمیں کیسی ہوتی ہیں؟"

علیمی صاحب نے بتایا کہ یہ خود بھی فلمیں بناتے ہیں۔ فلم پروڈیوسر اور رائٹر ہیں۔ مس جینی یہ سنتے ہی سروقد کھڑی ہو گئیں۔ ایک بار پھر ہم سے مصافحہ کیا اور بہت دیر تک "اوہ' اوہ" کہتی رہیں۔ ان کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ آخر کہنے لگیں "میرا خیال ہے کہ کافی پیش کرنی چاہیے" یہ کہہ کر وہ دلکشی سے چلتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔ ان کا سراپا ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اب چال کی دلکشی دیکھی تو ان کی کشش اور خوب صورتی کے مزید قائل ہو گئے۔

ہم نے علیمی صاحب سے پوچھا "کیا بات ہے۔ یہ اتنی گھبرا کیوں گئی ہیں؟"

وہ بولے "ارے بھائی' فلم پروڈیوسر امریکا والوں کے لیے بہت بڑی توپ چیز ہے۔ یہ تو کئی دن تک اپنے ملنے والوں کو بتاتی رہے گی کہ میں نے ایک فلم پروڈیوسر دیکھا ہے اور اس سے ہاتھ بھی ملایا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں بوکھلاہٹ اور خوشی کے مارے اس کے زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔"

ہمیں اس محاورے پر مزید یقین آ گیا کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیرون ملک خصوصاً یورپ اور امریکا میں ہم نے یہی دیکھا کہ فلم پروڈیوسر کا نام سنتے ہی سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور چہرہ تمتمانے لگتا ہے۔ یہ قدر دانی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ وہیں رہ پڑیں۔

مس جینی لہلہاتی ہوئی واپس آ گئیں۔ کافی کے دو کاغذ کے گلاس انہوں نے ہم دونوں کے سامنے رکھ دیے۔ تیسرا اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا اور بولیں "کتنی حیرانی کی بات ہے کہ میں ایک فلم پروڈیوسر کے ساتھ کافی پی رہی ہوں۔ اوہ' مجھے تو یقین نہیں آ رہا" یہ کہہ کر انہوں نے جلدی جلدی کافی کے چند گھونٹ بھرے اور پھر ہم سے کہا "آپ بھی نوش فرمائیے' بہت اچھی کافی ہے' خالص امریکن۔"

ہماری نگاہیں ان کے چہرے پر اور چمکتی ہوئی بڑی بڑی براؤن آنکھوں پر لگی ہوئی تھیں۔ گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور ایک گھونٹ لیتے ہی اچھو ہو گیا۔ بڑی مشکل سے

ہم سنبھلے۔ اس قدر تلخ' بدمزہ اور گرم کافی ہم نے پہلے کبھی نہیں چکھی تھی۔ دراصل امریکی "بلیک کافی" پیتے ہیں۔ بلیک کا مطلب یہ ہے کہ اس میں دودھ نہیں ڈالتے۔ مگر ظلم تو یہ ہے کہ وہ کافی میں چینی بھی نہیں ڈالتے یعنی محض کافی اور کافی گاڑھی۔ اتنی گرم کہ ہونٹوں سے لگانا بھی مشکل مگر وہ لوگ اس کے عادی ہوتے ہیں۔

"کیوں پسند آئی کافی؟" انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں دریافت کیا "یہ ہمارے ملک کی خاص کافی ہے۔"

امریکیوں کو اپنی چیزوں کی تعریف کرنے اور انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا بہت شوق بلکہ ارمان ہے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ بھی ہے۔ اس قوم کو لاشعوری طور پر یہ احساس ہے کہ دولت اور طاقت کے سوا فنون لطیفہ اور ثقافت کے میدان میں ان کے پاس دوسروں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس معاملے میں امریکی احساس کمتری کا شکار ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ یورپ' افریقہ' اور ایشیا کے چھوٹے چھوٹے ملک جو ان کے محتاج ہیں ثقافت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔

مصر کی تہذیب' یونان کی تہذیب' یورپ کے ممالک کی قدیم ثقافت۔ ایشیائی ملکوں کی تہذیب اور ان کا ثقافتی پس منظر' یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں امریکیوں کو اپنی تنگ دامانی کا شدت سے احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب اور جہاں بھی موقع پاتے ہیں اپنی مونچھ اونچی رکھنے کے لیے شیخیاں مارنی شروع کر دیتے ہیں۔ اب اس کافی کے مسئلے کو ہی لے لیجیے' بھئی کافی تو محض کافی ہوتی ہے۔ سوائے اس کے پبلسٹی یا عادت کے باعث کوئی کافی آپ کو زیادہ اچھی لگتی ہے ورنہ کافی' کافی میں اور کیا فرق ہے؟ ہم نے بچپن ہی سے "نیس کیفے" اور میکسویل کا نام سنا ہے اور وہی پیتے رہے ہیں لیکن امریکا والوں نے ایک اپنی کافی بنا رکھی ہے۔ جس کا نام سینکا ہے۔ یہ لوگ بڑے خلوص اور جوش و خروش سے اس کافی کی تعریف کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمیں پہلے بالکل علم نہیں تھا کہ امریکیوں کی "اپنی" کافی بھی ہے اور اس معاملے میں یہ کافی زود رنج واقع ہوئے ہیں مگر جب احساس ہو گیا تو ہم نے بھی ڈپلومیسی سے کام لینا شروع کر دیا لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔

مس جینی کے استفسار کے جواب میں ہم نے اخلاقاً خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زہر ہلاہل نے ہمارے حلق کو قریب قریب بند کر کے رکھ دیا

تھا۔ بھلا خود ہی سوچئے کہ ایک تو دودھ اور چینی کے بغیر کافی' اس پر انتہائی گاڑھی۔ اس ک
بھلا کیا تعریف کی جائے؟ مگر انسان کو اخلاق کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔
اس لیے ہم نے مسکرا کر کہا "واقعی بہت تلخ اور گرم ہے۔"

شاید یہ بات انہیں پسند نہیں آئی۔ تلخ اور گرم تو کوئی تعریف نہ ہوئی۔

کہنے لگیں "یہ امریکی کافی ہے' بہت اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے۔"

ہم نے سوچا کہ اگر مزید تکلف کیا تو یہ زہر پینا بھی پڑے گا۔ اس لیے عرض کیا "واق
بہت اچھی ہے لیکن آپ مائنڈ نہ کریں تو تھوڑی سی چینی منگوا دیں۔"

انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا "چینی! اس کا کیا کریں گے؟"

"کافی میں ڈالیں گے۔"

"اوہ" بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔

ہم نے کہا "دراصل ہمیں دودھ اور چینی کے ساتھ کافی پینے کی عادت ہے۔"

بولیں "تو پھر وہ کافی تو نہ رہی' مکسچر ہو گیا۔"

ہم نے کہا "ہم لوگ مکسچر ہی پینے کے عادی ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ
چائے میں بھی دودھ اور چینی ملا کر پیتے ہیں۔"

"اوہ! واقعی!"

علیمی صاحب نے فوراً صفائی پیش کی "مس جینی دراصل ہم لوگ بہت عرصے ت
انگریزوں کے غلام رہے ہیں نا اس لیے ان ہی جیسی عادتیں ہو گئی ہیں ہماری۔"

ہم نے کہا "مثلاً سڑک پر بائیں ہاتھ چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں سمجھ گئی۔ کوئی بات نہیں' اٹ از اوکے" وہ ایک بار ہاتھ لہراتی ہ
اٹھ کر گئیں اور چینی کے چند ٹکڑے ایک پلیٹ میں رکھ کر لے آئیں۔ کافی کا موضوع
ہوا تو انہوں نے ایک بار پھر فلموں کا ذکر چھیڑ دیا۔

کہنے لگیں "آپ کی انڈین فلمیں واقعی بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔"

"وہ ہماری نہیں ہوتیں' ہماری تو پاکستانی فلمیں ہوتی ہیں۔"

"ان دونوں میں کیا فرق ہے؟"

ہم کچھ بوکھلا سے گئے "فرق! فرق بس بہت معمولی سا ہے۔"

"کیا آپ کی فلموں میں بہت سے گانے اور ڈانس ہوتے ہیں۔ ہیروئن اور ہیرو اچھلتے
کودتے ہوئے گانے گاتے ہیں' سڑکوں اور باغوں میں رومانس کرتے ہیں؟"

"بالکل' بالکل۔"

وہ کھو سی گئی "اوہ۔ کیسے رومانٹک ملک ہیں! میں ایک چھٹی منانے وہاں ضرور جاؤں
گی۔ کتنی آزادی ہے آپ لوگوں کو محبت کرنے کی۔ جب جی چاہا محبت شروع کر دی۔
جہاں جی میں آئے گانے لگے۔ گانا اور ڈانس تو شاید آپ لوگوں کے کلچر کا حصہ ہے۔"

"ہمارے کلچر کا نہیں' انڈین کلچر کا" ہم نے تصحیح کی۔

"مگر ابھی آپ نے بتایا ہے کہ آپ کی فلموں میں بھی ایسے ہی گانے اور ناچ ہوتے
ہیں" ہیرو اور ہیروئن بازار اور باغ میں کھڑے ہو کر پیار بھرے مکالمے بولتے ہیں؟"

"ہاں' ہوتے تو ہیں" ہم نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"انڈین فلموں میں گانے اور ڈانس بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ مجھے تو بہت پسند ہیں۔"

"کیا آپ گانوں کا مطلب سمجھ لیتی ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"بالکل نہیں' اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بس کانوں کو اچھے لگتے ہیں۔ جب ہیروئن
اچھل اچھل کر گاتی ہے تو بہت مزہ آتا ہے۔ ویسے بھی پیار کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ معلوم
ہوتا ہے کہ آپ لوگ بہت رومانٹک ہوتے ہیں۔ کوئی فلم محبت سے خالی نہیں ہوتی۔
مجھے تو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ وہاں معاشرہ بہت کشادہ دل اور حقیقت پسند ہے۔
پیار کرنے والوں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ جب چاہے' جہاں چاہے محبت کا اظہار
کرنے لگتے ہیں۔ ان کے پاس وقت بھی کتنا زیادہ ہوتا ہے" انہوں نے ایک سرد آہ بھری
"ایک ہم لوگ ہیں کہ کسی وقت کاموں سے فارغ ہی نہیں ہوتے۔ یہ بھی کوئی زندگی
ہے؟" وہ اداس ہو گئیں۔

ہمارے کاغذات مکمل ہو چکے تھے۔ مس جینی نے ہمیں اکاؤنٹ کھولنے پر مبارک باد
دی اور ایک بار پھر ہم سے ہاتھ ملایا۔ پھر بولیں "آپ ہمارے اکاؤنٹ ہولڈر ہو گئے ہیں'
اب آپ اپنے لیے چیک بک پسند کر لیجیے۔"

"کیا مطلب؟" ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ یہ چیک بک پسند کرنے والی بات
ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

انہوں نے برابر والی میز پر سے ایک البم نما چیز اٹھائی اور ہمارے سامنے رکھ دی "دیکھ کر بتائیے کہ آپ کو کیسی چیک بک درکار ہے۔"

ہم نے البم کھولا تو وہ مختلف چیک بکوں کے نمونوں سے بھری پڑی تھی۔ امریکا میں چیک بک عموماً سادہ نہیں ہوتی۔ سرورق پر مختلف قسم کے ڈیزائن ہوتے ہیں اور کاغذ بھی عمدہ اور چکنا۔ البم طرح طرح کے نمونوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہر چیک پر اکاؤنٹ ہولڈر کا نام اور پتا بھی خوب صورتی سے چھپا ہوتا ہے۔ ہم تو بہت متاثر ہوئے۔ اتنی خوب صورت رنگین چیک بک اور ایسے خوش نما چیک' بھلا کس کا جی چاہے گا چیک کاٹنے کو۔

ہم نے ایک خوش رنگ اور خوب صورت چیک بک کا نمونہ پسند کیا۔ مس جینی کو بھی یہ ڈیزائن اچھا لگا۔ بولیں "کتنی چیک بکیں چھپوا دوں؟"

علمی صاحب ہماری پریشانی دیکھ کر جلدی سے کہنے لگے "عام طور پر دو ہزار چیک چھپوائے جاتے ہیں۔"

"دو ہزار چیک!" ہماری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

مس جینی نے وضاحت ضروری سمجھی' برابر میں رکھا ہوا ایک پیکٹ اٹھایا اور اسے کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کے اندر پچاس پچاس چیکوں پر مشتمل خوبصورت چیک بکیں کتابوں کی طرح رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پیکٹ میں پانچ سو چیک والی چیک بکیں تھیں۔

"مگر اتنے بہت سی چیک بکوں کا ہم کریں گے کیا؟"

علمی صاحب ہنسنے لگے پھر انہوں نے ہمیں بتایا کہ امریکا میں فقط لین دین نہیں ہوتا' چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی رقم کے لیے چیک کاٹا جاتا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ ایک دن میں کتنے چیک کاٹنے پڑتے ہیں۔

"ٹھیک ہے" ہم نے کہا "ایک ہزار چیکوں والی چیک بکیں ہمیں بھی بنوا دیں۔"

مس جینی نے کیل کولیٹر سنبھال کر کچھ حساب لگایا اور پھر کہا "سات ڈالرز اور ساٹھ سینٹ لاگت آئے گی۔ جو آپ کے اکاؤنٹ میں سے وضع کر لی جائے گی۔"

ہم بھلا کیا کہہ سکتے تھے۔ چپ چاپ سرہلاتے رہے۔ یکایک انہوں نے پوچھا "آپ کو

فی الحال ضرورت ہو تو ایک سادہ چیک بک لے لیجئے" اور ایک دبلی پتلی چیک بک نکال کر ہمارے حوالے کر دی۔ ہمیں خیال آیا کہ ہم نے تقریباً ساری رقم بینک میں جمع کرا دی تھی۔ اخراجات کے لیے کچھ کیش لینا بھی ضروری تھا۔

وہ بولیں "آپ اگر چیک کیش کرانا چاہیں تو وہ سامنے والی کھڑکی پر ڈولی آپ کی مدد کر دے گی۔"

ہم اٹھ کر ڈولی کے پاس چلے گئے۔ پانچ سو ڈالر کا ایک چیک بنایا اور مس ڈولی کے حوالے کر دیا۔ یہ ایک سفید فام خاتون تھیں۔ سفید رنگت کے سوا ان میں کوئی اور خوبی نظر نہیں آئی۔ بشرطیکہ آپ سفید رنگ کو خوبی سمجھتے ہوں۔

وہ ہماری جانب دیکھ کر مستقل مسکرائے جا رہی تھیں۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے ہم سے چیک وصول کیا۔ اس پر نظر ڈالتے ہی ان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ انہوں نے باری باری حیران ہو کر چیک کو اور ہمیں دیکھا اور پھر پوچھا "کیا یہ آپ ہی کا چیک ہے؟"

ہم نے سرہلا کر اقرار کیا۔

انہوں نے ایک لمحہ کچھ سوچا اور پھر "ایکسکیوزمی" کہہ کر غائب ہو گئیں۔

ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس میں پریشانی کا سبب کیا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ نمودار ہوئیں اور بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ذرا آپ میرے ساتھ آئیں گے' وائس پریذیڈنٹ مسٹر بک آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

ہم اس عزت افزائی پر حیران رہ گئے۔ خیر' وائس پریذیڈنٹ صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ انہوں نے مسکرا کر خیر مقدم کیا اور سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد پوچھا "آپ نے ابھی ہمارے بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولا ہے؟"

"جی ہاں۔"

وہ قدرے سوچنے کے بعد بولے "میں پوچھ سکتا ہوں کس لیے؟"

ہم نے کہا "خرچ کرنے کے لیے۔"

"مگر آپ کے پاس چیک بک بھی تو ہے" دیکھیے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اپنے پاس اتنا زیادہ کیش نہ رکھیں۔ جب مجھے پتا چلا کہ آپ اتنی بڑی رقم نکالنا چاہتے ہیں تو میں پریشان ہو گیا۔"

ان کی اس پریشانی پر ہم خود بھی پریشان ہو گئے۔ پاکستان ایک غریب ملک ہے مگر وہاں
کوئی بھی شخص چیک لے کر بینک میں جاتا ہے اور ہزاروں لاکھوں روپے کیش لے کر چلا
جاتا ہے۔ کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا' نہ پریشانی کا اظہار کیا مگر امریکا جیسے دولت مند ملک
میں ہم نے پانچ سو ڈالر کی رقم کیش لینے کا ارادہ کیا تو معاملہ وائس پریذیڈنٹ تک پہنچ گیا
اس وقت ایک ڈالر کی قیمت دس روپے تھی۔ اگر ہم پانچ ہزار روپے کی رقم کیش کرا رہے
تھے تو کون سی قیامت آ گئی؟

ہم نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا "اگر پانچ سو ڈالر کا چیک کیش کرانا قانون کے خلاف
ہے یا کوئی جرم ہے تو اور بات ہے ورنہ یہ ہماری رقم ہے۔ ہمیں کیش وصول کرنے کا حق
حاصل ہے۔ بینک کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ کچھ کھسیانے سے ہو گئے "مسٹر علی' آپ ناراض نہ ہوں۔ بینک کو بھلا کیا اعتراض
ہو سکتا ہے۔ آپ ہمارے اکاؤنٹ ہولڈر ہیں۔ آپ کا پیسا ہے جس طرح چاہیں استعمال
کریں' ہم تو آپ ہی کے مفاد میں مشورہ دے رہے تھے۔"

ہم نے کہا "ہماری اس حرکت پر جتنی حیرت آپ کو ہوئی ہے' اتنے ہی حیران ہم آپ
کے رویے پر ہوئے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ کے ملک کا رواج کچھ اور ہے
ہمارے ملک میں کوئی اور طریقہ ہے۔ ہم دو دن پہلے ہی امریکا آئے ہیں اور اپنی عادتیں اتنی
جلدی بدل نہیں سکتے۔ ہم لوگوں کو ہر چیز نقد خریدنے کی عادت ہے۔ جب تک ہماری جیب
میں کیش نہ ہو خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں۔"

وہ مسکرانے لگے' بولے "کوئی بات نہیں' آپ چیک کیش کرا لیں مگر ایک مشورہ
ضرور یاد رکھیں' اپنی جیب میں بیس پچیس ڈالر سے زیادہ اور دس ڈالر سے کم کیش نہ
رکھیں۔"

"اس میں کیا مصلحت ہے؟"

"دیکھیے' کم سے کم کیش جیب میں رکھنے کا یہ فائدہ ہے کہ آپ کو اگر کسی نے لوٹ لیا
تو زیادہ نقصان نہیں ہو گا۔ کم سے کم دس ڈالر رکھنے میں یہ مصلحت ہے کہ اگر کسی کی
جیب میں ایک ڈالر بھی نہ ہو تو لٹیرے اور اچکے مار پیٹ کرنے سے بھی باز نہیں آتے
اس لیے کم سے کم دس ڈالر ہمیشہ جیب میں رکھا کیجیے۔"

"یعنی چوروں کو مطمئن کرنے کے لیے؟"

"جی ہاں' یہ بھی بہت ضروری ہے۔ امریکا میں آنے والے ہر ٹورسٹ کو یہی مشورہ دیا
جاتا ہے۔ یہ خود آپ کی حفاظت کے لیے بہت ضروری ہے۔"

دیکھا آپ نے' امریکا کیسا عجیب و غریب ملک ہے؟ یہاں کی حکومت اور انتظامیہ
چوروں اور لٹیروں کے آگے کتنی بے بس ہے کہ انہیں رشوت دینے کا مشورہ دیتی ہے!

اگلے روز ویک اینڈ شروع ہو رہا تھا۔ یعنی ہفتہ اور اتوار۔ یہ دو دن ہفتہ وار چھٹی کے ہوتے ہیں اور ان ہی دنوں میں لوگ اپنے گھر کے کام اور دوسرے فرائض بھگتاتے ہیں مگر علمی صاحب نے ہمیں واشنگٹن کی سیر کرانے کا ارادہ کیا۔ ہفتے اور اتوار کے روز سڑکوں پر ٹریفک بہت کم ہوتا ہے کیونکہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں ہی رہتے ہیں۔ ویک اینڈ یعنی ہفتے کی رات کو رت جگا منانے والے بھی صبح دیر تک سوتے رہتے ہیں اس لیے سڑکوں پر بہت سکون اور امن ہوتا ہے۔ نہ ٹریفک جام' نہ لمبی لمبی قطاریں' ہم بڑے سکون سے صبح ناشتے کے بعد گھر سے نکلے اور آدھے پونے گھنٹے میں واشنگٹن پہنچ گئے۔ عام دنوں میں یہ فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہوتا ہے حالانکہ سڑکوں اور ٹریفک کا نظام انتہائی قابل تعریف ہے۔ علمی صاحب نے ہمیں مختلف قابل ذکر مقامات دکھائے۔ ہر جگہ تصویریں بھی اتاری گئیں۔ وہ عمارتیں اور مقامات جن کے بارے میں ہم صرف سنا اور پڑھا کرتے تھے۔ بنفس نفیس ہماری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ یہ واشنگٹن کا نہایت سرسری سا دورہ سمجھ لیجئے۔ اس شہر کی خوب صورتی دل کو موہنے والی ہے اور چھٹی کے دن ہجوم اور رش کی عدم موجودگی میں شہر کی آب و تاب میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

ہم امریکی صدر کی رہائش گاہ وہائٹ ہاؤس کے سامنے پہنچے۔

"یہ وہائٹ ہاؤس ہے۔"

اچھا' وہائٹ ہاؤس ایسا ہوتا ہے۔ تصویروں میں تو اس کے کچھ حصے ہی دکھائے جاتے ہیں۔ اس وقت وہائٹ ہاؤس کی پوری عمارت ہمارے سامنے تھی۔ ایک کافی بڑی' عام سی سفید رنگ کی مانوس سی عمارت تھی۔ ارد گرد سرسبز لان اور پھولوں کے تختے۔ چاروں طرف دیوار کے بجائے آہنی جنگلے لگے ہوئے تھے۔ نہ چوکی نہ پہرہ' نہ دھوم دھام۔ عمارت

کے اندر نہ باہر' کوئی نظر نہیں آیا۔ ہم آہنی جنگلوں کے پاس جا کر تصویریں بنانے لگے۔ پارو کب نچلی بیٹھنے والی تھی۔ وہ بندر کی طرح جنگلے پر چڑھ گئی۔ سات آٹھ فٹ اونچا جنگلا زیادہ بلند نہیں ہوتا۔ جب وہ اس کے آخری کنارے تک چڑھ گئی تو ہمیں ڈر ہوا کہ کہیں اندر ہی نہ اتر جائے۔ بڑی مشکل سے اسے پکڑ کر کھینچا۔ اس دوران میں سامنے سڑک پر ٹریفک چلتی رہی' فٹ پاتھ پر سے لوگ گزرتے رہے مگر کسی نے روک ٹوک نہیں کی۔ صرف اس کی بچگانہ حرکتوں پر مسکرا کر رہ جاتے تھے "یہ تو سیکیوریٹی نہ ہوئی" ہم نے سوچا۔ امریکی صدر کی رہائش گاہ اور اتنی غیر محفوظ" ہماری چشم تصور میں لاہور کا گورنر ہاؤس گھوم گیا۔ پنجاب کے گورنر کی یہ رہائش گاہ بلا مبالغہ ہر اعتبار سے وہائٹ ہاؤس سے بڑی ہے۔ نہ صرف اس کی عمارت بلکہ آس پاس کا رقبہ بھی وہائٹ ہاؤس سے زیادہ بڑا ہے۔ اور پھر وہاں تو آس پاس قلعہ نما اونچی اونچی دیواریں موجود ہیں جن کے دوسری جانب عام آدمی کی نگاہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ خود اس کی رسائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہے پھر دروازے کے سامنے محافظوں کا پہرہ رہتا ہے۔ کیا مجال جو کوئی ایرا غیرا گیٹ کے نزدیک بھی پھٹک سکے۔ اگر یہ حرکت بلکہ گستاخی پارو نے لاہور میں گورنر ہاؤس کی دیوار کے ساتھ کی ہوتی تو شاید اسے دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہی کر لیا جاتا۔

وہائٹ ہاؤس کو ایک اور برتری حاصل ہے کہ اس کے اندر عام آدمی بھی جا سکتے ہیں۔ مقررہ وقت میں لوگ لمبی لمبی قطاریں بنا کر صبر کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں اور باری باری امریکی صدر کی رہائش گاہ میں داخل ہو کر اس طلسماتی عمارت کے در و بام کو دیکھ سکتے ہیں۔ وہائٹ ہاؤس کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ امریکا جیسے امیر و کبیر اور عظیم ملک کے با اختیار صدر کے رہنے کی جگہ اور اتنی معمولی اور سادہ!

صدر کے نجی رہائشی کمروں کے سوا عمارت کا باقی حصہ سیاحوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔ اس دوران میں مختلف سرکاری عہدے دار گیلریوں اور راہداریوں میں سے گزر کر جاتے ہوئے بھی نظر آ جاتے ہیں۔ کئی بار تو ان یاتریوں کی ملاقات صدر صاحب سے بھی ہو جاتی ہے اور وہ "ہائی" کہہ کر سامنے سے گزر جاتے ہیں۔

امریکیوں کی یہ بات ہمیں بالکل پسند نہیں آئی۔ اپنے صدر کا بالکل رعب داب نہیں رکھا۔ ہمارے ہاں تو آپ ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ میں بھی اتنی آسانی سے داخل ہونے کی

جرات نہیں کر سکتے۔ علیمی صاحب نے ہمیں کچھ اور مقامات بھی دکھائے جن کا تذکرہ آگے ہو گا۔ واشنگٹن میں بھی میوزیم لاتعداد ہیں۔ آرٹ گیلریاں' میوزیم اور تفریح گاہیں اب مغربی کلچر کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ امریکا بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ یورپ کے چھوٹے چھوٹے پرانے تاریخی شہروں میں میوزیم جتنی زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں امریکا میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں لیکن جو بھی ہیں بہت اعلیٰ معیار کے ہیں اور وسیع پیمانے پر بنائے گئے ہیں۔ اسمتھ یونین واشنگٹن کا مشہور میوزیم ہے لیکن قابل ذکر چیز ائر اینڈ اسپیس میوزیم ہے۔ یہ ایک بہت بڑا' سلیقے اور اہتمام سے بنایا ہوا میوزیم ہے۔ سائنس نے فضائی پرواز اور خلا کے سلسلے میں جو بھی ترقی کی ہے اس کے مختلف مدارج اس میوزیم میں دیکھ لیجیے۔ انسانوں نے کس طرح اڑنا شروع کیا۔ پہلا ہوائی جہاز کس طرح اور کب معرض وجود میں آیا پھر فضائی شعبے میں سائنس نے کیسی ترقی کی اور خلا میں پہنچنے کے لیے کیا بندوبست کیا گیا؟ یہ سب مرحلے اس میوزیم میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مختلف ہوائی جہازوں کے نمونے بلکہ اصلی ہوائی جہاز بھی یہاں موجود ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میوزیم کی وسعت کتنی ہو گی۔ خلائی شٹل اور انسانی ترقی کے مختلف مدارج کے ساتھ ساتھ پہلے خلائی انسان کے چاند تک رسائی حاصل کرنے کے مناظر بڑی تفصیل سے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تو اور چاند کی سطح سے لایا ہوا پتھر بھی ایک جانب بڑی خوب صورتی سے سجا کر رکھا گیا ہے۔ اسی عمارت کے اندر ایک سنیما گھر بھی موجود ہے۔ ان دنوں میں اس سنیما میں د[illegible] اسکرین کے تازہ ترین تجربے کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ یہ اسکرین سنیما ہال کے تمام اطراف میں پھیلا ہوا ہے اور جب فلم شروع ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے دیکھنے والا خود اس ہوائی جہاز یا غبارے میں سوار ہے جو مختلف خطرناک مقامات سے گزرتا ہوا محو پرواز ہے۔ خواتین' بچوں اور کمزور مردوں کی تو بعض اوقات چیخیں نکل جاتی ہیں۔ بہر حال: ایک انتہائی دلچسپ اور انوکھا تجربہ ہے۔ ائر اینڈ اسپیس میوزیم میں داخلہ بالکل مفت ہے لیکن اس فلم کو دیکھنے کے لیے سنیما ہال کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے اور اکثر اوقات رش کی وجہ سے ایڈوانس بکنگ بھی کرانی پڑتی ہے۔ یہ ایک نہایت لمبی چوڑی عمارت ہے۔ بڑے سلیقے سے سجی ہوئی ہے۔ مکمل ائر کنڈیشنڈ ہے۔ یہاں فضائی نمونوں کے علاوہ اس موضوع کے بارے میں دنیا جہان کی کتابیں اور تصاویر بھی دستیاب ہیں اور علیحدہ علیحدہ کمروں میں دیکھا

فلموں کے شو مستقل طور پر دکھائے جاتے ہیں۔ آنے جانے والوں کو بیٹھنے کے لیے جگہ جگہ آرام دہ صوفے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ میوزیم کے لاؤنج میں' ایک قطار میں دس بارہ نہایت خوبصورت ٹیلی فون بوتھ لگے ہوئے ہیں جن میں سکے ڈال کر آپ آرام سے گفتگو کر سکتے ہیں بلکہ چاہیں تو یہاں سے دنیا میں کسی بھی جگہ کھڑے کھڑے بات کر سکتے ہیں۔ یہ میوزیم تو ہمیں پسند آیا ہی لیکن اپنی جدت اور ندرت کے علاوہ اس کا ایک اور پہلو بھی ہمیں بہت بھایا۔ یہ عمارت واشنگٹن میں مشہور و معروف ہے۔ تجارتی اور دفتری علاقے کے درمیان میں ہے اور یہاں بیٹھنے کا بھی انتظام ہے۔ عمارت کے باہر اور آس پاس کھانے پینے کی اشیا آئس کریم' کولڈ ڈرنکس اور کافی وغیرہ بھی بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ ہم نے اس کا یہ مصرف نکالا کہ اس سائنس میوزیم کو اپنے ذاتی دفتر کی حیثیت دے دی۔ بعد میں ہمیں جب بھی واشنگٹن میں کسی سے اپائنٹ منٹ کرنے کی ضرورت پیش آتی' اسے ہم یہیں کا پتا بتاتے تھے اور وقت دیتے تھے۔ ان دنوں خاصی گرمی شروع ہو چکی تھی۔ وہاں درجہ حرارت تو بہت زیادہ نہیں ہوتا لیکن حبس' ماحول کی کثافت اور کاروں کی افراط کے باعث یہ گرمی بھی خاصی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ائر اینڈ اسپیس میوزیم کے خشک ماحول میں ہمیں گرمی سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ یہ میوزیم اپنی نوعیت کا انوکھا ہے اس لیے سیاحوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ رنگ برنگے مختلف ڈیزائنوں کے ملبوسات میں خوب صورت خواتین' مرد' بچے سبھی بہت بڑی تعداد میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو بذات خود دل بستگی اور تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ ہم تو اپنے آپ کو ہی بہت ہوشیار سمجھتے تھے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ہماری طرح دوسرے لوگ بھی اس عمارت کو ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یہاں رومانی ملاقاتیں کرتے ہیں اور اسے "لو اسپاٹ" کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اگلے روز اتوار تھی۔ علیمی صاحب دیر تک سوتے رہے کہ لے دے کر یہی ایک عیاشی کبھی کبھی انہیں نصیب ہو جاتی تھی۔ ان دنوں ایک آسانی یہ بھی تھی کہ ناشتہ انہیں تیار ملا کرتا تھا۔ اس لیے بے فکری تھی۔ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ان کے بیٹے موجود تھے۔ ان کے تو عیش ہو گئے تھے۔

ناشتے کے بعد انہوں نے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اخبار بینی اور اونگھنا شروع کر دیا اور

ہم نے ٹیلی فون سنبھالا اور ڈائریکٹری سے جن ریالٹرز کے نمبر نوٹ کر لیے تھے انہیں فون گھمانے شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں طرح طرح کی آوازیں اور نت نئے لب و لہجے سننے پڑے۔ ہم امریکی لب و لہجے سے اس لیے آشنا تھے کہ مدت سے امریکی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان کی باتیں سمجھنے میں قدرے آسانی ہو گئی۔ یہ تو نہیں کہ ہم ان کی سو فیصد گفتگو سمجھ لیتے تھے مگر مطلب کی بات پلے پڑ ہی جاتی تھی۔

ہم نے مختلف نمبر گھمائے' دوسری طرف جن سے بات ہوئی ان میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ دفتر کے سیکریٹری اور ٹیلی فون وصول کرنے کی خدمات وہاں عام طور پر خواتین ہی کے سپرد تھیں۔ جیسے کہ بینکوں کا بیشتر چھوٹا بڑا عملہ خواتین پر مشتمل ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ بہت ملائمت اور شیرینی سے بات چیت کرتی ہیں اور جھگڑالو بھی نہیں ہوتیں۔ کام بڑے سلیقے اور نفاست سے کرتی ہیں۔

پہلے فون پر ایک صاحب سے بات چیت ہوئی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم کسی بزنس کی خریداری کے سلسلے میں ان کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

"کس قسم کا بزنس؟" انہوں نے دریافت کیا۔

ہم نے کہا "ریستوران' موٹیل' گفٹ شاپ' لانڈریٹ' گوگو بار ہر چیز میں ہمیں دلچسپی ہے۔"

وہ کچھ پریشان ہو گئے' پوچھنے لگے "سر' کیا آپ اکیلے ہیں؟"

ہم نے کہا "بالکل"

"اور اتنے بہت سے بزنس خریدنا چاہتے ہیں؟"

"اتنے بہت سے نہیں۔ ان میں سے صرف ایک۔ جو بھی ہمیں موزوں نظر آیا۔ وہ خرید لیں گے۔"

"قیمت نقد ادا کریں گے یا مورٹ گیج (قرضے پر) لیں گے؟"

ہم نے کہا "کوئی بات نہیں۔ نقد بھی ادا کر دیں گے۔"

وہ مرعوب ہو گئے اور جواب میں اس قدر شیریں بیانی کا مظاہرہ کیا کہ یوں لگا جیسے سراپا چینی کا مرتبان بن گئے ہوں۔ انہوں نے بڑے ادب سے ہمارا نام' پتا اور فون نمبر دریافت کیا اور کہا کہ بہت جلد آپ سے رابطہ کیا جائے گا۔

دوسرے نمبر ایک سریلی آواز سنائی دی "میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

ہم نے انہیں بھی وہی جواب سنا دیا۔

وہ حیران ہو کر بولیں "لگتا ہے کہ آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟"

"جی' جی۔ پاکستان سے۔"

انہوں نے مزید پوچھا کہ کب آئے ہیں' واپس کب جائیں گے' آپ کے پاس امریکی شہریت ہے بھی کہ نہیں؟ کیا؟ دیکھیے' میری بات سنئے' برا نہ مانیں تو آپ کو ایک مشورہ دوں؟"

"جی ضرور۔"

"بہتر یہ ہے کہ آپ فی الحال کسی ایک قسم کے بزنس پر توجہ مرکوز رکھیں۔ اس طرح تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ ہاں' ایک کے بعد ایک کر کے آپ دوسرے کاروبار بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہمیں تو کوئی ایسا بزنس چاہیے جو آسان ہو اور زیادہ سرمایہ بھی نہ لگے۔"

"مثلاً کتنا سرمایہ؟"

"اسمال بزنس میں کتنا سرمایہ لگ سکتا ہے؟" ہم نے گول مول جواب دیا۔

"ہزاروں سے لے کر لاکھوں ڈالر تک۔"

"بہتر ہو کہ ہزاروں ڈالر تک ہی محدود رہیں۔"

"اوکے" انہوں نے بھی ہمارا نام' پتا اور فون نمبر معلوم کیا اور بولیں "اوکے علی' تم بہت جلد میری طرف سے کچھ سنو گے" اور فون بند کر دیا۔

ہم نے اس کارروائی سے علیمی صاحب کو مطلع کیا' وہ بولے کہ فی الحال یہ دونوں ہی کافی ہیں پہلے ان کے نتائج دیکھ لیں۔ جلدی کیا ہے' اتنی دیر ذرا گھومیں پھریں' لوگوں سے ملیں' آپ کو بہت سی کارآمد معلومات حاصل ہو جائیں گی۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور علیمی صاحب نے اردو میں گفتگو شروع کر دی۔

ایک دو بار ہمارا نام بھی کانوں میں پڑا تو ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔ اس اجنبی دیار میں بھلا کون ہو سکتا ہے ہمارا پرسان حال' امریکا میں سرے سے ہمارا کوئی رشتے دار ہی

موجود نہیں تھا۔ چند دور دراز کے عزیز اور گنتی کے شناسا تھے جو اس وسیع و عریض ملک میں بکھرے ہوئے تھے مگر انہیں ہماری آمد کا کوئی علم نہیں تھا۔

علیمی صاحب فون پر پہلے تو خوش گفتاری کا مظاہرہ کرتے رہے پھر کہا ''لیجئے' آپ خود ہی ان سے بات کر لیجئے'' اور ریسیور ہمیں تھما دیا ''نیر زیدی صاحب بول رہے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

ذہن پر بہت زور ڈالا مگر نیر زیدی کی حقیقت کو نہ پا سکے۔ دوسری طرف ایک مہذب آواز بڑی بے تکلفی سے ہم سے مصروف کلام تھی ''آفاقی صاحب' آپ تو مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ بس آپ سے ملاقات ہونی چاہیے۔ میرے غریب خانے پر آیئے' بھابی اور بچوں کو بھی لایئے۔''

ہم نے کہا ''ہمیں تو آپ کے غریب خانے کا علم ہی نہیں ہے۔''

''میں خود آپ کو لینے آجاؤں گا۔ شام کو پانچ بجے' آپ سب یعنی علیمی صاحب سمیت رات کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ خدا حافظ'' انہوں نے فون بند کر دیا۔

ہم نے حیران ہو کر علیمی صاحب کی جانب دیکھا تو انہوں نے بتایا کہ نیر زیدی ایک کمپیوٹر کمپنی میں کام کرتے ہیں' صحافی بھی ہیں' ''جنگ'' کی نمائندگی کرتے ہیں اور وائس آف امریکا سے بھی خبریں اور تبصرے نشر کرتے رہتے ہیں۔''

''مگر یہ ہمیں کیونکر جانتے ہیں؟''

''فلموں کے حوالے سے جانتے ہوں گے۔''

شام کو پانچ بجے سے پہلے علیمی صاحب ہمارے ساتھ شاپنگ سینٹر میں گئے اور ہم کھانے پینے کی ضروری اشیا خرید لائے۔ ایک بڑے امریکی اسٹور میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس کی وسعت اور ہمہ گیری کو دیکھ کر ہم حیران رہ گیا۔ اسٹورز اور شاپنگ سینٹروں کا انداز یہاں عموماً ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ مختلف حصوں میں دنیا بھر کی ہر چیز خرید لیجئے۔ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک نظر ڈالیے اور آپ کو سائن بورڈ بتا دیں گے کہ کون سی چیز کہاں ملے گی۔ قیمتیں ہر چیز پر درج ہوتی ہیں۔ شاپنگ ٹرالیاں موجود ہیں۔ آپ اپنی ضرورت اور پسند کی چیزیں خرید کر ٹرالی میں بھرتے رہیے اور پھر قطار بنا کر کیشئر کے سامنے کھڑے ہو جایئے۔ یہاں ہر وقت خریداروں کا ہجوم رہتا ہے۔ پیسے وصول کرنے کے

لیے کئی خواتین تعینات ہیں (یہ کام بھی خالصتاً خواتین ہی کرتی ہیں) لیکن ہر ایک کے سامنے پیسے ادا کرنے والوں کی لمبی لمبی قطاریں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بے چاری مشین کی طرح مصروف رہتی ہیں۔ سر کھجانا تو ایک طرف بیٹھنے کی فرصت بھی نہیں ملتی اور بیٹھیں تو کہاں؟ وہاں تو ایک اسٹول تک نہیں ہوتا۔ اس لیے مسلسل کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ بہت زیادہ رش کے اوقات میں اس فریضے پر دو خواتین نظر آتی ہیں۔ خریدار سائیڈ ٹیبل پر سامان کے ڈھیر لگا دیتا ہے اور وہ باری باری اٹھا کر کیش رجسٹر میں ان کی قیمتیں درج کرتی ہیں اور پھر ان چیزوں کو پیکٹوں میں رکھ کر خریدار کے حوالے کر دیتی ہیں لیکن ہمہ وقت مسکرانا بھی شاید ان کے فرائض میں داخل ہے کیونکہ کسی وقت بھی ہم نے کسی خاتون کو بیزار' تھکا ماندہ یا چڑچڑا نہیں پایا۔

اشیا کی قیمتوں کے بارے میں ہماری معلومات تو صفر ہیں لیکن لبنیٰ نے بتایا کہ کھانے پینے کی چیزیں پاکستان کے مقابلے میں بہت سستی ہیں اور معیار کا تو خیر کیا پوچھنا!

سپر اسٹور سے گھر واپس پہنچے تو ابوالحسن نغمی صاحب ہمارے منتظر تھے۔ ان میں بظاہر کوئی زیادہ تبدیلی نظر نہیں آئی۔ انہوں نے بھی ہمارے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ جھوٹ تھا یا سچ؟ واللہ علم بالصواب۔

وہ بہت خلوص سے ملے تو مختصر طور پر پاکستان کا احوال پوچھا اور پھر اپنے احوال کا خلاصہ سنایا۔ صحافت سے کنارہ کشی ہونے کے بعد وہ انشورنس کمپنی سے وابستہ تھے اور کامیاب تھے۔ ہمارے بارے میں وہ خاصے متفکر تھے فوراً علیمی صاحب کے ساتھ صلاح و مشورے میں مصروف ہو گئے پھر ہم سے پوچھا ''آپ یہ بتایئے کہ آپ کون سا کام کرنا پسند کریں گے؟''

ہم نے کہا ''دیکھیے صاحب' ہم نے ساری زندگی میں صرف دو ہی کام کیے ہیں۔ صحافت اور فلم۔ ان کے سوا ہر کام کے بارے میں ہماری معلومات اور تجربہ اتنا ہی ہے جتنا کہ آپ کو ایٹم بم بنانے کے معاملے میں ہو گا۔''

وہ مسکرائے' بولے ''مجھے پتا ہے کہ آپ جو بھی کام کریں گے اس کا تجربہ بہت جلد حاصل کر لیں گے۔''

ان کا اور علیمی صاحب کا خیال تھا کہ ہمیں ورجینیا کے علاقے میں ہی اپنے مطلب کا

بزنس تلاش کرنا چاہیے کیونکہ آس پاس کافی دوست احباب اور ملنے والے رہتے ہیں مگر یہ بھی لازم ہے کہ صرف ایسے علاقے میں بزنس حاصل کریں جہاں کالوں کی آبادی زیادہ نہ ہو۔ مجبوری کی صورت میں اگر واشنگٹن بھی جانا پڑے تو وہ بھی زیادہ دور نہیں ہے مگر کالوں سے بچنا بہت ضروری ہے۔

"بھئی آخر' آپ لوگ کالوں کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟ ان کے مقابلے میں گوروں کو ترجیح دیتے ہیں حالانکہ ہمیں تو کالوں کا حامی ہونا چاہیے۔"

کہنے لگے "یہ راز بھی رفتہ رفتہ آپ پر آشکارا ہو جائے گا۔ بھائی' بات دراصل یہ ہے کہ کالوں کے علاقے میں تو خود بہت سے کالے بھی مجبور ہی رہتے ہیں۔ لڑائی مار کٹائی' جرائم' قتل و غارت' چوری ڈکیتی' غنڈہ گردی' بد اخلاقی' منشیات' آوارگی' پسماندگی' بدکلامی کون سی خرابی نہیں ہے جو وہاں نہیں پائی جاتی۔ اس لیے شریف آدمی ان علاقوں میں بزنس اور رہائش پسند نہیں کرتے ہیں۔ کیونکہ بلیک آبادیوں میں تو ہر طرف شرابی' چور اچکے' غنڈے اور منشیات فروش غول در غول گھومتے پھرتے ہیں۔ نہ کسی کی جان محفوظ نہ عزت و آبرو۔ ہم آپ تو کیا' پولیس بھی ان علاقوں میں جانے سے پرہیز کرتی ہے۔ سب نے انہیں ان ہی کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ غریب کالوں کو ہر ایک نے ان ہی کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ امریکا میں رہ کر ہی یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ کالے کس طرح رہتے ہیں' کتنے پسماندہ ہیں اور اس کا سبب کیا ہے؟ اس صورت حال کی ذمے داری سراسر حکومت اور گوروں کا معاشرہ ہے۔ صدیوں کی بدسلوکی' بے پروائی اور پسماندگی نے امریکی کالوں کو ایک عجیب و غریب قوم بنا دیا ہے۔ یہ اتنے بگڑ چکے ہیں کہ سعادت حسن منٹو کے الفاظ میں "اس خرابے میں اب مزید خرابی کی گنجائش نہیں ہے" اب اگر کوئی حکومت واقعی انہیں سدھارنا اور ان کے حالات کو بہتر بنانا بھی چاہے تو اس کے لیے بے شمار وسائل اور ان تھک جدوجہد کی ضرورت ہے اور امریکیوں کو فرصت نہیں ہے کہ ان پر اپنا وقت اور سرمایہ ضائع کریں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ کالے ایک ایسا ٹائم بم ہیں جس کی ٹک ٹک کی آواز بتدریج بڑھتی ہی جا رہی ہے اور وہ وقت پورا ہونے پر یہ بم اس طرح پھٹے گا کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی تباہ کاریوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا اور یہی

امریکی تہذیب و اقتدار کا انجام ہو گا۔ جس طرح فرعون کے گھر میں حضرت موسیٰ نے پرورش پائی تھی اسی طرح امریکی معاشرے کی گود میں کالے پرورش پا رہے ہیں اور نوٹ کر لیجئے کہ یہ امریکا کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے جو حضرت موسیٰ نے فرعون کے ساتھ کیا تھا۔

یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جس کی تفصیل آگے چل کر پیش کی جائے گی۔

نغمی صاحب سے بہت طویل عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی اس لیے کہنے اور سننے کو بہت کچھ تھا۔ کچھ دیر میں نیر زیدی صاحب بھی آ گئے۔ ایک تندرست' تروتازہ' شگفتہ مزاج نوجوان کو اپنے سامنے دیکھ کر ہم سوچ میں پڑ گئے کہ ان سے کب اور کہاں ملے تھے؟

انہوں نے ہماری مشکل آسان کر دی "بلاوجہ ذہن پر بوجھ نہ ڈالیے' آپ مجھ سے کبھی نہیں ملے۔ نہ آپ نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہے۔ میں نے آپ کو البتہ دیکھا تھا۔ فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ تحریریں بھی پڑھی تھیں۔ سمجھ لیجئے کہ آپ کے نزدیک یہ پہلی ملاقات ہے اور میرے لیے تجدید ملاقات۔"

لیجئے انہوں نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا۔ وہ جلدی میں تھے' اس لیے جلدی جلدی ہم سب کو سمیٹا اور چل دیے۔ علمی صاحب اور نغمی صاحب اپنی اپنی کاروں میں ساتھ ہو لیے۔

نیر زیدی کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ اسپرنگ فیلڈ میں رہتے تھے جو ملیحی صاحب کے گھر سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ گویا امریکی حساب سے بالکل نزدیک تھا۔ بہت خوب صورت اور سرسبز و شاداب تھا۔ سبزہ اور شادابی یہاں عموماً رہتی ہے۔ صرف سردی اور برف باری کے موسم میں خزاں کا دور دورہ ہوتا ہے اور وہ موسم گزرتے ہی ایک بار پھر سبزہ سر اٹھانے لگتا ہے۔ درختوں پر نکھار آجاتا ہے۔ نیر زیدی صاحب کا گھر بھی ایک ایسی ہی بستی میں تھا۔ سب گھروں کا انداز ایک ہی جیسا تھا۔ ان گھروں میں گیراج نہیں تھے۔ گھروں کے سامنے ہی کاریں پارک کی جاتی ہیں۔ بیشتر گھروں کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ گھر کے اندر داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے پاکستان کے کسی گھر میں آگئے ہوں۔ سجاوٹ پاکستانی انداز کی۔ صوفے وغیرہ بھی خالص امریکی طرز کے نہیں تھے۔ جگہ جگہ قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں پر مشرقی انداز کی تصاویر اور طغرے وغیرہ۔ ان گھروں میں سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہوتے ہی ڈرائنگ روم اور لاؤنج سے واسطہ پڑتا ہے۔

کھانے کا کمرا بھی کچن کے ساتھ ہی سمجھ لیجئے۔ نصف غسل خانہ گھر میں اندر داخل ہوتے ہی موجود ہے۔ نصف غسل خانہ وہ ہوتا ہے جس میں غسل کرنے کے سوا دوسری تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ شروع شروع میں ہم نے جب مکانوں کے اشتہاروں میں ڈھائی اور ڈیڑھ باتھ روم درج دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔ یہ راز بعد میں کھلا کہ آدھے باتھ روم سے کیا مراد ہے۔ گھر کے اس حصے سے سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں جہاں بیڈ روم اور مکمل غسل خانہ ہوتا ہے۔ نیچے والی سیڑھیاں بیس منٹ میں پہنچ کر دم لیتی ہیں۔ اس بیس منٹ ہال کے علاوہ ایک بیڈ روم اور باتھ روم بھی تھا۔ یہاں نیر صاحب کی والدہ مقیم تھیں۔ باقی حصہ بچوں کی جولان گاہ تھا۔ یہاں کی آرائش خالص مشرقی انداز کی تھی۔ یہاں

تک کہ دیوان اور گاؤ تکیے بھی موجود تھے۔ ایک تپائی پر ان کی والدہ پاندان لیے بیٹھی تھیں اور سروتے سے چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ امریکا جانے والوں کے والدین کی مشکل یہ ہے کہ وہ ساری عمر جس ماحول سے آشنا ہوتے ہیں امریکا جاتے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ نہ وہ چاہتیں، نہ وہ لوگ، نہ وہ طور طریقے۔ گھر کے دوسرے افراد کو اپنی مصروفیات اور مشاغل سے چھٹکارہ نہیں ملتا۔ لہٰذا ان کے حصے میں تنہائی اور بے زاری آتی ہے اور اس ماحول میں یہ اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جیسے بن پانی کی مچھلی۔

نیر صاحب کی بچی کی عمر پارو کے برابر ہوگی۔ بچہ بالکل کمسن تھا مگر انتہائی شرارتی۔ انہوں نے ابھی نیا نیا رینگنا سیکھا تھا۔ اس لیے سارے گھر میں گھومتے پھرتے تھے اور کئی بار سیڑھیوں سے بھی لڑھک چکے تھے۔ نیر زیدی تو خیر مقبول اور دلچسپ آدمی ہیں ہی مگر ان کی بیگم شاہین کا بھی ان کی مقبولیت میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ خاتون اس قدر خوش ذائقہ اور قسم قسم کے کھانے پکاتی ہیں کہ کم از کم امریکا میں رہتے ہوئے تو اس کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ نیر زیدی چھٹی کا دن عام طور پر گھر پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ یا تاش کھیلنے میں گزارتے ہیں اور اس روز دوستوں کی دعوت ہوتی ہے۔ کھانا کھلانا بھی ان میاں بیوی کی "ہابی" ہے۔ یہاں کچھ اور پاکستانی حضرات سے بھی ملاقات ہوگئی۔

جب اتنے بہت سے پاکستانی کسی غیر ملک میں اکٹھے ہو جائیں تو اندازہ کیجئے کہ کتنا ہنگامہ ہوا ہوگا۔ اکثر حضرات ہمیں غائبانہ طور پر جانتے تھے۔ انہیں اس بات پر حیرانی تھی کہ ہمیں بھلا امریکا میں قیام کرنے کی کیا سوجھ گئی؟

امریکا میں آباد زیادہ تر پاکستانیوں کی زبانی ہم نے اس حیرت کا اظہار سنا۔ بات یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ معاشی ضرورتوں کے تحت امریکا جا کر رہنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس شخص کو اپنے ملک میں کھانے کو عزت سے روٹی، سر چھپانے کو مکان اور سواری کے لیے کار حاصل ہو، اسے سمندر پار جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہاں آباد ہو جانے والے پاکستانیوں کی داستانیں آپ وقتاً فوقتاً سنتے رہیں گے۔ یہاں کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد یہی موضوع زیر بحث رہا کہ اب اگر ہم وہاں پہنچ ہی گئے ہیں تو ہمیں کون سا بزنس کرنا چاہیے۔ شاہین زیدی نے باتیں کرتے کرتے ہی انواع و اقسام کی ڈشیں تیار کر

لی تھیں اور مشرقی آداب طعام کے مطابق سویٹ ڈش کا بھی باقاعدہ اہتمام تھا۔ اس کے بعد
چائے کا دور چلا' پاکستانیوں کے گھروں میں کافی کی جگہ چائے کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔ اور
چائے پینے کے لائق بھی ہوتی ہے۔

اب مشوروں کا سیشن شروع ہوا۔

"آپ تو ایک ریستوران لے لیجئے۔ کھانے پینے کی بھی آسانی رہے گی۔" ایک
صاحب نے مشورہ دیا۔

"نہیں' ان کے لیے فلنگ اسٹیشن (پٹرول پمپ) مناسب رہے گا۔" دوسرے نے
رائے دی۔

"گفٹ شاپ بہترین ہے"

"لدے نہیں بھائی۔ ایک اچھی لوکیشن پر بیس پچیس کمروں کا موٹیل مل جائے تو سب
سے اچھا ہو گا۔ رہائش کی پرابلم بھی حل ہو جائے گی۔"

"لانڈریٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ایک صاحب بولے۔

ہم نے کہا "ہاں' اس طرح کپڑے دھونے دھلانے سے بھی نجات مل جائے گی۔"

سب ہنسنے لگے۔

"بھئی آپ خود بھی تو کچھ بولیے؟"

"کیا بولیں' ہمارے لیے تو سبھی کام نئے اور اجنبی ہیں۔"

"تو پھر کیا کریں گے؟"

نیر زیدی نے کہا "میری مانیں تو کچھ بھی نہ کریں۔ تھوڑے عرصے گھومیں پھریں۔ شہر
دیکھیں اور واپس چلے جائیں۔"

ہم نے کہا "ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ بچیوں کو چند سال یہاں تعلیم دلائیں....."

"چند سال!" ایک صاحب بات کاٹ کر بولے "پھر آپ واپس جا چکے۔ ارے صاحب
یہ ایسی جگہ ہے جہاں ایک بار آنے کے بعد کوئی واپس نہیں گیا۔ یہ ایک گنبد بے در ہے
جس میں داخل ہونے کے بہت سے دروازے ہیں مگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم
بھی یہی سوچ کر یہاں آئے تھے۔ اب گیارہ سال ہو گئے ہیں اور واپسی کا کوئی امکان نہیں
ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے" پھر سب نے بتانا شروع کر دیا کہ وہ کب آئے تھے۔ سوچا تھا کچھ کما
لیں گے تو واپس چلے جائیں گے مگر وہیں کے ہو کر رہ گئے حالانکہ واپسی کے لیے تڑپتے
رہتے ہیں۔ امریکا جا کر لوگ خواہش کے باوجود واپس کیوں نہیں آسکتے؟ کچھ عرصے بعد یہ
راز ہم نے بھی پالیا مگر اسے جاننے کے لیے آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔

نیر زیدی کی والدہ بیس منٹ میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم وہاں گئے
تو دیکھا کہ وہ خالص مشرقی ماحول میں پاندان کھولے بیٹھی ہیں اور سروتے سے چھالیا کاٹنے
میں مصروف ہیں۔ امریکا میں انہیں رہنا تو پڑتا ہے مگر کوئی ہم زبان اور ہم کلام نہیں ملتا۔
ان کی عمر اور مزاج کی بزرگ خواتین انہیں باتیں کرنے کے لیے کہاں سے دستیاب ہو سکتی
ہیں۔ امریکا والے بزرگوں کا یہ ایک عظیم المیہ ہے۔ دنیاوی آسائش اور مادی آرام مہیا
ہونے کے باوجود یہ لوگ تنہائی اور ذہنی روحانی آسودگی کے لیے ترستے ہیں۔ پرانے زمانے
کی باتیں کرنے والے لوگ تو اب پاکستان میں بھی ڈھونڈنے سے ہی ملتے ہیں بھلا امریکا میں
انہیں تلاش کرنے کی کیا تک ہے۔ ہم نے ان سے مشرقی کلچر کی باتیں شروع کیں تو وہ ایک
دم شگفتہ ہو گئیں۔ پھر جو گفتگو شروع ہوئی تو موضوعات کی کوئی کمی نہیں رہی۔

سب سے آخر میں تان جا کر ہومیو پیتھک علاج پر ٹوٹی۔ ہم نے چند دوائیاں انہیں
پیش کرنے کا وعدہ کیا جو ہم بہت بڑی مقدار میں پاکستان سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ ان کی
خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ انہوں نے ہمیں اتنی ڈھیر ساری دعائیں دیں کہ شاید پچھلے چند
سالوں میں بھی نہ ملی ہوں گی۔

اتوار کے دن ہم ایک بار پھر علیمی صاحب کے ساتھ علی الصباح روانہ ہوئے۔ وائس
آف امریکا میں بیٹھے پی رہے تھے کہ علیمی صاحب کے پاس ایک ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے
ایک لمحہ گفتگو کرنے کے بعد ریسیور ہمارے حوالے کر دیا۔ ہم حیران ہوئے کہ ہمیں وائس
آف امریکا میں تلاش کر کے فون کرنے والا بھلا کون ہو سکتا ہے؟"

یہ خاتون ریالٹر کا فون تھا۔ انہوں نے پہلے علیمی صاحب کے گھر پر فون کیا اور وہاں سے
یہ فون نمبر حاصل کر کے ہمیں تلاش کر لیا۔

"علی" وہ شیریں آواز میں گنگنائیں "تمہارے لیے خوش خبری ہے۔"

"خوش خبری!" ہم حیران رہ گئے۔

"ہاں' تمہارے لیے دو بہت اچھے ریستوران تلاش کیے ہیں' سمجھو کہ تمہارا تو پرابلم حل ہو گیا۔ کس وقت دیکھنا پسند کرو گے؟"

"آج ہی۔ بلکہ ممکن ہو تو ابھی۔"

"کیوں نہیں" وہ قہقہہ مار کر ہنسیں "میں تمہیں بیس منٹ میں پک کر سکتی ہوں مگر وائس آف امریکا آنا پڑے گا؟"

ہم نے انہیں ایر اینڈ اسپیس میوزیم پر ملنے کا وقت دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کوئی خوش قسمت ہو تو آفاقی جیسا" علیمی صاحب نے کہا "امریکا آئے ہوئے ابھی چار دن ہوئے نہیں کہ خوب صورت لڑکیوں کے فون آنے لگے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ فون کرنے والی لڑکی ہے اور خوب صورت ہے؟"

"ہمیں سب معلوم ہو جاتا ہے۔ آخر وائس آف امریکا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی مذاق تو نہیں ہے۔"

وائس آف امریکا سے میوزیم کا پیدل سفر دس منٹ کا بھی نہیں تھا۔ میوزیم میں وہی رونق اور گہما گہمی تھی۔ بچے' بڑے' عورتیں سبھی جوق در جوق آ رہے تھے۔ ایک خاتون ائر ہوسٹس کا لباس پہن کر آئی تھیں۔ جب کہ ان کے ساتھ والی جو کچھ پہنے ہوئے تھیں اسے سرے سے لباس کہنا ہی غلط تھا۔ لباس پلاسٹک کی ڈوریوں سے بنا ہوا تھا اور جالی کی طرح تھا۔ یہ جال بھی صرف جسم کے بالائی حصے پر تنا ہوا تھا۔ زیریں جسم پر انہوں نے شارٹ یا مختصر سا نیکر پہنا ہوا تھا۔ سنہری بالوں کو بھی پلاسٹک کی ڈوریوں سے باندھ رکھا تھا۔ پیروں سے بھی وہ ننگی تھیں کیونکہ جوتے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیے تھے۔ یوں تو وہاں حسینوں کا میلا لگا ہوا تھا مگر جب ان کی آمد ہوئی تو سب کی نظریں ان پر جم کر رہ گئیں۔

ایک بچے نے اپنی ممی سے کہا "ممی' وہ دیکھئے' خلا کی مخلوق۔"

ممی بذات خود خاصی خوب صورت تھیں۔ انہوں نے نگاہ غلط انداز اس طرف دوڑائی اور پھر بڑی حقارت سے بولیں "بیٹے۔ خلا میں ایسی بدشکل مخلوق نہیں ہوتی۔"

"مگر ممی۔ یہ تو بہت چارمنگ ہیں۔"

"چپ کرو۔ تمہیں کیا پتا بس تم بھی اپنے باپ پر گئے ہو" اور وہ بچے کو گھسیٹ کر باہر لے گئیں۔ بچہ واقعی اپنے باپ پر ہی گیا تھا کیونکہ وہ آخر وقت تک پلٹ پلٹ کر ان برائے

نام کپڑوں میں ملبوس خاتون کو دیکھتا رہا۔

ہم باہر سیڑھیوں پر کھڑے ہو گئے۔ طے یہ پایا تھا کہ ہم سیڑھیوں پر ہی ملیں گے تاکہ نہیں پارکنگ کی مشکل سے نجات مل جائے۔ سیڑھیوں کے نزدیک ایک ٹرک میں کولڈ ڈرنکس اور آئس کریم فروخت ہو رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر "ہاٹ ڈاگز" کی ریڑھی والا کھڑا ہوا تھا جس کی خوشبو سے ساری فضا مہک رہی تھی۔ "ہاٹ ڈاگ" یورپ اور امریکا میں اسی طرح گرما گرم تیار کر کے فروخت کیے جاتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں سیخ کباب۔ ان کی اشتہا انگیز خوشبو بھی ایسے ہی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ "ہاٹ ڈاگ" حرام گوشت کے ہوتے ہیں۔

ہم نے ٹرک والے سے ایک عدد آئس کریم خریدی اور ابھی اپنے منہ کے نزدیک بھی نہیں لے گئے تھے کہ انگریزی میں عقب سے آواز آئی "ٹھہریئے۔"

پلٹ کر دیکھا تو ایک لمبے تڑنگے' سیاہ فام سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اتنی گرمی کے باوجود انہوں نے ایک لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر کپڑے کا ہیٹ تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی' خاصے گندے کپڑے تھے۔ منہ بھی شاید انہوں نے دو چار دن سے نہیں دھویا تھا۔ آنکھوں میں ایک خواب ناک کیفیت تھی۔ ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

وہ کالوں کے مخصوص لہجے میں بولے "کیا یہ آئس کریم مجھے دے سکتے ہو؟"

ہماری حیرت دو چند ہو گئی۔ مان نہ مان' میں تیرا مہمان۔ ان حضرت کو ہم نے زندگی میں پہلی بار ہی دیکھا تھا اور وہ قدرے بے تکلفی سے' ہمارے حلق کے دربان بن کر ہمیں ہماری خریدی ہوئی آئس کریم کھانے سے روک رہے تھے۔ غصہ تو بہت آیا مگر کیا کرتے۔ پردیس کا معاملہ تھا۔ آس پاس بھی سب اجنبی چہرے ہی نظر آ رہے تھے۔ آئس کریم فروخت کرنے والی فربہ سی لڑکی نے بھی ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد منہ پھیر لیا تھا۔

ہمیں خاموش' گومگو میں مبتلا دیکھا تو انہوں نے پوچھا "کیا انگریزی نہیں جانتے؟"

"جانتے ہیں۔"

"میں نے کہا کہ کیا آئس کریم مجھے دے سکتے ہو؟" انہوں نے بڑے رعب سے تقاضا کیا۔

ہم نے خاموشی سے آئس کریم ان کی طرف بڑھا دی۔

"شکریہ' اچھے آدمی لگتے ہو" وہ آئس کریم کھاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

یہ "کالوں" کے ساتھ ہمارا پہلا براہ راست واسطہ پڑا تھا۔ کالوں کا خوف امریکا میں
نہیں ہے۔ گورے تو کیا حکومت بھی ان سے ڈرتی ہے۔ ان کی بہت سی باتوں پر چشم
کرلیتی ہے۔ پولیس ان کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی۔ انتظامیہ کے افسر بھی صرف نظرا
ہیں۔ ڈر تو ہمیں بھی تھا مگر جب کچھ عرصے بعد ایک ایسا ہی واقعہ دو بارہ ہمارے ساتھ
آیا تو ہمارا رد عمل مختلف تھا۔ ہوا یہ کہ واشنگٹن ڈی سی میں ۳۳ اور پی اسٹریٹ
چوراہے پر واقع اپنے ریستوران کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تھے۔ سردی کا
تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور سڑک پر خاصی رونق تھی۔ لنچ کا قیامت خیز وقفہ گزر چکا تھا
بہت مطمئن اور آسودہ موڈ میں ریستوران سے باہر نکل کر اپنا سگار سلگا رہے تھے کہ
سے ایک مردانہ آواز نے انگریزی میں مخاطب کیا "سنو!"

مڑ کر دیکھا تو ایک خوب موٹے تازے' تگڑے سیاہ فام کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں
ڈھیر سارے گندے سے گرم کپڑے اپنے جسم پر چڑھا رکھے تھے۔ ان سب پر ایک
اوور کوٹ تھا۔ داڑھی ان کی بھی بڑھی ہوئی تھی۔

نگاہیں ملیں تو بولے "سنو یہ سگار مجھے دے دو۔"

ہم ان کی بے تکلفی بلکہ بدتمیزی پر حیران رہ گئے۔ ایک نظر ان کے پہلوان نما
ڈالی۔ یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ امریکا میں قیام کے دوران میں خدا جھوٹ نہ بلوائے
نے ہزاروں کالے دیکھے ہوں گے مگر کوئی ایک بھی کمزور اور مریل نظر نہیں آیا۔ یہ غا
کی نسل کا اثر ہے کہ سبھی قد آور' مضبوط اور موٹے تازے ہوتے ہیں۔ آس پاس
فٹ پاتھ پر خوب چہل پہل تھی اور قریب قریب سبھی لوگ گورے تھے۔ پھر یہ
اپنے ریستوران کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور ایک اردو محاورے
مطابق اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے' چنانچہ ہم نے ہمت سے کام لیا اور انہیں جوا
"جی نہیں۔ سوری۔"

انہوں نے ہمارے کوٹ کی بالائی جیب میں رکھے ہوئے سگار کی طرف انگلی سے
کیا اور فرمایا "ایک سگار جیب میں بھی رکھا ہے۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا "اس کے بارے میں بھی یہی خیال ہے۔"

وہ مسکرائے اور شانہ ہلا کر بولے "اوکے۔ یو آر دی باس" اور آگے چل پڑے۔

دیکھا آپ نے۔ وقت انسان کو کس طرح سبق سکھا دیتا ہے۔ کالے کے رخصت
ہونے کے بعد موٹی سی گوری لڑکی نے اپنی گاڑی کی کھڑکی میں سے جھانکا اور مسکرا کر پوچھا
"تمہیں ایک اور آئس کریم دوں؟"

زیادہ دیر نہیں ہوئی ہو گی کہ ایک سرخ رنگ کی چمکتی ہوئی لمبی سی شاندار امر
ایک جھٹکے سے سیڑھیوں کے سامنے آکر رکی۔ اس کے اندر جو صاحبہ تشریف فرما تھ
اس سے بھی زیادہ شاندار تھیں۔ ان کی سنہری زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ آنکھ
پر سیاہ چشمہ تھا جو انہوں نے کار کے رکتے ہی اتار لیا تھا۔ انہوں نے سیڑھیوں کی جانب
طرح دیکھنا شروع کر دیا جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ ہم پر نظر پڑی تو مسکرائیں کیونکہ
بھی متلاشی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحہ بعد وہ مسکرائیں اور عینک س
ہمیں اشارہ کیا۔ ہم کشاں کشاں کار کے نزدیک پہنچ گئے۔

پوچھا "علی؟"

"یس" ہم نے سر ہلایا۔

"ہائی" انہوں نے شانوں کو حرکت دے کر کہا اور اگلی نشست کا دروازہ کھول کر
"پارک یور سیلف" بیٹھئے کہنے کا یہ انوکھا امریکی انداز ہمیں بہت پسند آیا۔ ہم ان کی ہدای
کے مطابق فوراً اگلی سیٹ پر "پارک" ہو گئے۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟" انہوں نے کار کو حرکت دی جو نہ صرف ٹھنڈک سے ب
ہوئی تھی بلکہ خوشبو سے بھی مہکی ہوئی تھی۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ہی فرمایا "ک
عجیب بات ہے' میں نے اپنا تعارف تک نہیں کرایا۔ میرا نام لوسی اسٹرانگ ہے' کیوں
نام ہے؟"

ہم نے کہا "نام تو اچھا ہے مگر اس کے آخر میں اسٹرانگ اچھا نہیں لگتا۔ عورتوں
نام کے ساتھ تو "نازک" ہونا چاہیے۔"

وہ ہنسنے لگیں "میرا نام تو صرف لوسی ہے۔ اسٹرانگ میرے شوہر کا نام ہے بلکہ ش

کہنا بھی درست نہیں ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ ہماری علیحدگی ہو چکی ہے۔ سوچتی ہوں' یہ دم چھلا ہٹا ہی دوں۔ خواہ
مخواہ مردوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔"

اب ہم نے ذرا غور سے ان کا جائزہ لیا۔ اچھی شکل و صورت کی مالک تھیں۔ سیاہ
چشمہ انہوں نے سامنے ڈیش بورڈ پر ڈال دیا تھا اور ان کی بھوری بھوری مسکراتی ہوئی
آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں۔ ان کی توجہ ڈرائیونگ پر تھی کیونکہ یہ دن کا وقت تھا جب
واشنگٹن کی سڑکوں پر کافی ٹریفک ہوتا ہے۔

"کیا نتیجہ نکالا؟" انہوں نے کار کو ٹریفک سگنل پر روکتے ہوئے پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

"میرے بارے میں۔ کافی غور سے دیکھ رہے تھے نا۔"

ہم کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ کم بخت کی چالاکی دیکھیے کہ ڈرائیونگ میں مصروف
رہنے کے باوجود ہماری چوری پکڑلی۔

ہم نے موضوع تبدیل کرنے کے لیے کہا "کچھ ریستوران کے بارے میں بتائیے جو
آپ دکھانے لے جا رہی ہیں۔"

بولیں "ہاں۔ بھئی تمہاری قسمت بہت اچھی ہے۔ یہ جو ریستوران ہے اس کا نام
"گلیز" ہے۔"

ہم ہنسنے لگے۔ اتنی دیر میں ٹریفک کھل گئی۔ انہوں نے گاڑی پھر ایک جھٹکے سے چلا
دی۔ یہ شاید ان کی ڈرائیونگ کا مخصوص انداز تھا۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

ہم نے انہیں بتایا کہ ہماری زبان میں "گلی" کیا ہوتی ہے اور اس کی جمع کو ہم
"گلیاں" کہتے ہیں۔

"یہ وہ گلی نہیں ہے۔ یہ مالک کے نام پر ہے۔ تم چاہو تو اسے خریدنے کے بعد نام
بدل سکتے ہو۔ اسے "علیز" کا نام دے سکتے ہو۔ دراصل یہ ریستوران نہیں ہے بلکہ ایک
قسم کی کینٹین ہے' بڑے منافع کا سودا ہے۔"

"اچھا!" ہم نے سر ہلا دیا۔

"سات منزلہ بلڈنگ ہے جس میں دفتر ہی دفتر ہیں۔ صبح ساڑھے سات بجے سے شام پانچ بجے تک کام اور پھر آرام۔ ہفتے میں دو دن چھٹی۔ اس سے بڑھ کر عیش کیا ہوں گے۔ اس عمارت میں جتنے دفاتر ہیں ان میں کام کرنے والے اسی ریستوران سے کھاتے پیتے ہیں۔ یعنی تمہیں گاہک بھی تلاش نہیں کرنے پڑیں گے۔"

یہ باتیں سن کر ہم خوش ہو گئے۔ ریستوران کے بزنس میں تو صبح سے رات گئے تک مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اور پھر ہفتے میں دو چھٹیوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عام طور پر ریستوران ہفتے کے ساتوں دن کھلے رہتے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی ریستوران والوں کو ناغہ کرتے دیکھا ہے؟"

ہم واشنگٹن ڈی سی کے مصروف علاقوں سے گزر رہے تھے۔ خوبصورت کشادہ سڑکیں، اونچی اونچی خوش نما عمارتیں، درمیاں میں جگہ جگہ پارک اور سبزہ زار۔ ٹریفک انتہائی شائستہ، ہارن کی آواز کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں مختلف علاقوں، بازاروں اور عمارتوں کے متعلق بتاتی رہیں۔ یہ فلاں شاپنگ سینٹر ہے، یہ فلاں سڑک ہے۔ یہ ای اور ۲۲ویں اسٹریٹ کا کارنر ہے۔

ہم نے پوچھا "یہ ای اور ۲۲ویں اسٹریٹ کا کیا معاملہ ہے؟"

وہ ہنسنے لگیں "تمہیں معلوم ہو گا کہ واشنگٹن میں دو قسم کی سڑکیں ہیں جو متوازی چلتی ہیں۔ ایک قسم کی سڑکیں حروف تہجی کے حساب سے ہیں یعنی اے بی سی وغیرہ وغیرہ اور دوسری سڑکیں نمبروں کے حساب سے ہیں۔ یعنی ایک دو تین چار مگر سو تک گنتی پوری نہیں ہوتی۔ ان سڑکوں کے چوراہوں پر جو عمارتیں ہوتی ہیں انہیں دونوں نمبر لگتے ہیں۔ جیسے ای اور ۲۲ویں اسٹریٹ۔ اس جگہ یہ دونوں سڑکیں ایک دوسرے کو کراس کرتی ہیں۔ کچھ سمجھے؟"

"کچھ سمجھے، کچھ نہیں سمجھے،" ہم نے کہا "تھوڑے دن میں سب کچھ سمجھ جائیں گے۔"

"ہاں۔ دیکھنے میں تو کافی ہوشیار لگتے ہو۔ وہ دیکھو، سامنے جو پارک ہے اور اس کے سامنے شیشوں والی خوبصورت سی جو عمارت ہے، وہی تمہارا ریستوران ہے" عمارت کے شیشوں پر دھوپ کی کرنیں پڑنے سے بہت خوب صورت منظر نظر آرہا تھا۔ ایسی عمارتوں کی

یہاں کمی نہیں ہے جن میں اوپر سے نیچے تک شیشے ہی لگے ہوئے ہیں۔ دن کے وقت سورج کی کرنیں اور شفق ان کو رنگین اور حسین بنا دیتی ہے اور رات کے وقت عمارتوں میں روشن رہنے والی روشنیاں ان کی دلکشی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ ہمیں یہ عمارت بہت پسند آئی۔

"اوہ۔ گڈ لک۔ تمہارے لیے تو سارے شگون ہی اچھے ہیں" انہوں نے کہا اور سڑک پر فٹ پاتھ کے ساتھ ایک کار پارکنگ کے نشان پر اپنی کار روک دی "دن کے وقت اس مصروف سڑک پر پارکنگ ملنا کسے نصیب ہوتا ہے؟ مگر قسمت تم پر مہربان ہے" کار سے اتر کر انہوں نے پارکنگ میٹر میں پچاس سینٹ کا ایک سکہ ڈال دیا۔ پارکنگ میٹر کے سسٹم سے تو آپ شاید واقف ہی ہوں گے۔ مغربی ملکوں میں ایک پارکنگ تو وہ ہوتی ہے جو عمارتوں کے اندر، تہ خانوں میں، کھلے مقامات پر یا پھر پارکنگ ہی کے مقصد سے بنائی جانے والی کئی منزلہ عمارتوں میں ہوتی ہے اور دوسری قسم کی پارکنگ سڑکوں پر کی جاتی ہے۔ ہر سڑک پر تو پارکنگ کی اجازت نہیں ہوتی، اس لیے یہاں نہ تو نشانات ہوتے ہیں اور نہ پارکنگ میٹر نصب ہوتے ہیں۔ پارکنگ میٹر میں آپ وقت کے حساب سے سکے ڈالتے ہیں۔ منٹوں کے حساب سے کرایہ ہوتا ہے۔ جتنی دیر پارکنگ مقصود ہو اسی حساب سے سکے ڈال دیں اگر وقت گزرنے کے بعد بھی کار وہیں پارک رہے گی تو آس پاس گھومنے والے پولیس کے فرشتے "ٹکٹ" لگا دیں گے، یعنی جرمانہ اور چالان۔ ٹکٹ کا سسٹم یہ ہے کہ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو ٹکٹ کی رقم چیک کے ذریعے پوسٹ کر دیجئے لیکن اگر کوئی اعتراض ہے تو بنفس نفیس ٹریفک کورٹ میں وقت مقررہ پر پیش ہو جائیے۔ یہ وقت بھی ٹکٹ پر ہی درج ہوتا ہے۔ عام طور پر وقت کے زیاں سے بچنے کے لیے لوگ ٹکٹ کی رقم چیک کے ذریعے ادا کر دیتے ہیں۔

لوسی فٹ پاتھ پر تیزی سے قدم بڑھا رہی تھیں۔ اسکرٹ ان کی سڈول ٹانگوں کو چھپانے میں ناکام تھا بہت اونچی ایڑی کی جوتی کے باوجود وہ برق رفتاری سے چل رہی تھیں۔ یہ تیز رفتاری مغرب والوں کی مزاج میں داخل ہے۔ جسے دیکھئے بھاگا جا رہا ہے۔

عمارت کا داخلہ بھی بہت خوب صورت تھا۔ شیشوں کے بڑے بڑے دروازے تھے۔ ان کے نزدیک پہنچیں تو یہ دروازے خود بخود کھل جاتے تھے۔ اور پھر خود بخود ہی بند ہو

جاتے تھے۔ شروع شروع میں یہ سب کچھ ہمیں بہت انوکھا سا لگتا تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ عادت پڑ گئی۔ قدرت نے انسانی فطرت کو کسی بات پر صرف ایک ہی بار حیران ہونے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ دوسری بار وہ اس کے معمول میں داخل ہو جاتی ہے۔

لاؤنج کا فرش بہت خوبصورت اور انتہائی چمک دار تھا۔ ہمیں تو ڈر ہوا کہ کہیں لوسی اونچی ایڑی کی جوتی کے سبب پھسل کر گر ہی نہ جائے مگر توبہ کیجئے اس کی رفتار میں مطلق فرق نہیں آیا تھا قدم یوں پڑ رہے تھے جیسے کوئی پلیٹ میں رکھ کر لے جا رہا ہے۔

چند گیلریوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک راہداری میں داخل ہو گئے جس کے باہر "ریستوران" کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ آگے چل کر ایک چھوٹا سا ہال تھا۔ جس میں بیس پچیس افراد کے بیٹھنے کا بندوبست تھا۔

"لوگ یہاں بیٹھ کر نہیں کھاتے، خرید کر ساتھ لے جاتے ہیں" لوسی نے ہمیں مطلع کیا۔

ہال کے برابر میں ایک چھوٹے سے کمرے میں انتظامیہ کا مختصر سا دفتر تھا۔ بہت صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا۔ لوسی نے دروازے پر دستک دی اور "یس کم آن" کی آواز سن کر اندر داخل ہو گئی۔ ہم تعاقب میں تھے۔

کمرے میں ایک موٹے سے بہت بڑی اور گول توند والے صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کی توند اتنی بڑی تھی کہ کرسی پر بیٹھ کر وہ اس کے پیچھے چھپ سے گئے تھے۔ آواز بہت کراری تھی۔ سر بالوں سے محروم تھا۔ صرف اطراف میں سفید جھالر سی لگی ہوئی تھی۔

لوسی نے اپنا تعارف کرایا پھر ہمارا تعارف کرایا اور بتایا کہ آپ کو ان سے اچھا خریدار نہیں مل سکتا۔ ان صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہماری طرف مصافحے کے لیے اپنا چھوٹا سا ہاتھ بڑھا دیا۔ ویسے تو ہاتھ چھوٹا نہیں تھا مگر توند کے مقابلے میں بہت کم تر نظر آ رہا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ توند ان کی ساری شخصیت پر حاوی ہو چکی تھی۔

"میرا نام بورڈر ہے۔" وہ کڑک کر بولے۔

"بورڈی۔ تم اس گاہک سے بہت خوش رہو گے" لوسی نے کہا۔

"سوری ہنی۔ تم لیٹ ہو گئی ہو۔ ریستوران میں فروخت کر چکا ہوں۔"

"اوہ" لوسی کے منہ سے نکلا "بہرحال، مبارک ہو۔"

بورڈر صاحب نے توند کے پیچھے سے جھانک کر ہمیں دیکھا اور گرج کر بولے "سوری ینگ مین۔"

ہمیں خاصا افسوس ہونے لگا۔ یہ عمارت، اس کے آس پاس کا علاقہ اور ریستوران ہمیں بہت پسند آیا تھا۔ ابھی قیمت وغیرہ کی تو بات ہی نہیں ہوئی تھی مگر ہم دیکھتے ہی خود کو اس کا مالک سمجھنے لگے تھے۔

"اوکے بورڈی" لوسی نے کہا "پھر سہی۔"

ہم نے بھی "اوکے" "بائی" کہا۔

بورڈی صاحب دھاڑ کر بولے "بس بس، ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہم واپس جانے کے لیے پلٹے، تو تیز ہوا کے جھونکے کی مانند ایک خوشبودار چیز ہمارے پاس سے گزر گئی "ہائی" کی آواز سے پتا چلا کہ "ایک خاتون ہیں۔ اور خاتون بھی کیسی؟ بس کچھ نہ پوچھئے، انتہائی اسمارٹ، چارمنگ، جامہ زیب اور خوش مزاج۔

"اچھا، تو یہ تم ہو؟" لوسی نے شناسا انداز میں کہا۔ پھر مجھ سے بولی "یہ سوسی ہے!"

"یہ ریستوران انہوں نے خریدا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"یہ خود نہیں خریدتی۔ لوگوں کو بے وقوف بناتی ہے۔ مل گیا ہو گا کوئی، آؤ ہم چلیں۔"

سوسی کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ اور دلکش سراپا کو چھوڑ کر ہم مجبوراً لوسی کے پیچھے چل پڑے۔ حسب معمول وہ انتہائی تیز قدمی سے چل رہی تھیں اور ساتھ ہی بولتی بھی جا رہی تھیں "وچ ہے یہ عورت۔ شکل نہیں دیکھی؟ خوفناک جادوگرنی لگتی ہے۔"

"خیر ایسی بھی نہیں ہے" ہم نے دبی زبان میں کہا۔

"تم تو کہو گے" وہ بگڑ کر بولی "آخر مرد ہو نا۔ سمجھ میں نہیں آتا مردوں کو اس میں کون سی خوبی نظر آتی ہے۔ بس چرب زبان ہے۔ شیشے میں اتار لیتی ہے، خدا بچائے ایسی عورتوں سے۔"

ہم عمارت سے باہر نکل کر فٹ پاتھ پر کار کی طرف چل پڑے مگر لوسی کی کمنٹری جاری رہی "میرے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی۔ کالج تو اسے نصیب ہی نہ ہو سکا۔ پڑھنے میں دل

ہی کب لگتا تھا اس کا۔ سوائے آوارہ گردی کے کوئی کام نہیں تھا۔ پڑھا تو زیادہ نہیں مگر بڑے بڑوں کو پڑھا دیتی ہے۔"

ہم کار کے پاس پہنچ گئے۔ لوسی کی نظر میٹر پر پڑی جو تیزی سے چل رہا تھا "اف، بلاوجہ پچاس سینٹ ضائع کیے۔ ابھی تو تیس سینٹ باقی ہیں۔"

ہم دونوں کار میں سوار ہو کر رخصت ہوئے تو لوسی نے ایک بار پھر جھٹکے سے کار اسٹارٹ کی مگر اس بار جھٹکا زیادہ شدید تھا۔

خدا جانے وہ خیال ہی خیال میں سوسی کا جھٹکا کرنا چاہتی تھی یا بورڈر صاحب پر غصہ اتار رہی تھی۔

کار ایک بار پھر واشنگٹن ڈی سی کی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ کار کے ائر کنڈیشنڈ نے ماحول کو خوشگوار بنایا تو لوسی کا موڈ بھی رفتہ رفتہ خوشگوار ہونے لگا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"کے اسٹریٹ" لوسی نے مختصر سا جواب دیا "بہت پر رش جگہ ہے اور اس سے بہت بہتر ہے۔"

ہم چپ رہے، ظاہر ہے کوئی تبصرہ کرنے سے قاصر تھے۔ "کے" اسٹریٹ کے بارے میں اتنا سنا تھا کہ وہ بہت خوب صورت اور فیشن ایبل سڑک ہے۔ وہاں بہت شاندار شاپنگ سینٹرز اور عالی شان دکانیں ہیں۔ سڑکوں پر ٹریفک کا رش کچھ بڑھ گیا تھا۔

یکایک لوسی کی نظر ہم پر پڑی تو اس کے چہرے پر ایک دم پریشانی سی چھا گئی "ارے یہ کیا؟"

ہم نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا "کیا ہوا؟"

"علی، مائی گاڈ۔ تم نے سیفٹی بیلٹ نہیں لگائی؟"

ہم نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"جانتے ہو، یہ ٹریفک کے اصول کے تحت جرم ہے۔ مجھے ٹکٹ مل سکتا ہے اس بات پر۔"

"ہم نے تو پہلے بھی نہیں لگائی تھی" ہم نے سادگی سے کہا۔

"خدا کے لیے جلدی لگاؤ، کسی کوپ (سپاہی) کی نظر پڑ گئی تو بہت مشکل ہو گی۔"

ہم نے سیفٹی بیلٹ کو کھینچا اور اپنے کاندھے پر سے لٹکا لیا "مگر اس کا فائدہ کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"اس کا فائدہ اس وقت پتا چلتا ہے جب ایکسیڈنٹ ہوتا ہے اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لیے انسان کے لیے اس غلطی کو درست کرنا نہ کرنا بے کار ہوتا ہے۔"

ہم سہم کر رہ گئے۔ امریکا میں حادثات کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا کہ اگر ایک کار کا حادثہ ہو جائے تو سو ڈیڑھ سو کاریں خواہ مخواہ ایک دوسرے پر چڑھ جاتی ہیں۔ اللہ رحم کرے، لوسی کی کمنٹری ایک بار پھر شروع ہو گئی۔

"یہ سڑک دیکھ رہے ہو۔ یہ کالوں کا علاقہ ہے۔ بازار میں بھی زیادہ تر ان ہی کی دکانیں ہیں۔ گلیوں میں ان کے گھر ہیں۔ بہت گڑ بڑ رہتی ہے ہر وقت۔ ایک تو ان کے بچے اتنے بہت سے ہوتے ہیں کہ جی گھبرا جاتا ہے۔ آخر یہ اتنے ڈھیر سارے بچے پیدا کیوں کرتے ہیں، ہیں؟"

"ہم کیا بتا سکتے ہیں؟" ہم نے معصومیت سے جواب دیا "یہ تو کوئی کالا ہی بتا سکتا ہے۔ تم ان کے ساتھ رہتی ہو۔ کبھی ان سے پوچھا نہیں؟"

"پوچھنا بے کار ہے۔ ان کے پاس ہر بات کا جواب موجود ہوتا ہے۔ جو کرتے ہیں بس کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس علاقے میں جائدادوں کی قیمتیں بہت کم ہیں۔ چوری چکاری، لوٹ مار، نقب زنی، ڈاکے، آوارہ گردی اور ڈرگز۔ کوئی ایک مصیبت ہو تو بتائی جائے۔ گورے تو گورے یہاں سے تو کالے بھی پراپرٹی بیچ بیچ کر جا رہے ہیں۔ کہو تو کوئی ستا ریستوران دلا دوں؟ ایک سیون الیون بھی بک رہا ہے۔ جو شخص اس کو چلاتا ہے اس کا تو دیوالیہ نکل گیا ہے۔ خود اسٹاف کے لوگ ہی اتنی چوریاں کرتے ہیں کہ خریداروں کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ ایک کورین ہے جس نے خریدا تھا۔ کوریا سے جو بچا کر لایا تھا وہ یہاں گنوا دیا۔ بے چارہ!"

کالوں کی آبادی نمایاں طور پر دوسروں سے مختلف نظر آتی ہے۔ گندگی، ویرانی، عجیب سی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ فٹ پاتھوں پر دیواروں سے ٹیک لگائے لڑکے کھڑے رہتے ہیں "لڑکیاں دن میں مصروف ہوتی ہیں" لوسی نے مطلع کیا "کیونکہ کالے خاندانوں میں لڑکے اور مرد عام طور پر کام نہیں کرتے۔"

"تو پھر کیا کرتے ہیں؟"

"آوارہ گردی، بدمعاشی، شراب پی کر پڑے رہتے ہیں۔ مجھے تو ان کی عورتوں پر بہت ترس آتا ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے ہم اس علاقے کی حدود سے باہر نکل گئے۔ چند اور سڑکوں سے گزر کر ہم "کے" اسٹریٹ پر پہنچ گئے۔ واقعی نہایت خوب صورت اور بارونق سڑک ہے۔ بڑے بڑے اسٹور، شاندار عمارتیں، کشادہ سڑکیں، فٹ پاتھوں کے درمیان کہیں کہیں سبزہ زار اور درختوں کے جھنڈ، اس علاقے میں فٹ پاتھوں پر خوش لباس اور خوب صورت عورتیں بھی چلتی پھرتی نظر آئیں۔ اسٹوروں میں خوب رش تھا۔ ایک جگہ درختوں کے سائے میں پتھر کی بینچوں پر چند کالے بیٹھے ہوئے نظر آئے۔

بیئر پی رہے ہوں گے "لوسی نے کہا "انہیں پینے پلانے کے سوا کرنا کیا ہے؟"

کے اسٹریٹ کے ایک چوراہے سے مڑ کر ہم ایک بغلی سڑک پر پہنچ گئے۔ ایک جگہ کار پارکنگ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ لوسی نے کار اندر موڑ دی۔ یہ ایک کافی بڑا سا میدان تھا۔ بہت سی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ داخلے کے وقت ایک سیاہ فام لڑکے نے ایک کارڈ سا لوسی کے حوالے کر دیا۔ یہ پارکنگ کا ٹکٹ ہے۔ باہر نکلتے وقت یہ دروازے پر دکھانا پڑتا ہے پارکنگ کا کرایہ بھی وصول کیا جاتا ہے۔

پارکنگ سے باہر نکل کر کچھ دور فٹ پاتھ پر چلنے کے بعد ہم ایک عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔

"بس، وہ ریستوران اس کے اندر ہے۔ بہت اچھی جگہ ہے کیا خیال ہے؟" لوسی نے پوچھا۔

جگہ تو واقعی اچھی تھی۔ یہاں سفید فام لوگوں کی آبادی زیادہ تھی۔ بلڈنگ کے بیرونی حصے میں ہی "پیکاک ریستوران" کا خوب صورت بورڈ لگا ہوا تھا۔

"بہت اچھا سودا ہے" لوسی نے کہا "ستر ہزار ڈالر تک میں مل جائے گا۔"

"ستر ہزار ڈالر!" ہم نے پریشانی سے دہرایا۔

"جگہ کے حساب سے زیادہ نہیں ہے۔ تیس ہزار ڈالر ڈاؤن پے منٹ، باقی ماہانہ قسطیں۔ صبح سے رات گئے تک چلتا ہے۔"

یہ سن کر ہم کچھ پریشان ہو گئے۔ ایک تو دکانداری اور وہ بھی صبح سے آدھی رات تک! ریستوران خاصا کشادہ اور خوب صورت تھا۔ دیواروں پر آئینے لگے ہوئے تھے۔ چھت پر فانوس بہت اچھے لگ رہے تھے۔ دو ویٹریس لڑکیاں دلکش لباس پہنے ہوئے تیزی سے ادھر ادھر آنے جانے میں مصروف تھیں۔ ریستوران سے زیادہ ہمیں لڑکیاں پسند آئیں۔

"کیا ویٹریس بھی ریستوران کے ساتھ ہی ملیں گی؟" ہم نے پوچھا۔

"ارے نہیں، یہ تو مالک کی لڑکیاں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چلی جائیں گی۔ ویٹریسیں کی کوئی پرابلم نہیں۔ بہت مل جاتی ہیں۔"

ایک جانب کچن کا حصہ تھا جو ہال کے اندر ہی بنا ہوا تھا۔ خاصا بڑا کچن تھا۔ جس کے تین اطراف میں خوب صورت سا کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک گوشے میں کیش رجسٹر تھا یعنی پیسے لینے اور دینے والی مشین۔ ایک قبول صورت، بھرے بھرے جسم کی صحت مند اور دراز قد لڑکی ایک بڑے میاں سے بل وصول کرنے کے بعد باقی رقم واپس دے رہی تھی۔ نزدیک گئے تو لڑکی اور زیادہ خوب صورت نظر آنے لگی۔

"یہ تو ریستوران کے ساتھ ہو گی نا؟" ہم نے آہستہ سے پوچھا۔

"اوہ نو، یہ بھی مالک کی بیٹی ہے۔ اس کی پانچ بیٹیاں ہیں، وہی اس ریستوران کو چلاتی ہیں۔" لوسی نے چپکے سے ہمیں بتایا "باقی دو کچن میں ہوتی ہیں۔"

ہمیں کافی مایوسی ہوئی۔ لڑکی کے نزدیک جا کر امریکی رواج کے مطابق "ہائی، ہائی" ہوئی۔ لوسی نے اپنا تعارف کرایا پھر ہمارا تعارف کرایا۔ لڑکی نے ہماری جانب بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟ یہ ان سے بات کریں گے۔ ریستوران کی خریداری کے سلسلے میں۔"

لڑکی مسکرائی "ڈیڈ تو تعطیل منانے گئے ہیں۔ ان کی جگہ میں جو موجود ہوں۔"

ہم تینوں ایک کونے والی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد لوسی نے ہمیں ضروری معلومات فراہم کرنا شروع کر دیں۔

"اس ریستوران کی ماہانہ آمدنی تیس ہزار ڈالر ہے۔ اخراجات بائیس ہزار ڈالر کے

قریب ہیں۔ آٹھ دس ہزار ڈالر مہینے کی بچت ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے" ہم نے جواب دیا۔

"اس کی قیمت اسی ہزار ڈالر ہے۔ نصف ڈاؤن پیمنٹ اور نصف قسطیں، تمام کاغذات تمہارے نام کر دیے جائیں گے۔"

لوسی نے ہوشیاری یہ کی کہ تمام اخراجات سے ہمیں مطلع نہیں کیا مثلاً مالک خود ریستوران میں کام کرتا تھا اور اس کی پانچوں بیٹیاں بھی سارے کام خود سنبھالتی تھیں۔ اگر ہم ان کی جگہ اسٹاف رکھتے تو کم از کم سات آٹھ ہزار ڈالر فی ہفتہ تنخواہیں دینی پڑتیں۔ یہ راز ہمیں بعد میں نغمی صاحب نے بتایا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے موٹے اخراجات تھے۔ گویا گھاٹے کا سودا تھا لیکن اس وقت ہمیں بہت فائدہ مند نظر آرہا تھا۔ لڑکی نے ہمیں اپنے ساتھ لے جا کر ریستوران کے تمام حصے دکھائے۔ کچن اور اس کے آلات کے بارے میں بتایا۔ ہر چیز مشینوں سے بنائی جاتی تھی۔ فریج، ڈیپ فریزر، کھانے پکانے کی مشینیں، پیزا بنانے کا سامان اور نہ جانے کیا کیا۔ پھر باتھ روم دکھائے۔ ایک زنانہ تھا، دوسرا مردانہ۔ ہر چیز اعلیٰ درجے کی اور صاف ستھری تھی مگر رہ رہ کر ہمیں یہ خیال آرہا تھا کہ اس ریستوران میں سب سے اچھی چیزیں وہ پانچوں لڑکیاں تھیں جو ریستوران کے ساتھ گاہک کو نہیں مل رہی تھیں۔ کچن میں کام کرنے والی دو لڑکیوں کو دیکھا تو یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا۔ اپنے خوش رنگ اسکرٹ بلاؤز پر سفید ایپرن باندھے اور سروں پر سفید کپڑوں کی اونچی اونچی باورچیوں والی ٹوپیاں لگائے وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ایسی باورچنوں کو باورچی خانے کی حدود میں بند رکھنا واقعی زیادتی تھی۔

"کیوں، کیا خیال ہے؟" واپس جا کر میز پر بیٹھے تو لوسی نے دریافت کیا۔

"کیا یہ ساری معلومات تم کاغذ پر لکھ کر مجھے دے سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں، ہر چیز میرے پاس ٹائپ کی ہوئی موجود ہے۔ تمام کاغذات بھی فائل میں لگے ہوئے ہیں۔ تم اچھی طرح اطمینان کر سکتے ہو۔"

"یہ چیزیں مجھے کب مل سکتی ہیں؟"

"آج بلکہ ابھی۔ مگر اس سے پہلے تمہیں پانچ ہزار ڈالر سیکیورٹی کے طور پر ہمارے پاس جمع کرانے ہوں گے۔"

"سیکیورٹی کس بات کی؟"

"یہ ہم لوگوں کا اصول ہوتا ہے۔ اس کے بغیر تفصیلات فراہم نہیں کی جاسکتیں۔ اگر سودا نہ طے ہوا تو یہ رقم واپس کر دی جائے گی" بظاہر یہ بے ضرر سی بات تھی مگر شام کو نغمی صاحب نے اس کا پول بھی کھول دیا۔ انہوں نے کہا "ارے آفاقی صاحب، یہ لوگ بڑے بدمعاش ہیں۔ سیکیورٹی کی رقم ہرگز واپس نہیں کرتے۔ ایک کے بعد دوسرے بزنس دکھاتے رہتے ہیں۔ جب تک آپ کوئی چیز خرید نہ لیں گے یہ آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے اور نہ ہی سیکیورٹی کی رقم واپس کریں گے۔"

ہم نے لوسی سے کہا "ہم ذرا سوچ کر جواب دیں گے۔"

"کیوں نہیں، خوب اچھی طرح سوچ لو" ہم لوگ ریستوران سے باہر نکل آئے۔

"مگر یہ لوگ اس ریستوران کو فروخت کیوں کر رہے ہیں؟" ہم نے باہر نکل کر پوچھا۔

"کوئی دوسرا بزنس لینا چاہتے ہوں گے۔ یہاں ایسا ہی چلتا رہتا ہے۔ لوگ ایک کے بعد دوسرا بزنس خریدتے رہتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو ہم ریالٹرز کا کام تو ٹھپ ہو کر رہ جائے۔"

ہم دوبارہ کار میں بیٹھے تو لوسی نے ہمیں قریب قریب قائل کر دیا تھا کہ اس سے بہتر کاروبار ہمیں تمام نارتھ امریکا میں نہیں ملے گا۔

"اب تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟" لوسی نے دریافت کیا "وہیں جہاں سے لیا تھا؟"

"ہاں، یہی مناسب ہے ورنہ میں ٹیکسی پر بھی جا سکتا ہوں۔"

"ارے بھئی، تم بالکل نئے اور اجنبی ہو۔ میں خود تمہیں ڈراپ کر دوں گی" اس نے اپنی کار کا رخ موڑ لیا۔ پتا نہیں کون سی سڑک تھی۔ راستوں کا تو ہمیں کچھ پتا نہیں تھا۔ ویسے بھی راستے ہمیں یاد نہیں رہتے اور یہ تو واشنگٹن ڈی سی کے اجنبی اور غیر مانوس راستے تھے۔ ہر جگہ اونچی اونچی عمارتیں، خوب صورت دکانیں، چہل پہل، ہمیں تو بظاہر بھی سڑکیں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔

لوسی کی نظر ڈیش بورڈ میں لگی ہوئی گھڑی پر پڑی تو وہ چونک سی گئی۔ "اوہ سوری علی!
میرا ایک اپائنٹ منٹ ہے۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔"

ہم نے کہا "کوئی بات نہیں۔ جہاں آسانی ہو مجھے ڈراپ کر دو۔ میں ٹیکسی لے کر چلا جاؤں گا۔ وائس آف امریکا اور ائر اینڈ اسپیس میوزیم کا پتا تو سبھی ٹیکسی والے جانتے ہوں گے۔ آسانی سے پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے ایک لمحہ دانتوں میں ہونٹ دبا کر سوچا پھر بولی "سنو، لنچ تو تم نے بھی نہیں کیا ہے۔ آخر کھانا تو کھاؤ گے، بھوکے تو نہیں رہو گے کیوں نہ ہم ساتھ ہی لنچ کریں؟"

"کہاں؟"

"ارے بھئی کسی ریستوران میں یا میکڈانلڈ چلے جائیں گے۔ کسی مہنگی جگہ نہیں جائیں گے۔ اوکے؟"

ہم نے کہا "اوکے۔"

"بس راستے میں ڈڈلے کو پک کرنا ہے۔"

"ڈڈلے!" ہم نے حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ یہ نام کچھ عجیب سا لگ رہا تھا "جیسے ڈڈھو"

"یہ مسٹر ڈڈلے کون ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"میرا بوائے فرینڈ ہے۔ بہت کیوٹ ہے۔ دیکھو گے تو مان جاؤ گے۔"

سوچا کہ ظاہر ہے، ایک خوش شکل، خوش عقل، کامیاب کاروباری عورت نے اسے پسند کیا تھا تو کچھ دیکھ کر ہی پسند کیا ہو گا۔ اگر نام کچھ اوٹ پٹانگ سا ہے تو کیا حرج ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو انسان کی شخصیت ہے۔

"پھر کیا خیال ہے؟" لوسی نے پوچھا "تم نے جواب نہیں دیا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر یہ سوچ لیں کہ میری وجہ سے۔"

"ارے نہیں اس بات کو بھول جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے مل کر بہت خوش ہو گے۔"

پتا نہیں کون کون سی سڑکوں سے گزر کر ہم نویں اسٹریٹ پر پہنچ گئے۔ راستے میں لوسی ہمیں مستقل یہ بتاتی رہی کہ ابھی جو ریستوران ہم دیکھ کر آ رہے ہیں ویسا کوئی اور بزنس ہمیں دستیاب نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں آنکھیں بند کر کے یہ ریستوران خرید لینا چاہیے۔ مزید تفصیلات بھی ہمیں فراہم کر دی جائیں گی۔ بس پانچ ہزار ڈالر کا ایک چیک کاٹنے کی دیر ہے۔

"اور تمہاری یہ رقم سودا مکمل ہوتے ہیں فوراً تمہیں واپس مل جائے گی" اس نے کہا "یہ ایک طرح سے ہمارے پاس تمہاری امانت ہو گی۔ اگر بات طے نہ ہوئی تو پھر بھی یہ تمہاری امانت جب کہو گے لوٹا دی جائے گی" وہ مسلسل ہمیں قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ ہم حیران تھے کہ ایک ایسی خوش ادا لڑکی اس قدر غیر رومانی اور کاروباری گفتگو کر رہی تھی۔ اسی لیے عقلمند کہتے ہیں کہ صنف نازک کو کاروباری مسائل سے علیحدہ رکھنا چاہیے۔ سارا رومانس غارت ہو جاتا ہے۔ ارے بھئی کاروبار کرنے کے لیے مرد کیا کم ہیں؟

نویں اسٹریٹ دیکھتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس علاقے میں کالوں کی آبادی اور عمل دخل زیادہ ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں سفید فام لوگوں کی دکانیں اور دفاتر نہیں تھے مگر کالے خاصی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ لوسی نے بتایا کہ اس سڑک پر کچھ نائٹ کلب، جمنازیم وغیرہ بھی ہیں اور ایسے سنیما گھر بھی ہیں جن میں قابل اعتراض فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

ہم نے کہا "اگر وہ قابل اعتراض ہیں تو کیسے دکھائی جاتی ہیں؟"

ہنس کر بولی "دراصل یہ ایک لمبی بحث ہے۔ بعض لوگوں کے لیے وہ قابل اعتراض ہیں مگر بہت سے لوگ انہیں قابل اعتراض نہیں سمجھتے اس لیے انہیں دیکھنے کی آزادی ہے۔ صرف نابالغ بچوں کو انہیں دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں اگر ان کے ماں باپ مناسب سمجھیں تو اپنے گھر میں ٹی وی پر انہیں دکھا سکتے ہیں۔ یہ ایک فری کنٹری ہے۔"

واقعی۔ اس میں تو کوئی کلام نہیں ہے کہ امریکا ایک آزاد ملک ہے۔ آزاد معاشرہ ہے

بلکہ یہاں تو وہ چیز ہی آزاد ہے۔ بقول نغمی صاحب کے "مادر پدر آزاد......"

ایک سلیٹی رنگ کی پست قد عمارت کے سامنے پارکنگ میں لوسی نے اپنی کار پا
لی۔ آثار ہی بتا رہے تھے کہ یہ سیاہ فاموں کا علاقہ ہے۔ عمارتیں کوئی زیادہ صاف تھ
نہیں تھیں۔ بہت زیادہ چمک دمک بھی نہ تھی۔ پارکنگ ایک میدان میں تھی۔ جس
انچارج ایک سیاہ فام بڑے میاں تھے۔ جب لوسی نے کار پارک کر دی تو وہ نمودار ہوئ
"فائیو ڈالر" انہوں نے مطالبہ کر دیا مگر لوسی کو دیکھ کر پہچان گئے "ہائی ینگ لیڈی!"

"ہائی بونیو" لوسی نے فوراً ان سے مصافحہ کیا پھر ہمارا تعارف کرایا۔ ہم نے بھی ان
ہاتھ ملایا۔ ہاتھ کیا تھا ہاتھی کا پنجہ تھا۔ وہ خود بھی کسی ہاتھی سے کم نہ تھے۔ بہت لم
چوڑے، موٹے، آواز ایسی کہ لگتا تھا کسی کنوئیں میں سے بول رہے ہوں۔ وہ جھو
ہوئے چلتے تھے۔ لوسی نے کہا "یہ بونیو ہیں، اپنی جوانی میں بڑے زبردست باکسر تھے۔"

ہمیں تو اب بھی وہ جوان ہی نظر آ رہے تھے۔ سیاہ فام لوگوں کی ایک خوبی یہ ہے
ان پر زمانے کے ماہ و سال کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اگر انکے بال سفید نہ ہوں تو یہ عمر بھر ا
ہی جیسے نظر آئیں۔ بال بھی ان کے عام طور پر جلدی سفید نہیں ہوتے۔ اب ان
صاحب کو ہی دیکھ لیجئے۔ پتا چلا کہ ان کی عمر ۶۷ سال ہے، ہم انہیں تیس بتیس سال کا
رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ آج کل بھی باکسنگ رنگ میں جا کر نوجوان لڑکوں کو ٹریننگ د
ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر انہیں ریٹائر ہونے کی کیا ضرورت تھ
بظاہر کوئی ایسی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ بہرحال، اس گرم جوشی اور گہری شناسائی
باوجود بونیو صاحب نے پارکنگ کی فیس پانچ ڈالر سے ایک سینٹ بھی کم نہیں کی۔ یہ
امریکا والوں کی وضع داری سمجھ لیجئے۔

مسٹر بونیو کے پارکنگ لاٹ سے ایک پتلی سی گلی کے راستے ہم باہر نکلے۔ یہ ایک
تنگ سڑک تھی۔ امریکا میں ایسی سڑکوں کو "ایلی" کہتے ہیں۔ آپ گلی سمجھ لیجئے۔ کوئی خا
صفائی نظر نہیں آئی۔ فٹ پاتھ بھی شکستہ سے تھے۔ بیئر وغیرہ کے خالی ڈبے اور اخبار وال
کاغذ بھی پڑے ہوئے نظر آئے۔ لوسی نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ایک بڑے
دروازے میں سے داخل ہو کر ہم جب اندر پہنچے تو ہمیں احساس ہوا کہ اس جگہ سفید
لوگ بھی موجود تو ہیں مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ سیاہ فام بہت زیادہ تھے۔ اور ا

کچھ عجیب قسم کے۔ اونچے اونچے، تگڑے جسم اور ہٹے کٹے، لباس وغیرہ بھی زیادہ نفیس نہ
تھا۔ جینز جیکٹ یا بش شرٹ اور جرسی پہنے ہوئے لوگ زیادہ نظر آ رہے تھے۔ لوسی نے
ہمیں اس کا سبب بھی بتا دیا۔

یہ باکسنگ کا ادارہ ہے۔ اندر باکسنگ کی تربیت دی جاتی تھی اور باکسنگ ایک ایسا شعبہ
ہے جس میں امریکی کالوں کو دوسروں پر برتری حاصل ہے۔ سفید فام لوگ تو بس ان پر
شرطیں لگا کر اور ان کے مقابلوں کا بندوبست کرنے تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اگر غلطی سے
باکسنگ کے میدان میں قدم رکھتے بھی ہیں تو منہ کی کھاتے ہیں۔ دراصل نسل اور جسمانی
برتری کے باعث سیاہ فاموں کی اجارہ داری ہے اور یہ خصوصیات انہیں قدرت نے عطا کی
ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ مجھے کوئی مریل سیاہ فام نظر نہیں آیا۔ بیماری تو کیا بڑھاپا
بھی ان کے پاس نہیں پھٹکتا۔ اللہ میاں نے خوب چیز بنائی ہے۔

ہم ایک دو گیلریوں سے گزرے۔ یہاں خاصی چہل پہل تھی۔ بیشتر مرد تھے اور خاصے
دیو قامت۔ ہمیں تو احساس کمتری پیدا ہو گیا۔

ایک کمرے کے کھلے دروازے پر دستک دے کر لوسی اندر داخل ہو گئی۔ یہ ایک دفتر
نما چیز تھی مگر کرسیاں میزیں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں۔ میزوں پر کاغذات بھی ردی کی
صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔

کمرے میں کوئی موجود نہ تھا۔ لوسی نے ایک میز پر رکھے ہوئے انٹر کام کا بٹن دبایا اور
بات کرنی شروع کر دی۔ پہلے تو اپنی آمد کی خبر دی اور پھر بتایا کہ میں دفتر میں منتظر رہوں۔
گفتگو کا اختتام "اوکے، اوکے" پر ہوا۔ امریکی گفتگو میں یہ الفاظ بہت زیادہ استعمال کرتے
ہیں۔ بات کا آغاز بھی عام طور پر "اوکے" سے ہوتا ہے اور ختم بھی "اوکے" پر ہی کرتے
ہیں۔ "اوکے" ان کے لیے کئی معنی رکھنے والا لفظ ہے۔ استعمال کے ساتھ اس کے معنی بھی
بدل جاتے ہیں۔

لوسی ایک میز پر ٹک گئی اور ہمیں کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ ہم خاموشی سے ایک
مڑھے دار کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا "بس دو منٹ۔"
اور واقعی دو تین منٹ بعد کمرے کا ریوالونگ دروازہ زور سے کھلا اور ایک دیو قامت
شخص اندر داخل ہوا۔

"ہائی لوسی مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں" لوسی دوڑ کر پاس پہنچ گئی۔ لوسی ایک کشیدہ قامت خاتون تھی مگر آ[?]
والے کے مقابلے میں بہت مختصر اور چھوٹی سی نظر آ رہی تھی۔ اس میں لوسی کا کوئی قصور
نہیں تھا۔ دراصل جو صاحب اندر داخل ہوئے تھے وہ پورے دیو کے دیو تھے۔ سیاہ رنگ
مگر اس میں ملاحت تھی۔ بہت زیادہ گھونگھریالے بال' لگتا تھا سیاہ باریک تاروں کی ٹوپی پہنے
ہوئے ہیں۔ ایک فٹ کا تو ان کا چہرہ ہو گا۔ اونچائی میں وہ ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ
تھے۔

لوسی ان کے برابر کھڑی ہوئی گڑیا جیسی لگتی تھی۔ انہوں نے محبت سے لوسی کو بچے کی
طرح اٹھا کر ایک کرسی پر کھڑا کر دیا اور بولے "تم کتنی اچھی لگ رہی ہو' حسب معمول۔"

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قدر لحیم شحیم آدمی کی آواز بہت باریک تھی یوں لگتا
جیسے کوئی بچہ بول رہا ہو۔

ان کی نظر ہم پر پڑی تو انہوں نے یوں دیکھا جیسے کسی دیو نے بالشتیوں کو دیکھا ہو'
پھر بولے "مسٹر' تمہیں کس سے ملنا ہے؟"

لوسی نے جلدی سے کہا "یہ میرے ساتھ آئے ہیں۔ میرے کلائنٹ ہیں" پھر کود کر
کرسی سے نیچے اتر کر ہمارا باقاعدہ تعارف کرایا "علی۔ یہ ڈڈلے' میں ان کے بارے میں
تمہیں بتا چکی ہوں۔"

ہم نے کہا "مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ باکسر ہیں۔"

"اوہ۔ سوری' یہ باکسر ہیں۔ ابھی تو کم عمر ہیں۔ تم دیکھ لینا ایک دن یہ شخص چیمپئن
گا۔"

ہم نے انہیں غور سے دیکھا۔ اگر کم عمری میں یہ حال ہے تو بڑے ہو کر نقشہ کیا ہو گا
اس پر ہمیں اپنے ایک دوست یاد آ گئے۔ انہوں نے ایک بہت اعلیٰ نسل کا کتا پالا تھا۔ ا[?]
روز ان کے ماموں گھر آئے تو کتا پیار سے ان کی طرف لپکا اور ان سے لپٹ گیا۔ وہ
چارے کتے کے وزن سے گر گئے۔ بھانجے نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں اٹھایا' معذرت
اور کہا "ماموں۔ معاف کیجئے گا' یہ دراصل ابھی بچہ ہے' نا سمجھ ہے۔ بڑا ہو گا تو سب ٹھیک
ہو جائے گا۔"

ماموں نے حیرت سے کتے کو دیکھا' اور پوچھا "یہ بچہ ہے؟"

جواب ملا "جی ہاں' صرف چھ مہینے کا ہے۔"

وہ بولے "میاں' یہ چھ مہینے کا پورا بکرا کا بکرا ہے۔ فی الحال تو یہ باقاعدہ کتا لگ رہا ہے۔
بڑا ہو گا تو کیا بن جائے گا؟"

ہم نے تعارف کے بعد مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا جو ڈڈلے نے پھول کی طرح
اپنے کفگیر جیسے ہاتھ میں تھام لیا' ہم نے سر اٹھا کر ڈڈلے کو دیکھا جس کا سر ہمیں گنبد کی
طرح نظر آ رہا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں دیکھ کر ہم خاصے مرعوب ہو گئے۔ مکا تو ایک طرف
اگر یہ شخص ہمیں انگلی بھی مار دے تو ہمارا کیا حشر ہو گا؟ ہم نے سوچا۔

لوسی نے کہا "علی' شاید تمہیں یقین نہ آئے مگر ڈڈلے کی عمر ابھی صرف سترہ سال
ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ سب سے کم عمر چیمپئن ہو گا۔"

سترہ سال کی عمر کے بچے ہم نے بھی بہت دیکھے ہیں۔ اور دیکھتے رہیں گے مگر وہ
انسانوں کے بچے لگتے ہیں۔ ڈڈلے صاحب کا بچپنا دیکھ کر ہم حیران رہ گئے' سوچا کہ جب
بچپنا یہ ہے تو جوانی کیا ہو گی؟ ڈڈلے نے ہمارا ہاتھ بڑی آہستگی سے چھوڑ دیا پھر بولا "علی' تم
کچھ کھایا پیا کرو۔ ورزش کیا کرو' مجھے تو تم بھی بچے ہی لگتے ہو۔"

اب ہم انہیں کیا جواب دیتے۔ شرمندگی کے مارے چپ چاپ ہی رہ گئے۔ اس پر
بھی ہمیں ایک لطیفہ یاد سا آ کے رہ گیا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

ایک چوہا جنگل میں جا رہا تھا۔ سامنے دیکھا کہ ایک ہاتھی کا بچہ چلا جا رہا ہے۔ چوہے
نے اس سے پہلے ہاتھی کا بچہ نہیں دیکھا تھا۔ بہت مرعوب ہوا اور اسے دیکھنے کے لیے
ڈرتے ڈرتے قریب پہنچا۔ ہاتھی کے بچے کی چوہے پر نظر پڑی تو وہ بھی کچھ حیران رہ گیا۔
ایک نہایت چھوٹی سی چیز حرکت بھی کر رہی تھی۔ وہ محتاط ہو کر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔
دونوں ایک دوسرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے اور جائزہ لینے لگے۔

چوہے نے پوچھا "بڑے صاحب' معاف کرنا۔ آپ کے راستے میں آ گیا ہوں۔ ناگوار
نہ ہو تو ذرا اپنا تعارف کرا دیجئے۔"

ہاتھی کا بچہ اس مودب گفتگو سے بہت حیران ہوا' انکساری سے بولا "بھائی میں تو بس
ہاتھی کا بچہ ہوں۔"

چوہا ششدر رہ گیا۔ بچہ اور اس سائز کا؟ پوچھا "آپ کی عمر کیا ہے؟"

جواب ملا "چھ مہینے اور آپ کون ہیں؟"

کہا "جی۔ خاکسار کو چوہا کہتے ہیں۔"

"کیا آپ .... ابھی بچے ہیں" ہاتھی کے بچے نے پوچھا۔

پورا بالغ چوہا ندامت سے بولا "ویسے میں بچہ تو نہیں ہوں مگر بچپن ہی سے ذرا بیمار شیمار رہتا ہوں۔"

مگر ڈوڈلے کی بات سن کر ہمیں یہ ضرور پتا چل گیا کہ ذہنی طور پر وہ بچہ ہی تھا۔

لوسی نے کہا "ہاں' کھانے پر یاد آیا کہ ہم لوگ لنچ پر جا رہے ہیں۔ میں نے علی کو بھی مدعو کیا ہے۔"

"اوکے ڈوک" ڈوڈلے نے مسکرا کر کہا "ہمیں چلنا چاہیے۔"

لوسی کی کار خاصی بڑی تھی مگر ڈوڈلے کے بیٹھتے ہی یوں لگا جیسے بھر گئی ہو۔ ہم سے تو بقول شخصے اس کار کی ڈاڑھ بھی گیلی نہیں ہوئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کوئی اس لمبی چوڑی کار میں بیٹھا ہوا ہے۔ ڈوڈلے نے کار میں بیٹھتے ہی باتیں شروع کر دیں۔ اس شخص میں اگر کوئی بات قدرتی تھی تو وہ اس کی آواز تھی بلکہ دیکھا جائے تو وہ بھی قدرتی نہیں تھی۔ اتنا بڑا ڈیل ڈول اور آواز اتنی باریک مگر پھر خیال آیا کہ ہاتھی کتنا گرانڈیل جانور ہوتا ہے۔ مگر اس کی آواز بھی پتلی ہوتی ہے۔ کم از کم اس کے جسم کے مقابلے میں تو مذاق ہی لگتا ہے۔ ڈوڈلے کو دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر بھی خدا کی قدرت یاد آگئی کہ اس فیل تن کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر طفلانہ آواز عطا فرمائی ہے۔

کچھ دیر بعد لوسی کو یاد آیا کہ کار کی پچھلی سیٹ پر ہم بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے اخلاقاً ہمیں بھی مخاطب کرنا ضروری سمجھا اور کہا "ڈوڈلے۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم علی کو بھی باتوں میں شامل کر لیں؟"

ڈوڈلے نے کہا "بالکل نہیں' لوسی تم بھول رہی ہو کہ ہم پرسنل باتیں کر رہے ہیں۔ ان باتوں میں علی کو کیسے شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہنی یہ ہمارا لو افیئر ہے" ہم نے اس کی صاف گوئی کے معترف ہو گئے۔ ویسے امریکیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بلا لاگ لپیٹ صاف صاف بات کہہ دیتے ہیں۔ جھوٹ' مصلحت' اور منافقت سے کام نہیں لیتے جب کہ ان

کے مقابلے میں ہم لوگ اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ڈوڈلے اور لوسی کی گفتگو میں ہماری شرکت نہ صرف اصولی طور پر غلط تھی بلکہ عملی طور پر بھی یہ آسان نہ تھی۔ ڈوڈلے صاحب خالص کالوں کے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک تو امریکی لب و لہجہ اور اس پر سے کالوں کا لب و لہجہ۔ بس سونے پہ سہاگا سمجھ لیجئے۔ اگر امریکی چبا چبا کر' فقروں کو استری کر کے چپٹا کر دیتے ہیں اور ناک کے ذریعے ادا کرتے ہیں تو کالے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اول تو ان کا لب و لہجہ ہی سفید فام امریکیوں سے مختلف ہے۔ اس پر ادائی کا انداز ایسا ہے کہ شاید خود بھی کچھ دیر بعد ہی اپنی بات سمجھتے ہوں گے۔ امریکا میں رہنے کے باوجود یہ لوگ بول چال' رسم و رواج' اور عادات و اطوار کے اعتبار سے گورے امریکیوں سے بے حد مختلف ہیں۔ ان کا مزاج' ان کا ذوق' ان کی پسند ناپسند' ان کا میوزک' ان کے ڈانس' ہر چیز مختلف ہے۔ بال بنانے اور لباس پہننے کا انداز بھی الگ ہے۔ یہ لوگ بہت گہرے تیز اور چیختے چنگھاڑتے رنگ پسند کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان کی رنگت پر بھلے بھی لگیں گے یا نہیں۔ عورتیں بال ایسے بناتی ہیں کہ بس دیکھتے ہی رہیے۔ انتہائی باریک' پتلی پتلی چوٹیاں خدا جانے کس طرح بناتی ہیں اور بالوں میں تیل بھی خوب لگاتی ہیں۔ یہ ان خواتین کے فیشن کی انتہا ہے۔ ماڈرن یعنی ترشے ہوئے بالوں کے معاملے میں بھی ان کے فیشن جدا ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو ان کے بال امریکیوں سے ہی کیا' عام بنی نوع انسان سے بھی مختلف ہیں۔ سخت' موٹے' گھنے اور تاروں کی طرح گتھے ہوئے۔ بال کیا ہیں یوں سمجھئے کہ سر پر ٹوپی سی رکھی ہوئی ہے۔ بالوں کی اس کوالٹی کے باعث ہی غالباً یہ لوگ گنج پن سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ہم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے مگر کالے گنجے خال خال ہی دیکھے ہیں بلکہ سوچ رہے ہیں کہ دیکھے بھی ہیں یا نہیں؟

ہم کار کی پچھلی نشست پر خاموش بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ آخر ان دونوں انسانوں میں وہ کون سی قدر مشترک ہے جس کے پیش نظر انہیں ایک دوسرے سے پیار ہو گیا ہے؟ ایک سفید' دوسرا کالا' ایک نرم و نازک دھان پان' دوسرا پہاڑ' ایک پختہ عمر دوسرا بچہ وغیرہ وغیرہ۔ مگر سنا ہے کہ عشق کا دیوتا کیوپڈ تو اندھا ہوتا ہے۔ وہ جب تیر چلاتا ہے تو کسی جگہ تاک کر نہیں مارتا بلکہ اردو محاورے کے مطابق بس ہوا میں تیر چلاتا ہے۔ اب یہ قسمت ہے کہ کسی کو بھی جا لگے۔ اپنی اپنی قسمت کہئے یا شامت۔ کیوپڈ صاحب کا یہ تیر بھی بس

اسی حساب سے کہیں نہ کہیں جا لگا تھا۔

لوسی نے اعلان کیا "ہم میکڈانلڈ جا رہے ہیں بلکہ وہاں پہنچ گئے ہیں۔"

سڑک پر خوش قسمتی سے ایک پارکنگ میٹر دستیاب ہو گیا اور لوسی نے وہاں کار پارک کر دی۔ گوشت کا وہ زندہ پہاڑ کار سے برآمد ہو گیا۔ سامنے ہی "میکڈانلڈ" تھا۔ دراصل میکڈانلڈ بھی کوکا کولا کی طرح امریکی کلچر کا ایک لازمی حصہ ہے۔ جہاں ایک بھی امریکی ہو؛ وہاں کوکا کولا اور میکڈانلڈ بھی ضرور ہو گا۔ کہنے کو آپ اسے ریستوران کہہ لیں یا ٹیک اوے۔ مطلب یہ کہ جہاں بیٹھ کر کھانا لازم نہیں ہے۔ پیک کرا کے ساتھ لے جائیں۔ یہ سب ایجادات خالص امریکی ہیں۔ امریکیوں نے تو اپنی زندگی کو آسان بنانے کے لیے یہ طریقہ اپنایا ہے۔ ایسے ریستورانوں کو "فاسٹ فوڈ" کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ کھانا فوراً آپ کے سامنے ہی تازہ تازہ پکا کر منٹوں میں آپ کو دے دیا جاتا ہے۔ نہایت عمدہ، لذیذ اور بہت سستا۔ چاہے ساتھ لے جائیں، خواہ وہیں بیٹھ کر صاف ستھرے، خوب صورت ماحول میں کھائیں مگر ویٹر وغیرہ کوئی نہیں ہوتا۔ خود ہی ٹرے اٹھا کر میز کے پاس لے جائیے اور کھا پی کر خود ہی ایک طرف رکھے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں ڈال دیجئے۔ بعض لوگ کھانے کے بعد بچا کھچا سامان وہیں میز پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس وقت عملے کے لوگ آ کر میز کو صاف کرتے ہیں۔ اس قسم کے ریستورانوں میں عام طور پر اسکول کی نوعمر طالبات کام کرتی ہیں۔ آسان اور دلچسپ کام ہے۔ زیادہ وقت بھی نہیں لگتا اور معاوضہ بھی معقول مل جاتا ہے۔ یہ "فاسٹ فوڈ" کا فلسفہ اور تصور ہے۔ مگر ہمارے ہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ فاسٹ فوڈ کے نام پر ہمارے ہاں جو ریستوران کھلے ہیں وہاں کھانے پینے کا سامان اعلیٰ ریستورانوں سے بھی زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میکڈانلڈ کا سسٹم عام طور پر ہر جگہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ امریکی کلچر کا ایک جزیرہ ہے۔ کسی بھی ملک، کسی بھی خطے میں میکڈانلڈ بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسا امریکا میں ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ امریکا ہی میں بیٹھے ہیں۔ خیر یہ میکڈانلڈ تو تھا ہی امریکا میں بلکہ عین امریکا کے قلب یعنی دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی میں۔ بہت خوب صورت اور رنگین ماحول تھا۔ رنگینی کا ایک سبب وہ نوخیز اور شگفتہ چہرہ لڑکیاں بھی تھیں جو کچن میں درجنوں کے حساب سے مصروف کار تھیں یا ادھر ادھر کاموں میں مصروف نظر آ رہی تھیں۔ ڈڈلے

کو سب نے ایک بار مڑ مڑ کر دیکھا ضرور۔ اس کا قد و قامت ہی ایسا تھا مگر اس کے بعد کوئی توجہ نہ دی۔ اگر یہ ٹی وی اسٹار یا باکسر ہوتا تو اب تو آٹوگراف لینے والوں اور والیوں کا ہجوم ہو جاتا۔

ہم لوگ بھی کچن کے سامنے والے بڑے کاؤنٹر پر جا کر قطار میں کھڑے ہو گئے۔ سامنے اوپر کی جانب ان اشیا کی فہرست تھی جو یہاں دستیاب ہو جاتی ہیں اور ساتھ ہی ہر چیز کی قیمت بھی درج تھی۔ مغربی معاشرے کا یہ پہلو بہت اچھا اور قابل تقلید ہے کہ ہر چیز کی قیمت ساتھ ضرور درج ہوتی ہے۔ ملازمت ہے تو تنخواہ درج ہوتی ہے گھر کرائے پر دینا ہے یا فروخت کرنا ہے تو اس کی بھی قیمت ساتھ درج کر دی جاتی ہے۔ دکانوں پر چھوٹی سی چھوٹی، بڑی سے بڑی کوئی چیز ایسی نہیں جس پر قیمت درج نہ ہو۔ ریستورانوں میں کھانے کی اشیا کے سامنے بھی قیمتیں درج کر دی جاتی ہیں۔

لوسی قطار میں ہمارے سامنے تھی۔ اس کے آگے ڈڈو، معاف کیجئے گا ڈڈلے صاحب تھے۔ لوسی نے مڑ کر اپنے تابناک چہرے کو ہمارے سامنے لہرایا اور کہا "وہ دیکھو، سامنے مینو درج ہے۔ اپنی پسند کی چیز کا آرڈر دے دینا وہ تمہیں بل دے دیں گے جو اسی وقت ادا کرنا ہو گا۔ پھر جب تک کھانے کی ٹرے نہ مل جائے اسی جگہ کھڑے رہنا۔ اوکے؟"

ہم نے جواب دیا "اوکے۔ مگر یہ سوچ کر بہت غصہ آیا کہ ہمیں دعوت دے کر لنچ کے لیے خود ہی لے گئی ہے اور بل بھی ہم ہی کو ادا کرنا پڑے گا۔ یہ بھی امریکی سسٹم کا یا کلچر کا ایک حصہ ہے۔

ہم نے تو ایک برگر اور ایک ملک شیک پر ہی اکتفا کیا مگر ڈڈلے کی ٹرے اوپر تک ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھی۔ آخر باکسر تھا اور بقول لوسی کے مستقبل کا باکسنگ چیمپئن۔ زیادہ کھائے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔

ہم لوگ میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ لوسی بے چاری نے تو صرف ایک "ڈائٹ کوک" پر اکتفا کیا تھا۔ ہمارے ٹرے میں بھی کھانے کا سامان برائے نام ہی تھا۔

ڈڈلے کی نظر پڑی تو پوچھا "کیا تم بھی ڈائٹنگ کر رہے ہو؟"

ہم نے کہا "نہیں، ہمارے پیٹ میں اتنی ہی گنجائش ہے۔"

اس نے ایک سالم برگر منہ میں رکھا اور کہا "پیٹ کو الزام نہ دو۔ پیٹ سب کا ایک

ہی سائز کا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو اس کا استعمال ہے۔ کھاؤ گے پیؤ گے تو پیٹ میں بھی گنجائش ہو جائے گی۔ سنو، تم باکسر کیوں نہیں بن جاتے؟"

یہ بات سن کر لوسی کو بے اختیار ایسی ہنسی آئی کہ اچھو ہو گیا۔

ڈڈلے نے حیران ہو کر پوچھا "کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آر یو اوکے؟"

لوسی نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور بولی "آئی ایم اوکے۔"

ڈڈلے نے ایک لمبی سی ڈکار لی اور کہا "اوکے!"

لنچ چند منٹ میں ختم ہو گیا۔ لوسی نے ہمیں پہلے ائر اینڈ اسپیس میوزیم کے باہر ڈراپ کیا اور ڈڈلے کے ساتھ یہ جا، وہ جا۔

ہم عجائب گھر کے سامنے کھڑے سوچتے رہے کہ لوسی اور ڈڈلے کی دوستی بھی کسی عجوبے سے کم تو نہیں ہے۔

شام کو ہم اکمل علیمی صاحب کے ہمراہ تھکے ہارے گھر پہنچے تو آدھی درجن کے قریب پیغامات ہمارے منتظر تھے۔ پہلے تو حیران ہوئے کہ سمندر پار، اس پردیس میں ہم اس قدر مقبول کیسے ہو گئے کہ اتنے ڈھیر سارے لوگوں نے ہمیں ٹیلی فون کے ذریعے یاد کرنا ضروری سمجھا مگر جب پیغامات پر نظر ڈالی تو سب کے سب پیغام صرف ایک ہی ہستی کی طرف سے موصول ہوئے تھے اور ان کا نام تھا وان ڈائیک ایٹا۔ شمالی یورپ کے کسی ملک سے تعلق رکھنے والے معلوم ہوتے تھے۔ دماغ پر بہتیرا زور ڈالا مگر وان ڈائیک ایٹا نام کے کسی شناسا کا خیال نہ آیا۔ آخر یہ اتنے مشکل اور طویل نام کے مالک کون صاحب ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟

پارو نے ہمیں مطلع فرمایا کہ انگریز صاحب، ایک بہت بڑی لال کار میں ہم سے ملاقات کے لیے بھی آئے تھے۔ ہماری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اتنی دیر میں نادیہ ایک وزیٹنگ کارڈ لے کر آئیں "پاپا۔ ایک امریکن یہ کارڈ دے گئے ہیں۔ ان کا نام وان ڈائیک آٹا ہے۔"

پتا نہیں وہ خود اپنے نام کا تلفظ کس طرح کرتے ہوں گے مگر ATTA کو نادیہ نے اگر "آٹا" بنا دیا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ بہر حال، کارڈ پر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ وہ ایک ریالٹر تھے یعنی پراپرٹی ڈیلر۔ ان کا دفتر ورجینیا میں تھا۔ ہمارے ٹیلی فون پیغام کے جواب میں بنفس نفیس برائے ملاقات تشریف لائے تھے۔ ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹی وی کے سامنے بیٹھے کافی نوش کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عاطف نے بتایا کہ ہمارے لیے ٹیلی فون ہے۔ کوئی "عطا" صاحب بول رہے ہیں۔

"عطا صاحب؟" ہم سوچ میں پڑ گئے "کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"ورجینیا سے ہی بول رہے ہیں مگر انکل' انگریزی بالکل امریکنوں کی طرح بولتے ہیں۔" ٹیلی فون پر گفتگو کی تو دوسری طرف ایٹا صاحب تھے۔ جنہیں نادیہ نے "آٹا" اور عاطف نے عطا بنا دیا تھا۔ ہم نے ان سے معذرت کرنی شروع کر دی کہ دراصل ہم سارا دن گھر پر موجود نہیں رہے۔ واشنگٹن ڈی سی گئے ہوئے تھے مگر اس اللہ کے بندے نے ایک بار بھی شکایت نہیں کی بلکہ اظہار ندامت ہی کرتا رہا کہ میں نے بار بار فون کر کے آپ لوگوں کو پریشان کیا۔ دیکھا آپ نے دکان داری اسے کہتے ہیں۔ ہم تو ہندو بنیوں کو ہی دکانداری میں ماہر سمجھتے تھے مگر پتا چلا کہ یہ تو امریکیوں کے سامنے طفل مکتب ہیں۔ تجارت کرنا تو کوئی ان سے سیکھے۔ بہر حال' آٹا صاحب کے ٹیپ کا بند یہ تھا کہ آپ کے لیے بہت اچھے پرپوزل موجود ہیں۔ آپ کل صبح مجھے خدمت کا موقع تو دیں۔

"کس قسم کا پروپوزل؟" ہم نے پوچھا۔

پروپوزل کا ذکر سن کر کمرے میں موجود سبھی لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ خاص طور پر لیٹی نے ہمیں گھورنا شروع کر دیا۔ ہم نے فون پر ہاتھ رکھ کر بتادیا کہ یہ پروپوزل کاروبار کے سلسلے میں ہے شادی وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آٹا صاحب بڑے زور شور سے بولے "میرے پاس مختلف قسم کے ریستوران' گفٹ شاپس' لانڈریٹ' گوگو وغیرہ موجود ہیں۔"

ہم نے پوچھا "لانڈریٹ سے آپ کا مطلب لانڈری ہے؟ جہاں کپڑے دھلتے ہیں؟"

بولے "علی' کم آن۔ ظاہر ہے لانڈری میں صرف کپڑے ہی دھوئے جا سکتے ہیں۔ برتن نہیں دھوئے جاتے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک پرزور قہقہ لگایا' پھر کہا "اگر آپ کل فارغ ہیں تو مجھے موقع دیجئے میں آپ کو کہاں ملوں؟"

ہم نے کہا "آپ کہیں گے تو ہم واشنگٹن ڈی سی میں مل لیں گے۔ ائر اینڈ اسپیس میوزیم کیسا رہے گا؟"

کہنے لگے "وہ جگہ تو میری کمزوری ہے۔ خالی وقت میں وہاں ضرور جاتا ہوں لیکن کچھ چیزیں ورجینیا میں بھی ہیں۔ روز لین میں ایک ریستوران ہے۔ آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کو آپ کے گھر سے لے لوں؟"

"بھئی آپ اتنی دور کہاں آئیں گے؟"

"میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ میں ورجینیا میں ہی رہتا ہوں۔"

اس طرح اگلے دن صبح دس بجے کا وقت مقرر ہو گیا اور انہوں نے "پھر ملاقات ہو گی" کہہ کر فون بند کر دیا۔

سب کی رائے یہ تھی کہ آٹا صاحب کافی کام کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ضرور کوئی اچھا سا کاروبار دلا دیں گے۔ اس کے بعد ہر ایک نے اپنی قیمتی رائے اور مشورہ پیش کرنا شروع کر دیا۔ بچیوں کی رائے "گوگو" اور ریستوران کے حق میں تھی۔

"وہ کس لیے؟"

"اس لیے پاپا کہ "گوگو" بہت پیارا نام ہے۔"

"تمہیں پتا بھی ہے کہ "گوگو" کیا ہوتا ہے؟"

"پتا تو نہیں مگر اس کی ساؤنڈ بہت اچھی ہے اور ریستوران میں کھانے پینے کی آسانی ہوتی ہے۔ پھر ماما کو کھانا وانا پکانے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی' کیوں ماما؟"

"تو پھر چل چکا ریستوران" ماما نے کہا

لیٹی گفٹ شاپ کے حق میں تھیں' کہنے لگیں "سالگرہ اور شادی کے موقعے پر لوگوں کو گفٹ دینے میں آسانی رہے گی۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے' یہ ہے ہم لوگوں کو کاروباری ذہنیت۔ ہندو ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مسلمان کبھی اچھے کاروباری نہیں بن سکتے۔

مگر علیمی صاحب کا ووٹ لانڈریٹ کے فیور میں تھا۔

"آپ جیسے لوگوں کے لیے یہ بہت اچھا پروپوزل ہے۔" انہوں نے کہا۔

"آپ جیسے لوگوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟" ہم نے وضاحت چاہی۔

لیٹی بولیں "مطلب یہ کہ آپ جیسے اناڑی اور کام چور' جنہیں کسی کاروباری کا تجربہ ہی نہیں ہے۔"

علیمی صاحب جلدی سے بولے "اس کے لیے تجربے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لانڈریٹ کے ہال میں بہت سی مشینیں لگی ہوتی ہیں۔ کپڑے دھونے والے خود ہی آجاتے ہیں۔ یعنی اشتہار دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ مشینوں میں خود ہی واشنگ پوڈر

اور کپڑے ڈال دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی رقم بھی۔ بعد میں خود ہی انہیں سوکھنے
مشین میں ڈال دیتے ہیں۔ کپڑے سوکھ جاتے ہیں تو انہیں سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔"

"اچھا۔ تو مالک کیا کرتا ہے؟"

"مالک بس پیسے بٹورتا ہے۔ آپ کو صفائی کے لیے ایک آدمی رکھنا پڑے گا۔ کسی
پارٹ ٹائم عورت یا بچے سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اس سے اچھا کام اور کوئی نہ ہو گا۔"

واقعی! اس سے اچھا کام بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔ بس لانڈریٹ ہمارے دل کو لگ گیا
ہم بلاوجہ پریشان ہو رہے تھے کہ ہمیں تو کسی کام کا تجربہ ہی نہیں ہے۔ لانڈریٹ چلانے
کے لیے تو کسی تجربے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بس ہم نے فیصلہ کر لیا کہ لانڈریٹ
خریدیں گے۔

دوسرے دن ٹھیک صبح نو بجے کار کا نازک سا ہارن سنائی دیا۔ باہر مسٹر وان ڈائیک آٹا
صاحب اپنی بہت لمبی اور چمکدار کار میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے تین پیس کا سوٹ پہن
رکھا تھا۔ گلے میں سرخ رنگ کی بو ٹائی باندھ رکھی تھی۔ رنگ ان کا سرخ و سفید تھا۔ قد کا
کچھ پتا نہیں چلا کیونکہ وہ بہت موٹے تھے۔ موٹے آدمی کے قد پر کوئی توجہ بھی نہیں دیتا۔
دیکھنے میں وہ چالیس پینتالیس سال کے نظر آئے مگر جب بے تکلفی ہوئی تو پتا چلا کہ ۶۵ سے
بھی زائد عمر کے ہیں۔ بھئی خوب، ان امریکیوں کو اپنی اصل چھپانے میں بھی کمال حاصل
ہے۔

ہم ناشتا واشتا کر کے بالکل تیار بیٹھے تھے فوراً ان کی کار کے پاس پہنچ گئے۔ نادیہ اور
پارو بھی ہمارے ساتھ تھیں۔

انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا "علی؟"

ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا تو چلا کر بولے "ہائی!"

ہم نے جواب میں کہا "ہائی۔"

انہوں نے کار میں بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور پھر نادیہ اور پارو کو دیکھ کر
کار سے باہر نکل آئے، پوچھا "یہ آپ کی ایڈوائزر ہیں؟"

ہم نے کہا "جی نہیں۔ یہ ہماری بچیاں ہیں۔"

"یہ بھی بزنس تلاش کرنے کے لیے ساتھ جائیں گی؟"

ہمارے جواب دینے سے پہلے نادیہ نے ہمارے کوٹ کا دامن پکڑ لیا "پاپا..... کہہ دیں نا
ہاں!"

ہم نے کہا "مگر بیٹے... ہم تو..."

"پاپا... ہم بھی سیر کر لیں گے۔ آپ کا کیا جائے گا، کیوں پارو؟"

پارو نے فوراً تصدیق کر دی اور ہمارے کوٹ کا دوسرا دامن پکڑ لیا۔

ہم نے مجبور ہو کر دیکھا۔ پھر مسٹر آٹا سے کہا "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو انہیں بھی
ساتھ لے چلیں یہ ذرا سیر کر لیں گی۔"

"شیور شیور" انہوں نے گرم جوشی سے کہا "میری کار میں بہت جگہ ہے۔ کم آن
گرلز۔"

یہ سنتے ہی دونوں گرلز کود کر کھلی کار کے اندر پہنچ گئیں۔ ہم نے کہا "ماما سے تو پوچھ
لو۔"

کہا "وہ خود ہی سمجھ جائیں گی، پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہمیں مسٹر آٹا نے اگلی سیٹ پر بٹھا لیا اور کار چل پڑی۔

وہی خوب صورت، کشادہ، درختوں اور سبزہ زاروں سے گھرے ہوئے راستے تھے اور
وہی حسین مناظر۔ درمیان میں مسٹر آٹا کی نان اسٹاپ گفتگو بھی جاری تھی۔ انہوں نے
سانس لیے بغیر پہلے تو اپنی اور اپنی کمپنی کا تعارف کرایا۔ بتایا کہ وہ یہودی ہیں پھر پوچھا "آپ
تو مسلمان ہوں گے؟"

ہم نے کہا "ظاہر ہے۔"

"اور کیا۔ علی تو مسلمان ہی کا نام ہو سکتا ہے۔ ویسے آپ یہودیوں کے خلاف تو نہیں
ہیں؟"

"بالکل نہیں" ہم نے کہا "ہم صرف اسرائیل کے خلاف ہیں۔"

"یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بحث کی جا سکتی ہے مگر اسے ہم فی الحال ملتوی کرتے
ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے ہمیں معیشت کے بارے میں بتایا۔ امریکا میں لوگوں کے لیے
کتنے بے پناہ وسائل اور امکانات موجود ہیں۔ کیسے لوگ آسانی سے دولت مند ہو جاتے ہیں

وغیرہ وغیرہ پھر کہا کہ سب سے پہلے ہم ایک لانڈریٹ دیکھنے چلیں گے جو نزدیک ہی ہے۔

ایک شاپنگ سینٹر میں کار پارک کرنے کے بعد وہ ہمیں لے کر ایک بہت شاندار لانڈریٹ میں گئے۔ بہت خوب صورت اور صاف ستھری جگہ تھی۔ فرش شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ چاروں طرف مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ چند خواتین اپنے کپڑے دھلنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایک جانب آفس کا کمرا تھا۔ یہ بھی خاصا کشادہ اور سجا ہوا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی پر کشش خاتون کرسی پر بیٹھی "پلے بوائے" میگزین پڑھ رہی تھیں۔ ہمارے لیے یہ پہلا اتفاق تھا اس لیے بھونچکے رہ گئے۔ "پلے بوائے" میگزین ہمارے ملک میں شجر ممنوعہ ہے۔ لوگ اسمگل کر کے لاتے ہیں وہ بھی سات تالوں کے اندر چھپا کر رکھتے ہیں اور کسی کو نہیں بتاتے کہ ان کے پاس پلے بوائے بھی ہے۔ بس راتوں کی تنہائیوں میں چوری چوری، سب کی نظریں بچا کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور یہاں یہ خاتون کھلے عام پلے بوائے کے مطالعے میں مصروف تھیں۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر بھی انہوں نے میگزین کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

ہمیں تو شرم آئی۔ مقام شکر ہے کہ بچیاں اس وقت باہر مشینیں دیکھنے میں مصروف تھیں۔

آٹا صاحب نے ہمارا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ لانڈریٹ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ خاتون نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بتایا کہ اس میں چالیس مشینیں لگی ہوئی ہیں۔

ہم نے پوچھا "آپ یہ کیوں فروخت کر رہی ہیں؟"

بولیں "میں بور ہو گئی ہوں اس یکسانیت سے۔ آخر کہاں تک مطالعہ کر سکتی ہوں"

مطلب یہ کہ اور کوئی کام ہی نہیں تھا کرنے کے لیے۔ لیٹی نے درست کہا تھا کہ: کام چور اور اناڑی لوگوں کے لیے بہترین کاروبار ہے۔

وہ بولیں "آپ چاہیں تو کوئی کپڑا دھو کر تجربہ کر لیں۔"

"مثلاً کون سا کپڑا؟"

"مثلاً آپ کی قمیص۔ چاہیں تو ٹراؤزر بھی مشین میں ڈال دیں۔"

دل میں تو آئی کہ ان سے پوچھیں کہ قمیص اور ٹراؤزر اتار دیں گے تو کیا پہنیں گے؟ مگر ان سے یہ سوال کرنا فضول تھا۔ وہ "پلے بوائے" کی قاری تھیں۔ کم سے کم لباس بلکہ

لباس کی بھی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ہمارے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کہنے لگیں "اوکے، اوکے" آپ اپنا رومال یا جراب دھو کر دیکھ لیں۔"

ہم نے شیشے کی دیوار سے باہر دیکھا تو ایک خاتون ایک مشین کے اندر سے دھلے ہوئے کپڑے باہر نکال رہی تھیں، ہم نے کہا "ہم ان کو نہ دیکھ لیں؟"

بھولپن سے پوچھنے لگیں "کسے؟ مشین کو یا خاتون کو؟" پھر خود ہی ہنس پڑیں۔ مسٹر آٹا بھی ہنسنے لگے۔ مجبوراً ہمیں بھی کھسیانی ہنسی ہنسنی پڑی۔ ہم معذرت کر کے باہر نکل گئے۔ دراصل ہمیں ڈر تھا کہ کہیں بچیاں اس کے اندر نہ آجائیں اور پلے بوائے میگزین نہ دیکھ لیں۔ مگر یہ وہی بات تھی کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ امریکا میں رہ کر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ پلے بوائے اور اس قسم کے دوسرے میگزین نظر سے محفوظ رہیں۔ وہاں تو چھوٹی چھوٹی دکانوں پر ٹافیوں کے ڈبوں کے برابر میں اس قسم کے میگزین رکھے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔ ہمارا ملک ہو تو کوئی ٹافی پر نگاہ بھی نہ ڈالے مگر وہاں سے دیکھا کہ لوگ میگزینوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

آٹا صاحب ہمیں مشین کے پاس لے گئے اور بتانے لگے کہ نہایت آسانی سے اسے چلایا جا سکتا ہے پھر انہوں نے ہمیں مختصراً یہ بتا دیا کہ اس لانڈریٹ میں کتنی مشینیں ہیں۔ ہر روز کتنی آمدنی ہو جاتی ہے جب کہ خرچ نہ ہونے کے برابر ہے۔

پھر کہا "علی، یقین کرو، مہینے کے ۸۰ ہزار ڈالر تو کہیں نہیں گئے۔"

"اسی ہزار ڈالر پرافٹ؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پرافٹ نہیں، آمدنی۔ اور اخراجات تو بے حد کم ہوتے ہیں۔ سمجھو کہ ساٹھ ہزار ڈالر مہینے پرافٹ ہے۔ یعنی سات لاکھ بیس ہزار ڈالر سالانہ۔"

ہمیں تو چکر آگئے۔ اور آنے بھی چاہیے تھے۔ کوئی شخص امریکا پہنچتے ہی تیسرے دن کھڑے کھڑے لکھ پتی ہو جائے تو اس پر بھلا کیا گزرے گی؟

ہمارا دل بے قابو ہو گیا۔ سوچا کہ اگر اس میں مبالغہ بھی ہے تو کتنا ہو گا؟ ماہوار ساٹھ ہزار ڈالر نہ سہی، تیس ہزار ڈالر بھی منافع ہوا تو بھی لکھ پتی ہو جائیں گے۔ بھئی واقعی لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ امریکا تو روشن مواقع کی سرزمین ہے۔ انسان بیٹھے بٹھائے لکھ پتی ہو جاتا

ہے۔ لکھ پتی بننے کا اس سے آسان نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

ہم تو اس بات پر مصر تھے کہ بس یہی لانڈریٹ خریدیں گے مگر آغا صاحب کا اصرار تھا کہ کچھ دوسرے "بزنس" بھی دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حالانکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہم "لانڈریٹ" کے منافع کی شرح سن کر ہی لوٹ پوٹ ہو گئے ہیں۔

ہماری اگلی منزل "روز لین" تھی۔ یہ ریاست ورجینیا کی حدود میں ہے اور بہت خوب صورت اور آباد علاقہ ہے۔ واشنگٹن ڈی سی یہاں سے ایک پتھر مارنے کے فاصلے پر ہے۔ یہ ہم نے انگریزی فقرے کا ترجمہ کیا ہے۔ مائنڈ نہ کیجیے۔

ایک اونچی سی عمارت میں ایک "گفٹ شاپ" دیکھی۔ عمارت میں بھی چہل پہل تھی اور گفٹ شاپ میں اس سے بھی زیادہ رونق تھی۔ یہ زیادہ بڑی دکان نہیں تھی مگر انواع و اقسام کی چیزیں یہاں موجود تھیں۔ ان میں سب سے نمایاں دو لڑکیاں تھیں۔ بے حد اسمارٹ اور خوب صورت، مسکراتیں تو منہ سے پھول جھڑتے تھے اور ہر وقت مسکراتی رہتی تھیں گویا ماحول باغ و بہار کی مانند تھا۔ دونوں کے بال سنہرے، آنکھیں گلابی اور چہرے ماہتابی تھے۔ اس چھوٹی سی دکان میں بھی وہ فلموں کی ہیروئنیں ہی لگتی تھیں اور کوئی خلاف معمول بات بھی نہ تھی۔ ہم نے پڑھا تھا کہ ہالی ووڈ کی بہت سی نامور ہیروئنیں ایسے ہی مقامات سے دریافت کی گئی تھیں۔ کسی ریستوران سے، کسی دکان سے، کسی کیمسٹ شاپ سے یا پھر یوں ہی آوارہ گردی کرتے ہوئے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس ملک میں حسن و جمال کی کوئی کمی نہیں ہے۔ قدم قدم پر حسینوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کوئی خوش قسمت ہو تو ہیروئن بن جاتی ہے ورنہ اسی طرح زندگی گزار دیتی ہے۔

آغا صاحب نے ہمیں فوراً حساب کتاب بتانا شروع کر دیا کہ اس گفٹ شاپ سے کتنی آمدنی ہوتی ہے۔ اخراجات کتنے ہیں۔ منافع کتنا ہے۔ فوائد کیا کیا ہیں۔ کتنے بجے سے کتنے بجے تک دکان کھلی رہتی ہے۔ کتنی قیمت میں مل سکتی ہے۔ ڈاؤن پیمنٹ کتنی کرنی ہوگی اور ماہانہ قسطیں کتنی ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک منافع کا تعلق ہے تو لانڈریٹ کے مقابلے میں یہ گفٹ شاپ کچھ بھی نہ تھی مگر رہ رہ کر ان دو خوب صورت لڑکیوں کا خیال آ رہا تھا۔

مسٹر آغا نے بتایا "آپ کو آٹھ سو ڈالر فی ہفتہ میں بہت اچھی سیلز گرلز بھی مل جائیں گی"

ہم نے فوراً دل ہی دل میں حساب لگایا۔ مطلب یہ کہ ہمیں یہ دو خوش بدن، خوش اطوار اور خوش مزاج لڑکیاں صرف سولہ سو ڈالر فی ہفتہ معاوضہ ادا کر کے مل جائیں گی۔ یعنی مہینے کے صرف چھ ہزار چار سو ڈالرز۔ جب اس رقم کو پاکستانی روپے میں تبدیل کیا تو دل بیٹھ سا گیا گویا اس زمانے کے حساب سے صرف چونسٹھ ہزار روپے ماہانہ۔ اور وہ بھی صرف دو سیلز گرلز کا معاوضہ!

اتنی دیر میں بچیاں ہمارے پاس آ گئیں۔ انہوں نے چیونگم، چاکلیٹ، ٹافی اور خدا جانے کیا کیا چیزیں خریدی تھیں اور ان دونوں کا مشورہ تھا کہ ہمیں یہ گفٹ شاپ فوراً سے پیشتر خرید لینی چاہیے۔

"تمہیں کیا چیز پسند آئی ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"پاپا" کیا وہ دونوں لڑکیاں بھی اس گفٹ شاپ کے ساتھ ہی مل جائیں گی؟" گویا وہ ہمارے دل کی بات بھی جان گئی تھیں۔

مسٹر آغا نے پوچھا "علی پھر کیا خیال ہے تمہارا؟"

ہم نے سوچنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا "سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہو گا۔"

اس نے کہا "وقت ضرور ملے گا۔ ویسے بہت اچھی چیز ہے۔ اسی ہزار ڈالرز میں سودا برا نہیں ہے۔"

ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا "اور وہ دونوں لڑکیاں!"

وہ ہنسنے لگا "سوری علی، وہ دونوں لڑکیاں نہیں مل سکتیں۔ ہاں مگر لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ گوری، کالی، براؤن، پیلی، جیسی بھی چاہو سیلز گرلز مل جائیں گی۔"

ہم نے کہا "ان دونوں کو کیا اعتراض ہے؟"

کہا "اعتراض تو کوئی نہیں ہے مگر وہ دونوں اس دکان کی مالک ہیں۔ گفٹ شاپ کو فروخت کرنے کے بعد ظاہر ہے کہ وہ کوئی دوسرا بزنس خریدیں گی۔"

اتنی دیر میں وہ دونوں لڑکیاں بھی گاہکوں سے فارغ ہو گئی تھیں۔ مسکراتی ہوئی ہماری طرف آ گئیں۔

آغا صاحب نے ہمارا تعارف کرایا کہ ہم دکان خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ فوراً

سراپا شہد بن گئیں۔ پہلے تو ہاتھ ملائے پھر مسکراہٹیں لٹائیں۔ اس کے بعد دکان کی تعر
شروع کر دیں کہ یہ تو ہر وقت خریداروں سے بھری رہتی ہے۔ دم لینے کی فرصت ن
ملتی۔

ہم نے پوچھا "تو پھر آپ اسے فروخت کیوں کر رہی ہیں؟"

"دراصل ہم یہاں سے شفٹ ہو رہے ہیں۔ ہم فلوریڈا جا رہے ہیں۔"

"مگر کوئی وجہ تو ہو گی؟"

وہ باقاعدہ ہنسنے لگیں "وجہ کچھ نہیں' بس تبدیلی۔"

بعد میں ہمیں پتا چلا کہ امریکی موسمی پرندوں کی طرح اکثر انتقال آبادی کرتے ر
ہیں۔ ایک جگہ کو چھوڑ چھاڑ کر دوسری جگہ چل دیتے ہیں۔ اور انہیں رکاوٹ بھی کیا ہ
گھر سے لے کر کار تک سبھی کچھ تو قرض پر ہوتا ہے۔ سامان ان کے گھروں میں کم
ضرورت کے لائق ہوتا ہے۔ جب ایک جگہ سے جی بھر گیا تو سوٹ کیس اٹھائے اور کار
بیٹھ کر دوسری جگہ چلے گئے بھاری سامان' صوفہ سیٹ' پنکھے۔ یہاں تک کہ فالتو کپڑے
فروخت کر دیتے ہیں۔ اس کا طریقہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ یا تو اخبار میں مختصر اشتہار
دیتے ہیں یا پھر گیراج سیل اور یارڈ سیل کے ذریعے ہر چیز اونے پونے بیچ دیتے ہیں۔ ا
سیل اور گیراج سیل یا تو مکان کے لان میں ہوتی ہے یا پھر گیراج میں۔ سارا سامان وہاں
دیا جاتا ہے۔ ہر چیز پر اس کی قیمت کی چٹ لگی ہوتی ہے۔ قیمت عام طور پر بہت کم
ہے۔ ہم نے ڈیکوریشن کے بعض اچھے پیس پچاس سینٹ یا ایک ڈالر میں بھی خریدے
سامان استعمال شدہ تو ہوتا ہے مگر بہت صاف ستھرا اور اچھی حالت میں اور قیمت ا
جیسے مفت میں پھینک رہے ہوں۔ اچھے خاصے گرم زنانہ کوٹ دو ڈالرز میں بھی مل
ہیں۔ ایک پاکستانی نے بتایا کہ انہوں نے ڈیڑھ ڈالر میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی میز خرید
اسے اٹھانے لگے تو معلوم ہوا کہ بہت زیادہ وزنی ہے۔ بہر حال اٹھا کر گھر لے آئے
پن کا راز جاننے کے لیے ذرا غور سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر ہی ایک
کی مشین بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ یارڈ سیل میں کپڑوں کے علاوہ
پینٹنگز' جوتے' کپڑے' میک اپ کا سامان غرضیکہ سبھی کچھ مل جاتا ہے۔ مزے کی
ہے کہ جو سامان اس طرح فروخت نہیں ہوتا اسے اپارٹمنٹ کے باہر فٹ پاتھ پر چھوڑ

ہیں۔ امریکی شہروں اور قصبوں میں گھومتے ہوئے آپ کو اکثر صوفہ سیٹ' بیڈ' پنکھے اور اس
قسم کی دوسری چیزیں فٹ پاتھ پر رکھی ہوئی مل جاتی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہاں
سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کرایہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کے مقابلے میں
نیا خرید لینا زیادہ مناسب اور سستا پڑتا ہے۔

ہمیں سوچ میں گم دیکھ کر ان میں سے ایک نے کہا "آپ یہاں نئے آئے ہیں۔ اگر
فرنیچر کی ضرورت ہو تو بیڈ' میٹریس' صوفہ سیٹ اور الماریاں ہم سے خرید سکتے ہیں۔
ہمارے پاس بہت خوب صورت ٹیبل لیمپ بھی ہیں۔"

ہم ہوں ہاں کر کے رہ گئے۔ ہمارا تو اس گفٹ شاپ سے دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک
گروسری شاپ' ایک کیمسٹ شاپ بھی اس روز ہمیں دکھائی گئی۔ لنچ کا وقت ہو چکا تھا اور
بچیاں "بھوک بھوک" کی فریاد کر رہی تھیں۔

مسز ثنا نے کہا "علی' کیا خیال ہے لنچ کے بارے میں؟"

ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا' بولے "چلو' میکڈانلڈ چلتے ہیں۔"

میکڈانلڈ حسب معمول بھرا ہوا تھا۔ لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں مگر ہر قطار چشم زدن میں غائب ہو جاتی تھی۔ وہاں پہنچ کر آثا صاحب ہم سے آگے لائن میں لگ گئے۔ ہم سمجھ گئے کہ یہاں بھی "دست خود' دہان خود" والا معاملہ ہو گا یعنی ہر ایک کو اپنا اپنا بل خود ہی ادا کرنا ہو گا۔ ہم رفتہ رفتہ امریکی آداب زندگی سے آگاہ ہوتے جا رہے تھے۔

برگر اور ملک شیک سے شغل فرماتے ہوئے ہم نے مسٹر آثا سے کہا "گوگو یہاں سے کتنی دور ہے؟"

کہنے لگے "نزدیک ہی ہے۔ لنچ کے بعد چلیں گے۔"

شاپنگ سینٹرز' میکڈانلڈ اور سیون الیون وغیرہ ایسے مقامات ہیں جہاں مفت کار پارکنگ کا بندوبست ہوتا ہے۔ اس لیے پارکنگ کوئی پرابلم نہیں ہوتی حالانکہ امریکا میں یہ بہت بڑا پرابلم ہے۔

"گوگو" واقعی زیادہ دور نہیں تھا۔ یعنی صرف بیس پچیس میل دور تھا۔

ایک خوب صورت سی ایک منزلہ عمارت کے سامنے جا کر آثا نے اپنی کار روک دی اور کہا "وہ دیکھو' سامنے ہے "گوگو۔"

آس پاس کے درختوں اور چھوٹے سے باغ میں گھری ہوئی یہ عمارت لکڑی کی بنی ہوئی تھی مگر کافی کشادہ تھی۔

آثا نے پوچھا "علی' میرا خیال ہے کہ تم بچیوں کو وہاں لے جانا پسند نہیں کرو گے؟"

ہم نے کہا "واقعی' انہیں بلاوجہ لاد کر پھرنا کیا ضروری ہے۔ یہ یہیں کار میں بیٹھی چاکلیٹ وغیرہ کھاتی رہیں گی۔"

یہ عمارت لکڑی اور شیشے کی تھی۔ دروازہ شیشے کا تھا جو خود بخود کھل جاتا تھا۔ اندر قدم

رکھا تو طبیعت خوش ہو گئی۔ کشادہ ہال' نہایت آراستہ' قیمتی چمکدار میزیں اور کرسیاں' قیمتی پردے' ایک جانب بہت لمبا سا کاؤنٹر جس کے پیچھے الماریوں میں قسم قسم کی شرابوں کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ سب سے نمایاں چیز اس عمارت کا فرش تھا جو انتہائی چکنا' چمک دار اور دلکش تھا۔

آثا صاحب نے ایک آنکھ دبائی اور ہم سے کہا "اسٹاف کے معاملے میں جانی کا ذوق لاجواب ہے۔ کیوں' کیا خیال ہے؟"

جانی کے ذوق جمال کی داد نہ دینا تو ناانصافی تھی۔ البتہ ان کے ذوق لباس کے بارے میں آپ اختلاف رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم نے سر ہلا کر آثا صاحب کی تصدیق کر دی۔

وہ پری نما خاتون اس اثنا میں کاؤنٹر کے پیچھے پہنچ کر مختلف شرابوں کی بوتلوں کو الٹ پلٹ کرنے میں مصروف تھیں۔ پہلے تو انہوں نے چند بلوریں جام اٹھائے اور انہیں ایک جھاڑن نما کپڑے سے خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ جس جھاڑن سے وہ گلاس صاف کر رہی تھیں اس میں سے ان کے دو لباس بڑی آسانی سے بنائے جا سکتے تھے۔ اس سے کم از کم یہ ثابت ہو گیا کہ ان کے لباس کا اختصار کپڑے کی عدم دستیابی کے سبب نہیں تھا۔ ہاں' اسے آپ ذوق نمود و نمائش کہہ سکتے ہیں۔ مغربی اور مشرقی عورتوں میں ہم نے ایک نمایاں فرق یہ دیکھا ہے کہ مشرقی عورتیں نمائش کے لیے ملبوسات اور زیورات کا سہارا لیتی ہیں جب کہ مغرب کی عورت ان فضول' اضافی چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ وہ صرف اور صرف اپنے جسم کی نمائش کرتی ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو بات بھی درست ہے۔ مانگے تانگے کے لباس اور زیورات کا سہارا لینے کی بجائے بہتر ہے کہ خود اپنے "زور بازو" پر بھروسا کیا جائے۔

ایک بار ہم نے ہالینڈ کے سفر میں یہ سوال اپنے خان صاحب سے بھی کیا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مغربی عورت جسم کی نمائش کرتی ہے اور مشرقی عورت زیورات اور لباسوں پر زور دیتی ہے؟

وہ مسکرائے اور بولے "جس کے پاس جو چیز ہوتی ہے وہ اسی کی نمائش کرتا ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا "مطلب یہ کہ مشرقی عورت کے پاس جسم نہیں ہوتا اور

مغربی عورت لباس اور زیورات سے محروم ہوتی ہے؟"

بولے "ایک حد تک ...... دراصل مغرب میں کوئی چیز بھی خالص نہیں رہی ہے
مصنوعی چیزوں پر زور ہے۔ مثلاً اصلی زیورات کی جگہ نقلی زیورات استعمال ہوتے ہیں
کپڑا بھی خالص سوتی یا اونی نہیں ہوتا۔ اس میں بھی نائلون وغیرہ کی آمیزش ہوتی ہے
اب لے دے کے ایک قدرتی، خالص اور اصلی چیز انسانی جسم ہی رہ گیا ہے ان کے پاس
بس اسی پر اتراتی پھرتی ہیں۔"

یہ تو محض برسبیل تذکرہ ہی سمجھیے۔ ہم ساقی کا تذکرہ کر رہے تھے جنہیں پرانے زمانے
کے اردو شعرا "ساقن" بھی لکھا کرتے تھے۔ اردو شاعری کا بھی عجیب ہی معاملہ ہے۔ اس
میں ۹۰ فیصد خیالات محض خواہشات اور خیالی تصورات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہماری شاعری
میں میخانہ اور ساقی کا اتنا چرچا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے پرانے زمانے میں گھر گھر، گلی گلی
میخانے کھلے ہوئے تھے اور خوب صورت ساقیں پیمانے بھر بھر کر لوگوں کو پلانے پر مامور ہوا
کرتی تھیں حالانکہ حقیقت میں شراب کو معاشرے میں بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ شرابی چھپ
چھپ کر پیا کرتے تھے اور جس کسی کے بارے میں پتا چل جائے کہ وہ شرابی ہے تو اسے
اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بھئی اس زمانے میں تو پردہ اتنا سخت قسم کا ہوتا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا
کہ خوب صورت لڑکیاں صراحی بدوش لوگوں کے پیمانوں میں شراب انڈیلتی پھرتی
ہوں؟ لطیفے کی بات یہ ہے کہ شراب اور میخانے کا تذکرہ کرنے والے اکثر شعرا صوفی تھے
اور انہوں نے شراب کو کبھی ہاتھ تک نہ لگایا تھا مگر ان کا کلام پڑھیے تو یوں لگتا ہے جیسے ہر
وقت شراب کے نشے میں چور چور رہا کرتے تھے۔

ساقی کو مغرب میں بار گرل کہتے ہیں۔ یہ فرض محض خواتین ہی کے لیے مخصوص
نہیں ہے بلکہ مرد حضرات بھی اس فرض پر مامور ہیں۔ انہیں "بار مین" کہا جاتا ہے۔ عام
طور پر یہ مشہور ہے کہ جام بنانے میں جتنی مہارت بار مین کو حاصل ہوتی ہے اتنی بار گرل
کو نہیں ہوتی لیکن یہ کمی وہ اپنے حسن و جمال سے پوری کر لیتی ہیں۔

بار گرل نے جام چمکا کر بالکل شفاف کر لیے تھے اور اس کے بعد ان میں شراب انڈیل
رہی تھی۔ جانی کی نظر پڑی تو فوراً ٹوک دیا اور کہا "اوہ نو! صرف دو گلاس درکار ہیں۔ انہیں
کوک دے دو۔"

لڑکی نے کہا "نو پرابلم، ایک پیگ میں خود پی لوں گی۔"

اب ہم پر "گوگو" کے اسرار کھلتے جا رہے تھے۔ ہم سمجھے تھے کہ گوگو بھی ایک
ریستوران ہوتا ہے لیکن پتا چلا کہ یہ نائٹ کلب کی قسم کی چیز ہے جس میں رقص و شراب
و کباب تو ہوتا ہی ہے، قمار بازی بھی اس کا ایک لازمی حصہ ہے۔ شاید اسی لیے جانی نے
ہمارا جائزہ لینے کے بعد رائے ظاہر کی تھی کہ "گوگو" چلانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔
جس طرح ہمارے ملک میں جوئے خانے بدمعاشوں کے اڈے ہوتے ہیں اسی طرح امریکا
میں "گوگو" بار بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ جوا، شراب، عورتیں جہاں یہ تین چیزیں ہوں گی
وہاں دنگا فساد اور غنڈہ گردی بھی ضرور ہوگی۔ گوگو کے مالک کو غنڈوں سے بھی بنا کر رکھنی
پڑتی ہے اور پولیس سے بھی بلکہ اس کے لیے بذات خود غنڈہ ہونا ضروری ہے۔ کوئی
شریف آدمی ایسے لوگوں سے کیونکر نمٹ سکتا ہے؟

جانی تو اپنا پیگ لے کر ایک طرف کو چلا گیا۔ آٹا صاحب ہمیں لے کر ایک اسٹول پر
بیٹھ گئے اور گوگو کے فوائد اور برکات بیان کرنے لگے۔

بولے "آپ اس لڑکی کو دیکھ رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "ظاہر ہے۔"

"یہاں ایسی دس لڑکیاں ہیں۔"

"دس؟" ہم نے پریشان ہو کر دریافت کیا "کیا یہاں اتنے بہت سے لوگ شراب پینے
آتے ہیں؟"

"یہ سب بار گرلز نہیں ہیں۔ دو ڈانسرز ہیں۔ بیلے ڈانس کرتی ہیں۔ اسٹرپ ٹیز بھی ہوتا
ہے یہاں" یعنی .... عریاں ڈانس؟ ہم پریشان ہو گئے۔

"اس کے علاوہ چاروں ویٹریس لڑکیاں بھی ہیں۔ بہت اچھی شکل کی ہیں اور بے حد
تجربہ کار ہیں۔ گاہک کو شراب میں تین حصے پانی ملا کر پلا دیتی ہیں اور اس کے فرشتوں کو بھی
خبر نہیں ہوتی۔ کیوں، ہے نا کمال کی بات؟"

"واقعی" ہم نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"دو لڑکیاں ادھر ڈائس پر ہوتی ہیں۔ علی، بس کچھ نہ پوچھو کتنی ماہر ہیں، کیا مجال جو
کسی کو جوئے میں جیت کر جانے دیں۔"

"یعنی بے ایمانی کرتی ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"بے ایمانی! ارے نہیں۔ اپنے فن کی ماہر ہیں۔ شکل و صورت اور فیگر ایسی ہے کہ جوازی بس ان ہی کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اس لیے تو انہیں کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔"

اتنی دیر میں بار گرل بھی اپنا گلاس لے کر ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"یہ کون ہیں؟" اس نے آتا سے پوچھا۔

"یہ تمہارے نئے باس ہیں۔ آئندہ تمہیں ان سے ہی واسطہ رکھنا پڑے گا۔"

"اوہ۔ کیا یہ میکسیکو سے آئے ہیں؟"

"نہیں' یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک جگہ سے آئے ہیں۔ کبھی پاکستان کا نام سنا ہے؟"

"نہیں!" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"نہ سنا ہی بہتر ہے۔ پاکستان کی انڈر ورلڈ کا تو دنیا بھر میں کوئی ثانی نہیں ہے۔"

اس نے غور سے ہمیں دیکھا "مگر یہ تو......"

"ان کی صورت شکل پر نہ جاؤ۔ تم دیکھنا کہ کس طرح قابو کریں گے سارے بدمعاشوں کو۔ جن ٹھگوں کے نام سے جان کانپتا ہے انہیں یہ چٹکی بجا کر قابو میں کر لیں گے۔"

"کیا مطلب! یہ جادو گر ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ یہ جادو گر نہیں' کاریگر ہیں۔"

لڑکی کو پہلے تو یقین نہیں آیا مگر پھر کچھ مرعوب سی ہو گئی۔ "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے ہماری طرف بڑھا دیا "میرا نام پنکی ہے۔"

"پنکی!"

"یہ میرا اصلی نام نہیں ہے۔ عرفیت ہے۔ نام تو میرا لارانما سکا ہے۔"

"کچھ عجیب سا نام ہے۔"

"میرے آباؤ اجداد جہاں رہتے تھے' وہ بھی عجیب سی جگہ ہے۔"

"وہ کون سی جگہ ہے؟"

"اسے ٹنڈرا کہتے ہیں۔ وہاں بہت سردی پڑتی ہے۔ اسی لیے وہ لوگ یہاں آگئے تھے۔"

آتا صاحب ایک چسکی لے کر بولے "اچھا ہی کیا انہوں نے ورنہ اگر تم یہ لباس ٹنڈرا میں پہنتیں تو اب تک تمہیں ڈبل نمونیہ ہو چکا ہوتا۔"

"ڈونٹ بی سلی ایٹ" پھر ہم سے پوچھا "گوگو بار یا گیمبلنگ ہاؤس چلانے کا پہلے کوئی تجربہ ہے آپ کو؟"

"چلانے کا کیا' ہمیں تو وہاں جانے کا بھی کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"اوہ گاڈ۔ پھر خریدیں گے کیسے؟"

یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ آپ جس قسم کا بزنس خریدنا چاہتے ہیں اکثر مالک چاہتے ہیں کہ آپ کو اس کا پہلے بھی تجربہ ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ آپ سے سودا نہیں کریں گے۔ اگر تجربہ نہ ہو تو پھر مالک اپنی دکان یا ریستوران فروخت کرنے کے بعد ایک ماہ تک نئے مالک کے ساتھ رہتا ہے تاکہ اسے اس اثنا میں معلومات حاصل ہو جائیں مگر ریالٹرز حضرات عام طور پر ان باتوں کو گول کر جاتے ہیں۔ ان کا مقصد تو صرف سودا کرانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں۔ ان کی بلا سے۔

ہم نے کوک کا ڈبا خالی کر کے کاؤنٹر پر رکھ دیا اور آتا صاحب سے کہا "اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

انہوں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا "واقعی' میرا بھی ایک اپائنٹ منٹ ہے۔ اوکے پنکی۔ پھر ملیں گے۔"

ہم گوگو بار سے باہر نکل رہے تھے تو ایک بڑی سی کھلی کار آکر رک گئی۔ اس میں سے چار پانچ غنڈہ صورت لوگ باہر نکلے اور زور زور سے باتیں کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔

کار میں بیٹھے تو آتا نے پوچھا "کیوں' کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا "کسی قیمت پر بھی نہیں۔"

وہ بولے "ہاں۔ یہ بات بھی ہے کہ اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ ویسے ایک بات کہوں' لڑکیاں یہاں بھی اچھی ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر ہم لڑکیاں نہیں کوئی اچھا سا کاروبار خریدنے کے ارادے سے نکلے

ہیں۔"

انہوں نے ہمارے طنزیہ لہجے پر مطلق توجہ نہیں دی' بولے "کوئی بات نہیں۔ ایسے پروپوزلز تمہارے سامنے ہیں۔ ان کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچ لو۔ ورنہ کل پھر دوسرے بزنس دکھادوں گا۔"

گھر پہنچ کر ہم نے نغمی صاحب کو فون کیا اور لانڈریٹ کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولے "آپ ایسا کریں کہ کل میرے دفتر آجایئے۔ ہم خود چند لانڈریٹ والوں سے مل کر معلومات حاصل کرلیں گے۔"

نغمی صاحب کا نیویارک انشورنس کمپنی کا دفتر روزلین میں تھا۔ ایک خوب صورت کئی منزلہ عمارت تھی۔ ہم بڑی آسانی سے ان کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ان کے کمرے میں ایک امریکی خاتون بھی دوسری میز پر بیٹھا کرتی تھیں۔ ہم تو انہیں دوشیزہ سمجھے تھے بلکہ ٹین ایجر۔ لیکن نغمی صاحب نے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہیں بلکہ مزید یہ کہ طلاق یافتہ بھی ہیں۔

"کتنے افسوس کی بات ہے؟" ہمیں ان کے بھولے چہرے پر ترس آگیا "اتنی کم عمری میں شادی بھی ہوگئی اور طلاق بھی۔"

"طلاق نہیں' طلاقیں۔ اور اتنی کم عمر بھی نہیں ہیں۔ ۲۷ سال کی عمر ہے ان کی۔"

"بہت خوب!" صاحب یہ امریکن' خاص طور پر امریکی عورتیں اپنی عمر چھپانے میں واقعی کمال رکھتی ہیں۔ مہ و سال ان پر بہت مہربان ہیں۔ یوں تو سبھی ان پر مہربان ہیں۔

وہ باہر گیلری میں سے کافی لینے گئی تھیں۔ جب کاغذ کے گلاس میں بلیک کافی لے کر واپس آئیں تو نغمی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا "روزی۔ یہ مسٹر علی سفیان آفاقی ہیں۔ میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں' فلم ساز ہیں۔"

باقی تعارف تو ان کے سر پر سے گزر گیا تھا مگر "فلم ساز" سن کر ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔

"کیا آپ یہاں بھی فلم بنانے آئے ہیں؟"

ہم سے پہلے نغمی صاحب بول پڑے "جی نہیں۔ یہ کوئی بزنس خریدنا چاہتے ہیں۔"

روزی نے پاکستان کی فلموں کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ فلم امریکا میں ایک باعث افتخار کاروبار سمجھا جاتا ہے۔ فلم والوں کو بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہوتے

ہیں۔ یہاں تک کہ صدر امریکا بھی ان سے ملاقات کرنا باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ روزی نے فوراً ہمیں کافی کی پیش کش کی اور ہمارے سرہلانے پر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ کافی کا ایک کاغذی گلاس لے کر واپس آئیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ بلیک کافی ہوگی مگر اس میں دودھ بھی تھا اور جب چکھا تو معلوم ہوا کہ مٹھاس بھی مناسب ہے۔

"میں نے دو چمچے چینی ڈالی' کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل۔ مگر آپ کو پتا کیسے چلا کہ ہم دو چمچ چینی پیتے ہیں؟"

بولیں "ابول کے سارے پاکستانی دوست اتنی ہی چینی پیتے ہیں۔"

ہم تو اس خوش اندام خاتون سے اس کی داستان حیات سننے کے مشتاق تھے مگر نغمی صاحب نے یاد دلا دیا کہ ہمیں لانڈریٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے جانا ہے لہٰذا "پھر ملیں گے" کا وعدہ کر کے چل پڑے۔

دفتر سے باہر نکلے تو اس کے بالمقابل ایک زیر زمین کار پارکنگ تھی مگر نغمی صاحب نے مشورہ دیا کہ ہم پیدل ہی چلتے ہیں۔ آس پاس ہی چند لانڈریٹیں موجود تھیں۔ یہ ریاست ورجینیا کا علاقہ تھا۔ بہت صاف ستھرا اور خوب صورت۔ بلند و بالا عمارتیں بھی تھیں اور خوبصورت رہائشی علاقے بھی۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا شاپنگ سینٹر تھا۔

اس شاپنگ سینٹر سے بھی ایک کہانی وابستہ تھی۔ ہوا یہ کہ کچھ عرصہ قبل موسم سرما میں ایک بار نغمی صاحب وہاں شاپنگ کے لیے گئے۔ باہر برف باری ہو چکی تھی۔ اور برف کانچ کی مانند جم گئی تھی۔ نغمی صاحب کو دیکھنے میں وہ پانی نظر آیا۔ تیزی سے قدم رکھا تو پھسل گئے اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کئی ماہ تک صاحب فراش رہے۔ ان کی انشورنس کمپنی نے علاج کا خرچہ برداشت کیا مگر نغمی صاحب نے شاپنگ سینٹر والوں پر بھی مقدمہ داغ دیا کہ انہوں نے برف کی صفائی ٹھیک سے نہیں کرائی تھی اس لیے مجھے بارہ لاکھ ڈالر ہرجانہ دلایا جائے۔ یہ مقدمہ اس وقت زیر سماعت تھا۔ مقدمہ بازی امریکا میں بھی بہت مہنگی چیز ہے۔ سب سے بڑا خرچ تو وکیلوں کا ہے جو اپنی فیس گھنٹوں کے حساب سے وصول کرتے ہیں۔ اس نوعیت کے مقدمے اپیل در اپیل کی وجہ سے کافی طویل عرصے تک چلتے رہتے ہیں۔

ہم نے پوچھا "اتنا خرچہ آپ کیسے برداشت کرتے ہیں؟"

کہنے لگے "ہرجانے کی امید ہے۔ اور اب تو میں نے اپنے وکیل سے طے کر لیا ہے کہ مقدمہ جیتنے کی صورت میں پچاس فیصد رقم اسے دے دوں گا۔"

امریکا میں یہ رواج بھی عام ہے کہ لوگ مقدمہ لڑنے کے لیے وکیل کو نقد فیس دینے کی بجائے منافع میں شریک کر لیتے ہیں۔ یہ طریقہ دونوں فریقوں کے لیے مناسب ہے

البتہ مقدمہ ہار جانے کی صورت میں وکیل نقصان میں رہتا ہے لیکن جیتتے ہوئے مقدموں میں وہ اتنی بڑی رقم کما لیتا ہے کہ یہ معمولی سی قربانی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ہمیں کچھ خریداری کرنی تھی مگر نغمی صاحب نے اس شاپنگ سینٹر میں جانے کی ہامی نہیں بھری۔ انہیں اندیشہ تھا کہ وہ لوگ کوئی گڑبڑ نہ کر دیں۔

ہم نے کہا "تو کیا امریکا میں بھی ایسا ہوتا ہے؟"

وہ ہنسنے لگے "بھائی امریکا میں کیا نہیں ہوتا؟"

ٹہلتے ہوئے ہم ایک لانڈریٹ پر پہنچ گئے۔ خاصی بڑی جگہ تھی اور دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک جانب لانڈری کی مشینیں تھیں اور دوسرے حصے میں ریڈی میڈ کپڑے فروخت ہوتے تھے۔ ایک کاؤنٹر پر ایک نوجوان چینی جاپانی ٹائپ کی چھوٹے قد کی گداز جسم لڑکی کاغذات الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

نغمی صاحب نے پاس جا کر کہا "ایکسکیوزمی......"

اس نے ہم دونوں کو دیکھا اور مسکرانے لگی "ایکسکیوزمی!"

"یو آر دی پروپرائٹر؟"

"آئی نو باس۔ مائی فادر باس "(یعنی میں مالک نہیں ہوں، میرا باپ اس کا مالک ہے)

نغمی صاحب نے ہم سے کہا "ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ کس بے دردی سے انگریزی کی ٹانگ توڑ دی؟"

لڑکی نے کان لگا کر ان کا فقرہ سنا اور پھر پوچھا "یو انڈین؟

ہم نے کہا "لڑکی سمجھدار معلوم ہوتی ہے۔ ہماری اردو سے سمجھ گئی کہ شاید ہم انڈین ہیں۔"

ایک طرف سے اسی شکل و صورت کا ایک درمیانہ عمر کا آدمی نمودار ہوا اور ان دونوں کے مابین سوال و جواب کا تبادلہ ہوا۔

"یس۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" اس نے سلیس انگریزی میں پوچھا۔

نغمی صاحب نے بتایا کہ ہم آپ سے لانڈریٹ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

"اوہ، کہیں تم لانڈریٹ خریدنے کا ارادہ تو نہیں کر رہے؟"

"ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

"تو پھر یسوع مسیح تمہاری حفاظت کرے" اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور انگلی سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

"کوئی زندگی نہیں ہے۔ ایک دم فضول کام ہے۔ ہر وقت کام کام، نگرانی، اخراجات میں تو وصیت کر جاؤں گا کہ میرے خاندان میں کوئی لانڈریٹ نہ خریدے اور کچھ پوچھنا ہے یا اتنا کافی ہے؟"

"جی بس یہی بہت ہے" ہم ان کا شکریہ ادا کر کے باہر چلے آئے۔

"ایک تو ہم ایشیائی لوگوں میں ایک یہ رواج بہت ہے کہ جو کام خود کرتے ہیں اس میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا بھی وہی کام کرے۔"

"مگر!"

"مگر وگر کچھ نہیں۔ یہ ویت نامی ہے یا پھر ملیشیائی ہے۔ ورنہ ہانگ کانگ سے آیا ہو گا۔ بہر حال چینی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ان لوگوں کی ذہنیت بہت خراب ہوتی ہے۔ ذرا بھی تعاون نہیں کرتے، ہم کسی اور سے پوچھتے ہیں۔"

اگلے لانڈریٹ کا مالک ایک انڈین سکھ تھا۔ ہم لوگوں سے تعارف ہوا تو خوشی سے سردار جی کی باچھیں کھل گئیں "جی آیا نوں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ پاکستانی پنجاب کے کون سے گاؤں میں رہتے ہو؟"

ہم نے بتایا کہ لاہور میں رہتے ہیں۔

بولے "کیا بات ہے لاہور کی۔ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ تو سمجھو کہ پیدا ہی نہیں ہوا۔"

ہم نے کہا "شکر ہے کہ ہم پیدا ہو چکے ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولے "واہگورو کی کرپا ہے جی۔ اساں تے ہن تکر جمے ای نئیں۔"

نغمی صاحب ہنسنے لگے "سردار جی، پیدائش کے بغیر ہی اتنے بڑے ہو گئے ہو؟"

"اجی یہ بھی کوئی پیدائش ہے" وہ ٹھیٹ پنجابی میں بولے "نہ لاہور دیکھا، نہ حسن ابدال، نہ گولڈن ٹیمپل، پنجاب کی ندیوں کا پانی بھی نہیں پیا۔"

"واقعی بڑے افسوس کی بات ہے" ہم نے ان سے اظہار ہمدردی کرنا ضروری سمجھا

"مگر سردار جی، آپ اتنے بڑے کہاں اور کیسے ہو گئے؟"

"اجی بس کچھ نہ پوچھو، شرم آتی ہے بتاتے ہوئے۔ ماں باپ ایسٹ افریقہ چلے گئے تھے۔ وہیں جنم ہوا۔ وہاں سے نکالے گئے تو انگلینڈ پہنچ گئے۔ اس کے بعد امریکا آ گئے۔ بس اپنا تو مقدر ہی پھوٹ گیا۔" انہوں نے ٹھنڈی آہیں بھرنی شروع کر دیں "آپ سیوا بتاؤ۔"

ہمارا سوال سن کر انہوں نے پہلے تو فرج میں سے کوک کے دو ڈبے نکال کر ہمیں پیش کیے۔ پھر اپنے لیے بیئر کا ایک ٹین کھولا اور چند گھونٹ لینے کے بعد اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ مشینیں اکثر خراب ہوتی رہتی ہیں۔ اول تو کاریگر ہی تقاضوں کے بعد آتا ہے اور جب آتا ہے تو سمجھو ہماری کھال اتار لیتا ہے۔ میرے پاس بائیس مشینیں ہیں جن میں سے ہر ہفتے دو تین خراب ہو جاتی ہیں اور ڈیڑھ دو ہفتے تک ان کی مرمت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ لانڈریٹ کی مشینوں میں پانی بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہرج ہے؟" ہم نے پوچھا۔

انہوں نے ہمیں یوں گھور کر دیکھا جیسے ہماری ہوشمندی پر شک کر رہے ہوں "بھائی جی، آپ کہاں سے آئے ہو؟"

ہم نے کہا "بتایا تو ہے کہ لاہور سے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر لاہور میں بھی پانی کا خرچہ تو ہوتا ہو گا!"

ہم نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر بتایا کہ ہمارے ماڈل ٹاؤن میں تو پانی کے حساب میں برائے نام بل وصول کیا جاتا ہے اور پانی خرچ کرنے کا کوئی حساب نہیں ہے۔ چاہے جتنا خرچ کرو۔"

وہ ایک بار پھر جذباتی ہو گئے "ماڈل ٹاؤن! بھائی جی ماڈل ٹاؤن جیسی آبادی تو ساری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کیا بات ہے ماڈل ٹاؤن کی۔"

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"میرے ڈیڈی نے۔ ویسے انہوں نے بھی ماڈل ٹاؤن کبھی نہیں دیکھا مگر تعریف بہت کی ہے۔ بھائی جی، ان بھائی جی سے پوچھو کہ یہاں پانی کتنا مہنگا ہوتا ہے۔ میٹر لگا ہوا ہے۔ سونے کے مول ہے پانی۔ ہماری لانڈریٹ میں پانی اور بجلی کا بہت خرچہ ہے۔ بس دیوالیہ

نکل جاتا ہے۔"

انہوں نے کافی ڈرانے والی باتیں کیں۔ دراصل ہمارے سوالوں سے زیادہ انہیں لاہور کے بارے میں سوال کرنے میں دلچسپی تھی۔ وہ تو اور بھی خاطر مدارت کرنے پر تلے ہوئے تھے مگر ہم نے اجازت لے کر رخصت لے لی۔

"اس کی باتوں سے سچائی کی خوشبو آتی ہے" نغمی صاحب نے باہر نکل کر کہا "مگر پھر بھی ہمیں کسی اور سے رائے لینا ہی بہتر ہو گا۔"

اس بار اتفاق سے ایک مسلمان سے ملاقات ہو گئی۔ ان صاحب کا تعلق ہندوستان سے تھا "میاں جی' سہارن پور کے رہنے والے ہیں ہم تو' اوہاں کی کیا بات ہے۔ کوئلیں کوکتی ہیں برسات میں۔ اوہاں کے آموں کی کیا بات پوچھتے ہو۔ جنت کا میوہ ہووے ہے' جنت کا۔ بس جی' اوہاں تو جیتے جی ہی جنت کا مزہ لے لیویں ہیں اللہ کے بندے۔ آموں میں مٹھاس ایسی ہووے ہے کہ شہد بھی کیا ہووے گا۔ اور رسیلے ایسے کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو میاں ایک آم میں ڈیڑھ دو کلو رس ہووے ہے۔ بس جی' کیا بتاویں تم کو۔ ہمیں بھی حضرت آدم کی طرحیو جنت سے دیس نکالا مل گیا ہے۔"

وہ کسی طرح سہارن پورا اور ملیح آباد کے موضوع سے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں اپنے ڈھب پر لائے اور لانڈریٹ کے بارے میں پوچھا۔

"اجی کیا پوچھو ہو۔ بس مشینیں ہوویں ہیں۔ میلے کپڑے اندر ڈال کر بٹن دبا دیویں ہیں۔ بس کپڑے دھل کر تیار۔ دھوپ دینے کی ضرورت بھی نہ ہووے۔ اندر ہی اندر سوکھ جاویں ہیں سسرے۔ یہاں سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے میاں جی' پر سہارن پور والی بات نہیں ہے" وہ باقاعدہ اداس ہو گئے۔

ہمیں ان پر بہت ترس آیا۔ ہم نے کہا "میاں جی۔ ایک بات بتائیں کہ آپ اپنی کوئلیں' بلبلیں اور آموں کے باغ چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے؟"

بولے "ارے بھیا' کیا بتاویں۔ لمڈے نے بڑا تنگ کر مارا تھا۔ پڑھ لکھ گیا تو شہر آ گیا۔ اور زیادہ پڑھا تو امریکا پہنچ گیا۔ بس پھر کیا بتاویں۔ ہمیں بھی بلا لیا اپنے پاس۔ دیکھو جی اپنا تو ایکو ایک ہی لمڈا تھا۔ اسے سات سمندر پار کلا کیسے چھوڑ دیویں۔ بس میاں جی' سارا مقدر کی باتیں ہوویں ہیں۔ باغ تو یہاں بھی ہووے ہیں پر کوئلیں اور آم نہ ہوویں۔ بر

وقت وقت کی بات ہے میاں جی۔ یہ وخت بھی گزر جائے گا۔"

پتا نہیں وقت گزرنے سے ان کی کیا مراد تھی کیونکہ ان کے واپس سہارن پور جانے کا تو کوئی امکان نہیں نظر آتا تھا۔ یہی تھا کہ یا تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ ماحول اور حالات کے عادی ہو جائیں یا پھر وقت آنے پر اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں وقت تو گزر ہی جانا تھا۔

لانڈریٹ کے بارے میں انہوں نے بھی وہی باتیں سنا دیں جو پہلے والوں نے بتائی تھیں۔ یعنی یہ کہ مشینیں خراب ہوتی رہتی ہیں۔ درست کرنے والے نہیں آتے بہت زیادہ فیس مانگتے ہیں۔ پانی اور بجلی کا خرچہ بہت زیادہ ہے۔ دن رات کرنے کے بعد بھی کچھ نہیں بچتا وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا لانڈریٹ خریدنے کا خیال تو ہم نے دل سے نکال ہی دیا۔ اگلے دن آغا صاحب صبح سویرے تشریف لے آئے۔ ہم نے ان سے لانڈریٹ کے بارے میں اپنی معلومات کی روشنی میں سوالات کیے۔ مشینوں کا پوچھا۔ ان کی مرمت پر آنے والے اخراجات کا ذکر کیا۔ پانی اور بجلی کے بے پناہ خرچوں کے بارے میں بتایا۔ وہ اول نمبر کے ڈھیٹ ثابت ہوئے' بولے "یہ اخراجات تو لازمی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جب کوئی لانڈریٹ چلائے گا تو مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ بھی ہو گی۔ انہیں مرمت بھی کرائے گا۔ پانی اور بجلی کے بغیر تو کوئی کام ہوتا ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر اتنے بہت سے اخراجات کے بعد بچت کیا ہو گی؟"

وہ مسکرانے لگے "علی' یقین کرو' آٹھ دس ہزار ڈالر کا منافع تو کہیں نہیں گیا۔"

وہ اسی ہزار سے سمٹ کر آٹھ دس ہزار پر پہنچ گئے تھے۔ ہم تھوڑی جرح اور کرتے تو شاید چھ سات سو پر بھی پہنچ جاتے مگر کیا مجال جو اس غلط بیانی پر ذرا بھی شرمسار ہوئے ہوں۔ ان کی ڈھٹائی دیکھ کر ہمیں اپنے ملک کے سیاسی لیڈر یاد آ گئے مگر ایک بات ہم پر پوری طرح واضح ہو گئی۔ وہ یہ کہ ہمارے ملک کے پراپرٹی ڈیلر تو امریکی ریالٹرز کے مقابلے میں طفل مکتب ہیں۔

اگلے دن ہم نے نغمی صاحب سے شکایت کی "یعنی آپ کے ریالٹرز تو ہمارے [illegible] ڈیلرز کے بھی کان کاٹتے ہیں۔"

"کیوں نہ کائیں! آخر امریکی ریالٹرز ہیں۔ امریکا ہر چیز میں دنیا کا لیڈر ہے۔"

"مگر اتنا جھوٹ۔ اتنا مبالغہ!" آٹا نے تو بہت رنگین نقشہ کھینچا تھا ہمارے سامنے۔

"کس نے؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آٹا نے۔"

"آٹے کا لانڈریٹ سے کیا تعلق؟" ان کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

"بھئی یہ ہمارے ریاٹر کا نام ہے۔ اس کا پورا نام وان ڈائیک ایٹا ہے۔ ہم لوگ ا
آٹا کہتے ہیں۔"

"بہت اچھا کرتے ہیں" نغمی صاحب خوش ہو کر بولے "یہ لوگ بھی تو ہمارے
بگاڑتے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست عطاء الرحمٰن کو "ایٹو رامن" کہتے ہیں۔ د
جانے آپ نے بہت ثواب کا کام کیا ہے۔"

امریکا میں کاروبار تلاش کرنے کا تجربہ بھی کافی دلچسپ اور معلوماتی ثابت ہوا۔
صاحب نے ہمیں کچھ اور بزنس بھی دکھائے جن میں سے کوئی ایک بھی ہمیں پسند نہ آیا
لونی کا قصہ بھی زیادہ مختلف نہ تھا۔ اس نے ہمیں بعض اچھے ریستوران بھی دکھا
تھے جو ہمیں پسند بھی آئے مگر پھر ہمیں یہ اطلاع دی کہ وہ ہمیں نہیں مل سکتا کیونکہ
اور نے خرید لیا ہے یا پھر مالک نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔

مگر کوئی بات نہیں ہے "اس نے بڑے خلوص سے کہا میں تمہیں بہت اچھا بزنس
کر ہی دم لوں گی۔"

"جہاں تک دم لینے کا تعلق ہے' امریکی ریاٹرز خود بھی دم نہیں لیتے اور دوسروں
بھی دم نہیں لینے دیتے۔ جس طرح انشورنس ایجنٹ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتے ہیں'
طرح ریالٹرز بھی اپنے شکار کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے
سیکیوریٹی کے طور پر پانچ ہزار ڈالر وصول کر لیتے ہیں اور پھر اچھے برے اتنے بہت
بزنس آپ کو دکھاتے ہیں اور اتنے پھیرے لگاتے ہیں کہ بوکھلا کر یا تنگ آ کر کوئی نہ
بزنس خریدے بنا چارہ نہیں رہتا۔ سیکیوریٹی کی رقم واپس کرنے کی بات وہ ضرور کرتے
مگر اس کی نوبت نہیں آتی۔ بزنس فروخت کرنے کے سلسلے میں جھوٹ اور مبالغہ آرائی
بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ صرف اس لحاظ سے وہ ہمارے پراپرٹی ڈیلرز سے بہتر ہیں کہ کوئی

اور متنازع چیز آپ کو فروخت نہیں کرتے لیکن اس میں بھی ریالٹرز کی تعریف کی کوئی بات
نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ امریکا میں جائیداد کی خرید و فروخت اور دستاویز لکھنے لکھانے کے
فرائض وکیلوں کے سپرد ہوتے ہیں۔ یہ فرض وکیل کا ہوتا ہے کہ وہ کاغذ لکھنے سے پہلے
کوائف کی تصدیق کر لے ورنہ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہی ذمے دار قرار پاتا ہے۔ وکیل
بھی دونوں فریقوں سے فیس وصول کرتا ہے جو خاصی معقول ہوتی ہے۔ امریکی وکیلوں کا
احوال بھی ہم وقت آنے پر آپ کو سنائیں گے۔

لوسی نے ہمیں کچھ اور بزنس بھی دکھائے۔ مثال کے طور پر گیس اسٹیشن، گیس اسٹیشن کا مطلب ہے پٹرول پمپ۔ یہ بھی ایک جھگڑے والی چیز ہے۔ وہاں گیس اسٹیشن اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ منافع کم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کارندوں کی بے ایمانیاں، کام چوریاں ہم جیسے نووارد کے لیے تو مسائل ہی مسائل ہیں۔ گیس اسٹیشن اگر اچھی لوکیشن پر ہے تو بہت اچھا ہے مگر ہمیں جو گیس اسٹیشن دکھائے گئے وہ بہت دور دراز علاقوں میں تھے۔ اچھا گیس اسٹیشن کون فروخت کرتا ہے بھلا؟ بعض گیس اسٹیشنوں کے ساتھ "کار واش" بھی ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ چیز پاکستان میں ناپید تھی۔ دیکھا جائے تو "کار واش" بہت کار آمد چیز ہے۔ کار کے اندر بیٹھے بٹھائے ہی کار دھل جاتی ہے۔ ایک جانب سے آپ کار لے کر اندر داخل ہوئے تو پہلے مرحلے پر ہوا کے دباؤ سے گرد و غبار صاف ہو گیا۔ ایک تو گرد و غبار وہاں ہوتا ہی کب ہے۔ چھ دن کے بعد بھی کار پر کپڑا پھیریں تو مٹی کا نام نشان نہیں ملتا۔ فضا اور ماحول کی آلودگی کے باعث کپڑے میں چکنی سیاہی سی ضرور لگ جاتی ہے۔ "کار واش" میں آپ کی کار کچھ اور آگے بڑھتی ہے تو اچانک پانی کی بوچھاڑ بلکہ موسلا دھار بارش سی ہونے لگتی ہے۔ پھر بڑے بڑے ملائم برشوں کی مدد سے صابن کا جھاگ مل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد والے مرحلے میں صرف پانی ہوتا ہے اور برشوں کی مدد سے صفائی مکمل ہو جاتی ہے۔ سب لوگ کار کے اندر ہی بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ بند شیشوں میں سے یہ سب کچھ ایک خواب کا منظر لگتا ہے۔ کار تو آپ کی دھل گئی مگر اس کو خشک کرنا آپ کی اپنی ذمے داری ہے۔ چنانچہ کار واش کے مرحلے سے گزرنے کے بعد کار باہر کھڑی کر کے کاغذوں کی مدد سے اسے خشک کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ تو کار کی صفائی کے لیے کپڑا استعمال کرتے ہیں مگر امریکا میں سب کام کاغذ کی مدد سے ہوتے ہیں۔ یہ کاغذ مختلف

سائز اور مختلف انداز کے ہوتے ہیں مگر خاص طور پر اسی مقصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ کار کی صفائی کرنے کے بعد دھونے اور صاف کرنے کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ کاغذ کو اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ آپ بھی فائدے میں رہے اور کاغذ بنانے اور فروخت کرنے والے آپ سے زیادہ فائدے میں رہے۔ امریکا میں دراصل انسانی زندگی کا مقصد ہی کاروباری لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے۔ تمام انسان دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں اور مختلف طریقوں سے انہیں منافع پہنچاتے ہیں۔ ان کے کاروبار کو فروغ دینے اور انہیں طرح طرح کے سود ادا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت انسان کو کسی اور مقصد کے لیے بنایا ہے مگر امریکی کہتے ہیں کہ انسانوں کی تخلیق محض اور محض کاروباری لوگوں کے مصرف کے لیے عمل میں آئی ہے۔ اس کا مظاہرہ قدم قدم پر دیکھنے میں آتا ہے۔

ہم جیسے ملکوں سے جو لوگ بھاگ بھاگ کر امریکا جاتے ہیں ان کی اکثریت عموماً ODD JOBS کرتی ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ تو کچھ اور ہے لیکن امریکا میں تو متفرق چھوٹے موٹے کاموں کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً گیس اسٹیشن پر کاروں میں پٹرول ڈالنا، ان کے شیشے صاف کرنا۔ شاپنگ سینٹروں میں سامان اتارنا، رکھنا اور فروخت کرنا یا پیسے وصول کرنا، ریستورانوں میں کھانا پکانا، برتن صاف کرنا، فرش، میزیں اور غسل خانے صاف کرنا۔ (کیونکہ "جمعدار" قسم کی کوئی چیز سارے امریکا میں نہیں پائی جاتی) عمارتوں اور سڑکوں کی صفائی کرنا۔ ہوٹلوں میں چوکیدار، ویٹر، باورچی وغیرہ کے طور پر کام کرنا۔ بہت زیادہ ترقی کر لی تو ٹیکسی ڈرائیور بن جانا۔ ترقی ان معنوں میں کہ ٹیکسی چلانے سے آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی نسبتاً اچھے معاوضے وصول کر لیتے ہیں۔ کار سازی کے اداروں میں بھی اچھا معاوضہ مل جاتا ہے۔ یہ اچھا معاوضہ فی گھنٹے کے حساب سے ہوتا ہے۔ ہم جس زمانے میں وہاں پہنچے اس وقت کم سے کم معاوضہ ساڑھے تین اور چار ڈالر فی گھنٹا تھا۔ "آڈ جاب" کرنے والوں کی قسمت میں عام طور پر یہی کم سے کم "معاوضہ" لکھا ہوتا ہے۔

ایک دن لوسی ہمیں پچاس میل دور ایک گیس اسٹیشن پر لے کر گئی۔ کوئی زیادہ آباد علاقہ نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ علاقے نئے نئے آباد ہو رہے ہیں اس لیے ہر چیز سستی مل جائیں گی۔ پانچ دس سال کے بعد قیمتیں کئی گنا ہو جائیں گی۔ گیس اسٹیشن خاصا صاف

ستھرا اور خوب صورت تھا۔ ایک وقت میں آٹھ کاروں میں پیٹرول ڈالا جا سکتا تھا۔ عام ط
پر یہاں سیلف سروس کا دستور تھا لیکن کوئی چاہے تو دوسروں سے سروس کرا لے۔ اس
قیمت کچھ زیادہ ہوتی ہے اس لیے امریکی عام طور پر سیلف سروس کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔

گیس اسٹیشن کا مالک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جرمنی یا آسٹریا سے اس کا تعلق تھا۔
بیس سال سے امریکی ہو گیا تھا مگر اپنے خصائل سے محروم نہیں ہوا تھا۔ لمبا چوڑا، مضبو
اور محنتی۔ اس نے ہمیں ایک چھوٹے سے آفس نما کمرے میں بٹھا لیا جس کے چ
اطراف شیشے کی دیواریں تھیں۔ اس دفتر میں ایک جانب کوک، پیپسی اور سیون اپ کی
دوسری طرف سگریٹ، کافی، چاکلیٹ اور اسنیکس کی مشین لگی ہوئی تھی۔ سکے ڈالیے
اپنی پسند کی چیز نکال لیجئے۔ بعض پیٹرول پمپ کافی کا بندوبست بھی رکھتے تھے۔

لوسی نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ اس شخص کو جغرافیے، تاریخ اور سیاست سے کو
دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے وہ پاکستان نامی کسی ملک سے واقف نہ تھا۔ امریکا میں ایسے لوگو
کی اکثریت ہے جنہیں ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ بس اپنے کام سے کا
رکھتے ہیں۔ اگر اخبار پڑھتے بھی ہیں تو اس میں صرف اپنے مطلب کے صفحات دیکھ لی
ہیں۔ کوئی کھیلوں کا صفحہ دیکھتا ہے۔ کوئی فیشن کا، کوئی بزنس کا۔ خواتین کو عام طور پر سی
اور رعایتی قیمتوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن کے کوپن اخبارات میں باقاعدگی سے شائع ہو
ہیں۔ امریکی کہتے ہیں کہ وہ بہت کفایت شعار قوم ہیں مثلاً ایک چیز کسی اسٹور میں پانچ
سینٹ کم قیمت پر دستیاب ہے تو کفایت شعار امریکی خواتین وہ کوپن سنبھال کر رکھ لیں
اور پہلی فرصت میں اس اسٹور کا رخ کریں گی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اسٹور پندرہ
میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں تک آمدو رفت میں وقت کے علاوہ پیٹرول کا خرچہ بھی
ہے جو رعایتی قیمت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ اس اسٹور پر پہنچنے
بعد وہ اور بہت سی ضروری اور غیر ضروری اشیا بھی خرید لیتی ہیں اور اس طرح چند
بچانے کے چکر میں سینکڑوں ڈالر خرچ کر آتی ہیں اور پھر اپنی اس کفایت شعاری پر فخر
ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ آپ کو ہم نے بتایا ہے کہ امریکا کاروباریوں کی جنت ہے۔
صرف دو قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ منافع کمانے والے کاروباری اور ان کے آلہ کار
والے خریدار، ظاہر ہے کہ خریداروں اور آلہ کار بننے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ کاروباری لوگ عام آدمیوں کو اصل صورت حال کا احساس تک
نہیں ہونے دیتے۔ ایسا نفسیاتی ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت
ہی محسوس نہیں کرتے۔ دراصل امریکا ایک ایسا ملک ہے جہاں انسانوں کو "برین واش" کر
دیا جاتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتے ہیں
اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ہمیں پیاس لگ رہی تھی اس لیے مشین میں سکے ڈال کر ایک کوک کا ڈبا نکالا اور
دوسرا لوسی کو پیش کیا۔ ہم کیونکہ نئے نئے گئے تھے اس لیے عادت سے مجبور تھے۔ یہ ممکن
نہ تھا کہ ہم خود تو کوک پی لیتے مگر لوسی کو نہ پیش کرتے۔ مالک کو تو اللہ نے یہ توفیق ہی
نہیں دی تھی کہ وہ ہماری خاطر مدارت کرتا اور کوک کا ایک ڈبا ہمیں پلا دیتا۔ توبہ کیجئے
صاحب۔

اس گیس اسٹیشن کی تعریف راستے بھر لوسی نے ہمارے سامنے بیان کی تھی۔ اب
محض رسمی معلومات کا تبادلہ ہونا تھا۔ یہ صاحب ابھی تک جرمنی سے باہر نہیں نکلے تھے۔
اس لیے انگریزی یوں بولتے تھے جیسے کلہاڑی سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہوں
لیکن ان کی انگریزی کا ترجمہ کرنے کے لیے ہمارے پاس لوسی موجود تھی۔ جب ہم نے
اخراجات اور منافع کے بارے میں پوچھا تو وہ لوسی کی جانب دیکھنے لگے۔

لوسی نے کہا "علی، یہ معلومات میں تمہیں دے چکی ہوں۔ مزید تفصیل درکار ہے تو وہ
بھی بتا دوں گی۔ فی الحال تم گیس اسٹیشن دیکھو۔ کتنا اچھا ماحول ہے۔"

ہم نے دیکھا تو واقعی بہت اچھا ماحول تھا۔ سامنے ایک کشادہ سی سڑک گزرتی تھی۔
دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ کبھی اکا دکا کار پیٹرول لینے کی غرض سے آجاتی تھی
جسے دیکھتے ہی ایک نوخیز اور خوب صورت لڑکی لپک کر کار کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ لڑکی جینز
اور مردانہ قمیص میں ملبوس ہونے کے باوجود نہ صرف لڑکی لگ رہی تھی بلکہ ضرورت سے
زیادہ لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کا سبب غالباً اس کا قدو قامت اور ضرورت سے زیادہ متناسب
جسم تھا۔ چہرے کا رنگ گورا بھبھوکا تھا۔ بال پیتل جیسے تھے۔ آنکھیں ہلکی نیلی اور پیلی
تھیں۔ یہ سب تفصیل ہم نے اس وقت نوٹ کی جب وہ آفس میں داخل ہوئی اور ہم میں
سے کسی کی جانب توجہ دیے بغیر وینڈنگ مشین میں سے چیونگم لے کر پھر باہر چلی گئی۔

لوسی نے کہا "سب سے زیادہ فائدے کی بات یہ ہے کہ آپ بذات خود' محض ایک ہیلپ کی مدد سے کاروبار چلا سکتے ہیں۔"

"ایک ہیلپ؟"

"مطلب یہ کہ ایک معاون۔ اس طرح آپ کے اخراجات بہت کم ہوں گے اور ظاہر ہے کہ منافع زیادہ ہو جائے گا۔"

ہم نے پوچھا "اس لڑکی کو کتنا معاوضہ دیا جاتا ہے؟"

لوسی ہنسنے لگی "علی۔ یہ لڑکی ان کی بیوی ہے۔ یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔"

اس اطلاع کے بعد اس گیس اسٹیشن میں ہماری رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو گئی۔ جرمن صاحب کی حرکت ملاحظہ فرمائیے کہ سارے مذاکرات خود ہی کرتے رہے اور بیوی کو ہمارے نزدیک نہیں پھٹکنے دیا تھا یا شاید اس حسینہ نے خود ہی کوئی توجہ نہ دی۔

واپسی پر میں نے لوسی سے پوچھا "یہ صاحب گیس اسٹیشن فروخت کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

"بیوی کی وجہ سے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی ہے۔ دنیا کی رنگینی سے دور یہاں اپنی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی۔ وہ واشنگٹن یا فلوریڈا میں رہنا چاہتی ہے۔ اسے وہاں بہت سی اچھی جاب بھی مل سکتی ہیں۔ یہاں زندگی ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ اب اولڈ مین کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو گیس اسٹیشن چھوڑ دے یا پھر بیوی سے ہاتھ دھو لے۔"

"مگر اس لڑکی نے یہ شادی کیوں کہ تھی؟"

"یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ہمیں کیا" وہ شانہ ہلا کر بولی' پھر کہا "بات یہ ہے کہ لڑکی نئی نئی امریکا آئی تھی۔ ہر چیز سے ناواقف تھی۔ اسے ایک اچھا ٹھکانا مل رہا تھا۔ شوہر کے پاس پیسے بھی تھے۔ رہنے کے لیے گھر بھی ہے۔ اس نے کوئی برا سودا تو نہیں کیا۔ کیوں' تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ سودا نہیں' یہ تو شادی ہے۔"

"یہ بھی ایک سودا ہی ہوتا ہے۔ بھئی پسند نہ آیا تو چھوڑ دیا۔ انسان وہی کام کرتا ہے جس میں اسے چار پیسے کا فائدہ نظر آئے۔ میرا خیال ہے کہ جرمن یہ بزنس نہیں چھوڑے گا۔ اسے اچھا گاہک نہیں مل رہا کیونکہ ابھی یہ جگہ آباد نہیں ہوئی ہے۔"

ہم فکر مند ہو گئے "تو کیا وہ اتنی خوب صورت بیوی کو چھوڑ دے گا؟"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ انسان زندگی میں نئے تجربات کرتا رہتا ہے مگر ہمیں کیا' یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے تم بتاؤ' تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

ہم نے کہا "بات یہ ہے کہ ہماری بیوی تو ہمارے ساتھ یہ کام ہرگز نہیں کرے گی۔"

"تو کیا ہوا۔ کوئی ہیلپ رکھ لینا۔ تھوڑا خرچا ہی بڑھ جائے گا نا۔"

"سوری' ہمیں یہ کاروبار ہی پسند نہیں آیا ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں ایک بہت اچھا بزنس دکھاتی ہوں۔"

"وہ کیا ہے؟"

"موٹیل' موٹیل جانتے ہو نا؟ تمہارے ملک میں بھی ہوتے ہوں گے؟"

ہم نے سر ہلا دیا حالانکہ ہمارے ملک میں اس وقت تک موٹیل کا رواج نہیں ہوا تھا لیکن ہمیں یہ معلوم تھا کہ موٹیل کیا ہوتا ہے۔ امریکی فلموں اور ناولوں نے ہمارے علم میں کافی اضافہ کیا تھا۔

"آج ہی دیکھنا پسند کرو گے یا کل؟"

"سچ پوچھیے تو موٹیل ہمارے خوابوں کی تعبیر تھی۔ کاروبار کا کاروبار اور رہائش کی رہائش۔ پھر کھانے پینے کی جھنجٹ سے بھی نجات۔ یعنی ہینگ لگے نہ پھٹکری' رنگ چوکھا آئے۔

ہم نے پوچھا "کتنی دور جانا ہے؟"

"دور تو ہے۔ یہاں سے ایک گھنٹے کا سفر ہے۔"

مطلب یہ کہ واپسی میں دو سوا دو گھنٹے کا سفر تھا مگر سوچا کہ اب تلاش میں نکلے ہیں تو خالی ہاتھ لوٹنا مناسب نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ موٹیل کا نام سن کر ہمارا اشتیاق بھی زیادہ ہو گیا تھا۔

لوسی نے ایک جگہ سے گولائی میں کار کو موڑا اور ہم ہائی وے پر پہنچ گئے۔ امریکی ہائی

ویز کی تعریف میں جو کچھ بھی کہا جائے کم ہے۔ ہمارے خیال میں تو اس ملک کی ترقی کی بنیاد ہی یہ ہے۔ ہائی ویز پر یک طرفہ ٹریفک ہوتی ہے اور عموماً تین یا چار لین ہوتی ہیں۔ ایک شولڈر بھی ہوتا ہے جس کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں۔ جب کوئی کار ہائی وے پر پہلی مرتبہ داخل ہوتی ہے تو اس کے لیے ایک علیحدہ لین ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنی ہی سڑک پر چلتی رہتی ہے اور ہائی وے پر داخل ہونے کے بعد بھی کچھ دور تک اس کی لین علیحدہ رہتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اچانک ہائی وے پر داخل ہو کر پہلے سے رواں دواں تیز رفتار ٹریفک میں گڑ بڑ پیدا نہ کرے۔ کچھ فاصلے کے بعد وہ اطمینان سے انڈیکیٹر دے کر اپنی پسند کی لین اختیار کر سکتا ہے۔ اس طرح ٹریفک میں مطلق گڑ بڑ نہیں ہوتی۔

راستے میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لاکھ امریکی سہی مگر لوسی بالآخر ایک عورت تھی اور زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ دنیا بھر میں عورتوں کی گفتگو کے موضوعات قریب قریب یکساں ہوتے ہیں۔ صرف ماحول' حالات اور پیشے کے اعتبار سے ان میں معمولی سی تبدیلی ہو جاتی ہے۔

لوسی کے ساتھ ہماری گفتگو فلم' موسیقی اور کاروبار سے گزر کر ڈڈلے تک پہنچ گئی۔ ان دنوں یہ اس کا سب سے محبوب موضوع تھا۔

"علی' کیا بتاؤں' اس کا فیوچر کس قدر شاندار ہے۔ دیکھ لینا' بہت جلد تم ایک نئے ورلڈ چیمپئن کا نام سنو گے۔"

"اس کا کیا نام ہو گا؟"

"اوہ۔ ڈونٹ بی اسٹوپڈ۔ علی' اس کا نام ڈڈلے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"ممکن تو ہے" ہم نے کہا "لیکن ....."

"لیکن کیا' آگے بولو۔"

"پھر دو ہی صورتیں ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ یا تو اس کا نام بدل دیا جائے یا اپنا بوائے فرینڈ بدل لو آخر کوئی اچھے نام والا ابھرتا ہوا باکسر بھی تو ہو گا۔ تمہاری ڈڈلے سے کتنی پرانی ملاقات ہے؟"

"صرف دو مہینے ہوئے ہیں۔"

"خیر بھئی یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔"

"وہ اپنا نام نہیں بدلے گا۔ اسے یہ نام بہت پسند ہے۔"

"اور تمہیں؟"

"مجھے اچھا لگتا ہے مگر ورلڈ چیمپئن کا معاملہ اور ہے۔"

"تو پھر تم کو چاہیے کہ ڈڈلے کے آس پاس کوئی اور باکسر۔"

"اس کی بھی کیا ضرورت ہے" وہ بات کاٹ کر بولی "دنیا میں باکسروں کے علاوہ اور بھی لوگ ہوتے ہیں۔ اور مجھے باکسنگ سے کوئی دلچسپ بھی نہیں ہے۔ میں نے تو آج تک پیسے خرچ کر کے کوئی باکسنگ مقابلہ ہی نہیں دیکھا۔"

"مگر صرف نام کی خاطر تم اپنا بوائے فرینڈ نہ بدلو۔ آخر اس میں دوسری خوبیاں بھی ہوں گی۔"

وہ بولی "باکسنگ کے علاوہ اس میں کوئی اور خوبی نہیں ہے۔ میں دراصل اپنی دوستوں پر رعب ڈالنا چاہتی ہوں۔ ورلڈ چیمپئن کا بہت رعب ہوتا ہے۔ معمولی بات تو نہیں ہے۔"

"یہ تو ہے۔"

"علی۔ تم نے مجھے ایک نیا خیال دیا ہے۔ میں اس بارے میں سوچوں گی۔"

ہم حیران رہ گئے۔ کہاں تو اتنی وابستگی اور کہاں یہ بے تعلقی اور بے نیازی!

"بس ہمارا ایگزٹ آنے والا ہے" اس نے کہا۔

ہائی ویز پر باہر نکلنے کے راستوں کو ایگزٹ کہا جاتا ہے۔ اس کی اطلاع کئی میل پہلے سے دی جاتی ہے۔ سامنے والے سائن بورڈ پر سب سے پہلے اس جگہ کا نام لکھا ہوتا ہے جو آنے والی ہے۔ اس کے بعد اگلی جگہ کا نام ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد والی جگہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کو پہلے سے باخبر کر دیا جائے کہ اب آپ کا ایگزٹ آنے والا ہے۔ امریکی ہائی ویز پر سفر اس لیے بہت پر لطف اور آسان ہوتا ہے اور کسی سے پتا دریافت کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ اگر آپ کے پاس درست پتا موجود ہے تو کسی بھی جگہ کسی کی مدد حاصل کیے بغیر پہنچ سکتے ہیں۔

ایگزٹ لینے کے بعد ہم ایک نیم دائرہ نما سڑک سے ہوتے ہوئے ایک اور سڑک پر آگئے۔ کشادگی اور خوب صورتی میں یہ بھی کم نہ تھی۔ دونوں طرف سر سبز ٹیلے اور

درختوں کے سلسلے تھے۔ امریکی اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ خالی زمین بنجر، اجاڑ
ویران اور بدنما نظر نہ آئے۔ اس لیے سبزہ اور درختوں کا کثرت سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ
چیزیں نہ صرف ماحول کو نظر فریب اور خوب صورت بنا دیتی ہیں بلکہ صحت مند، تازہ ہوا اور
آکسیجن بھی فراہم کرتی ہیں۔

یہ سڑک مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی ایک نہایت سرسبز علاقے میں داخل ہو گئی۔
لوسی نے اطلاع دی کہ اب آپ کا موٹیل آنے ہی والا ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے
واقعی ہم اس موٹیل کے مالک بن گئے ہیں۔

"تم نے اس موٹیل کے بارے میں ہمیں کچھ بتایا نہیں ہے" ہم نے یاد دلایا۔

"اس کا نام "گرین موٹیل" ہے۔ اس میں تیس کے قریب کمرے ہیں۔ دو ایکڑ کے
علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک مصروف سڑک پر واقع ہے اس لیے مہمان اکثر آتے رہتے
ہیں۔ بہت معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر مالک اسے فروخت کیوں کر رہا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگی "علی، تم ابھی تازہ وارد ہو اس لیے امریکیوں کے مزاج سے واقف نہیں
ہو۔ یہ ایک سیلانی قوم ہے۔ یکسانیت سے اکتا جاتی ہے۔ پھر ہمارا اقتصادی نظام ایسا ہے کہ
لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ مثلاً جس شخص
نے واشنگٹن میں مکان اور دکان قسطوں پر خریدی ہے وہ اسے بلا تاخیر فروخت کر کے اپنی
لگائی ہوئی رقم وصول کر لیتا ہے اور پھر ان ہی شرائط پر نیویارک میں مکان اور بزنس خرید لیتا
ہے۔ اس لین دین میں عموماً اسے گھاٹا نہیں ہوتا بلکہ تھوڑا بہت منافع ہو جاتا ہے۔ اس
لیے امریکی کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے۔"

ہم نے کہا "واقعی ٹھیک کہا تم نے۔ یہ تو سیلانیوں کی نسل ہیں۔ انگلینڈ، جرمنی،
فرانس، آسٹریلیا اور نہ جانے کہاں کہاں سے لوگوں نے آکر امریکا کو آباد کیا تھا اور پھر سارے
ملک میں ادھر سے ادھر گھومتے رہے۔"

"اب سمجھے ہو۔" وہ مسکرانے لگی۔ وہ خاصی سمجھدار اور خوش نظر لڑکی تھی۔ لڑکی
ان معنوں میں کہ امریکا میں ہر عمر کی خاتون کو لڑکی ہی کہا جاتا ہے۔ اگر انہیں عورت کہا
جائے تو وہ برا مان جاتی ہیں۔ لوسی تو جوان ہی تھی لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی

تھی کہ اس گوری چٹی خوب صورت، ذہین اور نازک اندام لڑکی نے ڈوڈلے جیسے سیاہ فام دیو
زاد کو کس سلسلے میں پسند کر لیا تھا؟

"وہ دیکھو۔ سامنے گرین موٹیل۔"

ہم نے سامنے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک پیالہ نما سبزہ زار کے درمیان میں ایک سفید انڈے جیسی خوب صورت دو منزلہ عمارت مسکرا رہی تھی۔ اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جن پر سبزہ اگا ہوا تھا اور سرو قامت درخت سر اٹھائے جھوم رہے تھے۔ مین روڈ پر سے ایک پختہ سڑک اس عمارت کی جانب جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جس کے آغاز میں ایک سائن بورڈ پر "گرین موٹیل۔ واک ان" لکھا ہوا تھا۔ یہ سڑک کافی طویل تھی اور دو رویہ درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ لوسی نے اس سڑک پر اپنی کار موڑ دی۔ ہم تو اس موٹیل کو دیکھتے ہی لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"بہت اچھی جگہ ہے" ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اچھی اور منافع بخش" اس نے تصحیح فرمائی۔

ایک ہلٹو نین ٹائپ کے اونچے اونچے سفید ستونوں والے برآمدے کے سامنے ہماری کار جا کر رک گئی۔ ہر چیز دلفریب تھی۔ دروازے اور کھڑکیوں میں قد آدم شیشے لگے ہوئے تھے۔ عمارت کے چاروں اطراف میں ایک دائرہ نما سڑک تھی۔ کمرے بھی دائرے کی صورت میں بنے ہوئے تھے اور یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ہر کمرے کے سامنے کار پارکنگ فراہم کی جائے۔ کمروں کے سامنے چھوٹے چھوٹے برآمدے تھے۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچ کر اپنے دروازے کا قفل کھولیے اور کمرے کے اندر چلے جائیے۔

لوسی نے کار ایک جانب کھڑی کر دی جس پر خوب صورت درختوں کا سایہ تھا۔ ہم کئی سیڑھیاں چڑھ کر استقبالیہ پر پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا۔ اسی ہال کے اندر سے چھوٹے سے ڈائننگ ہال کو بھی راستہ جاتا تھا۔ استقبالیہ پر ایک کافی عمر کی مگر اسمارٹ سی بڑی

بی تشریف فرما تھیں۔ میک اپ اور لباس کے فیشن کے اعتبار سے وہ کسی ٹین ایجر دوشیزہ سے کم نہیں تھیں۔ لوسی پر نظر پڑی تو بے اختیار مسکرائیں "ہائی لوسی!"

"ہائی پیٹ!"

امریکی طرز تخاطب یہی ہے کہ عمر کے امتیاز کے بغیر ہی ایک دوسرے کو پہلا نام لے کر پکارا جاتا ہے۔ اور تو اور پوتیاں اور نواسیاں بھی اپنی دادی اور نانی کو نام لے کر ہی پکارتی ہیں۔ امریکیوں کا کہنا ہے کہ اس سے بے تکلفی اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ ہماری تہذیب میں اسے بدتمیزی اور گستاخی قرار دیا جاتا ہے۔ بہرحال' اپنے اپنے ڈھنگ ہیں۔

لوسی نے فوراً ہمارا تعارف کرا دیا۔ بڑی بی کا پورا نام پیٹریشیا یونکر تھا۔ کچھ عجیب سا نام ہے مگر جب نام والی کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم آپ کون ہیں اعتراض کرنے والے؟

پیٹریشیا کے بقول ان کی معلومات بہت زیادہ تھیں۔ اس لیے وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ پاکستان بھی ایک ملک ہے۔

لوسی نے پوچھا "آپ پاکستان سے تو واقف ہیں نا؟"

بولیں "ہاں ہاں' بہت اچھی طرح۔ انڈو پاک بہت مشہور ملک ہے۔ جس طرح انڈو چائنا ایک بہت بڑا ملک ہے" اب ہم ان سے کیا عرض کرتے مگر کسی امریکی کا اتنا باخبر ہونا بھی بہت غنیمت تھا۔ شکر ہے کہ انہوں نے پاکستان کو قازقستان یا افغانستان کا حصہ قرار نہیں دیا تھا۔

"اچھا۔ تو تمہیں موٹیل چلانے کا شوق پیدا ہو گیا ہے" ہم کو مخاطب کر کے وہ مسکرائیں اور ان کے مصنوعی بتیسی جگمگانے لگی "کیا تمہیں پہلے بھی اس کا تجربہ ہے؟"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہم تو اس سے پہلے کبھی کسی موٹیل میں ٹھہرے تک نہیں ہیں۔ مگر گول مول سا جواب دے دیا "جی نہیں۔"

بولیں "پھر تم کیا کرو گے ینگ مین؟ یہ کافی مشکل کام ہوتا ہے۔ تم چاہو گے تو فروخت کے بعد ہم ایک مہینے تک تمہیں مدد اور تربیت فراہم کر دیں گے۔"

"بڑی نوازش ہو گی۔ پھر تو کوئی مشکل ہی نہیں رہے گی" ہم نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے کتنے بچے اور بیوی ہیں؟"

ہم نے کہا "بیوی تو ایک ہی ہے' بچیاں البتہ دو ہیں۔"

وہ ہنسنے لگیں "دلچسپ آدمی لگتے ہو' ارے بھئی بیوی تو ظاہر ہے کہ ایک ہی ہوگی۔"
ہم نے کہا "ایسا نہ کہیئے۔ ہمارے ملک میں ایک سے زائد بیویاں بھی ہوتی ہیں۔"
اچانک انہیں یاد آگیا "اوہ۔ ارے ہاں' تم تو مسلم ہو۔ شاید تین شادیاں اور کرو گے؟"

ہم نے کہا "بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔"

"کیوں۔ مسلمان تو چار شادیاں کرتے ہیں؟"

ہم نے کہا "کرتے نہیں ہیں' کر سکتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ایک ہی پر گزارہ کرتے ہیں۔"

بولیں "میں کسی کے مذہبی معاملات میں دخل دینا پسند نہیں کرتی مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی شادی ہونی چاہیے۔"

"ٹھیک فرمایا آپ نے۔ ہمارا ذاتی خیال بھی یہی ہے۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

ہم نے کہا "مناسب وقت کا انتظار کریں گے۔"

وہ ہنسنے لگیں "میں شادی کا نہیں پوچھ رہی۔ موٹیل کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

ہم نے کہا "اسے چلائیں گے اور کیا کریں گے؟"

"ارے بھئی' اتنے مختصر سے خاندان کے ساتھ موٹیل کیسے چلاؤ گے؟"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں دو تین شادیاں اور کرنی چاہئیں؟"

وہ ہنس پڑیں "بہت شریر ہو۔"

لوسی بھی مسکرانے لگی "علی' مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے شیطان (ناٹی) ہو۔"

ہم نے پریشان ہو کر کہا "مگر بات کیا ہے؟ آپ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

پیٹریشیا نے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ میری فیملی کتنی بڑی ہے؟"

"جی نہیں۔ اب بتا دیجئے۔"

"دیکھو نوجوان میرے دو بیٹے ہیں۔ خیر وہ تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

"کیوں خیریت تو ہے؟" ہم نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں ہاں' خیریت ہے۔ دراصل وہ میرے ساتھ نہیں رہتے۔ بس کبھی کبھار فون کر

لیتے ہیں۔ ان کے بچے بھی ان کے ساتھ نہیں رہتے۔ وہ بھی کبھی کبھی کرسمس کارڈ بھیج دیتے ہیں لیکن میری تین بیٹیاں ہیں اور ان کی دو بیٹیاں ہیں۔"

"تین کی دو بیٹیاں! یعنی مشترکہ؟"

"شرارت مت کرو۔ ارے بھئی دو کی ایک ایک بیٹی ہے اور تیسری کی اولاد ہی نہیں ہے۔ اس طرح یہ پانچ لڑکیاں ہیں۔ چھٹی میں خود ہوں۔ ہم سب مل ملا کر یہ موٹیل چلا رہے ہیں۔ تمہاری بیٹیاں کتنی بڑی ہیں؟"

ہم نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بچیوں کی اونچائی بتا دی۔

"ارے نہیں! عمر کیا ہے ان کی؟"

ہم نے عمر بھی بتا دی۔

"گویا بالکل بچیاں ہیں۔ تو پھر تم یہ موٹیل کیسے چلاؤ گے؟"

"اسٹاف رکھیں گے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا۔ مگر جانتے ہو اسٹاف کتنا مہنگا پڑے گا۔ تربیت یافتہ اسٹاف کم معاوضے پر نہیں ملتا۔ اور پھر کام کی نوعیت ایسی ہے کہ انہیں یہیں رہنا ہو گا۔ اس طرح رہائش اور کھانا بھی تمہارے ذمے ہو گا۔ پھر ان کی سوشل سیکیورٹی' انشورنس' یہ' وہ ہزار جھنجٹ ہیں۔"

"وہ تو ہیں" ہم نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

لوسی نے کہا "پیٹ۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ میں اور علی بیٹھ کر ورک آؤٹ کر لیں گے۔ کیا بہتر نہ ہو گا کہ ہم پہلے علی کو موٹیل کے کمرے وغیرہ دکھا دیں؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" انہوں نے میز پر رکھے ہوئے نازک سے انٹر کام کا بزر دبایا اور بہت نرم لہجے میں فرمایا "ہیلو نیٹ ... یہ تم ہو؟ اچھا سنو' اگر زیادہ مصروف نہیں ہو تو میرے ہاں آسکتی ہو؟ او کے۔ شکریہ۔"

یہ بات چیت انہوں نے اپنی صاحب زادی سے کی تھی۔

"یہ نیٹ ہے' میری بیٹی" انہوں نے ہماری پشت کی جانب دیکھ کر ارشاد کیا۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا اور حیران رہ گئے کہ اتنی جلد یہ خاتون کہاں سے اور کیسے برآمد ہو گئیں۔ وہ لنا کی صاحب زادی تھیں اس لیے ان سے زیادہ اسمارٹ اور خوش اندام تھیں۔ کم از کم

صورت شکل کے معاملے میں قدرت اس خاندان پر کافی مہربان معلوم ہوتی تھی۔ وہ بڑے
اسٹائلش انداز میں چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی ہم لوگوں کے نزدیک پہنچ گئیں۔

"نیٹ، علی سے ملو۔ یہ اس موٹیل کے اگلے مالک ہیں۔"

نیٹ نے فوراً اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے ہماری طرف بڑھا دیا۔ مغرب والوں کا یہ
طریقہ خوب ہے۔ عورت، مرد کے امتیاز کے بغیر بلا تامل مصافحہ کر لیتے ہیں۔ بلکہ مو
آداب محفل اور ملاقات کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے۔ ہمیں تو یاد نہیں کہ اپنے ملک میں
کسی انتہائی ترقی پسند اور فیشن ایبل خاتون نے بھی ہمیں مصافحے کا شرف بخشا ہو مگر جب
یورپ اور امریکا جاتی ہیں تو غیروں سے خوب ہاتھ ملاتی ہیں۔ بقول شاعر

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

اس شعر میں آپ موقعے کی مناسبت سے تبدیلی کر سکتے ہیں۔

نیٹ نے اپنا گرم اور ملائم ہاتھ ملا کر کہا "بہت خوشی ہوئی" ظاہر ہے کہ یہ رسمی فقرہ
تھا۔ مگر جب ہم نے یہی فقرہ دہرایا تو درحقیقت یہ سچائی تھی۔ ایسی لڑکیوں سے مل کر بھلا
کون بدذوق ہے جسے خوشی نہ ہو گی؟

اتنی دیر میں سامنے والا ایک دروازہ کھلا جو ڈائننگ روم کا دروازہ تھا۔

"لو، کیٹ بھی آ گئی!" بڑی بی بولیں "لو علی۔ کیٹ سے بھی مل لو۔ یہ بھی میری بیٹی
ہے۔"

ہمیں مجبوراً نیٹ کا ہاتھ چھوڑنا پڑا کیونکہ کیٹ نے مصافحے کے لیے ہماری طرف اپنا
ہاتھ بڑھا دیا تھا اور مغربی آداب کے مطابق مصافحہ صرف دائیں ہاتھ سے ہی کیا جاتا ہے۔

ہم نے بڑی بی سے پوچھا "سنئے، کیا آپ لوگوں کا تعلق کسی شاعر خاندان سے ہے؟"

وہ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگیں "وہ کیوں؟"

"ہمارے ہاں شاعری میں ایسا ہوتا ہے کہ شعر کا آخر لفظ ایک جیسا ہوتا ہے۔ جیسے
پیٹ، نیٹ، کیٹ۔ اسے "ہم قافیہ" کہتے ہیں۔"

وہ سب کی سب ہنسنے لگیں "یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میرا نام تو پیٹریشیا ہے۔ اس کا
مخفف پیٹ ہے۔ نیٹ کا نام نٹالی ہے اس لیے نیٹ کہلاتی ہے اور کیتھی کو ہم کیٹ کہتے

ہیں۔"

"صوتی اثرات بہت اچھے ہیں" ہم نے کہا۔

"اور نظری اثرات کیسے ہیں؟" نیٹ نے پوچھا۔

ہم کچھ گھبرا سے گئے۔ ایک دم لڑکیوں کی تعریف کرنا کچھ معیوب سے لگتا تھا۔ اور وہ
بھی ماں اور بہنوں کے سامنے۔ مگر سوال کا جواب دینا بھی اخلاق کا تقاضا تھا اس لیے کہا "وہ
بھی بہت خوب ہیں۔"

"شکریہ!" بڑی بی نے گرم جوشی سے کہا اور نیٹ سے فرمایا "تم انہیں اپنے ساتھ لے
جا کر موٹیل کے کمرے وغیرہ دکھاؤ۔ اتنی دیر میں کیٹ لوسی کو کافی وغیرہ پلا دے گی۔ کیوں
لوسی۔ کیا خیال ہے؟"

اس طرح لوسی اور کیٹ کو وہیں چھوڑ کر ہم نیٹ کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ نیٹ نے
بجائے اندر جانے کے باہر کا رخ کر لیا۔

ہم نے کہا "کیا ہم کسی اور موٹیل کو دیکھنے جا رہے ہیں؟"

"نہیں تو، کیوں؟"

"آپ باہر کی طرف جا رہی ہیں نا، اس لیے۔"

وہ ہنسنے لگی "یہ موٹیل ہے۔ اس کے تمام کمرے الگ الگ ہوتے ہیں۔ باہر سے
آنے والا مہمان باہر ہی باہر کار پارک کر کے اپنے کمرے میں پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے میں
تمہیں باہر لے جا کر یہ کمرے وغیرہ دکھاؤں گی۔"

ہم دونوں باہر پہنچ گئے۔ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر نیٹ نے اپنی پتلی کمر میں
بندھی ہوئی پٹی نما زنجیر یا زنجیر نما پٹی میں سے تلاش کر کے ایک چابی نکالی اور کمرے کا
دروازہ کھول دیا۔ کمرے کے سامنے مختصر سا برآمدہ یا ٹیرس تھا۔ اس میں بھی قالین بچھا ہوا
تھا۔ اندر تو خیر قالین کا فرش تھا ہی۔ ایک ڈبل بیڈ، صوفہ سیٹ، باتھ روم، ایک کھڑکی اور
ایک عدد سنگھار میز۔ یہ اس کمرے کی کل کائنات تھی۔ ہر چیز بہت نفیس اور خوب صورت
تھی۔ ایک جانب بار کے لیے چھوٹی سی جگہ بنائی گئی تھی۔ اس کے برابر ہی لال رنگ کا ٹیلی
فون رکھا ہوا تھا۔ بار کے ساتھ ہی چھوٹا سا فرج بھی تھا۔ اس کے برابر میں ایک سائڈ بورڈ
لکھنے کی میز کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

"دیکھا تم نے؟"

"ہاں دیکھا۔"

"ٹھیک ہے نا؟"

"اچھا ہے۔ اس کمرے کا کرایہ کتنا ہے؟"

وہ مسکرانے لگی "یہ بزنس سیکرٹ ہے مگر تمہیں بتا دیتی ہوں۔ اس کا ایک دن کا کرایہ پندرہ ڈالر ہے۔"

"دن سے کیا مراد ہے؟"

"ہمارا چیک ان ٹائم دن کو بارہ بجے ہوتا ہے اس لیے چیک آوٹ کا وقت بھی یہی ہے۔ لیکن جو شخص ایک بار اس کمرے میں داخل ہوتے ہی باہر چلا جائے اس سے بھی کم از کم ایک دن کا کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ رات کو آکر ٹھہرتے ہیں۔ دن میں بھی تھکے ماندہ ڈرائیور آرام کرنے کے لیے یہاں آجاتے ہیں؟"

"کھانا۔ ناشتا وغیرہ؟"

"ایک چھوٹا سا ریستوران ہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈائننگ ہال ہے۔ اگر کوئی چاہے تو اسے ناشتا اور کھانا بھی مل جاتا ہے مگر رات کے بارہ بجے کے بعد نہیں۔"

"یہ کمرا تم نے دیکھ لیا؟ بس دوسرے تمام کمرے ایسے ہی ہیں۔ فرنیچر وغیرہ سب کچھ بالکل یہی۔ تم ان سب کو دیکھنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر شاید تم اپنا وقت برباد کرنا پسند نہ کرو گے۔"

ہم ایک صوفے پر بیٹھ گئے "یہاں چائے کافی مل سکتی ہے؟"

"یہاں بیئر' وھسکی' رم اور کولڈ ڈرنکس مل سکتے ہیں' یہ دیکھو" اس نے فرج کا دروازہ کھول دیا "چاکلیٹ بھی ہیں۔"

"شکریہ۔ بس ایک سیون اپ نکال دو۔" اس نے سیون اپ کا ڈبا نکال کر ہمارے حوالے کر دیا۔

"تم بھی اپنی پسند کی ڈرنک لے لو۔"

"شکریہ۔ میں کام کے وقت کچھ نہیں پیتی۔"

ہم نے کہا "نیٹ یہ ہماری طرف سے ہے۔ قیمت ہم ادا کریں گے۔"

ہنس کر بولی "پھر بات دوسری ہے" اور ایک بیئر کا ڈبا نکال لیا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ مہمانداری کا یہ انداز۔ ہم مشرق کے لوگ شاید اسی لیے پسماندہ ہیں کہ مہمانوں کی خاطر مدارات بہت کرتے ہیں۔

"اس کمرے میں خوشبو بہت اچھی ہے۔ کیا ہر روز سینٹ کا اسپرے کیا جاتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی "بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم جانتے ہو کہ یہ خوشبو میرے پاس سے آرہی ہے۔"

"ہمیں واقعی اندازہ نہیں ہوا" ہم نے صفائی پیش کی۔

تم یہ موٹیل کیسے چلاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"تم کیسے چلاتی ہو؟"

"ہم تو چھ افراد ہیں۔ اماں کے سپرد انتظام' حساب کتاب اور استقبالیہ ہے۔ ہم تینوں بہنیں کمروں کی صفائی آراستگی اور عمارت کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ دو نو عمر لڑکیاں کچن کی ذمے دار ہیں۔ ویٹریس کے طور پر بھی وہی کام کرتی ہیں۔"

ہم نے کہا "بڑے مزے ہیں پھر تو' منافع ہی منافع اور خرچ کچھ نہیں۔"

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

"بھئی سب کارندے گھر کے ہیں۔ تنخواہ وغیرہ کا پرابلم ہی نہیں ہے۔"

"ڈونٹ بی سیلی۔ ہم سب اپنے کام کا معاوضہ لیتی ہیں۔ منافع میں سے حصہ الگ ملتا ہے۔ بس فائدہ یہ ہے کہ اول تو زیادہ تنخواہیں وصول نہیں کرتے کیونکہ جتنی زیادہ تنخواہ ہو گی اتنی ہی زیادہ سوشل سیکیورٹی اور انشورنس ہوتی ہے کیونکہ آپس کا معاملہ ہے اس لیے کم تنخواہوں پر کام کرتے ہیں۔ ہم سب کی ہفتہ وار تنخواہ ساڑھے چھ ہزار بنتی ہے۔ تمہیں چوبیس گھنٹے کے لیے چار گنا اسٹاف رکھنا پڑے گا کیونکہ یہ دھندا چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے۔ پھر تنخواہوں پر کم سے کم چودہ پندرہ ہزار ڈالر خرچ ہو جائے گا۔ سوشل سیکیورٹی اور انشورنس بھی اسی حساب سے دینا ہو گی۔"

"مارے گئے بھئی' تو پھر منافع کیا ہوا؟"

"منافع بھی اچھا ہو جاتا ہے بشرطیکہ مہمان آتے رہیں۔ جاڑوں کے موسم میں کاروبار بہت مندا ہو جاتا ہے۔ ویسے یہ بہت دلچسپ کام ہے۔"

"ہاں وہ تو ہم نے ناولوں میں پڑھا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے۔ قاتل' لٹیرے اور جرائم پیشہ لوگ یہاں پناہ لیتے ہیں۔ خوب مار پیٹ ہوتی ہے۔ لڑکیاں گھر سے بھاگ کر یہاں آجاتی ہیں۔ بیویاں اپنے شوہروں کی آنکھ میں دھول جھونک کر پہنچ جاتی ہیں اور بوائے فرینڈ سے مل کر شوہر کو قتل کرنے کے منصوبے بناتی ہیں۔ شوہر بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "کتنا اچھا تخیل ہے تمہارا؟ ارے بابا' کتابوں اور فلموں کی بات اور ہوتی ہے۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ ویسے کبھی کبھی جرائم پیشہ لوگ آتے تو ہیں۔ جیسے پچھلے دنوں ایک مفرور قاتل جیل سے بھاگ کر آگیا تھا اور اس نے کیٹ کو یرغمال بنا لیا۔"

"وہ کیسے؟"

"اسے لے کر ایک کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ پولیس بھی سائرن بجاتی ہوئی آگئی۔ چاروں طرف پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اسے حفاظت سے باہر نہیں جانے دیا تو وہ کیٹ کو گولی مار دے گا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"تین چار دن تک یہ ڈراما چلتا رہا۔ کافی پولیس تھی۔ انہوں نے تو پڑاؤ ڈال دیا تھا یہاں۔ پھر ٹی وی اور اخبار والے آگئے۔ خوب فلمیں بنائیں۔"

"مگر مجرم تو اندر بند تھا۔"

"فلمیں اور تصویریں تو ہم لوگوں کی بن رہی تھیں۔ سارے میں اس موٹیل کی پبلسٹی ہو گئی۔ اس کے بعد بہت سے لوگ تو موٹیل دیکھنے کے لیے آجاتے ہیں۔ ایک بات بتاؤں؟"

"ہاں۔ کہو!"

"اسی کے بعد تو پیٹ نے اس کی قیمت بھی بڑھا دی ہے۔"

"پولیس والوں کی وجہ سے تمہارا تو دیوالیہ پٹ گیا ہو گا؟" ہم نے پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"ارے بھئی ان کی خاطر مدارات' کھانا پینا' نخرے' شرابیں وغیرہ۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہمیں تو منافع ہی منافع ہوا۔ پولیس والے مستقل کھاتے پیتے

رہتے تھے۔ یہاں آنے والے کیمرہ مین' فوٹو گرافر اور صحافی بھی کم نہ تھے بلکہ آس پاس کے جو لوگ تماشا دیکھنے آتے تھے ان کی وجہ سے بھی خوب آمدنی تھی۔"

"پولیس والے اپنا بل خود ادا کرتے تھے؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا "تو پھر ان کا بل کون ادا کرتا؟ ان کا محکمہ' توبہ کرو۔"

ہم نے دل ہی دل میں کان پکڑے کہ امریکی پولیس پر بھی پاکستانی پولیس کا گمان کر لیا۔ جہاں پولیس تفتیش کے لیے مہمان جاتی ہے تو میزبان کو دیوالیہ کر کے ہی واپس آتی ہے۔ اور بے چارے کو حاصل وصول بھی کچھ نہیں ہوتا۔

"تین چار دن تک بے چاری کیٹ تو بہت پریشان رہی ہو گی؟" ہم نے دریافت کیا۔

اس نے بڑے زہد شکن انداز میں شانے اچکائے اور ہاتھ پھیلا کر بولی "سب سے زیادہ مزے میں تو کیٹ ہی رہی۔"

"مگر وہ قاتل ......"

"قاتل تھا تو کیا ہوا۔ بہت اچھا آدمی تھا وہ۔ اور اتنا ہینڈ سم اور اسمارٹ کہ کیا بتاؤں۔ کیٹ نے تو اس کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ سمجھو دونوں ہنی مون منا رہے تھے" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ "اور پھر جب اس نے خود کو پولیس کے حوالے کیا تو سب سے زیادہ تصویریں کیٹ کی ہی بنائی گئیں۔ وہ تو بیٹھے بٹھائے فلم اسٹاروں کی طرح مشہور ہو گئی۔ ایک دو ٹی وی پروڈیوسرز نے اسے آفر بھی کی ہے اور ایک میگزین اس روداد پر مشتمل واقعات کی سلسلہ وار کہانی بھی چھاپنے کو تیار ہے۔ یہ کم بخت ہمیشہ سے لکی ہے۔ کیا حرج تھا اگر جارجی مجھے یرغمال بنا لیتا۔ اس کی تو موج ہو گئی ہے۔ اسی لیے تو اب موٹیل میں اس کا دل نہیں لگتا۔"

"اس لیے تم لوگ اسے فروخت کر رہے ہو؟"

"شاید۔ بلکہ بہت حد تک۔ بات یہ ہے کہ اس قاتل نے ہم سب کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ بہت بھاگوان قاتل تھا وہ۔"

"اچھا!"

"اور کیا۔ دیکھو' کیٹ کی کہانی تو میں سنا چکی ہوں۔ اسے ایک ٹی وی کیمرہ مین نے پسند کر لیا اور اب وہ اس کے ساتھ نیویارک جا رہی ہے۔"

"سوری نیٹ۔ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔"

"بلاوجہ اپنی ہمدردی ضائع نہ کرو۔ میں بھی گھاٹے میں تو نہیں رہی۔ مجھے ایک ائرلائن کے چیئرمین نے سیکریٹری کی جاب آفر کی ہے۔ اور پتا ہے رہنا کہاں ہو گا؟"

"کہاں؟"

"لاس اینجلس میں۔ وہ تو میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔"

واقعی۔ کیٹ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ جیل سے بھاگے ہوئے ایک مفرور قاتل نے ان سب کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ لوگ امریکا کو "شاندار مواقع کی سرزمین" درست ہی تو کہتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایسا کسی اور جگہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ ہمارے ملک کی تو خیر بات ہی رہنے دیجئے۔ ہمارے ہاں تو موٹیل والوں کی زندگی ہی برباد ہو جاتی۔ لڑکیاں بدنام اور رسوا ہو جاتیں، پولیس قاتل کے شریک ہونے کے الزام میں پتا نہیں کتنے لوگوں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیتی اور آس پاس رہنے والوں کی بھی شامت ہی آجاتی۔ اور تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر بے چاری بڑی بی اکیلی رہ گئیں اس بڑھاپے میں۔

ہم نے اس شبے کا اظہار کیا "پیٹ غریب کو تم سب لوگ تنہا چھوڑ جاؤ گے؟"

"تنہا کیوں" پیٹ کی بھی شادی ہو رہی ہے۔ ایک بہت خوشحال کاشتکار سے۔ اس کا فارم یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

لیجئے ہمارا یہ اندازہ بھی غلط نکلا۔

"کیا خیال ہے، اب واپس چلیں۔ موٹیل تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔"

استقبالیہ پر لوسی اور پیٹ ہماری منتظر تھیں "کیوں پسند آیا؟" "اچھا ہے" ہم نے کہا "اب اس کی قیمت وغیرہ کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے؟"

"علی، یہ موٹیل حال ہی میں بہت مشہور ہو گیا ہے۔ اس لیے قیمت میں بھی کچھ اضافہ ہوا ہے۔ ان لوگوں نے ڈھائی لاکھ ڈالر میں خریدا تھا مگر اب یہ ہاف ملین مانگتے ہیں۔"

"پانچ لاکھ ڈالر؟"

"کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس کی ماہانہ آمدنی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے۔"

"اور اخراجات؟" ہم نے پوچھا۔

"یہ تم پر منحصر ہے۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو ذرا بھی تامل نہ کرتی۔ تمہیں صرف

ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر ڈاؤن پیمنٹ کرنی ہو گی۔"

ہمیں پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ یہ بزنس ہمارے بس کا نہیں ہے۔ یہ باتیں سن کر تو رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ معصوم صورت لوسی نے بھی ہمیں صحیح صورت حال نہیں بتائی اور یہ بات گول ہی کر گئی کہ اگر ہم موٹیل کو چلانے کے لیے عملہ رکھیں گے تو ہمارا خرچہ کتنا ہو گا اور ہمیں بچت کتنی کم ہو گی۔ امریکیوں کا یہ رخ رفتہ رفتہ ہمارے سامنے آ رہا تھا۔ ہم نے پیٹ سے بھی یہی کہا کہ ہم سوچ کر اور اپنی مسز سے مشورہ کر کے بتائیں گے۔ لوسی کے لیے بھی یہ مضمون واحد ہی تھا۔ واپسی کا سفر اس لحاظ سے پرلطف نہیں تھا کہ یہ دن بھی رائیگاں ہی گیا تھا۔ لوسی نے شاید یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بزنس ہمیں پسند نہیں آیا ہے یا پھر ہم اس میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس نے ہمیں واپسی کے سفر میں یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ اس کے پاس اور بھی بہت سے منافع بخش پروپوزل موجود ہیں۔ جہاں تک امریکی ریالٹرز کی دیانت داری کا تعلق ہے، اس کا تجربہ ہمیں بہت تلخ ہو رہا تھا۔ ان کا انداز فکر ہمارے روایتی گورکنوں جیسا تھا۔ یعنی ان کا فرض محض مردے کو قبر میں ڈال دینا ہوتا ہے۔ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں، ان کی بلا سے۔ ان لوگوں کا بھی یہی رویہ ہے۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بس کسی طرح سودا پٹ جائے۔ اس معاملے میں عموماً خریدار ہی نقصان میں رہتا ہے۔ خصوصاً ہم جیسا نووارد اور اناڑی خریدار۔ یہ لوگ حقائق پوری طرح بیان نہیں کرتے۔ اور خریدار یا فروخت کرنے والے کی لاعلمی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر بعد میں شکایت کی جائے تو بھولا منہ بنا کر کہتے ہیں "یہ تو آپ کو خود ہی معلوم ہونا چاہیے تھا۔ میرا کیا قصور ہے؟"

ایک خوبی ان میں یہ ہے کہ روایتی انشورنس ایجنٹ کی طرح پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ دن، رات، دوپہر، شام ہر وقت ان کا فون آتا رہتا ہے یا خود موجود ہو جاتے ہیں۔ سیر سپاٹا بھی کراتے ہیں۔ ذاتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر محض مطلب براری تک۔ مثال کے طور پر لوسی نے ہم سے انتہائی دوستانہ تعلقات قائم کر لیے تھے اور باتوں باتوں میں کئی بار "ڈیٹ" پر چلنے کے اشارے دیتی رہی تھی۔ ایک بار تو اس نے ایک جگہ سے گزرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ اس کا اپارٹمنٹ یہاں سے تیسری سڑک پر ہے اور وہ اس میں بالکل تنہا رہتی ہے۔ شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر ہم حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ

تمہیں اکیلے رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟

لڑکی ہم سے بھی زیادہ حیران ہو کر پوچھتی "ڈر؟ کس بات کا ڈر؟"

"ارے بھئی' آپ لڑکی ذات بالکل اکیلی رہتی ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

یہ بات ہم پر رفتہ رفتہ منکشف ہو گئی کہ امریکا تو دراصل "اکیلوں" کی قوم ہے۔ تھوڑے سے خوش نصیبوں کے سوا مرد ہو یا عورت' لڑکی ہو یا لڑکا' سبھی اکیلے رہتے ہیں اور یہ اکیلا پن ہی اس تہذیب کی اقتصادی عروج کا سبب بھی ہے اور انسانی رشتوں کے زوال کی وجہ بھی۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جو آپ مناسب وقت پر پڑھیں گے۔

تذکرہ ہو رہا تھا لوسی اور اس کے حوالے سے دوسرے امریکی ریالٹرز کا۔ بھئی کیا بتائیں' یہ لوگ تو جھاڑ کے کانٹے کی طرح چپک کر رہ جاتے ہیں۔ ہم نے لوسی کی جانب سے "ڈیٹ" وغیرہ کے سلسلے میں جو تذکرہ کیا ہے اسے بھی کسی اور معنوں میں نہ لیجئے۔ یہ تو وہاں کی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ مرد اور خواتین آپس میں ملتے ہی رہتے ہیں۔ ایک بات اور ذہن میں رکھیے' ہمارے ہاں یہ تاثر بھی عام ہے کہ "ڈیٹ" پر جانے کا مطلب ہے عشق اور عاشقی۔ جی بالکل نہیں! یہ تو "ڈیٹ" پر جانے والوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔ ورنہ یہ بھی ہوتا ہے کہ "کھایا پیا کچھ نہیں۔ گلاس توڑا' بل آٹھ آنے" یعنی ڈیٹ کو کھانا وانا کھلانے' فلم دکھانے یا گھمانے پھرانے کے بعد بڑی حفاظت اور احتیاط سے گھر پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کئی بار تو ایسا ہوتا ہے کہ ڈیٹ پر جانے والے اپنا اپنا بل بھی خود ہی ادا کرتے ہیں۔

مغربی تہذیب میں ہزار برائیاں سہی مگر ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہر چیز کا ضابطہ اور حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ لڑکے اور لڑکی میں دوستی کی مختلف اقسام ہوتی ہیں اور یہ بھی یاد رکھیے کہ اگر آپ کسی لڑکی یا خاتون کے ساتھ تنہا ہیں تو اس تنہائی کا "ناجائز" فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ ناجائز سے مراد یہ ہے کہ خاتون کی خواہش اور رضامندی کے بغیر اگر آپ کچھ کرنا چاہیں گے تو یہ ناجائز تصور کیا جائے گا۔ آپ نے بھی ایسے واقعات پڑھے اور سنے

ہوں گے کہ کسی صاحب نے جوش جذبات میں آکر خاتون کے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف دست درازی کرنی چاہی اور جیل پہنچ گئے۔ اسے آپ مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کہہ لیجئے یا انسانی حقوق کی پاسداری۔ دراصل امریکا اس لحاظ سے ایک مثالی ملک ہے کہ وہاں پر انسان کے حقوق یکساں ہیں اور یکساں کا مطلب واقعی یکساں ہیں۔ ہم تو رات دن "اسلامی مساوات" کے گن گاتے رہتے ہیں مگر حقیقت کیا ہے وہ آپ بھی جانتے ہیں اور ہمیں بھی معلوم ہے مگر جن لوگوں کو ہم کافر کہتے ہیں وہ انسانی حقوق کے معاملے میں واقعی مساوات کے قائل ہیں اور محض یہ زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ اس پر سو فیصد عمل بھی کرتے ہیں۔ اس کی مثالیں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہیں گی۔

لوسی کے علاوہ ہمارا واسطہ ایک اور خاتون ریالٹر سے بھی پڑا تھا۔ ان کا نام تھا جوزفین۔

"بہت تاریخی نام ہے" ہم نے تعارف کے بعد ان سے عرض کیا۔

"تاریخی۔ وہ کس طرح؟" ان کے سوال پر ہم سمجھے کہ غالباً تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی ہیں۔

"آپ کو معلوم ہو گا کہ نپولین کی محبوبہ کا یہی نام تھا!"

"واقعی!" انہوں نے حیران ہو کر کہا "مجھے پتا نہیں تھا۔ واقعی پھر تو میرا نام کافی اہم ہے۔"

امریکیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنی غلطی اور لاعلمی کا فوراً اعتراف کر لیتے ہیں۔ جوزفین کافی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ کالج میں پڑھی ہوئی تھیں۔ مختلف جگہوں پر کام کر چکی تھیں اور اب ایک ادارے میں کام کر رہی تھیں۔ ایک کامیاب ریالٹر تھیں اور لاکھوں کروڑوں ڈالر کی جائداد خرید و فروخت کرا چکی تھیں مگر جہالت ملاحظہ فرمائیے کہ اپنے نام کی تاریخی حیثیت سے ناواقف تھیں اور بڑی سادگی سے اس کا اعتراف بھی فرما رہی تھیں۔

جوزفین تیس پینتیس سالہ خاتون تھیں۔ یہ عمر تو امریکا میں "نوجوانی" کی ہوتی ہے۔ اس لیے نہایت اسمارٹ اور پرکشش تھیں۔ شکل و صورت اللہ نے اچھی بنا دی تھی۔ امریکا کی کافی خاک چھاننے کے بعد ہم ایک نتیجے پر پہنچے ہیں۔ پاکستان کی خاک چھاننے کے بعد بھی ہم ایک نتیجے پر پہنچ چکے ہیں وہ یہ کہ جس طرح پاکستان میں انگلش میڈیم سکول

چلانے والی خواتین کا خوش شکل، اسمارٹ اور فیشن ایبل ہونا ضروری ہے اسی طرح امریکا میں کاروبار اور ملازمت کرنیوالی بیشتر خواتین بھی ان ہی صفات کی حامل ہوتی ہیں۔ اب خدا جانے یہ اتفاق ہے یا اس کے لیے خصوصی اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ اچھی شکل و صورت رکھنے والی خواتین ہی پاکستان میں انگلش میڈیم سکول چلاتی ہیں۔ اور امریکا میں کاروبار۔

جوزفین کو بھی ہم نے بذریعہ ٹیلی فون دریافت کیا تھا۔ ظاہر ہے ہمیں بزنس کی تلاش تھی۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ہم ایک بار مختصر قیام کے بعد امریکا سے واپس آنے کے بعد دوبارہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر امریکا پہنچے تھے۔ اور مختلف ریالٹرز کو فون کر رہے تھے۔ جب چھ سات فون کر چکے تھے تو لبنیٰ نے ریسیور ہمارے ہاتھ سے لے لیا بلکہ قریب قریب چھین ہی لیا۔ ہم نے گھورا تو کہا "کچھ صبر کا مادہ بھی اپنے اندر پیدا کیجئے۔"

"کیا مطلب!"

"مطلب یہ کہ جن لوگوں سے فون پر بات کر چکے ہیں پہلے انہیں تو خدمت کا موقع دیجئے۔ کیا آپ امریکا کے سارے ریالٹرز کو ایک ہی وقت میں آزمانا چاہتے ہیں؟"

کوئی شک نہیں کہ بات انتہائی معقول تھی۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ ہماری بیوی کے منہ سے نکلی تھی مگر دانا تو پہلے ہی فرما گئے ہیں کہ یہ دیکھو کہ کیا کہا گیا ہے، یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے؟ لہٰذا ہم نے مزید فون کرنے سے پرہیز کیا۔ ہمارے وہم و گمان تک میں نہ تھا کہ وہ چھ سات فون ہی چھ سات سو فونوں پر بھاری تھے کیونکہ وہ فون ہم نے امریکا میں کیے تھے اور فون وصول کرنے والے ریالٹرز تھے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ مرد تھے یا خواتین۔ ان سب کی قوت کار، قوت ارادی اور بے وقوف بنانے کی صلاحیت ایک جیسی تھی۔ بہرحال، ہم پر جو گزری اور جیسی گزری وہ تو گزری، اس وقت ہم محض جوزفین کے تذکرے پر ہی اکتفا کریں گے۔

یہ تو شاید ہم بتا ہی چکے ہیں کہ وہ ایک خوش ادا، خوش شکل، خوش نوا، خوش مزاج اور ہر وقت خوش و خرم رہنے والی لڑکی تھی۔ اس کی عمر بھی ہم بتا چکے ہیں مگر آپ اسے پھر بھی نوجوان لڑکی ہی سمجھئے کہ امریکا کے اخلاق و آداب کا یہی تقاضا ہے۔ جوزفین ایک بھونچال کی طرح ہماری زندگی میں داخل ہوئی تھی اور جب تک ہماری زندگی میں شامل رہی، طوفان کی

مانند گرجتی، چمکتی اور برستی رہی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس نے ہمیں درجنوں سیکڑوں (مگر یہ تھوڑا سا مبالغہ ہو گا) بزنس اور گھر دکھائے۔ وہ یوں کہ اس وقت ہم عارضی طور پر اکمل علیمی صاحب کے "ہیلٹونین ولا" میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمیں زیادہ احساس نہیں تھا۔ ہمیں یہ احساس دلانے والی دو ہستیاں تھیں۔ ایک لبنیٰ اور جوزفین۔

پہلے تو لبنیٰ نے ایک دن کافی کا گرما گرم مگ پیش کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا "سنئے، اگر آپ نے امریکا میں کچھ عرصہ رہنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ آپ دوسروں کے گھر میں ہی رہیں۔"

"کیا مطلب؟" ہم نے پوچھا اور لبنیٰ نے منہ پھیر کر مسکرانا شروع کر دیا۔

لبنیٰ کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ "کیا مطلب" اگر ہمارا تکیہ کلام نہیں تو اس کے پاس کی کوئی چیز ضرور ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ ہم سے جو بھی بات کرتی ہیں ہمارا سوال یہی ہوتا ہے کہ "کیا مطلب؟" اس کے بعد ہم ان کی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد خود ہی کوئی اور مناسب جواب تلاش کر لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ہم "کیا مطلب" کہتے ہیں تو ہماری بچیاں بھی منہ جھکا کر چپکے چپکے مسکرانے لگتی ہیں۔ دیکھ لیا آپ نے کہ مائیں کس طرح باپ کے خلاف بچیوں کا برین واش کرتی ہیں؟

خیر، لبنیٰ کے ساتھ اس موضوع پر بالآخر ہم نے تبادلہ خیال کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ کوئی نہ کوئی "اپنا" ٹھکانا بھی تلاش کرنا چاہیے۔

ہم نے جب علیمی صاحب سے یہ بات کی تو وہ مسکرانے لگے۔ مگر سر جھکا کر نہیں اٹھا کر۔

"یار مسکرانے کی کیا بات ہے؟"

بولے "آفاقی صاحب۔ یہ امریکا ہے۔"

"وہ تو ہمیں بھی معلوم ہے۔"

"بھائی، پہلے آپ بزنس تو خرید لیجئے۔ اس کے بعد گھر بھی ڈھونڈ لیں۔"

ہم ان کی شکل دیکھنے لگے۔

"یہاں فاصلے بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جہاں کام یا

کرتے ہوں، رہائش بھی اس کے نزدیک ہی ڈھونڈیں۔ اب آپ کو پہلے بزنس تلاش کرنا ہے، دوسرا مرحلہ مکان کا ہو گا۔"

واقعی صاحب، ہم تو علیمی صاحب کو مان گئے۔ کس قدر سادگی اور آسانی سے انہوں نے اتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ جب کہ ہماری بیگم نے اس بات پر صرف "مسکرانا" ضروری خیال کیا تھا۔ بیگمات میں اور عقلمند دوستوں میں یہی باریک سا فرق ہوتا ہے۔

ہمیں مکان کی طرف متوجہ کرنے والی دوسری ہستی جوزفین تھی۔

ایک روز ہم دو ریستوران، ایک گفٹ شاپ، ایک گروسری شاپ اور ایک عدد جوتوں کی دکان دیکھنے کے بعد بے نیل و مرام واپس لوٹ رہے تھے کہ جوزفین نے کہا "علی ......" (اس بات پر حیران نہ ہوں، نہ پریشان ہوں۔ بتایا تو ہے کہ امریکا میں لوگ بے تکلفی سے پہلے نام یا عرفیت سے پکارنا پسند کرتے ہیں بلکہ یہ ان کی عادت ہے) "علی" اس نے کہا "کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم کوئی رہائش گاہ بھی ساتھ ساتھ تلاش کرتے رہو؟"

ہم نے اس کے سامنے طوطے کی طرح اکمل علیمی کا سکھایا ہوا سبق دہرایا "تم تو جانتی ہو جوزفین کہ یہ امریکا ہے؟" ہم نے کہا۔

اس نے ہمیں پریشان ہو کر دیکھا۔ ظاہر ہے بات ہی ایسی تھی۔ یعنی امریکا میں زندگی گزارنے والی ایک خاتون کو جمعہ جمعہ آٹھ دن پہلے امریکا آنے والا ایک شخص یہ بتا رہا تھا کہ "یہ امریکا ہے!"

"ہمارا مطلب یہ ہے کہ یہاں فاصلے بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لیے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں ان کا کام یا کاروبار ہو، گھر بھی اس کے آس پاس ہی مل جائے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر مکان بھی قرعہ اندازی میں تو نہیں ملتے۔ میرا مطلب ہے کہ مختلف علاقوں میں اچھے اور موزوں مکان تلاش تو کرنے چاہئیں پھر جہاں بزنس ہو گا وہیں مکان بھی لے لینا۔"

واقعی، بات تو نہایت معقول تھی۔

"اور تم کہتے ہو کہ ورجینیا میں ہی بزنس لینا پسند کرو گے۔ وہ بھی ایسے علاقوں میں جہاں کالے نہ ہوں؟"

ہم صفائی میں یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ دراصل کالوں سے ہمیں ڈر لگتا ہے مگر پھر سوچا

کہ ایک گندمی آدمی کا ایک گوری لڑکی کو یہ بتانا کہ اسے کالوں سے ڈر لگتا ہے بڑی احمقانہ
سی بات ہو گی۔ یقین جانئے کہ کالوں کے خلاف ہمارے دل میں کوئی بغض یا تعصب نہیں
ہے لیکن امریکا جا کر ان کے بارے میں جو کچھ سنا اور تھوڑا بہت دیکھا۔ اس نے ہمیں
خوف زدہ کر دیا بلکہ، ہمیں تو امریکی گوروں پر ترس آتا ہے جو اپنے آئین کے مطابق کالوں
کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور انہیں مساوی درجہ بھی دیتے ہیں۔ کیسے دیتے ہیں اور کس
طرح دیتے ہیں؟ یہ بات الگ ہے۔ لیکن عام زندگی میں وہ کالوں سے کوئی امتیاز روا نہیں
رکھ سکتے ورنہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔ وہ کالوں کو نوکری، بزنس یا مکان دینے سے انکار
نہیں کر سکتے البتہ کوئی معقول بہانہ ضرور بنا سکتے ہیں۔ وہ سرکاری دفتروں میں آبادی کے
تناسب سے کالوں کو ملازم رکھنے کے پابند ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بھارت کے برہمنوں سے
بدرجہا بہتر ہیں جو ۲۱ کروڑ اچھوتوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے
کہ اب اسکولوں میں کالے بچے آزادانہ داخل ہوتے ہیں اور اپنے رسم و رواج، عادات،
تلفظ گورے بچوں کو بھی سکھا دیتے ہیں کیونکہ بچے بہت جلد اثر قبول کرتے ہیں۔ واشنگٹن
ڈی سی کہنے کو امریکا کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر میں کالوں کی آبادی شرفیصد کے قریب ہے
اس لیے اسکولوں میں بھی بچوں کا یہی تناسب ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ گورے بچے جتنی دیر
کالے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، ان کی عادتیں اور انداز گفتگو سیکھتے رہتے ہیں، جو گوروں
کے مقابلے میں کافی مختلف ہیں۔ بڑے بڑے امریکی حکام، سینیٹرز، کانگریس کے ممبر، سب
کے بچے ان اسکولوں میں ہی پڑھنے کے لیے جاتے ہیں اور وہاں سے کالوں کا طرز حیات سیکھ
کر واپس آتے ہیں۔

ایک امریکی نے فریاد کے انداز میں ہم سے کہا تھا "کیا بتائیں ہمارے بچوں کی
زبان بالکل خراب ہو گئی ہے مگر کچھ نہیں کر سکتے۔"

بھئی وہ امریکا ہے جہاں تمام ایلیمنٹری اسکول سرکاری ہیں۔ پاکستان تو ہے نہیں کہ جہاں
ہر درجے کے لوگوں کے لیے مختلف قسم کے سکول ہیں۔

انگلش میڈیم سکول، ان میں بھی درجہ اول، دوئم اور سوئم ہوتے ہیں۔ پھر سرکاری
یعنی کمیٹی کے اسکول جہاں کوئی بھی اپنے بچے کو بھیجنا گوارا نہیں کرتا مگر اکثریت وہیں پڑھ
جاتی ہے۔ یعنی آپ اپنی حیثیت کے مطابق اپنے بچے کے لیے اسکول منتخب کر سکتے ہیں مگر

غریب امریکیوں کو یہ حق بھی نہیں ہے۔ ایسی اور بھی بہت سی باتیں ہیں جنہیں دیکھ کر
خیال آتا ہے کہ "خاک سپرپاور" ہے۔ کسی کو خصوصی امتیاز ہی حاصل نہیں ہے۔ محمود ایاز
سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔

اس پر یاد آیا کہ امریکا میں ہم نے دیکھا کہ سب سے بڑا "وی آئی پی" اسکول جانے
والا بچہ ہوتا ہے۔ وہاں اسکول بس کو امریکی صدر کی کار سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ پہلی
بات تو یہ ہے کہ اتنی بڑی سپرپاور کے انتہائی طاقتور صدر کی کار کے آگے پیچھے سائرن
بجانے والوں کی فوج نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس بے چارے کے لیے سڑکوں پر ٹریفک روکا جاتا
ہے۔ جیسے دوسرے سفر کرتے ہیں اسی طرح صدر صاحب کی کار بھی ہوتی ہے۔ مخصوص
حالات کے علاوہ کئی بار تو صدر کی کار کو ٹریفک سگنل پر بھی رکنا پڑتا ہے۔

اس کے مقابلے میں اسکول بس کے ٹھاٹ ملاحظہ فرمائیں۔ اسکول بس جب تک
اسکول میں کھڑی ہے اس وقت تک تو بس ایک بس ہی ہے۔ لیکن جوں ہی وہ اسکول سے
باہر نکلتی ہے اہم ترین وی آئی پی سواری بن جاتی ہے۔ سارے امریکا میں اسکولوں کی
عمارتوں کی طرح سب اسکول بسیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہی رنگ و روغن، وہی شکل
وصورت، خوب صورت، آرام دہ، کشادہ اور مکمل ائرکنڈیشنڈ۔ اس پر نمایاں حروف میں
لکھا ہوتا ہے۔ "اسکول بس" یعنی اگر آپ رنگ و نقشے سے نہیں پہچانتے تو لکھا ہوا پڑھ
لیں۔ یہ پڑھنا آپ کے لیے لازمی ہے۔ وہ یوں کہ "اسکول بس" کو امریکا میں بہت مراعات
حاصل ہوتی ہیں۔ جب اسکول بس رک جائے تو زمانہ تھم جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ جس
طرف وہ بس جا رہی ہے اس کے پیچھے تو سارا ٹریفک رک ہی جاتا ہے مگر سامنے سے آنے
والا ٹریفک بھی ساکت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور جب تک اسکول بس حرکت میں نہیں آتی کیا
مجال جو کوئی کار حرکت بھی کرے۔ یہ بات امریکا میں ہر ڈرائیور کو ذہن نشین کرا دی جاتی
ہے۔ جب کوئی لائسنس حاصل کرنے جاتا ہے تو منجملہ دیگر سوالوں کے اس سے اسکول بس
کے بارے میں بھی سوالات کیے جاتے ہیں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر بھاری جرمانے
عائد کیے جاتے ہیں۔ اور امریکا میں کوئی شخص تحریری اور عملی امتحان دیے بغیر لائسنس
حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ قصہ بھی آپ کو سنائیں گے۔ اب ذرا یہ مذاق ملاحظہ فرمائیے کہ
ایک جگہ اسکول بس کھڑی ہے اور اس میں سے بچے نکل رہے ہیں یا اس میں سوار ہو

رہے ہیں اور پوری سڑک پر یہاں سے وہاں تک تمام سواریاں دم سادھے کھڑی ہیں۔ ہمیں دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر یقین ہے کہ ایسے موقع پر صدر صاحب کی کار بھی رک جاتی ہو گی۔ اس لیے کہ وہاں قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ کمزور کے لیے تو قانون سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد مختلف درجات اور حیثیتوں والے اپنی حیثیت کے مطابق قانون توڑنے کے حقدار ہیں بلکہ یہ ان کا استحقاق ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہم نے جوزفین کو پوری وضاحت سے ذہن نشین کرا دیا کہ خدا کی بندی، اگر ہم کالوں کے علاقے سے پناہ مانگ رہے ہیں تو اس کا سبب ان لوگوں کی جلد کی رنگت نہیں ہے بلکہ ان کے اطوار و عادات ہیں۔

اس نے کہا "بہرحال، تم ورجینیا میں ہی بزنس لینا چاہتے ہو تو ظاہر ہے کہ مکان بھی یہیں ہو گا؟"

ہم نے کہا "وہ تو ہے۔"

"تو پھر بہتر ہے کہ ہم بزنس کے ساتھ ساتھ مکان بھی تلاش کرتے رہیں تاکہ عین وقت پر مشکل نہ ہو۔"

"بالکل درست کہا تم نے۔"

بس! یہ الفاظ کہہ کر ہم ایک بہت بڑی آفت سے دوچار ہو گئے۔ اس خاتون نے ہمیں بزنس کے ساتھ ساتھ گھر بھی دکھانے شروع کر دیے اور ہماری زندگی کے بہت سے قیمتی ایام اس مشقت کی نذر ہو گئے۔ صبح، دوپہر شام، رات کوئی بھی وقت ہو یا تو جوزفین خود آجاتی تھی یا اس کا ٹیلی فون آجاتا تھا۔ اس تلاش میں ہماری بیگم بھی ہمارے شانہ بشانہ ہوتی تھیں۔ اس لیے کہ گھر تو بیوی کی پسند کے بغیر لیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ لبنیٰ اور جوزفین بھی اچھی سہیلیاں ہو گئیں۔ ہم تینوں زیادہ وقت ایک ساتھ گزارتے تھے۔ کار کبھی ہماری ہوتی تھی، کبھی جوزفین کی مگر کھانے پینے کے اخراجات ہمیشہ ہمارے ذمے ہوا کرتے تھے۔ وہ اللہ کی بندی یا تو کچھ کھانے پینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی تھی یا پھر ہم اپنی جیب سے اس کا بل بھی ادا کرتے تھے۔ اس نے اگر کبھی بل ادا بھی کیا تو صرف اپنا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنی اس حرکت پر اسے ذرا سی بھی شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔

جوزفین ہر نئے بزنس اور گھر کے بارے میں ہمیں یوں بتاتی جیسے اس سے بہتر کوئی اور پروپوزل ہمیں مل ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ان تھک عورت تھی۔ اس کے پھیروں سے ہم تھک گئے تھے مگر اس پر کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا۔ جب کرسمس کا موسم آیا تو وہ کرسمس کیک لے کر آگئی۔ نیو ائر پر اس نے ہمیں نیو ائر کیک بڑے اہتمام کے ساتھ پہنچایا۔ اس نے اتنی یکسوئی اور خلوص کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا کہ ایک دن جب ہم اس کے دکھائے ہوئے ایک ٹاؤن ہاؤس کو مسترد کر چکے تھے اور وہ ہمیں اپنی کار میں واپس علیمی صاحب کے گھر چھوڑنے جا رہی تھی تو ہم نے ندامت کے ساتھ لبنیٰ سے کہا "یہ بے چاری اپنی کوشش کر رہی ہے۔ ہم ہیں کہ اس کی بتائی ہوئی کسی چیز کو پسند نہیں کرتے۔ مجھے تو اب انکار کرتے ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

لبنیٰ نے سنجیدگی سے کہا "اب تو ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے؟"

"وہ کیا؟" ہم نے خوش ہو کر پوچھا۔

"وہ یہ کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔"

"یہ کیا مذاق ہے؟"

"مذاق نہیں ہے۔ اس نے آپ کو اتنے ڈھیر سارے پروپوزل دیے ہیں۔ ایک آپ بھی دے کر دیکھ لیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ امریکا ہے، یہاں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔"

"یہ بہت چالاک ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی ترکیب نکال لے گی۔ بھئی آپ اس سے بات تو کریں۔"

جوزفین کار چلاتے ہوئے ہماری بات سن رہی تھی جو ہم اردو میں کر رہے تھے۔ کن انکھیوں سے دیکھ کر کہنے لگی "معلوم ہوتا ہے کوئی سیریس بات ہو رہی ہے؟"

ہم نے اچانک پوچھا "جوزفین۔ تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"

وہ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگی شاید اس اچانک سوال کی اسے توقع نہیں تھی۔ بولی "اس اچانک سوال کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

اب ہمارے بوکھلانے کی باری تھی، ہم نے کہا "بس ایسے ہی خیال آگیا۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ میں نے شادی نہیں کی؟"

"تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔"

وہ ہنسنے لگی "تمہارا کیا خیال ہے کہ ہر ملنے والے کو بتاتی رہوں کہ میں شادی شدہ ہوں؟"

"بات تو ٹھیک ہے" ہم نے شرمندہ ہو کر کہا۔

کہنے لگی "میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے ہیں۔ ایک پانچ سال کا اور دوسرا تین سال کا۔ میرے شوہر اکاؤنٹنٹ ہیں اور ہماری دو سال پہلے شادی ہوئی ہے۔"

ہم سمجھے کہ شاید ہمارے سننے میں غلطی ہوئی ہے "کتنے سال ہوئے ہیں تمہاری شادی کو؟"

"دو سال۔"

"مگر تمہارے بچے تو......"

وہ ہنسنے لگی "وہ میرے پہلے شوہروں کے ہیں۔"

"اچھا! خوب!"

"میں پہلے دو شادیاں کر چکی ہوں پھر ہماری طلاق ہو گئی۔"

"بہت خوب" اس کے سوا ہم اور کیا کہتے؟

لبنیٰ نے چپکے سے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ امید رکھی جا سکتی ہے۔"

جوزفین اگلے دن ہمیں ایک اپارٹمنٹ دکھانے لے گئی۔ یہ واشنگٹن ڈی سی اور ورجینیا کی سرحد پر ایک سات منزلہ خوب صورت عمارت تھی۔ بہت اچھی جگہ تھی۔ آس پاس شاپنگ سینٹر بھی تھے۔ جو ایک اضافی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ یہ اپارٹمنٹ چھٹی منزل پر تھا اور اتنا خوب صورت تھا کہ طبیعت خوش ہو گئی۔

جوزفین نے نیچے لابی سے ہی انٹر کام پر بات کر لی تھی اور اپارٹمنٹ کے مالک دروازے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ایک درمیانے قد' گٹھے ہوئے جسم کے یوروپین تھے۔ انگریزی کا لب و لہجہ اور تلفظ کچھ خراب تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہنگری کے رہنے والے ہیں' پندرہ سال سے امریکا میں ہیں اور اب امریکی ہیں۔ کسی فرم میں انجینئر تھے۔ اپارٹمنٹ کے اندر قدم رکھا تو وہیں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ یہ ایک انتہائی خوب صورت فلیٹ تھا۔ در و دیوار' پردے' فرنیچر' قالین سب کچھ آف وہائٹ تھا اور انتہائی بھلا لگ رہا تھا۔ گیلری اور ڈرائنگ روم کی دیواروں پر بہت خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ سجاوٹ بہت نفیس اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ جوزفین نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا کہ وہ اپارٹمنٹ بے حد خوب صورت ہے۔ ضرور پسند آجائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ یہ تین بیڈ روم کا اپارٹمنٹ تھا۔ چھت کے اوپر ایک بہت بڑا ہال تھا۔ جس کے چاروں طرف کی دیواریں شیشے کی تھیں۔ یہ بھی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ جوزفین نے بتایا کہ یہ کامن ہال ہے۔ عمارت میں رہنے والا کوئی بھی شخص یہاں تقریب منا سکتا ہے۔ اس کے لیے پیشگی اطلاع دینی ضروری ہوتی ہے۔ کھانا وغیرہ اپنا' فرنیچر اور کراکری اپارٹمنٹ والے فراہم کرتے ہیں اور اس کے عوض برائے نام کرایہ لیتے ہیں۔

مالک کا نام جیگر یا اسی قسم کا تھا۔ ان کی بیگم کچن میں سے تشریف لائیں۔ وہ اپنے شوہر

سے زیادہ لمبی تھیں۔ بالوں سے لے کر ان کی آنکھوں تک ہر چیز کا رنگ پلاٹینیم جیسا تھا وہ مسکراتی تھیں تو دونوں رخسار پر بہت خوب صورت گڑھے پڑتے تھے۔

"یہ میری بیوی ہے۔ غرضی۔"

"یہ بھلا کیا نام ہوا؟" لیلیٰ نے اردو میں کہا۔

"بھئی ہو گا کوئی مطلب۔ تمہارا نام بھی تو لیلیٰ ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

"میری بیوی بھی ہنگری کی ہے اور یہ بھی انجینئر ہے۔ ہم دونوں ایک ہی فرم میں کام کرتے ہیں اس کا عہدہ مجھ سے بڑا ہے۔"

یہ خاتون کچن سے آرہی تھیں مگر جھوٹے منہ بھی کھانے پینے کے لیے نہیں پوچھا مگر خاصی ہنس مکھ تھیں۔ دونوں میاں بیوی باتونی اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ ہم ان کے اپارٹمنٹ کی ایک ایک چیز کی تعریف کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا "یہ اپارٹمنٹ ہم نے بہت مان سے سجایا ہے۔ قالین اور فرنیچر کو بچانے کے لیے کوئی کتا اور بلی تک نہیں رکھی۔"

"اور بچے!"

وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے "بچے بھی نہیں ہیں۔ ہم دونوں بچے پیدا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔"

ہم نے ان سے کہا کہ یہ اپارٹمنٹ تو ہمارا ہو گیا مگر آپ یہ خوب صورت لیمپ، صوفے اور دوسرا سامان کہاں لے کر جائیں گے۔ یہیں چھوڑ دیں۔ ہم انہیں بہت سنبھال کر رکھیں گے بلکہ یہ تصویریں بھی یوں ہی لگی رہنے دیں۔

غرضی ہنسنے لگی۔ جیگر نے کہا "اس کے بعد کہو گے کہ اپنی بیوی کو بھی یہیں رہنے دیں؟"

جوزفین بولی "سوری جیگر، ایک اپارٹمنٹ میں دو بیویاں نہیں رہ سکتیں۔"

اس کے بعد قیمت اور اس کی ادائی کے بارے میں باتیں ہونے لگیں، قیمت وہ بہت زیادہ طلب کر رہے تھے "اس کی لوکیشن تو دیکھیے۔ سامنے واشنگٹن ڈی سی کی روشنیاں نظر آرہی ہیں اور دور دور تک آپ کوئی کالا نہیں دیکھیں گے۔"

"بہت پر سکون اور خوب صورت علاقہ ہے اور اپارٹمنٹ دیکھیے کتنا خوب صورت

ہے۔"

"وہ تو ہے لیکن قیمت بہت زیادہ ہے۔"

لیلیٰ نے ہمیں مشورہ دیا "زیادہ ہے تو کیا ہوا۔ آپ کون سی پوری قیمت ادا کریں گے۔ ڈاؤن پیمنٹ ہی تو کریں گے۔ بعد میں جب فروخت کرنا ہو تو آپ کو بھی اچھی قیمت ملے گی۔"

مختصر یہ کہ ہم رضا مند ہو گئے۔ جوزفین نے مشورہ دیا کہ دو تین دن کے اندر ہی لین دین ہو جانا چاہیے۔ جیگر نے ہمیں بتایا کہ پرسوں صدر ریگن کی صدارت کی افتتاحی تقریب کے سلسلے میں آتش بازی بھی ہے۔ آپ پرسوں شام ہماری چھت پر سے آتش بازی دیکھیں۔ واشنگٹن ڈی سی بالکل سامنے ہی تو نظر آتا ہے۔"

اتنے خلوص اور محبت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود دونوں میاں بیوی نے ہم سے ایک بار بھی چائے کافی کے لیے جھوٹے منہ تک نہ پوچھا۔

واپسی پر جوزفین نے ہمیں مبارک باد دی کہ آپ نے بہت اچھا سودا کیا ہے۔ گھر کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب واشنگٹن ڈی سی میں آپ کو ایک اچھا سا بزنس بھی خرید کر دے دوں گی۔ یہ انہوں نے اس طرح کہا جیسے کہ اپنی جیب خاص سے خرید کر ہمیں تحفے کے طور پر پیش کریں گی۔

لیلیٰ نے پوچھا "یہ لوگ اپنی پینٹنگز ہمیں دے کر جائیں گے یا نہیں؟"

"پتا نہیں۔"

"سنئے اگر وہ ہمیں تصویریں نہیں دیں گے تو ہم اپارٹمنٹ بھی نہیں لیں گے۔"

ہم بلا وجہ کی اس جھگڑا لو بات پر حیران رہ گئے۔ یعنی انہیں کسی بات پر اعتراض نہ تھا مگر اصرار یہ تھا کہ مالک مکان دو چار تصویریں ضرور دے کر جائے ورنہ بھاڑ میں جائے۔

اس اپارٹمنٹ کی سبھی نے تعریف کی۔ علمی صاحب کو بھی یہ جگہ اور عمارت پسند تھی اور نغمی صاحب کو بھی۔ نغمی صاحب کا دفتر تو وہاں سے بالکل ہی نزدیک تھا۔ بمشکل ایک میل دور ہو گا۔ امریکا میں یہ فاصلہ ایسا ہے جیسے کہ آپ کا پچھواڑہ۔

تیسرے دن ہم سر شام ہی سے مسٹر جیگر کے پاس پہنچ گئے۔ جوزفین ہمارے ساتھ نہیں تھی کیونکہ اس خوشی کے موقع پر اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ "ڈیٹ" رکھی

ہوئی تھی۔

"دوست کے ساتھ؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا "یعنی بوائے فرینڈ۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"مگر جوزفین، تم نے تو کہا تھا کہ تم شادی شدہ ہو اور تمہارا شوہر تمہارے ساتھ ہے؟"

"دراصل یہ ایک کاروباری ڈیٹ ہے۔ یہ شخص میرا بوائے فرینڈ ضرور ہے مگر میرا کلائنٹ بھی ہے۔ اس نے میرے ذریعے کئی اچھے سودے کیے ہیں۔ اس لیے میرے شوہر کو کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔"

"تو اسی قومی جشن کے موقع پر تمہارا شوہر بے چارہ گھر پر بے بی سٹنگ کرے گا؟"

"بالکل نہیں، اس کی بھی ایک ڈیٹ ہے۔ دراصل ہم دونوں نے حالات کے مطابق ایڈجسٹمنٹ کیا ہوا ہے۔ اگر ہم ویک اینڈ ساتھ نہیں گزار سکتے تو کبھی بور نہیں ہوتے۔ میرا ہزبینڈ بہت سوشل بندہ ہے۔ عورتوں میں بہت مقبول ہے۔"

"اور تم مردوں میں؟" ہم نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"مگر بچوں کا کیا ہو گا؟"

"وہ اپنی دادی کے پاس رہیں گے۔"

یہ فائدہ ہوتا ہے دادی نانی کا امریکا میں۔ ایسے موقعوں پر ہی یہ بڑی بوڑھیاں یاد آتی ہیں ورنہ انہیں ٹیلی فون اور کرسمس کارڈ سے ہی بہلا دیا جاتا ہے۔

جیگر اور اس کی بیوی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اس لیے نہیں کہ ہم ان کا اپارٹمنٹ خریدنے والے تھے بلکہ اس لیے کہ ان کے ملک کا نیا صدر رسمی طور پر اپنا عہدہ سنبھال رہا تھا۔ آپ جانتے ہوں گے کہ امریکا میں یوں تو دو سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ایک ری پبلکن اور دوسری ڈیموکریٹک۔ ان دونوں کے امیدواروں کا بہت زبردست مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ خوب جوش و خروش دیکھنے میں آتا ہے۔ سیاسی جلوسوں کا تو وہاں رواج نہیں ہے مگر ہمارے سیاسی جلسوں کی جگہ بہت بڑے بڑے سیاسی کنونشن منعقد ہوتے ہیں اور خوب چندہ اکٹھا ہوتا ہے۔ یہ کنونشن بھی بس میلے ٹھیلے یا تہوار کا نقشہ ہی پیش کرتے ہیں نہ ایک دوسرے کے خلاف غیض و غضب اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور نہ غصے سے منہ

میں جھاگ بھر بھر کر الزام تراشیاں کی جاتی ہیں۔ کافی دھوم دھڑاکے کے بعد ووٹ ڈالے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی ایک ہی امیدوار کامیاب ہوتا ہے۔ اب امریکیوں کی نالائقی یا سیاسی ناتجربہ کاری ملاحظہ فرمائیے کہ ادھر ٹیلی ویژن والوں نے نتائج کا اعلان شروع کیا اور ادھر ہارنے والے امیدوار نے نہ صرف شکست قبول کر لی بلکہ کامیاب ہونے والے کو مبارک باد اور مکمل تعاون کا یقین بھی دلا دیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے بعد صدر تمام امریکیوں کا صدر ہوتا ہے۔ ادھر صدر کے لیے بھی سارے ہم وطن یکساں ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ صرف اپنی جماعت کے کارکنوں اور نمائندوں کو فائدے پہنچائے جا رہے ہیں اور مخالف جماعت والوں کو نوکری تک نہیں مل رہی۔

جیگر صاحب نے صدر ریگن کو ووٹ نہیں دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی بیگم نے نہ صرف ریگن کو ووٹ دیا تھا بلکہ چندہ جمع کرنے کی غرض سے امدادی عشائیوں میں بھی شرکت کی تھی۔ مگر جوں ہی کامیاب صدر کے انتخابات کا اعلان ہوا ریگن صاحب ان دونوں کے صدر بن گئے۔ اس روز ساری امریکی قوم اپنے صدر کی تقرری کی تقریب کو ایک قومی جشن کے طور پر منا رہی تھی۔

جوزفین کی ہدایت کے مطابق ہم اپنی چیک بک بھی ساتھ لے گئے تھے تاکہ بیعانے کے طور پر جیگر کو کچھ رقم ادا کر دیں۔ اس روز کیونکہ قومی تہوار تھا اس لیے جیگر نے ہماری بہت زیادہ آؤ بھگت کی اور بلیک کافی کا ایک ایک مگ ہم دونوں کو پیش کیا۔ ہم نے بچیوں کے سامنے اس اپارٹمنٹ کی اتنی زیادہ تعریف کی تھی کہ وہ بھی اسے دیکھنے کی مشتاق تھیں چنانچہ ہم نادیہ اور پارو کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ انہیں ہر چیز پسند آ گئی۔ عمارت، اس کے آس پاس کا علاقہ، خوب صورت لابی، نہایت تیز رفتار لفٹیں۔ ہر جگہ قالین کا فرش۔ اور اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس کی ہر چیز آف وہائٹ تھی جو لڑکیوں کا پسندیدہ رنگ تھا۔ بشرطیکہ آپ اسے رنگ سمجھتے ہوں کیونکہ بعض لوگ وہائٹ اور آف وہائٹ کو رنگ نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو سفید ہے وہ تو کوئی رنگ ہی نہیں ہے۔ مخالفین کا کہنا ہے کہ سفید بھی آخر ایک رنگ ہے۔ جس طرح کہ سیاہ بھی ایک رنگ ہے۔

بہر حال، بچیاں تو فوراً لفٹ کے ذریعے بالائی منزل پر پہنچ گئیں۔ مسز جیگر ان کی

رہنمائی اور رفاقت کے لیے ان کے ہمراہ تھیں۔ ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔ جیب سے چیک بک نکالی اور جیگر سے پوچھا کہ فی الحال آپ کو کتنی رقم بیعانے کے طور پر دے دی جائے؟

جیگر کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی، کہا "مسٹر آفاقی۔ کیا یہ دونوں بچیاں آپ ہی کی ہیں؟"

ہم نے کہا "آپ کو کوئی شک ہے؟"

بولے "بالکل نہیں۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔"

ہم نے کہا "جب آپ کو شک ہی نہیں ہے تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ آپ کی دو بچیاں بھی ہیں؟"

"آپ نے پوچھا ہی نہیں تھا" ہم نے حیران ہو کر پوچھا "بات کیا ہے آخر؟"

"مسٹر آفاقی۔ بات یہ ہے کہ یہ سودا کینسل ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب! آخر اس کی وجہ؟"

"وجہ یہ ہے کہ اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں بچے نہیں رہ سکتے۔"

"تو پھر وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے شاید۔ جن لوگوں کے بچے ہوتے ہیں اس عمارت میں انہیں اپارٹمنٹ نہیں دیا جاتا۔ یہاں سب جوڑے جوڑے ہی رہتے ہیں۔ اس بلڈنگ کی انتظامیہ اور دوسرے تمام رہنے والوں کا یہی فیصلہ ہے۔"

یہ پہلا موقع تھا جب ہمیں امریکا میں یہ پتا چلا کہ وہاں ایسی عمارتیں بھی ہیں جہاں بچوں والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ امریکی ایک تو ویسے ہی اولاد پیدا کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ اب تو وہ سرے سے شادی وغیرہ کے بھی قائل نہیں رہے لیکن جب سے اچھی اچھی عمارتوں میں اس قسم کی شرائط رائج ہونے لگی ہیں تو لوگ بچوں کے اور زیادہ خلاف ہو گئے ہیں۔

ہم نے پوچھا "بھائی جیگر صاحب' یہ بتائیے کہ بچوں سے آپ کو کیا نقصان ہے جو آپ لوگوں نے اس پر پابندی لگا دی ہے؟"

بولے "دراصل اس عمارت میں بچوں کے کھیلنے کودنے کے لیے مناسب میدان اور

پارک وغیرہ نہیں ہیں۔ آخر انہیں بھی کھیلنے کے لیے کھلی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے اگر آپ نے میرا اپارٹمنٹ خرید بھی لیا تو آپ کی بچیاں بہت جلد بور ہو جائیں گی کیونکہ ان کا کوئی ہم عمر بچہ ساری عمارت میں نہیں ملے گا۔ کھیلنے کے لیے انہیں بہت دور جانا پڑے گا۔ اور پھر دوسرے رہنے والے بھی ڈسٹرب ہوں گے۔"

"دوسرے رہنے والے کیسے ڈسٹرب ہوں گے؟"

انہیں کوئی فوری جواب نہیں سوجھا پھر کہنے لگے "دیکھئے نا' ساری عمارت میں کوئی بچہ ہی نہ ہو۔ لیکن پھر اچانک دو بچے نظر آنے لگیں تو ان کا ڈسٹرب ہونا تو لازمی ہے۔"

ہم نے کہا "جیگر صاحب اگر یہی نظریہ آپ سے پہلی والی نسل بھی اپنا لیتی تو ذرا غور فرمائیے کہ آپ لوگ خود کہاں ہوتے؟"

وہ ہنسنے لگے "مسٹر آفاقی' آپ بلاوجہ جذباتی ہو رہے ہیں۔ بھئی بچے کوئی بری چیز تو نہیں ہوتے مگر بہت سے لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنا پسند نہیں کرتے۔ آپ تو جانتے ہیں یہ ایک فری کنٹری ہے۔ ہر ایک کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔"

دوسرے دن جوزفین کو ہم نے یہ بات بتائی تو وہ مسکرانے لگی اور بولی "غلطی دراصل میری ہے۔ یہ بات مجھے دریافت کر کے آپ کو بتانی چاہیے تھی۔"

مگر اس اپارٹمنٹ سے محروم رہنے کا ہمیں صدمہ ضرور ہوا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہمیں اور بھی پیش آیا تھا۔ جب ہم دوبارہ امریکا گئے اور وہاں گھر تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے تو ایک نہایت خوب صورت اپارٹمنٹ بلڈنگ دیکھ کر کشاں کشاں اندر چلے گئے۔ اس عمارت کے ارد گرد کافی بڑے لان تھے۔ عقب میں سوئمنگ پول بھی تھا۔ دیواروں میں زیادہ تر شیشے کا استعمال کیا گیا تھا۔ انتہائی شاندار اور خوب صورت عمارت تھی۔ استقبالیہ لاؤنج میں گئے تو وہ فائیو اسٹار ہوٹل کے لاؤنج سے بھی زیادہ شاندار تھا۔

ہم نے کہا "یہ عمارت واقعی رہنے کے قابل ہے۔"

نغمی صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے' بولے "مگر کرایہ بہت زیادہ ہو گا۔"

ہم نے کہا "اتنی خوب صورت جگہ پر رہنے کے لیے زیادہ خرچا کرنا بھی منظور ہے۔"

استقبالیہ پر ایک ادھیڑ عمر مگر نہایت اسمارٹ خاتون تشریف فرما تھیں۔ ان کے سامنے

قطار میں کچھ اور لوگ بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھا تو بولیں "آپ کچھ دیر انتظار فرمایئے۔ کھانے پینے سے شوق کیجیے۔ ادھر سامان موجود ہے۔"

سامنے والے گوشے میں ایک کافی طویل میز پر مختلف قسم کی شرابیں' وائن' کافی' چائے' بسکٹ' دودھ' اوولٹین' بیئر' کولڈ ڈرنکس' اسنیکس اور خدا جانے کیا کیا چیزیں نہایت نفاست سے سجی ہوئی تھیں۔ ایک دراز قد لیکن گداز جسم کی نوجوان لڑکی ویٹریس کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ ہمیں دیکھا تو مسکرائی اور ایک ایک پلیٹ اور کانٹا ہم سب کو تھما دیا' بولی "فکر نہ کریں۔ یہ سب چیزیں مفت ہیں۔"

ہم نے پوچھا "مہمانوں کے لیے؟"

بولی "جی نہیں۔ عمارت میں رہنے والوں کے لیے بھی یہ سامان ہر روز فراہم کیا جاتا ہے۔"

بھئی واہ۔ ہم نے سوچا' یہ تو بڑے غضب کی جگہ ہے۔

نغمی صاحب نے کہا "لکھ کر رکھ لیجیے۔ یہ جگہ بہت مہنگی ہوگی۔"

ہم نے لڑکی سے پوچھا "اس عمارت میں کرائے پر ہی اپارٹمنٹس ملتے ہیں یا قیمتاً خریدے بھی جا سکتے ہیں؟"

کہنے لگی "جی نہیں۔ صرف کرائے پر ملتے ہیں۔"

"کتنا کرایہ ہوگا؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔ ریسپشن پر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

ہم نے کہا "یہ تو بہت اچھی اور شاندار جگہ ہے۔ کرایہ داروں کے لیے اور کون سی سہولتیں موجود ہیں؟"

بولی "پیچھے بہت بڑا اور کورڈ سوئمنگ پول ہے۔ سردی' گرمی' برفباری' ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ گالف کے میدان ہیں۔ ٹینس کورٹس ہیں۔ ڈانسنگ فلور ہے۔ ایک چھوٹا سا کلب بھی ہے جہاں تاش وغیرہ کھیلی جاتی ہے۔"

"وغیرہ سے کیا مراد ہے؟"

"تاشوں کے علاوہ دوسرے قسم کا جوا بھی وہاں کھیلا جا سکتا ہے۔"

"ان سہولتوں کے لیے فیس کتنی ادا کرنی ہوتی ہے۔"

"جی کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ لبنیٰ اور نغمی صاحب کی بھی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"دراصل کرائے پر اپارٹمنٹ لینے والوں کو یہ سہولتیں فری مل جاتی ہیں۔"

نغمی صاحب نے ہمارے کان میں کہا "یقین کیجیے یہ جگہ بے حد مہنگی ہوگی۔"

ہم نے کہا "نغمی صاحب کیا ہرج ہے۔ یہ بھی تو دیکھیے کہ عیش کتنے ہیں۔ اس ماحول میں رہنا ہی بہت بڑی آسائش ہے۔"

لڑکی نے ہمیں باہم مشورے کرتے ہوئے دیکھا تو بولی "کلب کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا سینما گھر بھی ہے جہاں ہر قسم کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔"

"وہ بھی فری؟"

مسکرا کر کہنے لگی "بالکل۔ دراصل اس عمارت میں کرائے دار بننے کے بعد اس چار دیواری کے اندر جتنی بھی سہولتیں ہیں وہ سب کی سب مفت ہیں۔"

ہم بے حد مرعوب ہوئے۔ کافی اور اسنیکس سے شغل کرنے کے بعد جب دیکھا کہ استقبالیہ والی خاتون فارغ ہو چکی ہیں تو ہم ان کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے مسکرا کر ہمیں دیکھا اور انتظار کرنے پر معذرت طلب کی۔ اس کے بعد ایک فارم ہمارے سامنے رکھ دیا۔

ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ امریکا میں ہر جگہ فارم پر کرنا لازمی امر ہے۔ مکان خریدنا ہو۔ کرائے پر حاصل کرنا ہو۔ بچوں کو داخلہ دلانا ہو۔ نوکری حاصل کرنی ہو' کاروبار شروع کرنا ہو' بینک میں حساب کھولنا ہو۔ غرضیکہ ایک مفصل فارم پر کیے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

ہم نے فارم پر ایک نظر ڈالی۔ حسب معمول تمام سوالات موجود تھے۔ نام' بزنس' بیوی کا نام' بزنس' پتا' فون نمبر' بینک اکاؤنٹ اور بینک کا نام۔ کار کا نمبر' سوشل سیکیورٹی نمبر۔ اپنا بھی اور بیوی کا بھی۔ پہلے کہاں رہتے تھے' وہاں سے کس لیے چھوڑ دیا۔ اپارٹمنٹ ٹو بیڈ روم کا درکار ہے یا ایک بیڈ روم کا وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے فارم پر کر کے ان کے سامنے رکھ دیا اور پوچھا "سنیے مس' کیا ہم میاں بیوی اور دو بچوں کے لیے دو بیڈ روم کا اپارٹمنٹ مل سکے گا۔"

انہوں نے ہمیں یوں دیکھا جیسے ہم کسی اور سیارے سے آئے ہیں "دو بچوں کے

لیے؟"

ہم نے کہا "ہاں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بعض عمارتوں میں یہ پابندی ہے کہ جتنے بچے ہوں، اتنے ہی بیڈ روم بھی لازماً ہوں۔

بولیں "آپ کو کس نے بتایا ہے کہ ہم بچوں کو بھی رکھتے ہیں؟ مجھے افسوس ہے مگر اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں بچے نہیں رہ سکتے۔"

نغمی صاحب کو یہ بات اچھی نہیں لگی، کہنے لگے "آخر آپ امریکیوں کو بچوں سے اتنی نفرت کیوں ہے؟ بچے تو اس کائنات کا حسن ہیں، پھولوں سے زیادہ نازک اور خوب صورت چیز ہیں۔ ذرا یہ سوچیے کہ اگر دنیا میں حضرت آدم کے دور ہی سے بچے رکھنے پر پابندی لگ جاتی تو ہم اور آپ کہاں ہوتے؟"

نغمی صاحب کی طویل تقریر دل پذیر کے جواب میں وہ خاتون ایک بار پھر مسکرائیں اور بولیں "سوری سر، یہ فلسفہ میری سمجھ سے بالا تر ہے۔ میں تو صرف یہاں جاب کرتی ہوں۔ جو ضوابط بنا دیے گئے ہیں ان پر عمل کرنے کی پابند ہوں۔"

ہم نے واپس لوٹتے ہوئے ان سے دریافت کیا "ویسے۔ بائی دی وے۔ آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

وہ مسکرائیں اور بولیں "میں نے شادی ہی نہیں کی۔ شادی اور بچے میرے نزدیک غیر قدرتی اور غیر ضروری چیزیں ہیں۔"

لیجیے۔ گویا لنکا میں سبھی باون گز کے ہیں۔

ایک دن صبح سویرے جوزفین گہرے سرخ رنگ کے لباس میں بیر بہوٹی بن کر آگئیں۔

"بس فوراً میرے ساتھ چلیں۔"

"مگر کہاں؟"

"بہترین ٹاؤن ہاؤس تلاش کیا ہے آپ کے لیے اور قیمت نہ ہونے کے برابر۔"

سچ تو یہ ہے کہ ہم اب جوزفین، مسٹر ایڈا اور دوسرے ریالٹرز کی باتیں سن سن کر تنگ آگئے تھے مگر جب ایک خوش شکل عورت، ڈریس اپ ہو کر سویرے آپ کے گھر آجائے اور فوری طور پر ساتھ چلنے کی فرمائش کرے تو آپ کیا کریں گے! چنانچہ ہم نے وہی کیا جو آپ کریں گے۔ یعنی جوزفین کے ساتھ چل پڑے۔

"یہ ٹاؤن ہاؤس ہے کہاں؟" ہم نے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو۔ یوں سمجھو کہ جنت میں ہے۔ اگر سچ مچ جنت نہیں ہے تو پھر جنت سے پہلے والا اسٹاپ سمجھ لو۔"

علمی صاحب کے گھر سے نکل کر ہم باہر والی بڑی سڑک پر پہنچ گئے اور بجائے دائیں طرف مڑنے کے جوزفین نے بائیں جانب رخ کر لیا۔ یعنی واشنگٹن ڈی سی کے بالکل مخالف سمت کی جانب چل پڑی۔

"یہ ٹاؤن ہاؤس بالکل نیا نیا بنا ہے بلکہ ابھی تو آس پاس کے پورے مکان مکمل طور پر تعمیر بھی نہیں ہوئے۔ یہ بالکل نئی آبادی ہے اس لیے مکان کی قیمت اتنی کم ہے کہ یقین نہیں آتا۔"

"مگر جوزفین! اس طرح تو ہم واشنگٹن ڈی سی سے اور بھی دور ہو جائیں گے۔"

"علی، بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ تمہیں واشنگٹن ڈی سی جا کر کیا کرنا ہے؟ وہائٹ ہاؤس میں تو تم کوئی جاب نہیں کرو گے نا۔"

"مگر کوئی بزنس ......" ہم نے کہنے کی کوشش کی۔

"ارے بزنس صرف واشنگٹن ہی میں تو نہیں ملتا۔ اتنی بڑی ریاست ورجینیا پڑی ہے۔ جب تم گھر یہاں خریدو گے تو ظاہر ہے کہ پھر بزنس بھی اس کے نزدیک ہی تلاش کرو گے۔ یہاں بہت اچھا کاروبار دلا دوں گی تمہیں۔"

ہمارے لیے تو واشنگٹن ڈی سی اور ورجینیا دونوں ایک جیسے تھے۔ سوچا کہ بات معقول ہے۔

نصف گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم بڑی سڑک چھوڑ کر ایک رہائشی آبادی میں داخل ہو گئے "جوزفین یہ جگہ تو بہت دور ہے۔"

"امریکا میں فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے اور پھر میں تمہیں آس پاس ہی کسی اچھے شاپنگ پلازا میں بہت اچھا سا بزنس بھی دلا دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ہے نا؟" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ ہماری طرف بڑھا دیا۔ ہم نے کن انکھیوں سے پچھلی سیٹ پر تشریف فرما نغمی کو دیکھا اور پھر یہ سوچ کر جوزفین کا ہاتھ تھام لیا کہ بھئی، آخر بزنس تو بزنس ہی ہوتا ہے۔ ہمارا دل بالکل صاف ہے تو پھر ڈر کس بات کا؟"

یہ آبادی ابھی زیر تعمیر تھی۔ امریکا (اور کینیڈا میں بھی) یہ دستور ہے کہ نئی آبادی تعمیر کرنے سے پہلے سڑکیں، بجلی، پانی اور دوسری تمام سہولتوں کا بندوبست کیا جاتا ہے اس کے بعد مکانوں کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔ یہ مکان کمپنیاں بناتی ہیں۔ انفرادی طور پر کوئی بھی اپنا مکان نہیں بناتا۔ جیسا کہ ہمارے پاکستان میں ہوتا ہے کہ پلاٹ خریدا اور گھر بنانے کھڑے ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ آبادی جہاں بنائی جاتی ہے وہ زمین مہنگی ہوتی ہے۔ پھر دوسری تمام سہولتیں جنہیں ہمارے ہاں ڈویلپنگ چارجز کہا جاتا ہے' کافی مہنگی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنا روپیہ یکمشت خرچ کرنا وہاں کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ لوگ تو قرض کے عادی ہوتے ہیں۔

دنیا کی ہر چیز امریکی قرضے پر خریدتے ہیں اور پھر سالہا سال اس کی قسطیں ادا کرتے رہتے ہیں۔ ان کی گرہ سے اگر کچھ خرچ ہوتا ہے تو وہ تھوڑی بہت "ڈاؤن پیمنٹ" کی رقم ہوتی ہے۔ اس غریب قوم کی غربت کا اس بات سے اندازہ لگائیں کہ یہ تھوڑی سی نقدی بھی بیشتر امریکیوں کے پاس نہیں ہوتی اسی لیے تو بہت بڑی آبادی اپنے ذاتی گھروں میں نہیں رہتی۔ کرائے پر گزارہ کرتی ہے۔ ان کی امیری والی بات ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں ہے۔ ہر چیز قرضے پر' ہر چیز قسطوں پر اور وہ بھی سود در سود۔ بس یہ ہے کہ اس قوم کو یہودیوں نے اس کام پر لگا دیا ہے۔ کہ خوب کام کرو اور خوب خرچ کرو۔ قرضہ دینے اور سود وصول کرنے کے لیے ہم موجود ہیں۔ آبادی کے مکانات مکمل ہو جاتے ہیں تو کمپنیاں ڈاؤن پیمنٹ وصول کر کے لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیتی ہیں۔ کمپنیاں بھی کون سا اپنی گرہ سے خرچ کرتی ہیں۔ وہ بینکوں سے قرض لیتی ہیں۔ ادھر بینک والے انشورنس والوں کے کھاتے میں پیسے وصول کرتے ہیں۔ اور اسی طرح امریکا کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بالکل نئی نکور بستی تھی اور نہایت خوش صورت اور دلکش۔ ہمارے ہاں زیر تعمیر آبادیوں کو دیکھ کر الجھن ہوتی ہے مگر وہاں مکان بنانے سے پہلے آس پاس کی تمام سجاوٹ اور تعمیر مکمل کر لی جاتی ہے۔ اس لیے آبادی پر نکھار آجاتا ہے۔ رہائشی آبادیوں کے سامنے بھی فٹ پاتھ ضرور ہوتے ہیں اور سڑکیں بھی کافی کشادہ ہوتی ہیں۔ مختلف مکمل اور نامکمل مکانوں کے سامنے ریالٹرز کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ یعنی کمپنیاں انہیں فروخت کرنے کے لیے ریالٹرز کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ ان "حرکتوں" کا نتیجہ یہ ہے کہ عام آدمی پر قیمت کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے۔ مگر عام آدمی کی کون پروا کرتا ہے۔ یہ تو "سرمایہ دارانہ نظام" ہے۔ محض سرمایہ داروں کے فائدے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ عام آدمی تو ان کی "آسامی" ہے۔

ایک فٹ پاتھ کے نزدیک جوزفین نے کار روک دی ہم باہر نکلے تو ہوائی رفتار سے ایک دوشیزہ اسکیٹنگ کرتی ہوئی ہماری پاس سے گزرنے کی کوشش میں ہم سے ٹکرائی اور ہم دونوں فٹ پاتھ پر گر گئے۔ اس طرح کہ ہم اس کی آغوش میں تھے۔ شاید اسی لیے ہمیں چوٹ نہ آئی۔ چوٹ اسے بھی کوئی خاص نہیں آئی تھی۔ شاید وہ گرنے اور گرانے کی عادی تھی۔ اب منظر یہ تھا کہ ہم دونوں فٹ پاتھ پر نیم دراز تھے۔ اس طرح کہ ہمارا سر اس کی گود میں تھا اور وہ قریب قریب بیٹھنے والی پوزیشن میں تھی۔ ہماری فلموں میں ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات عام طور پر اسی انداز میں ہوتی ہے اور تماشائی بہت خوش ہوتے ہیں۔

ہم نے اٹھنے کی کوشش کی تو ہماری نگاہوں کے سامنے ایک دمکتا' دہکتا ہوا چہرہ تھا۔ بکھرے ہوئے سنہری بال اس کی پیشانی پر اور تھوڑے سے خود ہماری پیشانی پر پڑے ہوئے تھے۔ نہایت رومانی منظر تھا۔

لڑکی نے بجائے شکوہ شکایت یا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے مسکرا کر کہا ''ہائی!'' اتنے زور سے
سے کہ ہمیں اس کے تمام دانت نظر آ گئے۔ جن میں سے دو پر سونا چڑھا ہوا تھا۔
ہم نے بھی جواب میں ''ہائی!'' کہہ دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے بیک وقت اٹھنے کی
کوشش کی اور اس کوشش میں مزید خلط ملط ہو گئے۔ دیکھنے والوں کو اس اثناء میں پتا چل
گیا تھا کہ ہم دونوں میں سے قابل ذکر چوٹ کسی کو بھی نہیں آئی۔ اس لیے جوزفین اور
لبنٰی بھی ہنسنے لگیں۔ بہرحال، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سہارا دے کر اٹھایا۔ لڑکی
خاصی اسمارٹ اور قبول صورت تھی۔ جب ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے تو باقاعدہ
تعارف شروع ہوا۔

''میرا نام سوزی ڈینیئل ہے۔ وہ سامنے نکڑ والے مکان میں رہتی ہوں'' اس نے
مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

مصافحہ تو خیر ہم نے کر لیا مگر ہم سے پہلے بات چیت کا آغاز جوزفین نے کر دیا اور ہمارا
تعارف بھی کرا دیا۔ لبنٰی کی شلوار قمیص کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کے آثار پیدا
ہو گئے۔

''اوہ۔ کتنا خوب صورت لباس ہے۔ یہ کہاں کا ڈیزائن ہے پیرس کا؟''

شاید اس لیے کہ پیرس کے فیشن ہاؤس عام طور پر عجیب و غریب قسم کے ملبوسات
ایجاد کرتے رہتے ہیں جنھیں ہم نے روز مرہ کی زندگی میں کبھی کسی خاتون کو استعمال کرتے
ہوئے نہیں دیکھا۔

ہم نے اسے بتایا کہ یہ ہمارا قومی لباس ہے۔ اسے شلوار قمیص کہتے ہیں۔

اس نے حیران ہو کر لبنٰی کی قمیص کے گلے اور آستینوں کو اور پھر قمیص کی فٹنگ کو
دیکھا اور پھر ہماری طرف نظر کی، کہا ''حیرت کی بات ہے۔ کیا آپ کے ہاں مرد بھی یہی لباس
پہنتے ہیں؟''

ہم نے کہا ''ہاں۔ پہنتے تو ہیں مگر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ۔ نچلا حصہ تھوڑا سا مختلف
ہوتا ہے جب کہ بالائی حصے کی مردانہ قمیص اس سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ وہ آپ کی شرٹ
سے مشابہ ہوتی ہے مگر اس کی لمبائی کچھ زیادہ ہوتی ہے۔''

اس نے کہا ''مردوں کے بارے میں تو پتا نہیں مگر عورتوں کے لیے یہ لباس بہت

خوب صورت ہے۔''

اس تعریف و توصیف سے ہم بہت خوش ہوئے۔ سوچا کہ لبنٰی سے کہیں کہ اسے ایک
شلوار قمیص سوٹ بطور تحفہ پیش کر دیں مگر پھر ارادہ بدل دیا کیونکہ خواتین، خصوصاً بیویاں
ایسے مشوروں کا کچھ اور ہی مطلب نکالتی ہیں۔

''میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا؟'' سوزی نے کہا۔

''ہم پہلی بار آئے ہیں، مکان خریدنے کا ارادہ ہے۔''

''مکان یہاں بہت اچھے ہیں، ماننا پڑے گا۔ ماحول بھی اچھا ہے مگر دور دور تک کوئی
شاپنگ سینٹر نہیں ہے۔ نصف کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ''سیون الیون'' ہے اور بس۔ خیر، یہ
تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ سی یو۔'' وہ رخصت ہونے کے لیے پر تولنے لگی ''پھر ملاقات
ہو گی۔''

جوزفین نے کہا ''دوبارہ ملاقات میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ پہلی ملاقات جیسی
نہ ہو۔''

وہ ہنستی ہوئی، اسکیٹنگ کرتی ہوئی چلی گئی۔

جوزفین نے کہا ''علی آغاز تو بہت شاندار ہوا ہے۔''

ہمیں شاعر کا مصرع یاد آ گیا:

آغاز تو اچھا ہے، انجام خدا جانے؟

مگر اس کو شعر سنانا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

سامنے ایک خوب صورت سے مکان کے آگے ''برائے فروخت'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔
جوزفین نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ چند لمحے بعد ایک سفید بالوں والی بوڑھی خاتون نے
شیشے کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا اور انٹرکام پر دریافت کیا ''کون ہے؟'' جوزفین نے اپنا
اور ہمارا تعارف کرایا تو انہوں نے دروازے کا قفل کھول دیا۔ اندر قدم رکھا تو طبیعت
خوش ہو گئی۔ فرش پر یہاں سے وہاں تک ہلکے سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ سارے گھر
میں یہی قالین نظر آیا۔ جوزفین نے بوڑھی خاتون سے ہمارا تعارف کرایا کہ یہ مالک مکان کی
والدہ ہیں۔ پھر ان کی اجازت سے گھر کا معائنہ شروع ہوا۔ اس منزل پر تین بیڈ روم۔ ایک
بہت کشادہ لاؤنج اور اس کے اندر بہت خوب صورت کچن تھا۔ اس کے برابر ڈرائنگ روم

تھا۔ لاؤنج کے سامنے کافی کشادہ ٹیرس تھا جس کے سامنے دور دور تک درختوں کا خوب صورت ذخیرہ پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے نیچے ایک تہ خانہ تھا جس میں ایک بیڈ روم اور لاؤنج کے علاوہ بچوں کے کھیلنے کے لیے بھی کشادہ جگہ تھی۔ اس تہہ خانے کا ایک راستہ باہر گیراج میں تھا اور پچھلی جانب شیشے کے ایک کافی بڑے دروازے سے باہر عقب کے لان میں جانے کا راستہ تھا۔ بہت خوب صورت گھر تھا۔ ماحول اس سے زیادہ خوشنما' جوزفین نے بتایا تھا کہ اس گھر کی قیمت ۷۰ ہزار ڈالر ہے۔ دس ہزار ڈالر ڈاؤن پیمنٹ کرنی ہو گی۔ باقی اقساط' ایسے مکانات واشنگٹن اور ورجینیا میں کافی مہنگے تھے مگر کیونکہ یہ نئی بستی تھی اس لیے قیمت بھی کم تھی۔ جوزفین نے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیے۔

ہم نے کہا "مگر یہاں تو دور دور تک شاپنگ سینٹر بھی نہیں ہے ہمارے بزنس کا کیا ہو گا؟"

"بہت بڑا شاپنگ سینٹر زیر تعمیر ہے۔ ایک سال کے اندر بن جائے گا۔ بزنس بھی یہیں کہیں تلاش کر لیں گے۔"

یہ باتیں تہ خانے کے ڈرائنگ روم میں ہو رہی تھیں۔

لبنیٰ نے پوچھا "مگر یہ بڑی بی اتنا اچھا مکان فروخت کیوں کر رہی ہیں؟"

"یہ گھر ان کے بیٹے کا ہے اور بیٹے کو کیلی فورنیا میں نوکری مل گئی ہے اس لیے یہ گھر فروخت کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ وہ میاں بیوی تو پہلے ہی چلے گئے ہیں۔"

"تو یہ بڑی بی کب جائیں گی؟"

"انہیں تو دس تاریخ کو بہرحال چلا جانا ہے۔ چاہے مکان فروخت ہو یا نہ ہو۔"

"مگر یہ اپنے بیٹے اور بہو کے ہمراہ کیوں نہ چلی گئیں؟"

"دراصل انہیں اپنے بیٹے کے پاس نہیں جانا۔ یہ تو "اولڈ ہوم" میں جا رہی ہیں۔"

مطلب یہ کہ صاحب زادے تو مکان فروخت کر کے کیلی فورنیا چلے گئے اور اپنی بوڑھی ماں کو بوڑھوں کی پناہ گاہ میں بھیج دیا۔ اس قسم کی داستانیں ہم نے پہلے بھی سن رکھی تھیں مگر بذات خود ایسے لوگوں سے دو چار ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔

امریکی معاشرے میں یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ اولاد بوڑھے ماں باپ سے جان

چھڑانے کی خاطر انہیں ایسے اداروں میں داخل کر دیتی ہے۔ اور خود اپنی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں کھوئی رہتی ہے۔

ہمیں ان بڑی بی پر ترس آنے لگا۔

رخصت ہونے سے پہلے ہم ان سے ملنے کے لیے ڈرائنگ روم میں گئے تو وہ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ بہت اخلاق سے ملیں۔ کافی ہنس مکھ اور شائستہ خاتون تھیں۔ اس واقعے کا انہیں کچھ قلق بھی نہیں تھا۔ امریکا کے معاشرے کو آپ چاہے جتنا برا کہیں لیکن ہزار خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان لوگوں میں منافقت نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ خود کچھ کر رہے ہیں اور دوسروں کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ امریکی ماں باپ اپنی اولاد کی بے رخی' بے پروائی اور خود غرضی کی ذرا بھی شکایت نہیں کرتے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے خود بھی اپنے والدین کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا تھا۔ پھر اپنی اولاد سے شکایت کس بات کی؟

یہ بڑی بی جس ادارے میں جانے والی تھیں وہ ریاست ورجینیا میں تھا جب کہ ریاست کیلی فورنیا وہاں سے تین ہزار میل دور ہے مگر اس دوری وہ مطلق پریشان یا غمگین نہ تھیں۔ انہوں نے بہت فخر سے ہمیں بتایا کہ میرا بیٹا کبھی کبھی خط لکھنے کے علاوہ دو چار مہینے میں ایک بار ٹیلی فون بھی کرے گا۔ اماں جان کے لیے یہی بہت ہے۔

گھر دیکھ کر باہر نکلے تو دیکھا کہ سوزی بدستور اسکیٹنگ میں مصروف تھی اور دوبارہ فٹ پاتھ پر ہماری جانب آرہی تھی۔

لبنیٰ نے ہم سے کہا "آپ پہلے ہی فٹ پاتھ پر گر جائیے۔"

ہم نے پوچھا "وہ کیوں؟"

"بھئی وہ جو آپ کو ٹکر مار کر گرائے گی اس سے بہتر ہے کہ آپ خود ہی لیٹ جائیے' وہ ٹکرا کر آپ پر ہی گرے گی۔"

اتنی دیر میں سوزی ہمارے نزدیک آگئی تھی اور غنیمت ہے کہ اس نے بریک بھی لگا دیا تھا۔ اس بار اس کے کندھے سے ایک سیاہ رنگ کا پرس بھی لٹکا ہوا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ شاپنگ کے لیے جا رہی ہے۔

"شاپنگ!" وہ حیران ہو کر بولی "کیسی شاپنگ۔ شاپنگ سینٹر تو یہاں سے بہت دور ہے۔ کم از کم اسکیٹس کے ذریعے تو میں وہاں نہیں جا سکتی۔"

"تمہارے ہینڈ بیگ کو دیکھ کر یہ خیال ہوا تھا۔"

اس نے اپنا ہینڈ بیگ کاندھے سے اتار لیا اور زپ کھول کر بولی "اس میں چند ڈالرز لپ اسٹک اور ایک پستول کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

ڈالرز اور لپ اسٹک تو معمول کی چیز ہے مگر پستول کا سن کر ہم چونکے "پستول؟ وہ کس لیے؟"

وہ ہنسنے لگی "میں نشانہ بازی کی مشق کے لیے جا رہی ہوں۔ وہ سامنے جو موڑ ہے اس کے آگے چاند ماری کا کلب ہے۔ بہت سی لڑکیاں وہاں آتی ہیں ٹریننگ کے لیے۔"

ہم نے اس نازک اندام لڑکی کو دیکھا اور پھر پستول پر نظر کی جو اس نے بیگ سے نکال لیا تھا۔ یہ ایک مناسب نازک سا پستول تھا۔ اس کے دستے پر ہاتھی دانت لگا ہوا تھا۔ دیکھنے میں کھلونا سا لگ رہا تھا۔

اس نے کہا "ہائی جیکنگ اور حملوں سے بچنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"کیسی ہائی جیکنگ؟"

"لڑکیوں کو اکیلا دیکھ کر پستول دکھا کر غنڈے انہیں زبردستی لے جاتے ہیں۔ لوٹ مار کے علاوہ بے آبرو بھی کرتے ہیں۔ کئی بار تو قتل بھی کر دیتے ہیں۔ اب کیا کریں۔ خود کو اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ دو ہفتے کے اندر میرا نشانہ بہت اچھا ہو گیا ہے۔ سوچتی ہوں جوڈو کراٹے بھی سیکھ لوں۔ وقت بے وقت کام ہی آجائے گا۔" یہ کہہ کر اس پستول بیگ میں رکھنے کے بعد رخصت ہو گئی۔ ہم حیران کھڑے دیکھتے رہے۔ اتنے اہم معاملات کو امریکی کتنے سرسری انداز میں لیتے ہیں یہ بھی امریکی طرز زندگی کا ایک پہلو ہے۔ عورتوں کی بے حرمتی' قتل و غارت' لوٹ مار جب اتنی عام ہو جائے کہ عورت اسلحہ رکھنے پر مجبور ہو اور اپنی حفاظت کے لیے نہ صرف ہتھیاروں کا استعمال کرے بلکہ جوڈو کراٹے بھی سیکھے تو ایسے معاشرے کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قدر سرسری انداز میں تذکرہ کرنے کے علاوہ سوزی نے اپنے ملک میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کی۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ اگر یہ نوبت ہمارے ملک میں آجائے کہ اپنی جان اور آبرو کی

حفاظت کے لیے عورتیں بھی اسلحہ رکھنے' نشانہ بازی کی تربیت حاصل کرنے اور جوڈو کراٹے سیکھنے پر مجبور ہو جائیں تو ہمارا کیا رویہ ہو گا؟

سوزی کی جگہ کوئی پاکستانی خاتون ہوتیں تو سب سے پہلے تو وہ اپنے ملک کو برا بھلا کہتیں "توبہ توبہ۔ کیا بتائیں جی۔ یہ ملک بھی کوئی رہنے کے لائق ہے؟ شریفوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ عورتوں کی عزت تک محفوظ نہیں ہے۔ ڈاکو چور' بدمعاش کھلے پھرتے ہیں۔ پولیس تو خود ان سے ملی ہوئی ہے۔ نہیں جی' بالکل نہیں' اب یہ ملک رہنے کے قابل نہیں رہا۔"

اس کے بعد وہ اپنے ان رشتے داروں پر رشک کرتے ہیں جو یورپ اور امریکا میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اور وہاں ہر طرح عیش کر رہے ہیں۔ آخر میں تان یہاں ٹوٹتی کہ ...... بس جی' میں نے بھی ویزے کی درخواست دے دی ہے۔ وہاں جا کر گرین کارڈ بھی لے لوں گی۔ اس ملک سے تو نجات مل جائے گی۔"

گھر تو بہت خوب صورت اور آرام دہ تھا مگر بہت دور تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے دور' اللہ میاں کے پچھواڑے جا کر رہنے کی کوئی تک نہیں تھی اور پھر آس پاس کوئی شاپنگ سنٹر' پلازہ یا ایسی کوئی کاروباری آبادی نہیں تھی جہاں ہمیں کوئی معقول تو کیا نامعقول بزنس بھی دستیاب ہو جاتا۔ سوزی نے بتایا تھا کہ نزدیک ترین دکان سیون الیون تھی۔

لیٹی نے کہا "میں ایک ترکیب بتاؤں؟"

"بتاؤ؟"

"کیوں نہ ہم سیون الیون اسٹور خرید لیں؟"

ہم نے کہا "خریدنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی فروخت کرنے پر بھی آمادہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اتنے منافع کی چیز کو کون فروخت کرے گا؟"

جب جوزفین کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی تو اس نے ہماری رائے سے اتفاق کیا مگر پھر کہا میں اس بارے میں معلومات حاصل کروں گی۔ دوسرے دن "معلومات" کا نتیجہ بھی نکل آیا۔ مالک کسی قیمت پر بھی "سیون الیون" بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتے مگر اس نے ہمیں بہت خوش ہو کر یہ خوش خبری سنائی کہ واشنگٹن ڈی سی کی حدود میں ایک سیون الیون فروخت ہو رہا ہے۔ سیون الیون کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ ایک طرح سے

"عمرو عیار کی زنبیل" قسم کی چیز ہے۔ یہ ایک خوب صورت، کشادہ اور روشن عمارت میں
ایک پنساری کی دکان کی مانند ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک تو پنساری کی دکان کے
مقابلے میں ہزار گنا صاف ستھرا اور خوب صورت ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس میں
پنساری کی دکان کے مقابلے میں زیادہ اشیا دستیاب ہوتی ہیں۔ بنیادی ضرورت کی ہر چیز
یہاں مل جاتی ہے اور پھر سہولت یہ ہے کہ دن رات چوبیس گھنٹے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔
ظاہر ہے اس کو چلانے کے لیے مالک کا خاندان بہت لمبا چوڑا ہو یا پھر وہ بھروسے کا اور مخلص
اسٹاف رکھے۔ انتہائی احتیاط اور نگرانی کے باوجود گاہک بے شمار چیزیں چرا کر لے جاتے
ہیں۔ رہی سہی کسر اسٹاف کے لوگ پوری کر دیتے ہیں۔ سیون الیون ایک بہت بڑا تجارتی
ادارہ ہے۔ اسے انگریزی میں "فرینچائز" کہتے ہیں۔ اس کی بے شمار شاخیں ہر جگہ پھیلی
ہوئی ہیں۔ اس کا مالک دراصل ادارہ ہے لیکن جو شخص ایک اسٹور خریدتا ہے اسے جملہ
آمدنی کا ۵۱ فیصد منافع ادارے کو دینا پڑتا ہے۔ ادارے کی جانب سے عمارت، سازو سامان،
بجلی کے آلات اور فرنیچر اور ہر قسم کا سامان باقاعدگی سے فراہم کیا جاتا ہے لیکن فرینچائز
خریدنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جو شخص اسے خریدنے کا خواہش مند ہو اسے درخواست
کے ساتھ اپنے مستحکم مالی حالات کا گوشوارہ اور اپنے کاروباری تجربے کے بارے میں
معلومات بھی فراہم کرنا ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ادارہ انٹرویو کے لیے طلب کرتا ہے۔ اور
تمام شرائط اور صلاحیتوں پر پورا اترنے کے بعد چند ہفتوں کی تربیت کا بندوبست کرتا ہے۔
اس مقصد کے لیے بھی ادارے موجود ہیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد وہ ۴۹
فیصد منافع پر اسٹور آپ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ عمارت اور مال و اسباب ادارے کا اور
اسے چلانے کا بندوبست آپ کا۔ ان بنیادوں پر تمام فرینچائز کام کرتے ہیں۔ خواہ وہ سیون
الیون اسٹور ہوں، میکڈانلڈ، جینوز ریستوران ہوں یا پیزا ہٹ ہوں۔ اس قسم کے بہت
ادارے اب امریکا اور کینیڈا میں بہت کامیابی سے چل رہے ہیں بلکہ اب تو یہ عالم ہو چکا
ہے کہ چھوٹے بڑے ہر کام میں فرینچائز نے اپنی ٹانگ اڑا دی ہے۔ یہ لوگ ارب پتی
ہوتے ہیں اس لیے چھوٹا موٹا کاروبار کرنے والے ان کے سامنے قدم نہیں جما سکتے۔ اس
طرح ارتکاز زر کا سلسلہ جاری ہے۔ امیر، امیر ترین ہوتا جا رہا ہے جو لوگ فرینچائز حاصل
کرتے ہیں وہ انہیں فروخت بھی کر سکتے ہیں لیکن طریقہ کار وہی ہے کہ ادارے کی منظوری

اور اجازت کے بغیر آپ کسی کے ہاتھ یہ بزنس فروخت نہیں کر سکتے۔ کاروبار چلانے والے
کے مسائل اور مشکلات کیا ہیں؟ ان سے ادارے کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ انہیں محض
اپنے منافع اور حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ سیون الیون بظاہر ایک بہت منافع بخش
کاروبار ہے۔ لیکن اس کاروبار کو بحسن و خوبی چلانے کے لیے جن مشکلات سے گزرنا پڑتا
ہے۔ اور نقصانات کے کیا امکانات ہیں، یہ ہر کوئی نہیں جانتا۔

اگلے روز ہم جوزفین کے ہمراہ واشنگٹن ڈی سی کے ایک علاقے میں پہنچے۔ کافی دور
دراز جگہ تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہاں کالوں کی اکثریت تھی۔ جن علاقوں میں
کالوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے وہ دیکھ کر ہی پہچانے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ
سفید چہروں کے بجائے سیاہ فام چہرے نظر آتے ہیں۔ پھر صفائی اور نفاست بھی اتنی زیادہ
نہیں ہوتی۔ ان علاقوں میں جرائم کی بھی کثرت ہوتی ہے۔ کالے مرد، عورتیں اور بچے جگہ
جگہ نظر آتے ہیں۔ مشرقی لوگوں کی مانند کالوں کی بھی یہ عادت ہے کہ ان کے بچے گھروں
کے باہر شور مچاتے پھرتے ہیں۔ عورتیں اور مرد گھروں کے باہر بیٹھے نظر آتے ہیں۔
سڑکوں، گلیوں اور عمارتوں کے اندر اور باہر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جوڑوں یا جتھوں کی
شکل میں کھڑے یا بیٹھے ہوئے مل جاتے ہیں۔ سفید فام علاقوں میں ایسا دستور نہیں ہے۔
کالوں کے علاقوں میں دوسری برائیوں کے علاوہ جرائم کی بھی بہتات ہوتی ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ جن آبادیوں میں کالے آکر آباد ہو جائیں، وہاں سے سفید فام اور دوسرے لوگ رفتہ
رفتہ بوریا بستر باندھ کر رخصت ہو جاتے ہیں اور اس طرح کچھ عرصے بعد یہ مکمل کالوں کی
آبادی بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں جائدادوں کی قیمتیں گر جاتی
ہیں۔ گندگی بڑھ جاتی ہے۔ بدنظمی اور بدامنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور جرائم بھی بہت
زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ کالوں کا اپنا مخصوص طرز زندگی ہے۔ ان کا رہن سہن، بول چال،
رسم و رواج، ملبوسات، فیشن اور طور طریقے سبھی مختلف ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات
یہ ہے کہ جب ان علاقوں میں کالوں کی اکثریت ہو جاتی ہے تو جرائم اور بدنظمی میں تو اضافہ
ہو جاتا ہے مگر پولیس کی توجہ کم ہو جاتی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ پولیس بھی انہیں ان کے
حال پر چھوڑ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قتل و غارت، لڑائی دنگا، جرائم، لوٹ مار، جوا،
منشیات فروشی، عریانی اور بے راہ روی کا ان علاقوں میں بہت زور ہوتا ہے۔ کھلے عام

منشیات کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ جگہ جگہ جوئے کے اڈے اور مجرموں کی پناہ گاہیں ہیں۔ شراب خانوں کے سامنے مارپیٹ اور قتل و غارت معمول میں داخل ہے اور پولیس بھی صرف نظر کرتی ہے۔ اقتصادی، کاروباری اور سماجی اعتبار سے بھی یہ پسماندہ علاقے سمجھے جاتے ہیں۔

ہم جہاں "سیون الیون" کی تلاش میں گئے تھے یہ دراصل ایک درمیانی قسم کا علاقہ تھا۔ اس لحاظ سے کہ اس کے ایک جانب گوروں کے علاقے تھے اور دوسری جانب کالوں کی آبادی تھی۔ لیکن گوروں کے مقابلے میں کالے زیادہ نظر آتے تھے سیون الیون کی عمارت کے باہر جوزفین نے اپنی کار کھڑی کر دی۔ ہم نے عمارت دیکھی تو بہت اچھی لگی۔ صاف ستھری، شیشے چمکتے ہوئے، روشنیوں سے منور، اندر بھی کافی اچھا انتظام تھا لیکن کام کرنے والوں میں سیاہ فام زیادہ تھے۔ کیش رجسٹر پر جو صاحب براجمان تھے۔ وہی اس کے مالک تھے۔ وہ ایک برازیلین تھے۔ رنگ و روغن اور ناک نقشے کے اعتبار سے بہت حد تک پاکستانی ہی لگتے تھے۔ اونچے، مضبوط اور خاصے چست و چالاک نظر آرہے تھے۔ اب تو خود کو امریکن ہی کہتے تھے مگر یہ بتانا نہیں بھولتے کہ میں برازیل سے آیا تھا۔ ان کا ایک نوجوان بیٹا اور نو عمر بیٹی بھی اس وقت موجود تھی۔ ان تینوں کے سوا باقی چہرے سیاہ فاموں کے تھے۔ نہ جانے یہ نفسیاتی اثر تھا یا حقیقت کہ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے سفید فاموں کے مقابلے میں سیاہ فام ست، کاہل اور کام چور ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی منظر دیکھا۔ ان تینوں باپ بیٹی کے مقابلے میں دوسرا عملہ یوں لگتا تھا جیسے بغیر تنخواہ کے کام کرتا ہے۔

سائرس صاحب ہمارے ساتھ اسٹور سے باہر چلے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ فی الحال اپنے عملے کے لوگوں پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنا اسٹور فروخت کر رہے ہیں۔

"مگر آپ اسے فروخت کیوں کر رہے ہیں؟" ہم نے ان سے دریافت کیا۔

بولے "دراصل ہم لوگ واپس اپنے وطن جا رہے ہیں۔"

"کتنے سال کے بعد؟"

"میں پندرہ سال کا تھا جب امریکا آیا تھا۔ اب میری عمر اڑتالیس سال ہے۔"

"بزنس کیسا ہے یہاں؟"

"بزنس تو اچھا ہے مگر منافع نہیں ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"کالوں کی حکمرانی ہے۔ میرا قریب قریب سارا عملہ سیاہ فام ہے۔ یہ لوگ کام نہیں کرنا چاہتے، مطالبات بہت زیادہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوریاں بہت ہوتی ہیں۔"

"چوریاں کون کرتا ہے؟"

"عملے کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ گاہک بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ شاید ان کی آپس میں ملی بھگت ہے۔ میں، میری بیوی اور تین بچے باری باری ہر شفٹ میں ڈیوٹی دیتے ہیں مگر اتنے بہت سے گاہکوں اور عملے کے لوگوں پر کیسے نگاہ رکھی جا سکتی ہے۔ مہینے کے خاتمے پر جب حساب ہوتا ہے تو چوریوں کا پتا چلتا ہے۔ "فرنچائز" والوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ تو جتنا مال دے کر جاتے ہیں اس کی پوری قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ گھاٹا ہمارے حصے میں آتا ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر ان کو دیکھا اور پھر جوزفین کی جانب نگاہ کی۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ وہ یہ سب کچھ ایک ایسے شخص کو بتا رہے تھے جو ان کا اسٹور خریدنا چاہتا تھا۔ یہ باتیں سننے کے بعد کون اس کو خریدے گا؟" ہم نے سوچا۔

انہوں نے سگریٹ سلگائی اور بولے "کوئی ایک مشکل ہو تو بیان کروں۔ اس کے علاوہ ہفتے میں دو تین بار پستول دکھا کر لوٹنے والے بھی آجاتے ہیں۔"

جوزفین نے کہا "اس کے باوجود آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ سب باتیں سننے کے بعد کوئی آپ سے یہ اسٹور خرید لے گا؟"

بولے "ہرگز نہیں۔ دیکھیے بات یہ ہے کہ جو حقیقت ہے وہ چھپی نہیں رہے گی۔ جو بھی خریدنے کے ارادے سے آئے گا وہ اپنے طور پر آس پاس سے بھی معلومات حاصل کرے گا اور اسے یہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا پھر چھپانے کا فائدہ؟"

ہم ان کی معقولیت کے قائل ہو گئے۔ "مگر اس طرح تو کوئی بھی اسے نہیں خریدے گا۔"

بولے "یہ میں بھی جانتا ہوں کوئی شریف آدمی اس اسٹور کو ہرگز نہیں خریدے گا۔ مجھے بگ ماؤتھ کے ہاتھ ہی بیچنا پڑے گا۔"

"بگ ماؤتھ؟"

"اس علاقے کا ایک غنڈہ ہے۔ دو کلب' ایک جوا خانہ اور دو مساج گھروں کا مالک ہے۔ منشیات کا دھندہ کرتا ہے۔ ہے تو گورا مگر اس کے تمام کارندے کالے ہیں۔ اس نے بے شمار لڑکوں کو مجرم اور لڑکیوں کو آوارہ اور آبرو باختہ بنا دیا ہے۔ یہ سامنے فٹ پاتھ دیکھ رہے ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"سرِ شام ہی یہاں منشیات بیچنے والوں کی ٹولیاں آجاتی ہیں۔ کال گرلز میرے اسٹور کے اندر بھی دھندا کرنے پہنچ جاتی ہیں۔"

ہم ان کی باتیں سن کر پریشان ہو گئے۔ امریکا کے دارالحکومت کا یہ حال ہو گا؟ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

"آپ پولیس کو کیوں نہیں بتاتے؟" ہم نے اپنی دانست میں انتہائی عقلمندی کا ثبوت دیا۔

"پولیس کو کیا بتاؤں' وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔"

ہم نے جوزفین سے کہا "اچھا' اب اجازت لیتے ہیں ان سے۔"

جوزفین نے ان سے پوچھا "جب آپ کے پاس ایک گاہک موجود ہے تو پھر آپ اخبار میں اشتہار کیوں دیتے ہیں؟"

سائرس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "بے وقوفی' اور کیا!"

پھر تلخی سے مسکرا کر بولا "وہ کسی چیز کے دام نہیں پوچھتا۔ بس آفر دیتا ہے چاہے دوسرے کا دیوالیہ ہی کیوں نہ نکل جائے۔ اوکے' بائی" وہ بیزاری سے بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

ہم دونوں خاموشی سے کار پارکنگ کی جانب چل پڑے۔

فٹ پاتھ پر تین سیاہ فام نو عمر لڑکے اسکیٹنگ کرتے پھر رہے تھے۔ ان کی عمریں چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہیں ہوں گی مگر ڈیل ڈول کے لحاظ سے وہ جوانوں سے بھی بڑھ کر نظر آرہے تھے۔

انہوں نے جوزفین کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے۔

"ہائی شوگر!" ایک لڑکے نے مسکرا کر کہا۔

"ہنی۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا تمہیں" دوسرے نے سامنے سے راستہ کاٹا۔

جوزفین خوش دلی سے مسکرانے لگی "بیوقوفی مت کرو لڑکو۔ راستہ دے دو۔"

وہ ہنستے اور سیٹیاں بجاتے ہوئے آگے نکل گئے۔

جوزفین اس واقعے سے ذرا بھی متاثر نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید اس کے لیے معمول میں داخل تھا مگر ہم لڑکوں کو اس کے گرد منڈلاتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔

امریکی کھیلوں کی شوقین قوم ہے مگر ان کے کھیل بھی دوسروں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کے کھیلوں کی بنیاد انگریزوں کے کھیلوں پر ہی ہے مگر دوسری تمام چیزوں کی طرح امریکیوں نے ان کا حلیہ بھی بگاڑ دیا ہے۔ گولف، باسکٹ بال، ٹینس ایسے کھیل ہیں جو امریکی بھی اسی طرح کھیلتے ہیں جس طرح دنیا کے دوسرے ملکوں میں کھیلے جاتے ہیں۔ مگر کچھ کھیلوں کو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بدل لیا ہے مثلاً کرکٹ یورپ کا مقبول ترین کھیل ہے مگر امریکا میں تھوڑے بہت ایشیائیوں کے سوا کوئی کرکٹ کا نام تک نہیں جانتا۔ امریکیوں نے اس میں ضروری ترمیم کے بعد اس کا نام بیس بال رکھ دیا ہے۔ اس کا انداز کچھ کچھ کرکٹ ہی کی طرح کا ہے۔ اس میں وکٹ نہیں ہوتے نہ اسٹمپ ہوتے ہیں۔ ایک صاحب ایک چھوٹے سے دائرے میں بلا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو کرکٹ کے بیٹ کی طرح نہیں بلکہ کپڑے دھونے والے ڈنڈے کی شکل کا ہوتا ہے۔ یہ گول ہوتا ہے۔ ایک جانب سے پتلا اور پھر بتدریج موٹا ہوتا جاتا ہے۔ پتلی جانب سے کھلاڑی اسے تھام کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کھیل میں وکٹ تو نہیں ہوتی مگر ایک بولر ضرور ہوتا ہے جو پوری قوت سے کھلاڑی کی جانب بال پھینک کر مارتا ہے، کرکٹ کی طرح یہ گیند زمین پر نہیں ماری جاتی بلکہ فل ٹاس کی طرح سیدھی کھلاڑی کے پاس جاتی ہے۔ کھلاڑی اس گیند پر پوری قوت سے بلا مارتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بلا زمین پر رکھ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ بجائے وکٹوں کے درمیان دوڑنے کے کھلاڑی بھاگ کر ایک مربع نما میدان کا چکر لگاتا ہے اور اس طرح اسکور بنا لیتا ہے۔ بار بار دیکھنے کے باوجود یہ کھیل آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکا مگر یہ امریکیوں کا محبوب اور مرغوب ترین کھیل ہے۔ جن دنوں بیس بال کے مقابلے شروع ہوتے ہیں بڑے بڑے امریکی ٹیلی ویژن کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ

جاتے ہیں۔ قریب قریب وہی منظر ہوتا ہے جو کرکٹ میچوں کے زمانے میں ہمارے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ امریکی دفتروں میں اور دوکانوں میں میچ نہیں دیکھتے۔ جو زیادہ شوقین ہوتے ہیں وہ چھٹی لے کر گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ یہ وکٹوں کے بغیر ایک گاؤ دم ڈنڈے کی مدد سے کھیلا جانے والا کھیل ہے جس کا انداز ہمارے گلی ڈنڈے سے ملتا جلتا ہے۔ بیس بال کے کھلاڑی امریکیوں کے ہیرو ہوتے ہیں۔ مرد ان پر رشک کرتے ہیں اور عورتیں انہیں دیکھ کر آہیں بھرتی ہیں۔ دولت اور شہرت ان کے گھر کی لونڈی ہوتی ہے بلکہ لونڈیاں کہہ لیجئے۔

ایک اور کھیل جسے امریکیوں کی ایجاد کہا جاتا ہے رگبی ہے۔ یہ دراصل فٹ بال کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ فٹ بال تو گول ہوتی ہے مگر یہ گیند بیضوی شکل کی ہوتی ہے۔ اس میں بھی دو ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ بس یہاں فٹ بال سے اس کی مشابہت ختم ہو جاتی ہے۔ فٹ بال کے کھلاڑی تو اچھے خاصے انسان نظر آتے ہیں مگر رگبی کے کھلاڑی آسمانی یا خلائی مخلوق دکھائی دیتے ہیں یا پھر قدیم یونانی فوج کے بکتربند، زرہ پوش سپاہی۔ ایک تو اس کھیل میں حصہ لینے والوں کا لمبا چوڑا، قوی ہیکل اور انتہائی مضبوط ہونا ضروری ہے۔ پھر ان کا حلیہ انہیں اور بھی دیوزاد بنا دیتا ہے۔ ان کے سروں پر عجیب قسم کی فوجی خود نما ٹوپیاں ہوتی ہیں۔ شانوں پر پیڈنگ ہوتی ہے، جسم کے دوسرے حصوں کی حفاظت کے لیے بھی مختلف قسم کے آلات باندھے جاتے ہیں۔ اس طرح جب کھلاڑی کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں داخل ہوتا ہے تو "توپچی" بنا ہوا نظر آتا ہے۔ فٹ بال تو پیروں سے کھیلا جاتا ہے مگر یہ کھیل ہاتھوں سے کھیلا جاتا ہے۔ اب ہوتا یوں ہے کہ دونوں فوجیں، میرا مطلب ہے کہ دونوں ٹیمیں میدان میں آمنے سامنے صف آرا ہو جاتی ہیں۔ ایک ٹیم کے کھلاڑی کے ہاتھ میں کدو نما گیند ہوتی ہے۔ کھیل شروع ہوتے ہی وہ صاحب اس کدو نما گیند کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر غنیم، یعنی مخالف ٹیم کے گول کی جانب بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکا اور شاید خود امریکیوں کی فہم سے بھی بالا ہے۔ جوں ہی وہ صاحب گیند لے کر بھاگنا شروع کرتے ہیں، باقی ماندہ کھلاڑی ان کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ اس میں دوست دشمن اور اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ سب کے سب اس غریب کے تعاقب میں روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ اس

کے پیچھے محض دوڑتے رہتے ہیں۔ جی نہیں' وہ اسے پکڑنے کی اور اس سے گیند چھیننے کی کوشش میں اس سے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ اس کوشش میں گیند لے کر بھاگنے والا ٹھوکر کھا کر یا شاید مصلحتاً زمین پر گرتا ہے اور باقی سب کے سب کھلاڑی "دھپا دھپ" اس پر گر جاتے ہیں۔ انسانوں کی ایک پہاڑی سی بن جاتی ہے۔ جس کے نیچے وہ غریب بالکل دب جاتا ہے لیکن یہ کوئی جنگ و جدل نہیں ہے۔ کھیل ہی کا ایک حصہ ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کھلاڑی ایک دوسرے پر گر جاتے ہیں۔ ان حالات میں سب سے نیچے دب جانے والے کھلاڑی کا تو زندہ رہنا ہی کسی معجزے سے کم نہیں ہے مگر وہ نہ صرف زندہ سلامت رہتا ہے بلکہ نہ جانے کس ترکیب سے انسانوں کے اس ڈھیر میں سے نکل کر دوبارہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ غالباً اس کھیل کا اصول بھی کبڈی کی طرح کا ہے۔ کیونکہ جب وہ کھلاڑی گیند پکڑے ہوئے مخالف ٹیم کی لائن عبور کر لیتا ہے تو سمجھئے کہ گول ہو گیا۔ ویسے رگبی میں گول پوسٹ نہیں ہوتے۔ یہ کچھ عجیب و غریب قسم کا کھیل ہے۔ جسے امریکی ہی ایجاد کر سکتے تھے اور وہی اسے کھیلتے ہیں۔

امریکا میں کھلاڑیوں' فن کاروں' گلوکاروں' موسیقاروں' باکسروں وغیرہ کی بہت آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ محض زبانی کلامی نہیں بلکہ دامے درمے بھی۔ یہ لوگ بے حد دولت مند ہوتے ہیں مگر شاید رگبی کے کھلاڑی امریکی لڑکیوں کے خواب کی تعبیر ہوتے ہیں۔ یہ عام امریکیوں کے مقابلے میں زیادہ لمبے' زیادہ مضبوط اور زیادہ کوڑھ مغز ہوتے ہیں۔ ان سے آپ کسی قسم کی ذہانت یا عقل مندی کی توقع نہیں رکھ سکتے لیکن خواتین ان پر واری صدقے جانے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتی ہیں۔

ہمارے پڑوس میں ایک بار غلغلہ برپا ہو گیا اور لوگوں کا ایک ازدحام اکٹھا ہو گیا حالانکہ امریکی تو وہ قوم ہے جو شادی بیاہ اور سوگ کے موقعے پر بھی یوں اکٹھی نہیں ہوتی۔ دیکھا کہ آس پاس کی سڑکوں پر کاروں کا ہجوم ہے اور فٹ پاتھوں پر ہر عمر کے لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم سمجھے کہ شاید کوئی فلم اسٹار یا پھر کوئی وزیر وغیرہ آنے والا ہے مگر بعد میں پتا چلا کہ رگبی کے ایک کھلاڑی تشریف لا رہے ہیں' وہ پڑوس میں کسی گھرانے کے رشتے دار تھے۔ ان کی آمد کی خبر سنتے ہی سب لوگ خوشی سے بے خود ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک بہت بڑی کار آ کر رکی۔ بڑی بڑی کاریں تو وہاں عام ہیں مگر اس کار میں سے جو شخص برآمد ہوا وہ

ہیئتاً عام نہیں تھا۔ کار خاصی بڑی تھی مگر وہ صاحب جب اس میں سے نکلے تو یوں لگا جیسے کہ انہیں "تہ" کر کے کار میں بٹھایا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی ٹانگوں کی تہوں کو کھولا اور جب کار سے باہر نکلے تو ایک جھنڈے کی طرح بلند ہو گئے۔ لمبے لمبے ہاتھ' اس سے زیادہ لمبی ٹانگیں' اور ان ہی کی مناسبت سے بہت لمبی گردن مگر نہایت مضبوط۔ یوں سمجھئے کہ اگر ہماری دو رانیں یکجا کی جائیں تو ان کی ایک گردن بنے گی۔ خاصے دیو ہیکل انسان تھے۔ سوائے اس کے کہ ان کا رنگ گورا تھا ہمیں تو ان میں کوئی اور خوب صورتی نظر نہیں آئی مگر ان کو دیکھتے ہی صنف نازک کے حلقے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ بچیاں' جوان' بوڑھیاں' جسے دیکھیے ان سے ہاتھ ملانے کا مشتاق تھا۔ جوان عورتوں نے ان کو گھیر لیا اور ان کے لباس کو نوچنے لگیں۔ اگر میزبان انہیں گھیر گھار کر گھر کے اندر نہ لے جاتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کا تمام لباس چیتھڑوں میں تبدیل ہو جاتا۔ اور وہ قابل سنسر ہو جاتے۔ ہماری پڑوس میں رہنے والی ایک خاتون نے بعد میں ہمیں بتایا کہ ایک دنیا ان صاحب کی دیوانی ہے۔ کیا کنواری اور کیا شادی شدہ' ہر عورت ان سے شادی کرنے کی حسرت لیے بیٹھی ہے۔ اگر یہ اشارہ کر دیں تو بے شمار خواتین کھڑے کھڑے اپنے شوہروں سے طلاقیں لے لیں۔ واقعی صاحب' اپنی اپنی قسمت ہے۔ ہم نے اپنی بیگم کے سامنے اس خیال کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا "اسے قسمت نہیں' بدقسمتی کہئے۔"

ہم نے پوچھا "بدقسمتی کس کی؟"

اس کے جواب میں وہ صرف گھور کر رہ گئیں۔

ہمارا خیال تھا کہ رشوت اور بے ایمانی صرف ہمارے ہاں تک ہی محدود ہے یا پھر یہ تیسری دنیا کے ممالک کا مقدر ہے مگر جب امریکا گئے تو پتا چلا کہ یہ روگ ہر جگہ ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔ یہ تو آپ نے امریکی فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں بھی دیکھا ہو گا کہ معلومات حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو رشوت دینی پڑتی ہے۔ وہ اطلاع جو آپ سیدھے سادے طریقے سے حاصل نہیں کر سکتے۔ چند ڈالر پیش کر کے بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں اور پھر اطلاع کی تفصیلات بھی رشوت کے مطابق ہی ہوتی ہیں۔ یعنی جتنی بڑی رشوت' اتنی ہی زیادہ معلومات لیکن عام زندگی میں جائز کام کرانے کے لیے رشوت کی عموماً کوئی ضرورت نہیں پیش آتی۔ مگر جس رفتار سے امریکا میں تیسری دنیا کے لوگ جا کر آباد

ہو رہے ہیں اس کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں امریکا بھی رشوت کے معاملے میں ہماری طرح "ترقی یافتہ" ملک ہو جائے گا۔

اس ضمن میں ایک واقعہ اور سن لیجیے۔

ابوالحسن نغمی صاحب کے دفتر کی بلند و بالا عمارت واشنگٹن ڈی سی اور ورجینیا کی سرحد پر واقع تھی۔ جب ہم نے دوسری بار امریکا جانے کے بعد کار خرید لی تو پھر اسے پارک کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ امریکا ایسا ملک ہے جہاں پر وہ مسائل موجود نہیں ہیں جو تیسری دنیا میں مسائل سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں ہمارے مسائل ختم ہوتے ہیں وہاں سے ان کے مسائل شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً کار خریدنا امریکا میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مگر کار کو پارک کرنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ہر جگہ اور ہر وقت آپ اپنی کار کو پارک نہیں کر سکتے۔ کار خریدنے میں آپ کے دس منٹ لگتے ہیں مگر ہر روز جب آپ اپنے دفتر جاتے ہیں تو پارکنگ کی مناسب اور محفوظ جگہ تلاش کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے؟ غلط پارکنگ ہم اور آپ بھی وطن عزیز میں کرتے ہیں یا امریکا میں بھی آپ غلط پارکنگ کر سکتے ہیں مگر اس کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جرمانہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد آپ سوچتے ہیں کہ اس سے تو آپ کار کے بغیر ہی بھلے تھے۔ کار پارکنگ اور اس سلسلے میں ادا کیے جانے والے جرمانوں کی داستان ہم آپ کو آگے چل کر سنائیں گے۔ فی الحال "رشوت" کا تذکرہ سن لیجیے۔ نغمی صاحب کی عمارت کے سامنے' سڑک کے دوسری جانب ایک زمین دوز پارکنگ کی جگہ تھی۔ یہ جگہ ان کے دفتر کے لوگوں کے لیے مخصوص تھی۔

جب ہم نے نئی نئی کار خریدی اور بزنس کے سلسلے میں باقاعدگی سے واشنگٹن کے پھیرے لگانے شروع کیے تو "پارکنگ" کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس زمانے میں واشنگٹن میں انڈر گراؤنڈ ٹرین چلتی تو تھی مگر اس کا پھیلاؤ بہت زیادہ نہیں تھا۔ ورجینیا کی جانب اس کا آخری اسٹیشن "روز لین" تھا۔ یہ اسٹیشن نغمی صاحب کے دفتر کے بالکل نزدیک تھا۔ ہمیں اول تو واشنگٹن کے راستوں کا علم نہیں تھا' دوسرے ٹریفک کے ضوابط یاد نہیں تھے' تیسرے پارکنگ کے معاملات سے ناواقف تھے۔ اس لیے نغمی صاحب نے ہمیں یہ دانش مندانہ مشورہ دیا کہ آپ گھر سے میرے دفتر تک کار سے آجایا کیجیے اور یہاں کار پارک کر کے انڈر گراؤنڈ ٹرین کے ذریعے واشنگٹن کی راہ لیجیے۔

مشورہ تو انتہائی معقول تھا مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ ہم انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کے نزدیک اپنی کار کھڑی کہاں کریں؟ ایک بار ہم نے سامنے والے شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لاٹ میں اپنی کار کھڑی کر دی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہاں تو ہر وقت گاہک کاروں پر سوار ہو کر آتے جاتے رہتے ہیں اگر ہم نے بھی اپنی ایک کار وہاں پارک کر دی تو کسی کو کیا پتا چلے گا؟ مگر صاحب یہ ہماری نادانی اور لاعلمی تھی۔ ہم اس وقت تک امریکیوں کے مزاج سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ اگر ہر شاپنگ سینٹر کے سامنے لوگ اس طرح کاریں پارک کرنے لگیں تو شاپنگ سینٹر والے تو "بے وقوف شخص" ہوئے؟ پیسے کمانے کے طریقے کوئی امریکیوں سے سیکھے اور پیسے بچانے والوں کا کھوج لگانا بھی ان پر ختم ہے۔ اب ہماری ہی مثال لے لیجیے۔ اس روز ہم نے دن کے دس بجے شاپنگ سینٹر کے سامنے وسیع پارکنگ لاٹ میں اپنی کار کھڑی کر دی۔ ایک لمحے کے لیے شاپنگ سینٹر کے اندر گئے اور پھر وہاں سے ٹہلتے ہوئے باہر نکل کر سیدھے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن پہنچ گئے۔ اس طرح کار اور کار پارکنگ دونوں مسائل سے ہمیں چھٹکارا مل گیا۔ شام تک ہم اپنے کاموں میں لگے رہے۔ مغرب کے بعد ٹرین کے ذریعے روز لین پہنچے اور تیز قدمی سے شاپنگ سینٹر کا رخ کیا۔ دیکھا تو ہماری کار بدستور اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ گویا ہم امریکیوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے!

اس کامیابی پر مسکراتے اور سیٹی بجاتے ہوئے ہم کار کے نزدیک گئے تو اس کے سامنے والے شیشے پر ایک رنگین سا کاغذ ٹیپ کی مدد سے لگا ہوا تھا۔ ابھی اس کا معائنہ ہی کر رہے تھے کہ ایک اسمارٹ' نوعمر وردی پوش سیکیوریٹی والا ہمارے نزدیک آیا۔ ہمیں سر سے پیر تک دیکھا اور پوچھا "سر' کیا پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کار آپ ہی کی ہے؟"

"جی ہاں' یہ میری ہی کار ہے۔"

"آپ اسے پارک کر کے کہاں چلے گئے تھے؟"

ہم سمجھ گئے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ جھوٹ بولنے کی ویسے بھی ہمیں زیادہ پریکٹس نہیں ہے۔ اور پردیس میں تو اس سے ہم یوں بھی پرہیز کرتے ہیں اس لیے کہا "ہم ذرا اپنے کاموں سے چلے گئے تھے۔"

اس نے شیشے میں لگے ہوئے کاغذ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا "جناب۔ آپ صبح دس

پندرہ پر کار پارک کر کے گئے تھے اور اب سات بج کر اٹھائیس منٹ پر واپس آئے ہیں۔"

ہم نے کہا "ہاں۔ بس ذرا دیر ہو گئی۔"

بولا "آپ کو علم ہو گا کہ یہ پارکنگ محض گاہکوں کے لیے مخصوص ہے؟"

ہم نے بوکھلا کر کہا "ہے تو، مگر ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔"

بولا "آپ ذرا اندر جا کر سامنے والے آفس میں مس روتھری سین سے مل لیجیے۔"

ہم نے کہا "کیا ابھی؟"

"جی ہاں، کار کا قفل کھولنے سے پیشتر۔"

ہم پریشان سے ہو گئے۔ وہی بات ہوئی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ پہلی بار امریکیوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی اور پکڑے گئے۔

بہرحال، ہم نے مسکرا کر اسے دیکھا اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور شاپنگ سینٹر کے اندر پہنچ گئے۔

مس روتھری سین سامنے والے مختصر سے دفتر میں تشریف فرما تھیں۔ ان کے سامنے میز پر کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا، وہ ٹائپ رائٹر پر ٹائپ بھی کرتی جا رہی تھیں۔ ان کے نام سے تو کسی اینٹی بایوٹک مائی سین کا خیال آتا تھا مگر بذات خود وہ انتہائی اسمارٹ اور خوش نظر تھیں نیلے اور سفید فراک میں وہ اور بھی زیادہ بھلی لگ رہی تھیں۔ افسوس ہوا کہ ایسی حسین لڑکی کو بدذوق امریکی ٹائپ رائٹر کے سامنے بٹھا کر "ضائع" کر رہے ہیں۔

ہم نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے اپنی چمکدار نیلی نیلی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور مسکرا کر اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

اچھا تو آپ ہیں وہ؟" انہوں نے ہمارا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا

"جی ہاں۔ وہ ہم ہی ہیں۔"

"کیا آپ غیر ملکی ہیں؟"

"جی ہاں۔ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔ چند روز پہلے۔"

"شاید اسی لیے یہاں کے طور طریقوں سے ناواقف ہیں؟"

"واقعی" ہم نے مسکرا کر کہا "ابھی تو ہمیں ٹھیک سے یہاں کی سڑکیں تک یاد نہیں ہوئی ہیں۔ طور طریقے کون بتائے گا؟ مگر رفتہ رفتہ سیکھ لیں گے۔ آپ ہم سے کس لیے ملنا

چاہتی ہیں؟"

وہ ہماری معصومت اور اداکاری سے متاثر ہو گئیں۔ کچھ یہ بات بھی ہے کہ ابھی خود امریکیوں کو جھوٹ بولنے اور بہانہ سازی کی عادت بھی نہیں پڑی ہے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" انہوں نے ملائمت سے پوچھا۔ ہمارے بتانے پر فرمایا "علی۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آئندہ کسی بھی شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لاٹ میں اپنی کار کھڑی نہ کرنا۔"

"کیوں؟ اس میں کوئی حرج ہے؟" ہم نے معصومیت سے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ یہ جگہ گاہکوں کے لیے وقف ہوتی ہے اور وہ بھی صرف اس وقت تک کے لیے جب وہ اندر خریداری کر رہے ہوں۔ دیکھیے نا، اگر اس طرح سبھی یہاں اپنی کاریں پارک کرنے لگیں تو ہمارے خریدار کہاں جائیں گے؟"

"ہاں۔ یہ تو ہے" ہم نے کہا۔

"آپ خیر منائیں کہ آپ کی کار کو محکمے والے "ٹو" کر کے نہیں لے گئے ورنہ دو سو ڈالر ادا کرنے پڑتے۔ پریشانی الگ ہوتی۔ اس معاملے میں شاپنگ سینٹرز اور اسٹوروں والے کسی سے رعایت نہیں کرتے۔"

ہم سچ مچ گھبرا گئے "تو کیا ہمیں دو سو ڈالرز دینے پڑیں گے؟"

"اس بار تو نہیں مگر آئندہ لازماً۔"

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ایک پردیسی کی مدد کی ہے۔

وہ مسکرا کر بولیں "آپ پر جرمانہ ضرور کر دیا جاتا مگر میں نے خاص رعایت کر دی۔ پتا ہے کس لیے؟"

ہم نے کہا "وہ بھی بتا دیجیے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ آپ اجنبی اور انجان ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میرا بوائے فرینڈ بھی پاکستانی ہے" وہ مسکرانے لگیں۔

اور کوئی موقع ہوتا تو ہم رشک و حسد کی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتے۔ اس قدر خوب صورت لڑکی، کسی اور پاکستانی کی دوست؟ حیف ہے۔

"بہت شکریہ" مگر ہم نے کہا "آپ کا بھی اور اپنے ہم وطن کا بھی۔"

کچھ بھی ہو۔ اپنے ہم وطن پردیس میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طرح کام آہی جاتے ہیں۔

دوسرے دن ہم نے یہ واقعہ نغمی صاحب کو سنایا تو وہ بہت ہنسے "ارے آفاقی صاحب، میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اسی شاپنگ سینٹر کے سامنے سے پھسل کر گرنے کی وجہ سے میرے کولہے کی ہڈی ٹوٹی تھی اور میں نے ہرجانے کا دعویٰ کر رکھا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ نے وہاں کار پارک کرنے سے تو منع نہیں کیا تھا۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے، بولے "آپ کی پارکنگ کا مسئلہ تو واقعی حل کرنا پڑے گا۔ خاص طور پر جب تک آپ کوئی بزنس نہیں شروع کر دیتے۔ اس وقت تک کہاں کہاں اپنی کار لیے پھریں گے؟ بیس پچیس ڈالر اور دو چار گھنٹے تو آپ کے پارکنگ کے سلسلے میں ہی ضائع ہو جائیں گے۔ اب آپ نے کار کہاں پارک کی ہے؟ کہیں دوبارہ وہیں تو نہیں پارک کر دی؟"

"ارے نہیں۔ اب ہم اتنے بے وقوف بھی نہیں ہیں۔ سائڈ والی سڑک پر ایک جگہ پارکنگ میٹر پر کھڑی کی ہے مگر وہاں دو گھنٹے کے بعد پارکنگ کی اجازت نہیں ہے۔"

انہوں نے مزید غور فرمایا۔ کافی کا ایک گلاس نوش فرمایا۔ ایک گلاس ہمیں پیش کیا پھر کہا "آیئے میرے ساتھ!"

نغمی صاحب کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ انشورنس کمپنی میں ایجنٹ تھے۔ اگر باقاعدہ ملازم ہوتے تو دفتری اوقات میں ہم سے بات تک کرنے کا وقت نہ نکالتے۔ یہی حال ان کی شریک کار امریکی خاتون کا تھا۔ وہ بھی موقع پا کر ہم سے فلمی دنیا کے بارے میں گپ شپ کر لیا کرتی تھی۔ وہ خود بھی ایک زمانے میں ایکٹریس بننے کے چکر میں تھیں۔ یہ داستان آپ کو پھر سنائیں گے۔

نغمی صاحب کمروں اور برآمدے سے نکل کر لفٹ میں سوار ہوئے اور نیچے لابی میں پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے عمارت سے باہر نکل کر سامنے والی سڑک عبور کی جہاں اس وقت زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔

ہم سے پوچھا "آپ نے کار کہاں پارک کی ہے؟"

ہم انہیں لے کر اپنی کار کے پاس پہنچ گئے، انہوں نے کہا "کار کا دروازہ کھولیے اور

میرے ساتھ چلیے۔"

ہم نے ایسا ہی کیا۔ بولے "آپ کو ون وے کی وجہ سے لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑے گا۔ ہمارے دفتر کے سامنے والی پارکنگ میں جانا ہے۔"

ہم نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اس پارکنگ میں ہم چند بار پہلے بھی ان کے ہمراہ جا چکے تھے کیونکہ وہ اپنی کار وہیں پارک کیا کرتے تھے۔

پارکنگ کے اندر پہنچ کر انہوں نے فرمایا "وہ سب سے آخری کونے والی خالی جگہ میں اپنی کار پارک کر دیں۔"

ہم نے ایسا ہی کیا۔ کار سے باہر نکلے تو پارکنگ کا انچارج آگیا۔ یہ ایک دیو زاد سیاہ فام تھا جسے نغمی صاحب "جیکی" کہہ کر پکارتے تھے۔

"ہائی جیکی!" انہوں نے کہا۔

"ہائی مین" وہ اپنے فٹ بھر کے پنجے سے اپنا تربوز سے بھی بڑے سائز کا سر کھجانے لگے "تم پھر آگئے، اور یہ کار!"

نغمی صاحب مسکرائے "جیکی۔ یہ کار میرے دوست علی کی ہے۔ تم تو ان سے مل چکے ہو؟"

"شیور" اس نے ایک بار پھر اپنا کفگیر جیسا ہاتھ مصافحے کے لیے ہماری طرف بڑھا دیا۔

"علی اپنی کار فی الحال یہیں پارک کیا کریں گے۔ اوکے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "اوکے۔ لیکن ......"

نغمی صاحب نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ہم سے مخاطب ہو کر بولے "آفاقی صاحب۔ آپ اسے ایک ڈالر دے دیا کرنا۔ کیوں جیکی، ٹھیک ہے نا؟"

"اوکے چیف" وہ مسکرانے لگا۔

ہم دونوں پارکنگ سے باہر نکل آئے۔ ہم نے پوچھا "مگر ہم کتنی دیر تک یہاں کار پارک کر سکتے ہیں؟"

"رات کو آٹھ بجے تک اس کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ اس وقت سے پہلے آپ اپنی کار نکال لیا کریں، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

ہم نے کہا "ٹھیک ہے۔ مگر نغمی صاحب' کیا امریکا میں بھی ......"
وہ ہنسنے لگے "ارے امریکا میں کیا نہیں ہوتا؟"
"کیا صرف کالے ہی ایسا کرتے ہیں یا گورے بھی؟"
وہ بولے "ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جسے موقع ملتا ہے وہ ہاتھ سے نہیں گنواتا۔"

اس طرح کچھ عرصے کے لیے ہماری پارکنگ کا مسئلہ بخیرو خوبی حل ہو گیا۔
ایک بار ہمیں اپنے کاموں کے سلسلے میں کچھ دیر ہو گئی اور یہ خیال ہی نہیں رہا کہ ہمیں آٹھ بجے سے پہلے اپنی کار حاصل کر لینی چاہیے تھی۔ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن سے نکل کر ہم دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پارکنگ کی جانب پہنچے۔ اندر گئے تو دیکھا کہ وہاں بہت ہلکی سی روشنی ہو رہی ہے۔ ہماری کار کے علاوہ صرف ایک اور بڑی سی کار موجود تھی جو اس کے برابر ہی کھڑی تھی۔ اس کے سوا نہ کوئی کار' نہ آدمی۔ ہم اپنی کار کی جانب بڑھے اور سوچتے رہے کہ باہر نکلنے والی رکاوٹ کو ہٹانے والا بٹن کون دبائے گا کیونکہ اس کے بغیر ہم اپنی کار پارکنگ سے باہر نہیں لے جا سکتے تھے۔
ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ بڑی سی کار کا دروازہ کھلا اور جیکی کا دیو قامت پیکر بر آمد ہوا۔ کم روشنی میں وہ کسی جن سے کم نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو ہم سہم کر رہ گئے۔

"ہائی مین" اس نے اپنی بھاری آواز میں کہا "بہت لیٹ ہو گئے؟"
ہم نے کہا "بس۔ ذرا دیر ہو گئی۔"
"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں" پھر اس نے بڑی کار کی کھڑکی میں منہ ڈال کر کہا "باہر آ جاؤ ہنی!"
کار کا دوسرا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک اور دیو زاد پیکر بر آمد ہوا۔
یہ ایک سیاہ فام خاتون تھیں۔ وہ گہرے رنگ کی لمبی سی میکسی میں ملبوس تھیں۔ قدو قامت میں جیکی سے قدرے کم ہوں گی مگر پھیلاؤ میں کسی طرح کم نہ تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک بوتل بھی تھی۔
"یہ ڈینی ہے" جیکی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا "یہ میری ڈیٹ ہے۔ تمہارا انتظار

تھا اس لیے ہم نے ڈیٹ یہیں منالی۔"
ہم اس کے خلوص اور احساس ذمے داری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔
"ہنی' اب ہم کھانا کھائیں گے اور پھر مووی دیکھنے چلیں گے۔ او کے!"
ہنی نے سر ہلا کر تائید کر دی۔ ہم نے کار اسٹارٹ کی اور رخصت ہونے کا ارادہ کیا۔ جیکی نے دفتر والے کمرے میں جا کر باہر جانے والا راستہ کھول دیا۔ اس بے چارے نے تو ہم سے کچھ نہیں کہا تھا مگر ہمارے ضمیر نے ہمیں ملامت کرنا شروع کر دیا۔ آخر ہم نے ضمیر کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اور کار سے اتر کر "جیکی" کے پاس گئے۔ "جیکی' تم کون سی مووی دیکھو گے؟"
"کوئی بھی دیکھ لیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے!"
ہم نے دس ڈالرز کا ایک نوٹ اس کی خدمت میں پیش کیا "مووی تم میری طرف سے دیکھنا۔"
اس نے دس ڈالر کے نوٹ کو دیکھا۔ خوش ہو کر اسے چوما' پھر آگے بڑھ کر اپنی "ڈیٹ" کو چوما اور اس کے بعد ہماری جانب رخ کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا ہم فوراً کار میں بیٹھ گئے۔ "بائی جیکی!" ہم نے ہاتھ ہلایا۔
"بائی علی۔ ٹیک کیئر۔"
ہم نے پارکنگ سے باہر نکلنے سے پہلے جیکی کی گونج دار آواز سنی۔ وہ اپنی گرل فرینڈ سے کہہ رہا تھا "مووی کو جہنم میں ڈالو ہنی' تھوڑی سی اور نہ پی لیں!"

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم شاید وان ڈائیک ایٹا صاحب کو بھول گئے یا پھر وہ
ہمیں فراموش کر بیٹھے؟ جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم تو خیر انہیں اس لیے نہیں بھول سکتے
تھے کہ ضرورت مند تھے۔ ہمیں جلد سے جلد اچھے سے اچھے کاروبار کی تلاش تھی۔ ہم اپنی
گرہ سے خرچ کر رہے تھے۔ اپنے ایک دوست کے گھر میں مہمان بنے ہوئے تھے۔ جب
تک ہمارے کاروبار کا فیصلہ نہ ہو جاتا ہم اپنے گھر کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے
تھے۔ ہر گزرنے والا دن ہمیں بے چین کر رہا تھا۔ ادھر آٹا صاحب ایک اسامی کو ہاتھ سے
گنوانے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب بھی موقع ملتا' یا ہم انہیں ملتے' وہ ہمیں کوئی نہ کوئی نیا
بزنس دکھانے کے لیے ضرور لے جاتے تھے۔

ایک رات ان کا فون آیا "علی تمہارے سارے مسائل حل ہو گئے۔ سارے دلدر
دور ہو گئے۔"

"وہ کس طرح؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس طرح کہ تمہارے لیے بہترین کاروبار ڈھونڈ لیا ہے میں نے۔ گھر بھی زیادہ دور
نہیں ہے اور بہت لاجواب چیز ہے۔ علاقہ بھی بے مثال ہے اور مالک بھی فروخت کرنے
کے لیے بہت بے تاب ہے۔ اب یوں کرو کہ صبح دس بجے مجھے وہیں ملو جہاں تم لڑکیوں
سے ملتے ہو" یہ کہہ کر وہ خوب زور زور سے ہنسے۔ ان کا اشارہ اسپیس اینڈ سائنس میوزیم
کی طرف تھا اور لڑکیوں سے مراد لوسی تھی۔ اس سے ہماری اپائنٹ منٹ عموماً اسی جگہ کی
ہوتی تھی۔

ہمیں خاموش پا کر وہ فون پر گرجے "سنو' کہیں تمہاری مسز تو آس پاس نہیں ہے؟"
سنو۔ اس معاملے میں ڈرنا نہیں چاہیے۔ مرد بنو' مرد۔ بیوی جو کچھ بھی ہے۔ بالآخر عورت

ہے۔ کیا سمجھے؟ تو پھر کل ٹھیک صبح دس بجے" انہوں نے اپنی بات ختم کرتے ہی فون بند کر
دیا۔

دوسرے دن ہم ملیحی صاحب کے ہمراہ بس کے ذریعے ان کے دفتر پہنچ گئے اور پھر
وائس آف امریکا کے دوستوں سے گپ شپ کرنے کے بعد پونے دس بجے سائنس اینڈ
اسپیس میوزیم کی سیڑھیوں پر جا پہنچے۔ اس کے گرد و نواح کے لوگ اب ہم سے بخوبی
واقف ہو چکے تھے۔ آئس کریم ہم نے اتنی کھائی تھی جتنی کہ مہلت ملی تھی۔ اس لیے
آئس کریم والی کو تو شاید خواب میں بھی ہماری شکل ہی نظر آتی ہو گی۔ ایک "ہاٹ ڈاگ"
فروخت کرنے والا تھا۔ اس سے ہم نے کبھی ہاٹ ڈاگ نہیں خریدا تھا مگر وہ ہر روز ہمیں
دیکھ کر مسکرایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں ندامت سی ہونے لگی کہ یہ بھی کیا سوچتا ہو گا کہ
یہ شخص ہر روز یہاں آتا ہے۔ ڈھیروں آئس کریم کھاتا ہے مگر کبھی ایک ہاٹ ڈاگ
خریدنے کی توفیق نہ ہوئی۔ چنانچہ ایک دن ہم نے اس کے پاس جا کر اپنا تعارف کرایا۔ وہ
مسکرانے لگا۔

"تمہیں اکثر آئس کریم کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں' یہ بتاؤ تمہیں وہ گداز جسم لڑکی پسند
ہے یا تم ڈائٹ پر ہو۔ حالانکہ تمہیں ڈائٹ پر جانے کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اس لیے ہاٹ ڈاگ نہیں کھاتے
کیونکہ ...."

".... کیونکہ یہ پورک ہوتا ہے" اس نے ہمارا جملہ مکمل کر دیا۔ پھر کہنے لگا "اس میں
ہرج ہی کیا ہے۔ تم ایک لذیذ نعمت سے محروم ہو۔ یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔"

بات کچھ بنی یا نہ بنی۔ مگر ہمارے دل کا بوجھ ضرور ہٹ گیا۔ اس کے بعد بھی جب وہ
ہمیں میوزیم کی سیڑھیوں پر منتظر دیکھتا تو دور ہی سے ہاتھ ہلا کر "ہائی" ضرور کر دیتا تھا۔ خاصا
خوش مزاج آدمی تھا۔ ایک دن ہم سے کہنے لگا "تم یہاں کیا کرتے ہو؟"

ہم نے کہا "انتظار!"

وہ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگا۔ ہم نے بتایا کہ بھائی یہ ہماری میٹنگ پلیس ہے۔ کوئی
اور ٹھکانا تو ہے نہیں۔ جس سے ملنا ہوا اسے یہیں کا وقت دے دیتے ہیں۔

کہنے لگا "میں تمہاری جگہ ہوتا تو یوں بے کار وقت ضائع نہ کرتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اتنا فالتو وقت بے کار ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اسے کام میں لاؤ۔"

"مثلاً کس طرح؟"

"مثلاً تم گائیڈ بن جاؤ۔ اتنے بے شمار لوگ ہر روز میوزیم دیکھنے آتے ہیں۔ انہیں اندر کی سیر کرا دیا کرو اور اپنی فیس کھری کرو۔"

"مگر ہمیں تو میوزیم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "تمہیں کس نے بتا دیا کہ گائیڈ کو زیادہ معلومات ہوتی ہیں؟ ارے ساری من گھڑت باتیں ہوتی ہیں۔ تھوڑی بہت معلومات اور زیادہ کہانیاں۔ چاند پر آدمی گئے تو کیا ہوا؟ خلا میں کیا چیز نظر آئی؟ کون سا ہوائی جہاز کب بنایا گیا تھا۔ چاہے جو تاریخ اور سن بتا دو۔ کسے یاد رہتا ہے۔ جتنی بڑھ چڑھ کر باتیں بناؤ گے اتنا ہی کام چلے گا تمہارا۔ وہ دیکھو' سامنے ایک فیملی آرہی ہے۔ ان سے ہی شروع کر دو۔"

سامنے ایک بس سے ایک چھوٹا سا گروپ برآمد ہوا تھا۔ ماں' باپ۔ دو نوجوان لڑکیاں' دو بچے۔ ایک بہت کم سن بچی۔

"یہ لوگ ساؤتھ سے آئے ہوئے لگتے ہیں۔ انہیں تو بالکل معلومات نہیں ہوتیں۔ چاہے جو انہیں بتا دینا۔ جاؤ' یونہی کرو۔"

وہ لوگ سیڑھیوں کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ بچیاں بہت خوش تھیں جب کہ نوجوان لڑکیاں حیرت سے آس پاس کے مناظر اور ہجوم کو دیکھ رہی تھیں۔ اس میوزیم میں ہر وقت آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا ہے۔ عجیب عجیب قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ان میں اکثریت تو امریکیوں ہی کی ہوتی ہے جو دوسرے شہروں اور ریاستوں سے سیر و سیاحت کے لیے یہاں آتے ہیں مگر غیر ملکیوں کی بھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ "ہاٹ ڈاگ" والے نے ہولے سے سیٹی بجائی اور ایک آنکھ بند کر کے ہمیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا مگر ہماری ہمت نہ پڑی۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ ترکیب خاصی اچھی تھی۔ پیسے کمانے کی ترکیبیں تو ان امریکیوں پر ختم ہیں۔

ٹھیک دس بجے آٹا صاحب کی لمبی چوڑی کار سیڑھیوں کے سامنے آکر رک گئی اور ہمیں دیکھ کر انہوں نے کار سے بازو باہر نکال کر "ہائی" کا نعرہ بلند کیا۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے گھڑی دیکھی اور کہا "ہماری گھڑی کے مطابق تم تین سیکنڈ لیٹ ہو۔"

"سوری" اس نے معذرت کی "بس ٹریفک کے ہجوم میں دیر ہو گئی۔"

اب ہم واشنگٹن کی سڑکوں کے ٹریفک میں گم ہو گئے۔

"پہلے میں تمہیں ایک گھر دکھاؤں گا۔ ۲۶ ویں اسٹریٹ پر ہے۔ دوسری منزل پر بہت خوب صورت اپارٹمنٹ ہے۔"

"مگر بزنس سے پہلے گھر........"

"بزنس بھی مل جائے گا۔ حوصلہ رکھو۔"

دن کے وقت واشنگٹن کی سڑکوں پر بے پناہ رش ہوتا ہے مگر بہت نظم و ضبط کے ساتھ ٹریفک چلتا رہتا ہے۔ کوئی اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ نہ کوئی جلد بازی کرتا ہے۔ ٹریفک لائٹ سرخ ہو جائے تو امریکی صدر کی کار بھی رک جاتی ہے۔ نصف گھنٹے بعد ہم مختلف خوب صورت سڑکوں سے گزر کر ایک رہائشی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں قریب قریب سبھی مکان دو منزلہ تھے اور بہت خوب صورت اور صاف ستھرے۔ بعض مکانوں کے سامنے مختصر سا لان بھی تھا۔

"یہ لو' پہنچ گئے" آٹا نے کار روک دی "یہ جہاں میں کار پارک کر رہا ہوں نا۔ یہ تمہاری پارکنگ ہو گی۔"

رہائشی مکانوں کے سامنے ہر ایک کے لیے ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ جس کے لیے اسے بلدیہ کو کچھ فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ مگر یہ حق صرف رات ہی کے وقت حاصل ہوتا ہے۔ دن کے اوقات میں کوئی بھی وہاں کار پارک کر سکتا ہے۔

آٹا نے اوپر والے زینے کے ساتھ لگا ہوا بزر دبایا اور انٹرکام پر بات کرنی شروع کر دی۔ سامنے کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ یہ سب کارروائی اوپر سے کی گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم ایک خوبصورت لاؤنج میں پہنچ گئے۔ فرش نہایت چکنا اور خوب صورت لکڑی کا تھا۔ شیشے کی مانند چمک رہا تھا۔ چند صوفے' ایک راکنگ چیئر' ایک جانب ٹی وی ٹیبل اور دوسری طرف کھانے کی گول میز' بالکل سامنے ایک خاتون کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ان کی عمر ستر سے لے کر ایک سو ستر سال تک کچھ بھی ہو سکتی تھی۔

ان کی کمر کمان کی طرح خمیدہ تھی۔ بے حد ضعیف اور کمزور نظر آ رہی تھیں مگر جب بولیں تو آواز میں کرارا پن تھا۔ ان کے منہ میں ایک بھی دانت نہ تھا۔ بتیسی شاید انہوں نے ا ریسٹ دینے کے لیے نکال کر رکھ دی تھی اس کی وجہ سے ان کی بات سمجھنے میں کافی مشکل پیش آئی تھی مگر آٹا غالباً اس کا عادی تھا۔

"اوہ مسز ہارڈی ینگ" اس نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے "آپ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ ہمیشہ کی طرح اسمارٹ، خوب صورت اور تروتازہ" حالانکہ ان میں سے کوئی ایک تعریف بھی ان پر صادق نہیں آتی تھی۔ البتہ وہ میک اپ سے پوری طرح لیس تھیں "یہ دیکھیے آپ کا نیا کرایہ دار۔ علی، یہ مسز ینگ ہیں، لینڈ لیڈی۔ آس پاس کے بارہ اپارٹمنٹس ان ہی کی ملکیت ہیں۔ یہ زیادہ تر جنوبی فرانس میں رہتی ہیں۔ یہ دیکھو، کتنا اچھا اپارٹمنٹ ہے!"

اپارٹمنٹ واقعی بہت اچھا تھا مگر واشنگٹن شہر میں تھا۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے آس پاس کوئی جگہ نہ تھی۔ سبزہ بھی زیادہ نہ تھا۔ پھر جب قیمت سنی تو ہوش اڑ گئے "یہ واشنگٹن ڈی سی ہے علی۔ امریکا کا دارالحکومت۔ یہاں تو کرائے پر مکان ملنا ہی ناممکن ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ وہائٹ ہاؤس کے گردونواح میں تمہارا گھر ہو گا۔"

مسز ینگ نے ہمیں بہت غور سے دیکھا پھر سامنے والی میز کی طرف گئیں۔ انہوں نے پہلے تو میز پر سے عینک اٹھا کر آنکھوں پر رکھی۔ پھر اس میں لگا ہوا آلہ اپنے کان میں لگایا۔ اس کے بعد ایک پیالے میں سے بتیسی اٹھا کر اپنے منہ میں فٹ کی اور پھر کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیا۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ان بڑی بی کے منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت، آنکھوں سے صحیح طور پر دکھائی نہیں دیتا، کانوں سے سنائی نہیں دیتا۔ یہ جنوبی فرانس میں جا کر کیا کرتی ہیں۔ ان کے لیے تو سبھی مقامات یکساں ہیں۔

انہوں نے تیز آواز میں کہا "نوجوان، تم نے اپارٹمنٹ دیکھا؟"

"جی ہاں۔"

"پسند آیا؟"

"جی بہت اچھا ہے۔"

"تو پھر میں کل وکیل کو بلا لوں گی، لیز سائن کرنے کے لیے۔"

ہم نے پریشانی سے آٹا کو دیکھا اور کہا "مگر ابھی ہم اپنی مسز کو بھی یہ گھر دکھائیں گے۔"

بڑی بی نے کہا "جب تمہیں پسند ہے تو مسز کو بھلا کیا اعتراض ہو گا۔ ہمارے زمانے ں مارے فیصلے مرد ہی کیا کرتے تھے۔ بہر حال تم اپنی بیوی کے شوہر ہو۔ میں کیا کہہ سکتی وں؟"

اس کے بعد مزید بات چیت کی گنجائش نہیں تھی۔ ان سے اجازت لے کر ہم بڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ آٹا صاحب کہنے لگے "ہمارے جاتے ہی اس نے دوبارہ عینک ر بتیسی نکال کر رکھ دی ہو گی۔"

"وہ کیوں؟"

"بہت کنجوس ہے۔ اس کا بس چلے تو سانس بھی نہ لے۔"

اس خاتون کی کہانی یہ تھی کہ یہ ساری جائداد کی اکیلی وارث تھیں۔ باقی سب مر کھپ گئے تھے۔

اللہ بس، باقی ہوس۔

ہم نے آٹا صاحب کو بتا دیا کہ ہم یہ اپارٹمنٹ نہیں لیں گے، وہ بولے "یو آر دی ں۔"

امریکی بلاوجہ بحث کرنے کے عادی نہیں ہیں نہ کسی پر اپنی رائے ٹھونستے ہیں۔

"اب ہم چودھویں اسٹریٹ پر جا رہے ہیں" انہوں نے اعلان کیا "بہت مشہور اسٹریٹ ہے جانتے ہو؟"

ہم نے کہا "ہمارے ہاں تو چودھویں کا چاند ہوتا ہے۔"

"وہ تو یہاں بھی ہوتا ہے۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا خاص بات ہے اس میں؟"

ہم نے کہا "یہ بہت لمبا قصہ ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"اوکے۔"

چودھویں اسٹریٹ پر پہنچتے ہی انہوں نے فرمایا۔ "اب ہم ایک ویڈیو شاپ دیکھنے جا رہے ہیں۔"

چودھویں اسٹریٹ پر مختلف قسم کی دکانیں تھیں۔ رہائشی اپارٹمنٹ بھی تھے مگر آٹا

صاحب نے بتایا کہ یہ اپنی نائٹ لائف' نائٹ کلبوں اور ایکس سینما گھروں کے حوالے سے
بھی مشہور ہے۔

"یہ ویڈیو شاپ بہت موقع پر ہے۔ آس پاس نائٹ کلب ہیں۔ صبح سے رات گئے
تک خوب رش رہتا ہے اور یہیں پیپ شو بھی ہوتا ہے۔"

PEEP SHOW کے بارے میں ہم جانتے تھے۔ لندن میں پکاڈلی کے آس پاس کی
گلیوں میں بھی اس قسم کی دکانیں موجود ہیں جہاں سیاحوں کے دم قدم سے خوب رونق لگی
رہتی ہے۔

"بہت اچھا بزنس ہے۔ منافع ہی منافع ہے۔"

ہم نے کہا "مسٹر وان ڈائیک۔ بہتر ہے کہ واپس چلو۔"

وہ حیران ہو کر ہمارا منہ دیکھنے لگا "مگر وہ دکان تو دیکھ لو۔"

"سوری۔ ہم اس قسم کا بزنس نہیں چاہتے۔"

"مگر اس میں منافع بہت ہے .... ایسے سودے بار بار نہیں ملتے۔"

"نہیں بس اسے رہنے دو۔"

"تمہاری مرضی۔ میرے پاس اس کے اور بھی گاہک ہیں" انہوں نے کار کا رخ موڑ
لیا "دراصل یہ دن کا وقت ہے نا۔ اس لیے رونق نہیں ہے۔ یہ جگہ تو دراصل شام کے
بعد دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ اس قسم کے دھندوں کو ہمارے ہاں کس نظر سے دیکھا جاتا
ہے مگر امریکی یہ نہیں سمجھیں گے۔ جیسے ہم ان کی بہت سی باتیں نہیں سمجھتے۔

امریکا میں ذریعہ معاش کی تلاش میں مصروف رہنے کے باوجود ہم سیرو سیاحت کے
لئے بھی وقت نکالتے رہے۔ واشنگٹن اور گردو نواح کے قابل دید مقامات دیکھے۔ واشنگٹن
درحقیقت ایک نہایت خوبصورت اور خوش نظر شہر ہے۔ شہر کا بیشتر حصہ قدیم طرز کے
مکانات اور عمارتوں پر مشتمل ہے۔ عام امریکیوں میں بھی ہم نے فیشن پرستی اور اظہار
ولت مندی کا شوق نہیں دیکھا۔ وہ پر آسائش زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں اور اس کی
ض خواہش ہی نہیں کرتے بلکہ اسے حاصل کرنے کے لئے سخت محنت اور ان تھک
لریقے پر کام کرتے ہیں۔ یعنی کام کے وقت کام اور انتہائی توجہ اور لگن کے ساتھ محنت۔
ارے اندازے کے مطابق عام طور پر ہمارے ایک درجن کارکن بھی ایک امریکی کے
ابر کام نہیں کرتے۔ ہمارے اور ان کے کام میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ وہ کام کو سجا بنا
ر کرتے ہیں' محض بیگار یا خانہ پری نہیں سمجھتے۔ ان ملکوں کو اللہ میاں نے تو صرف
لیق کیا ہے' انہیں ترقی دینے اور خوب صورت بنانے کی تمام ذمے داری انسانوں نے
رانجام دی ہے۔ ہم ان کی جن آسائشوں اور سہولتوں کو دیکھ کر ان پر رشک کرتے ہیں
انہوں نے خود ہی اپنے لئے حاصل کی ہیں۔ ہم جس انداز میں کام کرتے ہیں' وقت اور
ی دولت کا زیاں کرتے ہیں' سرکاری محکمے جس غفلت' بددیانتی' بدعنوانی اور بے حسی کا
اہرہ کرتے ہیں اگر ان پر پچاس فی صد بھی قابو پالیا جائے تو ہمارا ملک ان سے کہیں بہتر
سکتا ہے۔ مگر ان دل جلانے والی باتوں سے کیا حاصل ہے؟

"واشنگٹن مانومینٹ" یعنی یادگار واشنگٹن دیکھنے کے بعد ہم ایک دن نغمی صاحب کے
شورنس آفس پہنچے تو ان کی روم میٹ روزی نے بہت گرم جوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔
وں نے الماری کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ نغمی صاحب کی ٹوپی اور کوٹ وہاں لٹکا ہوا
ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ دفتر ہی میں کہیں مصروف ہیں۔ کچھ دیر میں آجائیں گے۔
ماانثاء میں وہ بذات خود اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں گئیں اور کافی کا ایک کاغذی گلاس

بھر کرلے آئیں۔

بولیں "میں نے اس میں چینی کے چھ ٹکڑے ڈالے ہیں اور تھوڑی سی کریم بھی ہے"
ہم نے چکھ کر دیکھا تو نہایت شیریں اور مزیدار کافی تھی۔ ان کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے اتنی جلدی ہماری ضروریات اور مزاج کو سمجھ لیا۔ وہ شانے اچکا کر مسکرانے لگیں اور بولیں "اٹ از اوکے!"

نغمی صاحب کی غیر موجودگی میں ہمیں روزی کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سنہری بالوں' شہد اور دودھ جیسی رنگت اور شہد کے رنگے جیسے بالوں والی ایک دلکش لڑکی تھی۔ نغمی صاحب نے ہمیں اس کی عمر ۲۸۔۲۹ سال بتائی تھی مگر دیکھنے میں وہ بیس بائیس سال کی دوشیزہ نظر آتی تھی۔ طبیعت اور طور طریقے بھی اچھے تھے' دوسروں کی ضروریات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی اس کے اندر تھی پھر اتنی کم سنی میں دوبار شادی اور دونوں بار طلاق لینے کی کیا وجہ ہوئی؟ ہم سوچنے لگے۔

یکایک اس کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے دریافت کر رہی تھی "کیوں کیا خیال ہے؟ میں ہیروئن بن سکتی ہوں؟"

ہم نے حیران ہو کر اسے دیکھا' بولی "تم اتنے غور سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ میں سمجھی شاید یہ اندازہ لگا رہے ہو کہ میں ایکٹریس بن سکتی ہوں یا نہیں؟"

ہم نے کہا "اس میں شک نہیں ہے کہ اگر ہم نے یہاں کوئی فلم بنائی تو تمہیں ار میں ضرور کاسٹ کریں گے۔"

وہ خوش ہو گئی "واقعی! مگر تم کس زبان میں فلم بناؤ گے؟"

"اردو میں۔"

"مجھے تو اردو نہیں آتی۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ ہم رومن میں تمہیں مکالمے لکھ کر دے دیا کریں گے اور پھر گائیڈ ٹریک کی مدد سے کسی اور لڑکی کی آواز میں اردو میں ڈب کرلیں گے۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟" اسے ہماری بات کا یقین نہیں آیا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں امریکی فلمیں مقامی زبانوں میں ڈب کر کے دکھائی جاتی ہیں۔"

"تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔ نغمی نے کہا تھا کہ تم تجربہ کار فلم پروڈیوسر ہو۔"

دراصل باہر کی دنیا کے بارے میں عام امریکیوں کی معلومات صفر کے برابر ہوتی ہیں۔ آپ انہیں جو چاہے بتا دیجئے وہ اس پر یقین کرلیں گے۔

"تم یہاں فلم بناؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"مشکل ہے۔ یہاں کوئی اسکوپ نہیں ہے اردو فلموں کے لئے۔"

اس نے سرد آہ بھری "اسی لئے تمہیں کوئی بزنس پسند نہیں آرہا۔ نغمی نے کہا تھا کہ تم نے ساری زندگی صرف فلمیں ہی بنائی ہیں۔ سنو' تم اپنا ملک چھوڑ کر امریکا کیوں آگئے؟ کیا سیاسی پناہ کی تلاش میں؟"

ہم اس کا مطلب سمجھ گئے۔ اس زمانے میں دنیا کے مختلف ملکوں سے آنے والوں کی لرح پاکستانیوں کی آمد کا سلسلہ بھی تیز ہو گیا تھا اور امریکی آئین کے مطابق انہیں "سیاسی اہ" دے دی جاتی تھی۔ ایرانی' افغانی' کیوبن' چینی ویت نامی اور اب پاکستانی سبھی امریکی ہت حاصل کرنے کے لئے جھوٹے سچے بیانات دے کر یہ ثابت کر دیا کرتے تھے کہ سیاسی لریات میں اختلاف کے باعث حکومت وقت نے ان کی زندگی وبال کر دی ہے۔ ان کی ان کو خطرہ ہے اس لئے وہ پناہ کی تلاش میں امریکا آگئے ہیں۔ اس بنیاد پر لاکھوں افراد کو رکی شہریت دے دی گئی تھی۔ پاکستان سے جانے والے کہتے تھے کہ وہ ملک میں فوجی مومت کے حوالے سے جانیں بچا کر بھاگے ہیں۔

ہم نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سیاسی آدمی نہیں ہیں اس لئے سیاسی پناہ لینے اسوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کہنے لگی "معاف کرنا۔ میں نے تمہارے ذاتی معاملات میں مداخلت کر دی۔"

ہم نے کہا "معاف تو کر سکتے ہیں مگر ایک شرط پر۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ ہم بھی تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دیں گے۔"

وہ ایک دم کرسی پر تن کر بیٹھ گئی اور پریشان ہو کر بولی۔ "اوہ۔ نو۔"

ہم نے کہا "تو پھر جانے دو۔" اور بے تعلقی سے کافی پینے میں مصروف ہو گئے۔

وہ کچھ دیر ٹائپ کرنے میں مصروف رہی اور کن انکھیوں سے ہمیں دیکھتی رہی پھر

جب ہم نے کوئی توجہ ہی نہیں دی تو تنگ آکر ٹائپ رائٹر پر اس کی انگلیاں تھم گئیں۔ ایک لمبی سانس لے کر کہنے لگی "اوکے اوکے۔ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پوچھو تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

ہم نے کہا "رہنے دو۔ کوئی اور بات کرو۔"

بولی "علی، تم نے مجھے اپ سیٹ کر دیا ہے اگر تم نے مجھ سے نہیں پوچھا تو مجھے یقیناً اپنے نفسیاتی معالج کے پاس جانا پڑے گا۔"

ہم پریشان ہوئے کہ بلاوجہ اس نازک اندام کو ہم نے اعصابی تناؤ کا شکار کر دیا۔ بہرحال، اس کی حاجت روائی بھی مطلوب تھی اس لئے ہم نے بلاوجہ کا تجسس پیدا کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ہم نے کہا "روزی۔ تم ایک پڑھی لکھی، خوب صورت لڑکی ہو۔ ذہین بھی ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہارے اندر انڈر اسٹینڈنگ کی بھی کمی نہیں ہے۔ خاصی صلاح کل اور خوش مزاج بھی معلوم ہوتی ہو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ تمہاری ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہوئی؟"

اس نے ایک لمبی سانس لی اور مسکرا کر بولی "بس اتنی سی بات تھی؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نہ جانے کیا پوچھ بیٹھو گے اور مجھے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس ڈسکشن سے پہلے ہم دونوں کو کافی کے ایک کپ کی ضرورت پڑے گی۔ کیوں کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا "ٹھیک، ہم تمہارے لئے کافی لے آتے ہیں۔"

برابر والے کمرے میں کافی ہر وقت تیار رہتی تھی۔ ہم نے اس کے لئے ایک کاغذی گلاس میں محض بلیک کافی ڈالی اور اپنے گلاس میں چھ سات چینی کے کیوبس اور فریج میں سے نکال کر ڈھیر ساری کریم ڈالی اور کافی کپ لا کر اس کے سامنے دھر دیا۔ اس نے ایک گھونٹ بھرا اور کہا "شکریہ، تم نے بہت لذیذ کافی بنائی ہے۔"

حالانکہ ہماری اس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ ہاں پکتی ہوئی کیتلی میں سے ہم گلاس میں کافی انڈیلنے کے قصوروار ضرور تھے مگر یہ بھی امریکیوں کے حسن اخلاق کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔

"تمہیں یہ سوال کرنے کا خیال کیوں سوجھا؟" اس نے دریافت کیا۔

ہم نے سوچا صاف صاف بات کرنی چاہیے، کہا "روزی، ہمارے ملک میں تم جیسی لڑکیوں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ شادی کے بعد شوہر بھی ان کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سنا ہے کہ تم ایک چھوڑ دو شادیاں کر چکی ہو اور پھر بھی غیر شادی شدہ ہو۔ ہمیں یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے۔"

کہنے لگی "دیکھو علی، مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے ملک میں شادیاں کیوں ہوتی ہیں اور کیوں قائم رہتی ہیں یا کس لئے طلاق ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہاں یہ بہت عام سی بات ہے۔ دراصل ہم لوگ شاید شادی کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ چٹ پٹ شادی ہو جاتی ہے اور اسی طرح علیحدگی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شادی اب ہمارے معاشرے میں کوئی پاکیزہ، ضروری اور قابل احترام چیز نہیں رہی۔ شادی ہو یا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عورتیں بھی مردوں کی طرح آزاد اور خودمختار ہیں۔ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ کوئی پابندی پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے بلاوجہ گھر اور شادی کی بندش اور ذمے داریوں سے آزاد رہنا چاہتی ہیں اور مرد تو سدا کے ہرجائی ہیں۔ انہیں تو تھوڑے تھوڑے عرصے بعد پارٹنر بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہی رہتی ہے۔"

روزی نے ہمیں شادی بیاہ کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی بتائیں۔ پہلے ہم یہ بتا دیں کہ روزی کے نام کے بارے میں بھی پوری طرح یاد نہیں آرہا۔ اس کا نام روزی یا شیرل تھا۔ شیرل کے آگے کچھ اور بھی منسلک تھا جو غالباً اس کے شوہر کا نام تھا۔

بہرحال ہم اس کا نام روزی ہی فرض کر لیتے ہیں۔

روزی نے اپنے ٹھہرے ہوئے ملائم لہجے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ حیرت انگیز بھی تھا اور عبرت ناک بھی۔ مثلاً شادی کا رواج ایک تو اس لیے ختم ہوتا جا رہا ہے کہ شادی کرنا اب فیشن کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ بلاوجہ کی پابندیاں کون مول لے جب کہ عورت اور مرد کو کھلے عام شادی کے بغیر ایک ساتھ رہنے کی آزادی حاصل ہے۔ اس طرح نہ تو عورت کو بیوی بن کر شوہر کا پابند ہونا پڑتا ہے اور نہ ہی شوہر کسی قسم کی ذمے داریاں قبول کرتا ہے۔ مغرب میں ایک اچھی یا بری بات یہ بھی ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان طلاق ہو جائے تو اکثر حالات میں شوہر بیوی کو خاصی موٹی رقم ادا کرتا ہے۔ دولت مند لوگوں کو اپنی دولت کا اچھا خاصا حصہ بیوی کو دینا پڑتا ہے اور متوسط لوگ اپنی کمائی میں سے ایک

مقررہ رقم مطلقہ بیوی کو دینے کے پابند ہیں۔ بغیر شادی کے ایک ساتھ رہنے کی صورت میں شوہر اس بلاوجہ کے خرچے سے بھی بچ جاتا ہے پھر ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ خواہ مخواہ اولاد کا جھنجھٹ بھی نہیں پالنا پڑتا۔ ظاہر ہے کہ جب ایک مرد اور عورت محض عارضی طور پر ایک ساتھ رہتے ہوں تو وہ عیال داری کے جھگڑوں میں پڑنا پسند نہیں کرتے۔ بغیر شادی کے رہنے والے اپنی اپنی کمائی بھی کرتے رہتے ہیں اور اپنے اپنے اخراجات بھی برداشت کرتے ہیں۔ گویا کوئی بھی فریق دوسرے پر بار نہیں بنتا۔

یہ سب "فوائد" تو کسی حد تک پہلے بھی ہمیں معلوم ہی تھے مگر روزی نے ایک اور نکتہ بھی بیان کیا۔ اس نے بتایا کہ اگر میاں بیوی دونوں برسر روزگار ہیں تو ان کی مشترک آمدنی پر ٹیکس لگتا ہے لیکن اگر وہ شادی کے بندھن سے آزاد ہوں تو پھر انہیں نسبتاً کم ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ گویا معاشرہ اور نظام مملکت بھی مرد اور عورت کو شادی نہ کرنے اور شادی کے بغیر ہی گناہ کی زندگی بسر کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔

ہم نے کہا "بھئی تم نے تو اب شادی کا مزہ بھی چکھ لیا۔ کیا خیال ہے اب دوبارہ بھی شادی کرو گی یا اسی طرح آزاد رہنا پسند کرو گی؟"

"کون جانتا ہے" اس نے بڑے ہیجان خیز انداز میں شانے اچکائے اور بولی "فی الحال تو بہت اچھی گزر رہی ہے۔ دوست بھی ہیں۔ سوشل لائف بھی ہے۔ اچھی جاب ہے۔ ایک کمرے کا اپارٹمنٹ ہے۔ میرے لیے بہت کافی ہے۔ شادی کرنے کی کوئی خاص ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی۔"

بقول شاعر۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

اتنی دیر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور اس نے بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں شروع کر دیں۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی بوائے فرینڈ تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ سابق شوہر کے ساتھ ویک اینڈ کا پروگرام طے کیا جا رہا تھا۔ بہت خوب' کیا ٹھاٹ ہیں! نہ شادی کی فکر' نہ طلاق کا غم' نہ علیحدگی کا ڈر' شادی سے پہلے بھی درست اور شادی کے بعد بھی۔

اس نے پوچھا "تم نے کتنی شادیاں کی ہیں؟ اس وقت شادی شدہ ہو یا اکیلے؟"

یہ وہ سوال ہے جو یورپ اور امریکا میں ہم سے بار بار پوچھا گیا اور ہم نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا "بھئی ہماری تو ایک شادی ہوئی تھی۔ وہی چلی آرہی ہے اب تک۔"

"اوہ۔ کتنی عجیب بات ہے! سنو اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھو؟"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں؟"

"کیا تم لوگ ایک دوسرے سے بور نہیں ہوتے؟"

ہم نے کہا "دراصل ہم لوگوں کو بور ہونے کی عادت سی پڑ جاتی ہے۔ اس لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ ہم مشرقی لوگوں میں ایک اور فرق بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم لوگ بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ کوئی تعلق یا رشتہ ایک بار قائم ہو جائے تو پھر اسے توڑنا ہم لوگوں کے لئے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

"کتنی عجیب سی بات ہے! کیوں ہے نا؟" اس نے ایک لمبی سرد آہ بھر کر پوچھا۔

"شاید۔" ہم نے کہا۔

اسی وقت نغمی صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

"ارے۔ آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ ابھی آپ ہی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔"

"کہاں؟"

"ہمارے منیجر ایک انڈین ہیں۔ بہت دلچسپ اور بھلے آدمی ہیں۔ میں ان ہی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ آپ کا ذکر آیا تو وہ ملنے کی خواہش ظاہر کر رہے تھے۔ ٹھہریئے' میں ابھی پوچھتا ہوں۔"

انہوں نے انٹرکام پر ایک بٹن دبایا اور باتیں کرنے لگے "آداب عرض۔ ابھی میں اپنے کمرے میں آیا تو آفاقی صاحب آئے ہوئے ہیں اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔ ٹھیک ہے۔ ہم ابھی آرہے ہیں۔" انہوں نے فون بند کر دیا "آیئے۔ آپ کو ان سے ملاتے ہیں۔"

روزی کی سمجھ میں ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ شانے ہلا کر اور منہ بنا کر دوبارہ ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

نغمی صاحب کے کمرے سے نکل کر ہم مختلف ہال کمروں' گیلریوں اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے منیجر صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔ بڑے معقول اور دلچسپ جوان آدمی

تھے۔ گندمی رنگت، سیاہ آنکھیں، سیاہ بال، سیاہ مونچھیں، آنکھوں پر چشمہ، بہت گرم جوشی سے ملے۔ ان کا نام صحیح طور پر یاد نہیں رہا مگر بھائیہ، چکرورتی یا اسی قسم کا تھا۔ وہ الہ آباد یا لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ وہیں تعلیم حاصل کی تھی اس لیے اردو کا لب و لہجہ اور تلفظ نہایت شستہ اور شائستہ تھا۔ ان کے کمرے کی ایک دیوار شیشے کی تھی جس میں سے واشنگٹن کی بلند عمارتیں نظر آتی تھیں۔ بہت خوشنما منظر تھا۔

تعارف اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولے "مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے مگر آپ کے پاکستان کی کوئی فلم نہیں دیکھی۔ اشتیاق ضرور ہے۔ ممکن ہو تو کوئی اپنی فلم دکھایئے۔"

ہمارے پاس تو فلم تھی نہیں۔ نہ ہی ویڈیو کی دکانوں پر پاکستانی فلمیں دستیاب تھیں۔ پاکستانی سفارت خانے میں پاکستانی فلموں کی موجودگی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہاں پاکستانی فلمیں اور کہاں سفارت خانے کے افسر لوگ۔ وہ کوئی بھارتی سفارت خانہ تو تھا نہیں جہاں لوگوں کو مدعو کر کے اور پکڑ پکڑ کر بھارتی فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور اپنے ہنرمندوں اور فن کاروں سے مقامی لوگوں کو متعارف کرایا جاتا ہے۔

انہوں نے ہمیں بہت اچھی قسم کی چائے پلائی اور بتایا کہ یہ خاص انگلش چائے ہے جو بہت مشکل سے تلاش کر کے لاتا ہوں کیونکہ امریکیوں کو تو چائے پینے کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔ ہمارے بزنس کے بارے میں باتیں شروع ہوئیں تو انہوں نے بہت سی مفید معلومات فراہم کیں پھر یہ مشورہ دیا کہ اگر گرین کارڈ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو چھاپڑہ صاحب سے رابطہ قائم کریں۔

"کون چھاپڑہ؟" ہم نے پوچھا۔

"ایک انڈین وکیل ہے، بہت چلتا پرزہ ہے۔ آپ کے ہاں تو مارشل لاء ہے اور یہاں "سیاسی پناہ" کا چکر چل رہا ہے۔ چھاپڑہ منٹوں میں آپ کو گرین کارڈ دلا دے گا۔ بس اتنا ثابت کرنا ہو گا کہ پاکستان میں لوگوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ آپ کی جان و مال محفوظ نہیں ہیں، اس لیے سیاسی پناہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میرا بہت اچھا واقف ہے۔ کہیے تو اس سے بات کروں؟"

ہم نے کہا "جی نہیں۔ فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اور ہمیں مارشل لاء حکومت

ے ایسی کوئی تکلیف بھی نہیں ہے۔"

نعمی صاحب حسب معمول جذباتی ہو گئے۔ کہنے لگے "آفاقی صاحب۔ گرین کارڈ کے لالچ میں ہمارے پاکستانیوں نے ملک کو خوب ذلیل اور رسوا کیا ہے۔ ایسا نقشہ پیش کرتے ہیں کہ سننے والوں کو ترس آجاتا ہے مگر ملک کی کتنی بدنامی ہو رہی ہے اور ان باتوں میں کتنا جھوٹ اور کتنا سچ ہے اس کا کسی کو احساس نہیں ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ایسے پاکستانیوں کی وکالت زیادہ تر انڈین وکیل کرتے ہیں اور ہمارے ملک کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ شرم آجاتی ہے۔"

چکرورتی صاحب نے کہا "خیر چھوڑیے، کوئی اور بات کرتے ہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر آپ امریکا میں بزنس کے سلسلے میں قیام کرنا چاہتے ہیں تو عام سیاحت کا ویزا کام نہیں آئے گا۔ بہتر ہو کہ آپ "بزنس ویزا" حاصل کریں۔ ورنہ آگے جا کر مشکل پیش آسکتی ہے۔"

"کوئی نہیں پوچھتا جناب۔"

پھر بھی اگر کسی نے پوچھ لیا تو مشکل ہو جائے گی۔ آپ اور ٹائپ کے آدمی ہیں ورنہ یہاں تو ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو ویزا کے بغیر ہی خاندانوں سمیت لاپتا ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ کوئی شریفانہ زندگی تو نہ ہوئی۔"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ قانون سے ڈرنا شاید ہمیں گھٹی میں پلایا گیا تھا۔ جب ہم اپنے ملک میں قانون سے ڈرتے ہیں تو پردیس کی تو بات ہی اور ہے۔ ان کا یہ مشورہ ہمارے دل کو لگ گیا اور ہم ایک نئے وہم میں مبتلا ہو گئے۔ لاکھ سب نے سمجھایا کہ بھائی آپ کو بزنس کرنے کے لئے بزنس ویزا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تو کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ بھائی تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ چاہے کوئی چیز خریدو یا بیچو۔ کیا مجال جو کوئی پوچھ لے کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ امریکی شہری ہیں بھی یا غیر ملکی ہیں؟ گرین کارڈ دکھائیں! دراصل امریکی تو خالص بنئے ہیں۔ ہزار بنیے مرتے ہیں تب ایک امریکی جنم لیتا ہے۔ انہیں تو پیسے سے سروکار ہے۔ کون کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا؟ ان کی بلا سے۔ انہیں تو بس کاروبار سے غرض ہے۔

اکمل علیمی صاحب نے خالص امریکی انداز میں ہمیں کوئی بھی مشورہ نہیں دیا۔ بس اتنا

کہا کہ پتا کر لیجئے اگر جانا ضروری ہے تو چلے جائیں۔ نیر زیدی صاحب کا خیال تھا کہ جانا غیر ضروری ہے۔ نفی صاحب رہ رہ کر سمجھا رہے تھے کہ بھائی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سارے خاندان کو سامان سمیت لاد کر لے جائیں گے اور پھر واپس آئیں گے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟ ہم نے لیلیٰ سے مشورہ لیا تو انہوں نے خالص جنتی بیویوں کی طرح فرمایا "جو آپ مناسب سمجھیں۔"

"بھئی تمہاری بھی تو کوئی رائے ہو گی۔ اپنی ذاتی رائے دو؟"

"اچھا۔ تاکہ غلط نکلے تو مجھے ہزاروں باتیں سننی پڑیں؟"

"بالکل نہیں۔ وعدہ رہا۔ مگر تم اپنی رائے تو بتاؤ۔"

تھوڑی دیر غور و فکر فرمایا پھر بولیں "آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا "سوچتے ہیں بلاوجہ خطرہ کیوں مول لیں۔ ویزا بدلوا کر آجاتے ہیں پھر اطمینان سے یہاں کوئی بزنس کریں گے۔"

فرمایا "بالکل ٹھیک خیال ہے' ایسا ہی کریں۔"

لیجئے ہو گیا فیصلہ۔ ہم نے واپسی کا پکا ارادہ کر لیا۔ جوزفین' لوسی' آغا سب کو بتا دیا کہ ہم کچھ عرصے کے لیے واپس جا رہے ہیں۔ واپس آئیں گے تو بزنس کریں گے۔ تم لوگ اچھا سا بزنس اور گھر تلاش کر کے رکھو۔ آغا صاحب نے تو یہ سن کر دوبارہ ہمارے گھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ شاید سوچا ہو گا کہ یہ بندہ تو گیا ہاتھ سے۔ واپس جا کر دوبارہ کیوں آئے گا؟

جوزفین نے ہمارا پاکستان کا پتا بھی حاصل کر لیا اور فون نمبر بھی۔ اس نے یقین دلایا کہ علی فکر نہ کرو۔ جب تم واپس آؤ گے تو دو ہفتے کے اندر تمہاری ہر ضرورت پوری ہو جائے گی۔ اوکے' ٹیک کیئر' یہ کہہ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

لوسی نے ہمیں فون کر کے بتایا کہ وہ ہمیں ہمارے مخصوص اڈے یعنی ائر اینڈ اسپیس میوزیم سے پک کر لے گی۔ ہم وقت مقررہ سے پہلے سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ وہی منظر تھا' وہی ماحول تھا اور وہی لوگ' اسی طرح جوق در جوق سیاحوں اور سیربینوں کے گروہ آرہے تھے۔ طرح طرح کے لوگ' طرح طرح کے فیشن' طرح طرح کے چہرے۔ سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر وہی آئس کریم اور لولی پاپ بیچنے والی گداز جسم لڑکی اور کچھ فاصلے پر ہاٹ ڈاگ کی پیڑھی لگانے والا وہی شوخ و شنگ لڑکا۔

ہمیں دیکھا تو دور ہی سے آواز لگائی "ہے!" (اے امریکیوں کا "اوئے" سمجھ لیجئے) ہم اس کے نزدیک چلے گئے۔

"کیا خیال ہے۔ میری تجویز پر عمل نہیں کرو گے؟"

ہم نے کہا "نہیں بھئی۔ ہم کچھ عرصے کے لیے واپس جا رہے ہیں۔"

"کہاں؟" وہ حیران ہو گیا۔

"اپنے وطن' پاکستان' دو چار مہینے کے بعد آجائیں گے۔"

"اوکے" اس نے بے پروائی سے کہا اور ہم سے بے تعلق سا ہو گیا۔

ادھر ہمارا یہ حال کہ رخصتی کے خیال سے خواہ مخواہ جذباتی ہوئے جا رہے تھے۔ سوچتے تھے یہ سب چیزیں خواب و خیال ہو جائیں گی۔ بلاوجہ اداس ہونے کو جی چاہ رہا تھا۔ مشرق اور مغرب کے لوگوں میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔

آئس کریم والی لڑکی سے 'خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم نے سینکڑوں آئس کریمیں خرید کر کھائی ہوں گی۔ کافی اور ملک شیک اس کے علاوہ۔ ہمیں اب وہ موٹی سی گوری سی لڑکی بھی اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔ اس روز بہت دل چاہ رہا تھا کہ اسے بھی بتا دیں کہ ہم واپس جا رہے ہیں۔ الوداع مگر مشکل یہ تھی کہ لڑکی اس تمام عرصے میں مسکرانے کے سوا ہم سے ایک بار بھی مخاطب نہیں ہوئی تھی۔ اب ہم بھلا اسے کیسے کہتے کہ "سنو موٹی سی لڑکی۔ ہم کچھ دن کے لیے پاکستان جا رہے ہیں۔ ان سیڑھیوں پر ہم تمہیں نظر نہیں آئیں گے۔ تم ہمیں بہت یاد آؤ گی" بس دل مسوس کر رہ گئے۔

آئس کریم خرید کر ہم سیڑھیوں کی طرف گئے۔ اور ایک درمیانی سیڑھی پر بیٹھ کر دنیا کا نظارہ کرنے لگے۔ لڑکپن میں ایک ہندوستانی فلم کا گانا ہمیں بہت پسند آیا تھا۔ اس وقت رہ رہ کر وہی گانا یاد آ رہا تھا۔

یہ زندگی کے میلے
دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے

فلمی شاعروں کو کچھ لوگ خواہ مخواہ برا کہتے ہیں حالانکہ بہت سے فلمی گانے اپنی سادگی اور پرکاری کے باعث بہت پر اثر ہوتے ہیں۔

نہ جانے کب تک ہم ان خیالوں میں کھوئے رہے۔ اچانک "ہائی" کی آواز سے چونکے۔ دیکھا تو سیڑھیوں کے سامنے لوسی اپنی شاندار کار میں بیٹھی زور زور سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ خدا جانے وہ کب سے "ہائی ہائی" کر رہی ہو گی۔ ہمارا ملک ہوتا تو مخاطب کرنے کے لیے فلک شگاف آوازوں میں ہارن گونجنے لگتا مگر مغربی ملکوں میں کار کا ہارن بجانا اسی طرح ہے جیسے کسی کو گالی دے دی جائے۔

ہم پاس گئے تو بولی "کیا قصہ ہے؟ کوئی نشہ وشہ تو نہیں کرنے لگے؟ کب سے ہاتھ ہلا رہی ہوں۔"

بس یہی تو فرق ہے امریکیوں میں اور ہم لوگوں میں کوئی پاکستانی ہوتا تو کہتا کہ بھائی، آپ کس آرٹ کی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں؟

ہم نے معذرت کی اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اس نے ایک بٹن دبایا اور کھڑکی کا شیشہ خود بخود اوپر ہو گیا۔ کار کی مخملیں سیٹیں، خنک فضا اور مہکتی ہوئی خوشبو نے ہمیں کسی اور ہی دنیا میں پہنچایا اور پھر برابر میں لوسی جیسی طرح دار عورت کی ہم نشینی! پاکستان میں ان چیزوں کے حاصل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ سوچ کر ہم ایک بار پھر اداس سے ہو گئے۔

"کتنے دن کے لیے جا رہے ہو؟" اس نے کار کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"دو مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"ویری نائس۔ آئیڈیل۔"

ہم نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"ایک لاجواب بزنس تلاش کیا ہے تمہارے لیے۔ دو ماہ تک کام بن جائے گا اور اس کے نزدیک ہی گھر بھی مل جائے گا۔"

"ہے کس جگہ؟" ہم نے پوچھا۔

"جب واپس آؤ گے تو بتاؤں گی۔ تھوڑی دیر کے لئے بزنس کو بھول جاؤ۔ ریلیکس کرو۔" ہم کار کی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے

"ارے۔ یہ کیا!" اس نے گھبرا کر کہا اور ہم ایک بار پھر اٹین شن ہو گئے۔

"کیا ہوا؟"

"علی کیا کرتے ہو۔ کچھ تو خیال کرو۔"

"مگر ہوا کیا ہے؟ ہم نے کیا کر دیا؟"

"سیٹ بیلٹ نہیں پہنی۔ وطن واپس جاؤ گے تو وہ لوگ کیا کہیں گے کہ امریکا والوں نے اس شخص کو سیٹ بیلٹ باندھنا بھی نہیں سکھایا۔"

ہم دل ہی دل میں خوب ہنسے۔ اس بے وقوف کو یہ پتا ہی نہیں تھا کہ ہمارے ملک میں سیٹ بیلٹ صرف ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتی ہیں اور بہت سے مسافر اس کی بھی زحمت نہیں گوارا کرتے۔

"تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ میں نے تمہارا مشورہ مان لیا ہے۔"

"کون سا مشورہ؟" ہمیں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

"وہی۔ ڈڈلے کے بارے میں۔ علی، تم نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ بہت ڈل اور ڈیڈلی فولش انسان ہے۔ اس کے چیمپئن بننے کا اتنا ہی امکان ہے جتنا کہ تمہارا ہے۔"

ہم نے ذرا غور سے اس کو دیکھا کہ کہیں مذاق تو نہیں کر رہی ہے مگر وہ بالکل سنجیدہ تھی۔

"عقل تو اس کے نزدیک سے ہو کر نہیں گزری۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں کے مکے کھا کھا کر اس کی عقل پانی ہو کر ناک کے راستے بہہ گئی ہے۔ بھئی قسم لے لو جو کبھی کوئی عقل کی بات اس کے منہ سے نکل جائے۔ بس دو ہی کام آتے ہیں اسے۔ کھانا اور مار کھانا۔"

ہم دل ہی دل میں شرمندہ سے ہو گئے کہ بلاوجہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان میں ہماری وجہ سے غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ بے چارے ڈڈلے سے ہمیں ہمدردی سی محسوس ہونے لگی۔

"تو پھر تمہاری شادی۔"

"ارے شادی کون احمق کر رہا تھا۔ ویسے شادی ان باکسروں کو بھی سوٹ نہیں کرتی اور میرا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خیر چھوڑو، پتا ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"کہاں؟"

"جمنازیم۔"

"جمنازیم۔ مگر کیوں؟"

"یہ تمہیں وہاں پہنچ کر معلوم ہو جائے گا۔"

کئی سڑکوں سے گزر کر ہم ایک صاف ستھرے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ گوروں کی آبادی تھی۔ مگر کالے بھی نظر آرہے تھے۔ اگرچہ نسبتاً کم تعداد میں تھے۔ ایک بڑی سی سڑک کے عقبی حصے میں ایک میٹر پارکنگ میں خالی جگہ پاکر لوسی نے اپنی کار پارک کر دی اور میٹر میں سکے ڈال کر ہم دونوں نے کونے والی خوب صورت سات منزلہ عمارت کا رخ کیا۔ فٹ پاتھ خاصی کشادہ تھی اور اس پر مختلف مقامات پر خوب صورت بڑے بڑے پھولوں کے گملے بھی رکھے ہوئے تھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سات آٹھ فٹ طویل درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ جن کی جڑوں کو سنگریزے ڈال کر ڈھانپ دیا گیا تھا۔ یہ بھی یورپ اور امریکا میں ایک عام رواج ہے کہ درختوں کی جڑوں میں بھی مٹی نظر نہیں آتی۔ پتھریلے کنکر یا خوب صورت انداز میں ترشے ہوئے سنگریزے ڈال کر مٹی کو چھپا دیا جاتا ہے۔ پتھروں کے نیچے مٹی کی سطح ہوتی ہے۔ درخت کو پانی دیا جائے تو پانی ان سنگریزوں سے چھن کر درخت کی جڑوں تک پہنچ جاتا ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو بارش میں گندگی اور کیچڑ نہیں ہوتی دوسرے آنکھوں کو بھی بھلا لگتا ہے۔

سنگ مرمر کی تین چار سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک بہت وسیع و عریض لابی میں داخل ہو گئے ایک جانب حسب دستور ایک کاؤنٹر پر افسر استقبالیہ کا سائن لگا ہوا تھا۔ یہ ایک ہنس مکھ درمیانہ عمر کی خاتون تھیں۔ سرخ و سفید رنگ سرخ بال' بھوری آنکھیں' جسم متناسب اور دراز قد۔ لوسی کو دیکھ کر وہ مسکرائیں اور ان سے "ہائی ہائی" کا تبادلہ کرنے کے بعد ہم دونوں ایک لفٹ کی جانب بڑھے۔ لفٹ مین ایک سفید فام نو عمر لڑکا تھا اپنی گہرے نیلے رنگ کی یونیفارم میں بہت پیارا لگ رہا تھا۔

"ہائی جونیئر" لوسی نے اس کے بال تھپتھپائے۔

"ہائی لیڈی۔ فورتھ اسٹوری؟"

لوسی مسکرانے لگی "اوکے۔"

لڑکے نے مستعدی سے لفٹ کا دروازہ کھولا۔ بند کرنے سے پہلے دو خواتین اور ایک نوجوان بھاگے بھاگے آئے "ہے۔ ایک منٹ!"

لڑکے نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور ان تینوں کو بھی لفٹ میں سمیٹ لیا۔ لفٹ خاصی

کشادہ تھی۔ دروازے کے عین سامنے آدم قد شیشہ لگا ہوا تھا۔ فرش پر گہرے سبز رنگ کا قالین تھا۔ ہم نے آنے والوں کو غور سے نہیں دیکھا تھا مگر جب سامنے والے شیشے پر نظر پڑی تو ان کا سراپا نظر آگیا۔ دونوں نوجوان لڑکیاں کافی کشیدہ قامت اور خوش شکل تھیں۔ ان کی ہر چیز مناسب تھی' سوائے لباس کے انہوں نے نہایت مختصر سفید رنگ کے نیکر پہنے ہوئے تھے۔ بالائی جسم پر جرسی قسم کی بلا آستین کی سفید رنگ کی کوئی چیز تھی جو ان کے جسم کے تناسب سے نصف سائز کی تھی۔ کپڑا آخری حد تک کھنچ چکا تھا اور کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔ صاحب زادے نیلے رنگ کی نیکر اور سفید جرسی میں ملبوس تھے۔ لڑکیاں مسلسل چیونگم کھا رہی تھیں اور بات بات پر نوجوان کی پسلیوں میں کہنیاں مار رہی تھیں۔ وہ بھی بے ساختہ کوئی بات کہنے کے بعد ان کے کولہے پر دھپ لگا دیتا تھا۔ یہ سب یوں ہو رہا تھا جیسے چند کم عمر لڑکے بے تکلفی سے ہنسی مذاق میں مصروف ہوں۔

لفٹ کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ چوتھی منزل تک پہنچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ چوتھی منزل پر لفٹ رکی تو دونوں لڑکیاں اچانک دھکا دے کر باہر نکلیں اور دوڑتی ہوئی ایک جانب چلی گئیں۔ نوجوان بھی ہنستا ہوا ان کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ لوسی نے بڑے مشفقانہ اور لگاوٹ کے انداز میں ان لوگوں کو دیکھا اور لفٹ سے باہر آتے ہوئے بہت لاڈ بھرے انداز میں کہا "شریر!" گویا ان کی تمام حرکتوں کو لوسی کی تائید حاصل تھی۔ سامنے ایک گیلری تھی جس میں سے گزر کر ایک ہال کو راستہ جاتا تھا۔ یکایک برآمدے میں کھلنے والے دو دروازوں میں سے بہت اونچے اونچے قد والے دس بارہ لڑکے برآمد ہوئے۔ انہیں قد کی لمبائی کے پیش نظر عوج بن عنق کہا جا سکتا تھا۔ ان میں کالے' گورے ہر قسم کے نوجوان تھے لیکن کالوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ بلند آوازوں میں باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے برابر سے نکل گئے۔ ان کے سامنے ہم بالشتیے نظر آرہے تھے۔

ہال کمرے میں فرش انتہائی شفاف اور چکنا تھا اس پر نشانات بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ باسکٹ بال کا میدان تھا۔ ایک انتہائی دراز قد گندمی رنگت والا شخص باسکٹ بال ہاتھ میں تھامے بار بار اچھل کر اس گیند کو نیٹ میں پھینکنے کی مشق کر رہا تھا۔ اپنے انتہائی دراز قد کے باعث اس کام میں اسے ذرا بھی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا جسے وہ پنجوں کے بل تھوڑا سا اچھل کر اپنے لمبے ہاتھوں سے بڑی آسانی کے ساتھ گیند کو نیٹ میں ڈال

دیتا ہے۔

لوسی نے بڑے محبت بھرے انداز میں اس لمبے تڑنگے آدمی کو دیکھا جو ہم دونوں کی موجودگی سے یکسر بے خبر تھا۔ لوسی نے بڑے مٹھاس بھرے لہجے میں پکارا "ہائی جونیئر۔"

ہم نے دل میں سوچا کہ اگر یہ جونیئر ہے تو پھر سینیئر کیا ہو گا؟

جونیئر نے گردن موڑ کر ہماری جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ قد کے مقابلے میں بہت چھوٹا نظر آرہا تھا۔ جب کہ گردن بہت موٹی تھی۔ اس غیر متوازن بناوٹ کی وجہ سے وہ کچھ عجیب سا نظر آرہا تھا۔ گیند کو نیٹ میں سے گزرنے کے بعد اس نے دوبارہ پکڑ لیا اور مسکراتا ہوا لوسی کی طرف بڑھا اس کے دانت سفید تھے اور مسوڑے نہایت سرخ' ہنستے ہوئے دانتوں کے ساتھ اس کے سارے مسوڑھے بھی نظر آنے لگے۔ ہم نے دل میں سوچا کہ اس کے ڈینٹسٹ کو علاج کے سلسلے میں کتنی سہولت ہوتی ہو گی۔ اس کا رنگ نہ سیاہ تھا نہ سفید۔ گندمی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ڈیل ڈول کی طرح اس کا رنگ بھی قدرے نرالا ہی لگا۔ نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ اس کے چہرے کے نقوش مناسب ہی تھے۔ سوائے اس کے کہ ناک بہت لمبی تھی اور کان' چہرے اور سر کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے۔ ویسے تو اس کا سر اور چہرہ معقول ہی کہا جا سکتا تھا لیکن قدو قامت کے لحاظ سے بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا۔ بہت لمبا قد' لمبی لمبی ٹانگیں' لمبے لمبے ہاتھ' موٹی سی گردن اور اس گردن پر چھوٹے تربوز کے سائز کا چہرہ۔

"ہائی ہنی" اس نے باسکٹ بال کو الٹے ہاتھ میں تھام لیا جو اس کے کنگ سائز ہاتھوں میں ٹینس کی گیند کی طرح لگ رہی تھی۔ اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس نے لوسی کی پتلی سی کمر کو تھام لیا اور اسے اپنے پاس کھینچ کر اپنی کمر سے لگا لیا۔ اس کا ارادہ تو شاید گلے لگانے کا ہو گا مگر جہاں لوسی کا گلا ختم ہوتا تھا وہاں سے ان صاحب کی کمر شروع ہوتی تھی پھر اس نے جھک کر لوسی کو پیار کیا اور کہا "ہائی بیوٹی فل!"

لوسی کی پتلی کمر اس کے ایک ہاتھ میں سما گئی تھی۔ کچھ تو اس کا ہاتھ زیادہ بڑا تھا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ لوسی کی کمر بہت زیادہ پتلی تھی۔ اس کی نزاکت کا احساس ہمیں پہلی بار ہوا تھا۔

"ان سے ملو گل بی۔ یہ علی ہیں' میرے کلائنٹ" اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہا "علی'

گل بی ڈرلنگ ہیں۔ جیسا کہ تم اب تک جان چکے ہو گے یہ باسکٹ بال کے کھلاڑی ہیں اور بہت جلد چیمپئن شپ جیتنے والے ہیں۔"

پھر وہی چیمپئن شپ' ہم نے دل میں سوچا۔ آخر اس لڑکی کو چیمپئن کے سوا کوئی اور کیوں پسند نہیں آتا۔ اس کا نفسیاتی تجزیہ کرانا بہت ضروری ہے۔

ہم تو یہ باتیں سوچ رہے تھے مگر گل بی نے وہیں کھڑے کھڑے لوسی کی کمر کو چھوڑ کر اپنا ہاتھ ہماری جانب بڑھا دیا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی اسپرنگ تھا جو ایک لمحے میں پھیل کر اتنے فاصلے تک پہنچ گیا اخلاقاً ہم نے بھی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ہمارا ہاتھ اونٹ کی داڑھ میں زیرے کی طرح نظر آرہا تھا۔ ممکن ہے اس موقع کی مناسبت سے آپ کو اس محاورے کا استعمال بے محل لگ رہا ہو مگر اس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے یہ بالکل مناسب اور بر محل تھا۔ اس کا ہاتھ سخت اور کھردرا تھا۔ شکر ہے کہ اس نے گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہمارا ہاتھ صرف تھام کر چھوڑ دیا۔ ورنہ ہماری انگلیوں کی خیر نہ تھی۔

لوسی اچھل کر ہم دونوں کے درمیان میں آگئی اور بولی "علی۔ تم نے اخباروں میں گل بی کے کارناموں کے بارے میں پڑھا ہو گا؟"

ہم نے کہا "دراصل ہم اسپورٹس کے صفحات نہیں پڑھتے" اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ کرکٹ اور ہاکی کے سوا دوسرے کھیلوں کی خبروں میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خصوصاً ان حالات میں کہ ان میں حصہ لینے والی ٹیم بھی پاکستانی نہ ہو۔

گل بی نے ہمیں مسکراتی ہوئی آنکھوں سے گھورا مگر کچھ کہنا مناسب نہ جانا۔ شاید دل ہی دل میں بدذوق' گھامڑ' جنگلی قسم کے خطابات سے نواز رہا ہو گا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دل ہی دل میں تو لوگ بادشاہوں کو بھی برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ ہمارا کیا بگڑ سکتا تھا

ہم تینوں ہال کے ایک گوشے میں پڑی ہوئی پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "اب تم سمجھ گئے کہ میں تمہیں جمنازیم کیوں لے کر آئی ہوں؟" اس نے سوال کیا۔

ہم نے بوجھ بجھکڑ کے انداز میں فوراً جواب دیا "ہاں مسٹر گل بی سے ملاقات کرانے کے لیے؟"

"تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔ تم کچھ عرصے کے لیے پاکستان جا رہے ہو نا؟ میں نے سوچا

کہ تمہیں اپنے بوائے فرینڈ سے ملا دوں۔ تم جب واپس آؤ گے تو پورے امریکا میں "گل بی گل بی" کا شور مچا ہو گا۔ دیکھ لینا۔ یہ لڑکا بہت جلد چیمپئن شپ جیت لے گا۔ کیوں، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ تم کہہ رہی ہو تو درست ہی ہو گا۔"

وہ اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک مشین کی جانب بڑھا، اس میں چند سکے ڈالے اور کوک کا ایک ڈبا نکال کر لے آیا۔ ہم تو خیر اس کے لیے قطعی اجنبی تھے مگر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ یہ بداخلاقی اور کنجوسی ہمیں ایک آنکھ نہیں بھائی۔ اس نے ایک ڈبا کھول کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور پھر اسے ایک طرف اچھال دیا۔ ڈبا کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے ایک گاربیج کی ٹوکری میں جاگرا۔ اس کے نشانے کی داد نہ دینا ناانصافی تھی۔ "گاربیج" کے بارے میں ہم یہ بتاتے چلیں کہ امریکیوں کی جدت پسندی نے انگریزوں کے "ڈسٹ بن" کو گاربیج میں تبدیل کر دیا ہے۔ کوڑا کرکٹ کو وہ گاربیج ہی کہتے ہیں۔ ہمیں تو گل بی کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں آئی تھی مگر لوسی نے قطعاً برا نہیں منایا تھا بلکہ وہ بدستور اس لمبوترے بے ڈھنگے قسم کے انسان پر واری صدقے ہو رہی تھی۔

"میں ادھر سے گزر رہی تھی، سوچا تم سے بھی ملتی جاؤں۔ ویسے تم کب تک فارغ ہو جاؤ گے۔؟"

"ہو سکتا ہے شام تک یا پھر رات تک، غالباً کل صبح تک۔"

ظاہر ہے کہ انتہائی بھونڈا اور فضول جواب تھا مگر لوسی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی

"بہت شریر ہو تم۔ اتنا ہنساتے ہو، یو لانگ فیلو۔"

"ہنی اگر برا نہ مانو تو تمہیں یہ یاد دلا دوں کہ یہ میری ایکسر سائز اور پریکٹس کا وقت ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ مجھے بہت زیادہ تیاری کرنی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔"

"تعاون! اگر ممکن۔ ہو تو میں تمہارے ساتھ پریکٹس تک کرنے کو تیار ہوں۔ کاش ایسا ہو سکتا۔"

گل بی کے چہرے پر دوبارہ ہنسی کے آثار نمودار ہوئے اور اس کی باچھیں ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیل گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایک بار پھر ہمیں اس کے لال لال

سوڑھوں کی زیارت کرنی پڑی مگر اس بار زیادہ نزدیک سے۔

"ہنی تم بہت ہنساتی ہو" اس نے کہا "تمہاری یہی ادا مجھے بہت پسند ہے؟"

ہم نے دل میں سوچا کہ لوسی کو اس اونٹ نما انسان کی کون سی ادا پسند ہے؟

لوسی اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے زانو پر جا بیٹھی "ڈارلنگ! میں چاہتی ہوں کہ تم یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا کے سب سے بڑے اسپورٹس مین بن جاؤ۔"

"تمہارا مطلب ہے اور لمبا ہو جاؤں؟" گل بی نے اپنے لطیفے پر خود ہی ہنسنا شروع کر دیا اور ایک بار پھر وہی مسوڑھے ہمیں دیکھنے کو ملے۔

یکایک تیز تیز قدموں سے چلنے کی آواز آئی۔ عقبی گیلری میں سے ایک اسمارٹ سی لڑکی تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ ہم لوگوں پر نظر پڑی تو اس نے خوش ہو کر نعرہ لگایا "اوہ گل بی۔ تم یہاں چھپے بیٹھے ہو؟"

اتنے بڑے ہال میں بیٹھا ہوا اتنا لمبا تڑنگا آدمی بھی ان صاحبہ کو چھپا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ بھی لاڈ کا ایک انداز تھا۔ وہ تیزی سے گل بی کی جانب بڑھیں جس کی گود میں لوسی پہلے ہی براجمان تھی۔ لوسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا مگر نووارد لڑکی اسے مطلق نظرانداز کر کے گل بی کے پاس پہنچ گئی اور پیروں کے پنجوں کے بل اچھل کر اس کے رخسار پر ایک عدد بوسہ ثبت کر دیا۔ لپ اسٹک کی سرخی کا نشان ایک مہر کی طرح گل بی کے رخسار پر نمودار ہو گیا۔ اس اہم فریضے سے فارغ ہونے کے بعد لڑکی نے لوسی پر ایک نگاہ ڈالی اور مسکرا کر کہا "ہائی، تم بھی ہو؟"

گل بی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس کے باوجود لڑکی کو اس کے چہرے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اچھلنا پڑا تھا۔

لوسی نے نہایت سرد یخ بستہ لہجے میں جواب دیا "میں تو ہوں مگر تم بھی ابھی تک ہو؟"

اگر الفاظ کی خنکی کو محسوس کیا جا سکتا تو ان الفاظ سے نووارد کو نمونیہ ہو جانا چاہیے تھا مگر شکر ہے کہ قدرت نے انسانوں کو ابھی تک بہت سی آفات سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

لوسی نے گل بی کی گود میں بیٹھے بیٹھے بڑی لگاوٹ سے کہا "گل بی ڈارلنگ! یہ تمہاری ایکسر سائز کا وقت ہے میرے خیال میں تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گل بی کے دوسرے رخسار پر اپنی لپ اسٹک کی مہر ثبت کر دی اور مسکراتی ہوئی اٹھ

کھڑی ہوئی۔ گل بھی انگڑائی لیتا ہوا کھڑا ہو گیا اور یوں لگا جیسے اچانک ایک درخت اگ آیا ہو۔

"اوکے۔ ٹیک کیئر" اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے زنبور نما ہاتھ میں دے دیا مگر خیریت ہی رہی۔

"ڈیئر۔ تم نیٹ پر جاؤ۔" لوسی نے تحکمانہ انداز میں کہا اور گل بی ہنستا ہوا باسکٹ بال سنبھال کر نیٹ کی طرف چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے مشینی انداز میں وہی عمل دوبارہ شروع کر دیا جو اس سے پہلے کر رہا تھا۔ یعنی گیند کو زمین پر مارنا اور پھر اچھل کر نیٹ میں پہنچا دینا۔ لوسی نے ایک مسکراتی ہوئی نظر اس لڑکی کی جانب پھینکی اور فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی باہر کی جانب چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

کار میں بیٹھنے کے بعد اس کا پہلا سوال تھا "کیوں بھئی۔ گل بی کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

ہم نے کہا "کافی لمبا ہے۔"

"ڈونٹ بی سلی۔ میں اس کی شخصیت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"کافی شاندار ہے" ہم نے ڈپلومیسی سے کام لیا "پتا نہیں کھلاڑی کیسا ہے؟"

بولی "سپر۔ اس جیسا دوسرا کھلاڑی آس پاس موجود نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "لوسی۔ ویسے تو یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے مگر مائنڈ نہ کرو تو ایک بات پوچھوں؟"

"شیور!" اس نے ایک چیونگم منہ میں ڈال لی۔

"ڈڈلے سے تو تمہارا تعلق ختم ہو گیا لیکن تم عجیب و غریب ناموں والے بوائے فرینڈز ہی کیوں پسند کرتی ہو؟ وہ ڈڈلے تھا' یہ گل بی ہے۔"

"گل بی اچھا نام نہیں ہے؟ تمہیں پسند نہیں آیا؟"

"کچھ عجیب سا نام ہے۔ ویسے ہمارے ملک میں ایک مٹھائی ہوتی ہے جسے جلیبی کہتے ہیں۔"

وہ مسکرائی "علی۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کے پھول کو کسی بھی نام سے پکارو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔"

"یہ تو ہے مگر وہ ڈڈلے۔"

"تم نے ٹھیک کہا تھا علی۔ اس کے دماغ میں سیمنٹ بھرا ہوا ہے۔ بہت ڈل قسم کا آدمی ہے اور پھر میں نے پتا کر لیا ہے۔ اس کے چیمپئن بننے کا بھی کوئی امکان نہیں ہے تو پھر ...؟"

ہم نے کہا "ابھی گل بی کے پاس ایک لڑکی آئی تھی۔"

"لڑکی" وہ بات کاٹ کر پھنکاری "اس کی عمر ۳۵ سے کم نہیں ہے۔ ویسے وہ اپنے آپ کو بچی ہی سمجھتی ہے۔ شو آف کتنا کرتی ہے! ہنہ" اس نے غصے کے مارے دو تین اور چیونگم اپنے منہ میں ڈال لیے اور اس تیزی سے چبانا شروع کیا جیسے اس لڑکی کو چبا رہی ہو۔

"یہ گل بی کی سابقہ گرل فرینڈ ہے۔ گرل فرینڈ بھی کیا' ان لوگوں کے تو بے شمار فین ہوتے ہیں اگر کسی سے ہنس کر بات کر لی تو وہ گرل فرینڈ تو نہیں ہو جاتی۔ یہ تو خود کو ہر ایک سے چپکی پھرتی ہے۔ انسان میں کوئی خودداری بھی ہونی چاہیے۔ تم نے دیکھا کہ گل بی کتنا ہنسانے والا شخص ہے۔ بس' اسی لیے لڑکیوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔"

ہم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے کار چلاتی رہی اور چیونگم چباتی رہی پھر اچانک پوچھا "تم ایک غیر جانب دار آدمی ہو۔ یہ بتاؤ کہ تم گل بی اور ڈڈلے کا موازنہ کیسے کرو گے؟"

ہم ایک لمحے کے لیے تو سٹپٹا سے گئے پھر سوچا کہ اس نے رائے پوچھی ہے تو ایمانداری سے بتانی چاہیے' ہم نے کہا "ڈڈلے کا رنگ زیادہ کالا تھا اور گل بی کا قد زیادہ لمبا ہے۔"

وہ بے اختیار ہنس پڑی "یہ کیا بات ہوئی۔ نان سنس' یہ بتاؤ کہ تم دونوں میں سے کسے پسند کرو گے؟"

ہم نے امریکی دستور کے مطابق کہا "دیکھو لوسی اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ان دونوں میں سے کسی کے نزدیک بھی نہ جاتا۔"

"کیا!" اس نے بے ساختہ بریک مار دیا۔ خیریت ہوئی کہ ہم کسی بڑی شاہراہ پر نہیں

تھے ورنہ دس بارہ کاریں تو لازماً ہم پر چڑھ جاتیں۔

"اوہ سوری" اسے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ کار پھر اپنی مقررہ رفتار سے چلنے لگی

"بہرحال یہ تمہاری اپنی رائے ہے" اس نے شانے اچکائے اور دونوں ہاتھ پھیلا دیے "میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"تمہیں رائے پسند نہیں آئی تو مجھے افسوس ہے مگر شاید تم نے میری ذاتی رائے مانگی تھی؟"

"آف کورس۔"

"بات یہ ہے کہ تمہیں اسپورٹس مین بہت زیادہ پسند ہیں۔"

"اسپورٹس مین نہیں، چیمپئن" اس نے تصحیح کی "میں ہر قیمت پر کسی مشہور چیمپئن کی گرل فرینڈ بننا چاہتی ہوں۔ چاہے وہ مجھ سے شادی نہ کرے۔ اس کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

"ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تھینک یو، علی۔ ایک بات کہوں گی، تم بہت کیوٹ ہو۔ اچھا یہ کہو تم واپس آنے سے ایک دو ہفتے پہلے مجھے اطلاع تو دو گے نا۔ تاکہ میں تمہارے لیے بزنس اور گھر ڈھونڈ رکھوں۔"

"کیوں نہیں، میرے پاس تمہارا کارڈ ہے۔"

بولی "ہو سکتا ہے تم ورجینیا اور واشنگٹن ڈی سی کے بجائے کسی اور اسٹیٹ میں رہنے کا ارادہ کرو؟"

ہم نے کہا "یہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ کسی اور اسٹیٹ میں ہمارے اتنے بہت سے دوست اور ملاقاتی نہیں ہیں۔"

"اور اب تو ان میں اضافہ ہو گیا ہے" وہ شوخی سے مسکرائی "تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو نا؟"

"کسی حد تک" ہم نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی "پتا نہیں تم بہت شریر ہو یا بہت زیادہ سچے۔ یقین کرو میں تمہارے لیے بہت اچھا بزنس تلاش کر کے رکھوں گی۔ تم سے ملنے کے بعد واقعی مجھے خوشی

ہوئی ہے اگر تم اسپورٹس مین ہوتے تو میں تمہیں ضرور اپنا بوائے فرینڈ بنا لیتی۔"

"مگر ہم شادی شدہ ہیں" ہم نے اسے یاد دلایا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں دوستی کی بات کر رہی ہوں، شادی کی نہیں۔"

"کاش!" ہمارے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کاش کیا؟" اس نے ہمیں کہنی مارنے کی کوشش کی "آگے بھی تو بولو۔"

ہم نے کہا "کاش ہم بھی بہت کالے، لمبے اور کند ذہن ہوتے۔"

وہ ہنسنے لگی "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسپورٹس مین ہونا بھی لازمی چیز ہے۔"

"اوکے، اوکے" ہم نے کہا "اس کے لیے تو ہمیں دوسرے جنم کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"اچھا اب تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟"

"وہیں۔ ائر اینڈ اسپیس میوزیم کی سیڑھیوں پر۔ ورنہ وائس آف امریکا پر ڈراپ کر دو۔"

"اوکے۔" اس نے ہمیں وائس آف امریکا کے سامنے ڈراپ کر دیا۔ ہم کار سے باہر نکلنے لگے تو بولی "علی۔ میں تمہاری رائے کی بہت قدر کرتی ہوں اس لیے گل بی کے بارے میں تمہارے خیالات معلوم کرنا چاہتی تھی۔"

"شکریہ" ہم نے کہا۔ اس نے بڑے خلوص سے مصافحہ کیا۔ ہونٹ سکیڑ کر "بائی" کہا اور "سی یو" یعنی پھر ملیں گے کہہ کر کار میں سوار ہو کر یہ جا وہ جا۔

ہم نے وائس آف امریکا کے استقبالیہ پر سیکیورٹی والے سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ اب ہمیں پہچاننے لگا تھا۔ ایک شناختی کارڈ اس نے ہمارے کوٹ کے کالر پر لگا دیا اور ہم لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ گئے۔ منزل کا تو ہمیں پتا تھا مگر ایک ہی جیسے راستوں، گیلریوں اور راہداریوں کی وجہ سے اکمل صاحب کا دفتر تلاش کرنے میں کافی مشکل پیش آتی تھی۔ بہرحال بھٹکتے بھٹکتے اور جگہ جگہ سے دریافت کرتے ہوئے ہم بالآخر اکمل صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔ سب لوگ موجود تھے۔ چائے اور کافی بھی تھی۔ موضوع بحث ہماری روانگی تھی، حسب دستور مختلف لوگ مختلف آراء پیش کر رہے تھے۔ ہم کچھ اور کنفیوژ ہو گئے۔ اکمل اس روز اپنی کار لے کر آئے تھے اس لیے دفتر سے نکلتے ہی سیدھے گھر روانہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

اکمل صاحب کے ہیلٹونین خوب صورت مکان میں رہتے ہوئے ہمیں کافی وقت گزر گیا تھا اور اب اس گھر سے بھی کچھ وابستگی اور لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ آس پاس سبزہ زار اور درخت‘ ان کے درمیان میں گھرا ہوا ایک خوبصورت اونچے اونچے ستونوں والا مکان جس میں ہم نے بہت دلچسپ اور مزیدار دن گزارے تھے۔ اس گھر کو چھوڑنے کے خیال سے ہم اداس ہو گئے۔ ہم مشرقی لوگ بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں!

گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بچیوں کی آوازیں کان میں پڑیں۔ وہ انگریزی میں جھگڑا کر رہی تھیں۔ نادیہ نے تو اسکول جانے کی وجہ سے امریکی لب لہجہ سیکھ لیا تھا مگر پارو ابھی انگریزی سے نابلد ہی تھی پھر بھی انگریزی کے الفاظ بولنے کی کوشش کرتی تھیں۔

عاطف نے ہمیں اطلاع دی کہ میامی بیچ سے ہمارے لیے ایک ٹیلی فون آیا تھا۔

"پام بیچ سے؟" ہم حیران ہو گئے۔ جہاں تک ہماری یادداشت کام کرتی تھی وہاں ہمارا کوئی شناسا نہیں رہتا تھا۔ البتہ میامی بیچ کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ پڑھتے اور فلموں میں دیکھتے رہے تھے۔

"کس کا فون تھا؟"

"انکل مجھے نام یاد نہیں رہا۔"

"یار یہ بتا دو کہ آواز مردانہ تھی یا زنانہ؟" یہ اکمل صاحب تھے۔

"میرا خیال ہے کہ کوئی مرد ہی تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ دوبارہ فون کریں گے۔"

ہماری بھوک پیاس اڑ گئی۔ میامی بیچ جیسی رنگین اور رومانٹک جگہ سے کوئی ہمیں فون کرے گا۔ یہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آخر وہ کون ہو سکتا ہے؟ ہمارا فون نمبر اسے کس نے بتایا ہو گا؟ وہ کہنا کیا چاہتا ہے؟ اسی ادھیڑ بن میں نہ تو ہم سے ٹھیک سے کھانا کھایا گیا اور نہ ہی ٹی وی کے دلچسپ اور مقبول پروگراموں میں ہمارا دل لگا۔ ہم ٹیلی فون کے برابر والے صوفے پر اٹین شن ہو کر بیٹھ گئے یہاں تک کہ ہماری کمر دکھنے لگی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور دوسری ہی گھنٹی پر ہم نے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!"

"ہیلو۔ کون بول رہا ہے۔ مجھے آفاقی صاحب سے بات کرنی ہے" کوئی اردو میں بات کر رہا تھا۔ آواز اور لہجہ کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔

"میں بول رہا ہوں۔"

"کیا؟ آفاقی بول رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔ اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے؟"

"آفاقی۔ پہچانا مجھے؟"

"آواز تو جانی پہچانی ہے" ہم نے کہا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ فلمی کرداروں کی طرح اپنا حافظہ تو نہیں کھو بیٹھے؟"

"کون۔ خان صاحب!" ہم نے خوشی اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا "کہاں ہو؟"

"اور کون ہو سکتا ہے۔ مابدولت میامی بیچ سے بول رہے ہیں۔"

ہمیں یقین نہیں آیا "خان صاحب۔ تم وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"عیش۔ سنا نہیں تم نے وہ شعر کہ عیش تو بس خان لوگوں کے لیے ہی بنا ہے" انہوں نے حسب عادت شعر کا مفہوم سنا دیا۔ ان کا اشارہ شعر کی طرف تھا"

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

ہم نے پوچھا "مگر تم وہاں گئے کیوں ہو؟ میرا مطلب ہے پاکستان سے اچانک میامی بیچ! یار کیوں بے وقوف بنا رہے ہو" سچ سچ بتاؤ‘ کہاں سے بول رہے ہو؟ کیا تم ابھی امریکا میں ہو؟"

"میرے بھائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ امریکی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تمہیں اب تک یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ میامی بھی امریکا میں ہی ہے۔ اچھا‘ میرا وقت ضائع مت کرو۔ پہلے بھی ایک کال کر چکا ہوں۔ حرام کا مال نہیں ہے میرے پاس۔"

"تو پھر فون کیوں کیا ہے؟" ہمیں واقعی یقین نہیں آیا تھا۔

وہ بھنا کر بولے "بس‘ ایک پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا اور وہ بھی میرے پاس ہی کھڑا دم ہلا رہا ہے۔ لو جی‘ تم بھی ذرا بھونک کر سنا دو۔ اس کے بعد ٹیلی فون پر بٹ صاحب کی مانوس

آواز سنائی دی "بھائی جی۔ السلام علیکم۔ کیا حال چال ہے؟"

"ارے بٹ جی" ہم نے خوش ہو کر کہا "تم بھی؟"

"ہاں۔ میں بھی۔"

"مگر تم دونوں ہو کہاں"

"خان صاحب نے بتایا تو ہے کہ ہم میامی بیچ میں ہیں۔ سنئے آفاقی صاحب آپ تو بے وفائی کر کے چلے آئے۔ اب ہم پیچھے پیچھے آگئے ہیں تو آپ تھانے داروں کی طرح تفتیش کر رہے ہیں۔ لیجئے خان صاحب سے بات کیجئے۔"

خان صاحب نے فون سنبھال لیا "کیوں بھائی۔ اب یقین آگیا کہ نہیں؟"

"مگر خان صاحب آپ دونوں۔"

"سنیں برادر۔ زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ ہم بہت تھوڑے دنوں کے لیے یہاں آئے ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ دو چار دن کے لیے ہمارے پاس آجائیں۔"

"تم کیوں نہیں آجاتے؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ کہاں تک سنو گے' کہاں تک سناؤں؟ ہم یہاں اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پتا یاد نہیں ہے۔ فون نمبر لکھ لیں۔" اس کے بعد انہوں نے اٹک اٹک کر ہمیں ایک فون نمبر لکھوا دیا اور کہا "کل نہیں تو پرسوں ضرور پہنچ جائیں۔ فلائٹ کی خبر دینا نہ بھولیں۔ ہم ائرپورٹ پر پہنچ جائیں گے۔ باقی باتیں زبانی ہوں گی۔ خدا حافظ۔"

فون بند ہو گیا تو ہم چند لمحے سکتے کے عالم میں بیٹھے رہے پھر خیال آیا کہ کہیں ان دونوں نے ہمیں بے وقوف تو نہیں بنایا ہے؟ فوراً ان کا دیا ہوا لانگ ڈسٹینس کا نمبر ڈائل کیا۔

ایک خالص امریکی نسوانی آواز سنائی دی۔ "اسٹار ہوٹل' گڈ ایوننگ۔"

ہم نے پوچھا "آپ کے ہوٹل میں مسٹر خان ٹھہرے ہوئے ہیں' ان سے بات کرا دیں۔"

"ون مومنٹ" اور دوسرے لمحے خان صاحب کے زور زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دی "استاد۔ ہمیں پتہ تھا کہ چیک ضرور کرو گے' اب تو یقین آگیا نا؟ بس اب سیٹ بک کر کے خبر کر دینا۔ اچھے بچوں کی طرح' شاباش۔"

پاکستان سے آئے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا لیکن جب کانوں میں خان صاحب اور بٹ صاحب کی آوازیں گونجیں تو پھران کے بلاوے پر کان نہ دھرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ادھر کچھ عرصے کے لیے پاکستان واپس جانے کا پروگرام بھی بن رہا تھا۔ ہم نے سوچا' کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پاکستان جائیں اور خان صاحب ادھر گھومتے رہیں اور جب ہم واپس امریکا آئیں تو وہ واپس جا چکے ہوں اس لیے یہی فیصلہ کیا کہ اگر چند روز خان صاحب اور بٹ صاحب کی معیت میں گزر جائیں تو غنیمت ہو گا۔ ٹیلی فون پر سیٹ بک کرانے میں ذرا بھی دقت پیش نہ آئی۔ تیسرے دن دوپہر کی فلائٹ سے ہماری روانگی ٹھہر گئی۔ سیٹ کنفرم ہوتے ہی خان صاحب کو فون کے ذریعے مطلع کر دیا اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس سنبھال کر ہم روانہ ہو گئے۔ للّی اور دوسرے لوگوں کو ہم نے یہی بتایا کہ بزنس کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے میامی جا رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ہمیں ڈیلٹا ائرلائنز کے ذریعے سفر کرنا تھا۔ خاصی بڑی فضائی سروس ہے۔ مسافروں کی سہولت اور آسائش کے لیے تمام چیزیں موجود تھیں مگر بین الاقوامی سفر کے دوران میں جو رکھ رکھاؤ دیکھنے میں آتا ہے وہ امریکا میں ڈومیسٹک سفر کے دوران نہیں ملتا۔ ہوائی جہاز البتہ بہت شاندار ہوتے ہیں اور بالکل نئے نویلے لگتے ہیں۔ ائر ہوسٹس خواتین خالص امریکی تھیں۔ اندرون ملک سفر کرتے ہوئے ایک خاص بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ عملے میں سب کے سب لوگ سفید فام ہی نیں ہوتے۔ گندمی' بھورے اور پیلے رنگ والے بھی نظر آجاتے ہیں۔ دراصل مختلف قوموں اور نسلوں کی آمیزش نے یہ گل کھلایا ہے کہ امریکا میں بھانت بھانت کی بولی سنائی دیتی ہے اور ملک ملک کا آدمی نظر آتا ہے۔ میامی کی جانب سفر کریں تو جنوبی امریکا کے لوگ کافی تعداد میں نظر آتے ہیں اور سفید فام یورپین نسل کے میل ملاپ کی بدولت ایک بالکل نئی نسل وجود میں آگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں اکثر مردوں اور عورتوں پر ہندوستانی یا پاکستانی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ میکسیکو' اسپین اور جنوبی امریکا کی ریاستوں سے تعلق رکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد یہاں اپنا مزاج' طور طریقے اور روایات فراموش نیں کر سکے ہیں۔ ہسپانوی نسل کے لوگ اس ضمن میں خاص

طور پر بہت حساس ہوتے ہیں۔ جنوبی امریکا کے تمام ملکوں میں ہسپانوی بولی جاتی ہے اور جب یہ لوگ امریکا میں جوق در جوق داخل ہوتے ہیں تو اپنی نیم مشرقی عادات اور ہسپانوی زبان بھی ساتھ لے کر آتے ہیں۔ امریکا میں ان کی بہت بڑی تعداد بستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کے بعد ہسپانوی امریکا کی دوسری سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔

ہماری چار ائرہوسٹسوں میں سے دو تو یورپین تھیں اور دو ہسپانوی۔ یورپین اپنے کشیدہ قامت، نیلی آنکھوں، سرخ بالوں اور سفید رنگت کی وجہ سے اپنی دونوں ساتھ والیوں سے الگ نظر آرہی تھیں۔ ہسپانوی عموماً کالے تو نہیں ہوتے۔ گندمی رنگ یا کھلتا ہوا گندمی رنگ ہوتا ہے اگر سفید بھی ہو تو جلد کی رنگت یورپ والوں کے مقابلے میں مختلف ہوتی ہے۔ عام طور پر ان کے بال اور آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں یا پھر براؤن۔ قدو قامت میں یورپی امریکیوں کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔

ایک ہسپانوی ائرہوسٹس کو ہم نے پہلی نظر میں ہندوستانی یا پاکستانی جانا، بعد میں پتا چلا کہ وہ بھی ہمیں جنوبی امریکا کی کسی ریاست کا باشندہ سمجھ رہی تھی۔ سفید فاموں کے مقابلے میں ہم دونوں میں کچھ چیزیں مشترک تھیں۔ اس فلائٹ پر زیادہ ہجوم نہ تھا۔ ہمارے برابر والی دو سیٹیں بھی خالی پڑی ہوئی تھیں ائرلائن کا عملہ تھا تو چاق و چوبند لیکن ڈسپلن اور رکھ رکھاؤ میں قدرے دیسی پن تھا۔ پہلے تو یہ کہ وردیوں میں یکسانیت نہیں تھی۔ ہم نے نیویارک کے ائرپورٹ پر مقامی ائرلائنز کی ایسی ائرہوسٹس بھی دیکھی تھیں جو سرے سے یونیفارم میں ملبوس ہی نہ تھیں۔ ہمیں کافی دینے کے لیے جب یہ ہسپانوی نسل کی صاحب زادی نزدیک آئیں تو انہوں نے مسکرا کر بڑی اپنائیت سے ہسپانوی میں کوئی بات کی۔ ہم نے جواب میں بتایا کہ ہم اسپینش نہیں جانتے۔

"اوہ۔ ایکسکیوز می سر، مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔" اس نے خالص امریکی لب و لہجے میں انگریزی بولنی شروع کر دی۔ ہم نے بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو اس نے مسکرا کر سر ہلایا اور تیزی سے چلی گئی مگر کچھ دیر بعد جب قدرے فرصت ملی تو دوبارہ آئی اور ہماری برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی وہ ایک صحت مند اور خوش رو لڑکی تھی اور بہت زیادہ باتونی۔ اس نے پہلے تو ہمیں اپنے دادا جان کے امریکا آنے کی داستان سنائی پھر اپنے خاندان کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد خود اپنے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ اس کا نام شمولی یا اسی قسم

کا تھا۔ جب اپنے بارے میں بات چیت ختم کر لی تو مجھ سے اس نے خالص دیسی انداز میں کہا۔ "اب آپ اپنے بارے میں بتائیے؟" گویا باہمی تعارف کا کوئی مقابلہ شروع ہو گیا تھا وہ تو شکر ہے کہ اسے اپنی مصروفیات کی بناء پر اٹھ کر جانا پڑا ورنہ یہ "بیت بازی" نہ جانے کتنی دیر تک جاری رہتی۔

اس فلائٹ میں کافی تعداد غیر ملکی سیاحوں کی تھی۔ دراصل میامی کو سیاحوں کے نقطہ نظر سے بہت اہمیت حاصل ہے۔ امریکی بھی یہاں بہت ذوق و شوق سے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم سفر سیاحوں میں عورتوں اور مردوں کی تعداد قریب قریب برابر رہی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ بیشتر خواتین تنہا سفر کر رہی تھیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کتاب یا میگزین تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میامی اور پام بیچ کے بارے میں معلوماتی پمفلٹ تھے جن کا دوران سفر انہوں نے اتنا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ غالباً انہیں یہ کتابیں ازبر ہو گئی ہوں گی۔ بہتر ہو اگر ہم کچھ میامی کے بارے میں بیان کر دیں۔

میامی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لاطینی امریکا اور یورپ کا سنگم یا درمیانی راستہ ہے۔ کہنے کو میامی ایک شہر ہے اور بہت خوبصورت اور چمک دمک والا شہر ہے لیکن یہ اپنے ساحلوں کی بناء پر زیادہ مشہور ہے۔ میامی، امریکا کے بالکل نچلے حصے میں واقع ہے۔ اگر آپ نے برصغیر پاک و ہند کا نقشہ دیکھا ہے تو ہندوستان کے انتہائی جنوب میں سری لنکا ایک نقطے کے مانند نظر آتا ہے۔ سری لنکا اور ہندوستان کے درمیان پچیس تیس میل کا سمندری فاصلہ حائل ہے۔ جس سے فائدہ اٹھا کر بھارتی حکومت سری لنکا میں تخریب کار بھیجتی رہتی ہے۔ میامی کی صورت حال قدرے مختلف ہے وہ امریکا کے انتہائی جنوب میں ایک لمبوترے حصے کی طرح باہر نکلا ہوا ضرور ہے۔ لیکن وہ سری لنکا کی طرح جزیرہ نہیں ہے بلکہ اس سرزمین کا ایک خطہ ہے۔ امریکا کے اس جنوبی ساحلی علاقے کے ایک کونے میں میامی ہے تو دوسرے کونے میں ہوسٹن ہے اور ہوسٹن اور لاس اینجلس کے درمیانی علاقے سے میکسیکو پیوست ہے اور دونوں ملکوں کی یہ سرحد کافی طویل ہے۔ میکسیکو کے بعد ہی لاطینی امریکا کے دوسرے ملک مثلاً گوئٹے مالا، کوسٹاریکا، نکاراگوئے، ہنڈراس، پانامہ، وینزویلا، کولمبیا، ایکوئے ڈور، پیرو، ارجنٹائن اور برازیل وغیرہ کی باری آتی ہے۔ یہ طویل علاقہ سمندر سے گھرا ہوا ہے اور ان میں سے بعض ممالک تو جزیرہ نما ہیں۔ ان ملکوں کو یوں کہنے

کو تو آزادی سے خود مختاری حاصل ہے۔ لیکن یہ ایک لحاظ سے امریکا کے شاگرد پیشہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امریکی حکومت ان ملکوں پر اپنی مرضی اور خواہشات ٹھونستی رہتی ہے۔ ان میں بڑے ملک بھی ہیں اور بہت چھوٹے بھی مگر امریکی اثرات سے کوئی آزاد نہیں ہے جو کوئی آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے اسی امریکی حکومت مختلف طریقوں سے "ٹھکانے" لگا دیتی ہے۔

میامی کی ایک اور وجہ شہرت بھی ہے وہ یہ کہ میامی کیوبا سے بہت نزدیک ہے۔ کیوبا اور میامی کے درمیان سمندر کا پانی حائل ہے لیکن فاصلہ مشکل سے ساٹھ ستر کلو میٹر ہو گا۔ کیوبا کی آمرانہ حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو لوگ غیر قانونی طریقوں سے فرار ہو کر امریکا میں پناہ حاصل کرنے کی غرض سے آتے ہیں' میامی ان کے لیے پہلی جائے پناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی میامی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے کیوبا کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ وہاں قریباً چالیس سال سے صدر کاسترو کی سوشلسٹ حکومت قائم ہے اور یہ ننھا سا جزیرہ کسی زمانے میں دنیا کی دو بڑی سپرپاورز کے مابین نہ صرف جھگڑے کا سبب بنا رہا تھا بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب کیوبا کی وجہ سے ساری دنیا ایٹمی جنگ اور تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔ سوویت یونین میں صدر خروشچیف کی حکومت تھی اور امریکا میں صدر کینیڈی بر سر اقتدار تھے۔ کیوبا کو سوویت حکومت ہر طرح کی امداد فراہم کرتی تھی مگر جب صدر خروشچیف نے اعلان کیا کہ وہ کیوبا میں ایٹمی میزائل نصب کریں گے تو امریکی صدر کینیڈی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ امریکا اپنی سرحدوں کے بالکل نزدیک بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنی بغل میں ایٹمی ہتھیاروں کی تنصیف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جواب میں خروشچیف صاحب نے کہا کہ امریکا نے بھی تو سوویت یونین کے چاروں طرف سے ایٹمی ہتھیاروں' راکٹوں اور میزائلوں کے گھیرے میں لے رکھا ہے پھر وہ سوویت یونین کو اس حق سے کس طرح محروم کر سکتا ہے؟

صدر کینیڈی کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہیں تھا اس لیے جواب میں انہوں نے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا فارمولا پیش کر دیا اور صاف اعلان کر دیا کہ سوویت یونین سے جو بحری جہاز کیوبا جائیں گے امریکی بحریہ ان کی تلاشی لے گی اور اگر ان پر ایٹمی میزائل پائے گئے تو انہیں کسی طور بھی کیوبا جانے کی اجازت نہیں دے گی۔

جواب میں صدر خروشچیف نے جواب آں غزل کے طور پر اعلان کر دیا کہ صدر کینیڈی ہوش کے ناخن لیں۔ سوویت یونین اور کیوبا دونوں آزاد اور خود مختار ملک ہیں اور امریکی صدر کے پابند نہیں ہیں۔ سوویت جہاز ہر قیمت پر ایٹمی میزائل لے کر کیوبا جائیں گے اور اگر انہیں زبردستی روکنے یا ان کی تلاشی لینے کی کوشش کی گئی تو اس حرکت کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔"

لیجیے جناب اس بیان بازی کے بعد ساری دنیا دم سادھ کر بیٹھ گئی کیوں کہ خروشچیف صاحب کے اعلان کے مطابق روسی جہاز کیوبا کے لیے روانہ ہو گئے تھے اور امریکی بحریہ نے اس کی ناکہ بندی کا بندوبست کر لیا تھا۔ جیسے جیسے روسی جہاز کیوبا کی جانب بڑھ رہے تھے' ویسے ویسے ساری دنیا کے لوگ ایٹمی جنگ چھڑ جانے اور اس کے نتیجے میں دنیا کی بربادی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ انتہائی پریشانی کے دن تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی سپر طاقت اپنے موقف سے ہٹنے پر آمادہ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ روسی جہازوں کو زبردستی روکنے کی صورت میں جو ایٹمی جنگ شروع ہوتی وہ محض اس علاقے تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ ساری دنیا روسی اور امریکی ایٹمی میزائلوں سے آراستہ تھی دونوں ملکوں کے ہوائی جہاز ایٹمی ہتھیار برسانے کے لیے کمربستہ تھے۔ اس جنگ کو کون کون نشانہ بنے گا اور دنیا کا انجام کیا ہو گا؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور ظاہر ہے کہ جان بھی نہیں سکتا تھا۔ ساری دنیا کے رہنے والے انتہائی اعصابی تناؤ اور کشیدگی کے عالم میں تھے لیکن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ روسی صدر خرد شچیف نے عین وقت پر اپنی مونچھ نیچی کر لی۔ امریکی اور روسی بحریہ کے جہاز ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہو چکے تھے کہ اچانک صدر خرد شچیف کے حکم پر روسی جہازوں نے اپنا رخ تبدیل کر لیا اور واپس لوٹ گئے۔ ساری دنیا نے اطمینان کا اور سکون کا سانس لیا۔ یہ بات نہ بھولیے کہ اگر یہ ایٹمی جنگ چھڑ جاتی تو میامی' کیوبا اور اس کے پاس کے علاقوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا۔ بہرحال اللہ نے خیر کر دی اور یہ جنگ ٹل گئی جس کے نتیجے میں خان صاحب اور بٹ صاحب کو میامی اور پام بیچ جانے کا موقع مل گیا اور اس بہانے ہم نے بھی دنیا کا ایک اور حصہ دیکھ لیا۔

امیگریشن سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو خان صاحب اور بٹ صاحب ہمارے منتظر تھے۔ خان صاحب نے نہایت سنجیدگی سے ہم سے ہاتھ ملایا اور پھر مزید کرم فرماتے ہوئے ہمیں

گلے سے لگا لیا مگر یہ اس قسم کا معانقہ تھا جیسا کہ عام طور پر کسی ملک کا وزیراعظم یا سربراہ اپنے دوست ملک کے وزیراعظم یا سربراہ سے کرتا ہے یعنی انتہائی رسمی اور سرکاری قسم کا۔

بٹ صاحب نے "اوئے جیوندے رہو۔" کا نعرہ مارا اور ہمیں "جپھی" ڈال لی۔ آپ کو بغلگیری اور "جپھی" کا فرق بتانے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ آپ اس کی باریکی سے یقیناً واقف ہوں گے اور اگر واقف نہیں ہیں تو پھر آپ کو کچھ بتانا بیکار ہے۔ سامان ہمارے پاس بہت مختصر تھا اس لیے باہر نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ باہر نکلتے ہوئے خان صاحب نے فرمایا۔ "آفاقی صاحب، ہم نے امریکا کی پونچھ پر پاؤں رکھ دیا ہے۔"

ان کی زبانی ایک سیاسی بیان سن کر ہم حیران رہ گئے اور کہا۔ "خان صاحب، یہ کام تو دنیا کی کوئی دوسری سپرپاور تک نہیں کر سکی۔ آپ نے کیسے کر دیا؟"

بولے "مشکل یہ ہے کہ آپ کو ہر بات سمجھانی پڑتی ہے بھائی جان۔ میامی کو آپ امریکا کی دم کہہ سکتے ہیں۔ میرا یقین نہیں تو نقشہ دیکھ لیجئے اور اس وقت ہم "امریکا کی دم" پر کھڑے ہیں اب تو سمجھے یا مثالیں دے کر سمجھاؤں؟"

ہم نے فوراً ہینڈز اپ کر دیے پھر پوچھا۔ "یہ بتائیں کہ آپ کو میرا پتا اور فون نمبر کس طرح معلوم ہوا؟ اتنے بڑے ملک امریکا میں آپ نے مجھے کیسے ڈھونڈ لیا؟"

جواب میں وہ دونوں پر اسرار انداز میں مسکرائے اور ایک دوسرے کی جانب معنی خیز انداز میں دیکھا۔ ہم مزید مرعوب ہو گئے۔ "اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ آپ نے وہ گھوڑے والا لطیفہ تو سنا ہوگا۔؟"

ہم سمجھ گئے کہ کوئی انتہائی پرانا اور دیمک زدہ لطیفہ اب پھر سننے کو ملے گا مگر اس کی روک تھام ہمارے بس میں نہیں تھی۔ آپ نے بھی یقیناً بارہا پڑھا ہوگا مگر مجبوری کا نام صبر ہے۔

کہنے لگے "ایک صاحب کا گھوڑا گم ہو گیا۔ بہت تلاش کیا مگر کہیں نہیں ملا۔ تیسرے دن ایک صاحب گھوڑا لے کر آ گئے۔ گھوڑے کا مالک بہت خوش ہوا۔ لانے والے کو انعام و اکرام بھی دیا پھر پوچھا کہ بھائی یہ گھوڑا تو کسی کو بھی نہیں ملا تھا۔ تم کہاں سے ڈھونڈ لائے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "بالکل آسانی سے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں گھوڑا ہوتا اور گم

ہو جاتا تو کہاں جاتا بس میں وہیں چلا گیا۔ یہ گھوڑا وہیں کھڑا ہوا تھا۔"

"اس لطیفے کا ہمارے سوال سے کیا تعلق ہے؟"

بولے "ہے کیوں نہیں ہم نے سوچا کہ اگر ہم آپ کی جگہ ہوتے اور امریکا جاتے تو کس کے پاس پہنچتے؟ عقل نے کہا کہ اکمل علیمی کے پاس"

"مگر ان کا فون نمبر تمہیں کس نے بتایا؟"

"کبھی عقل کی بات بھی کر لیا کرو۔ ہمیں پتا ہے کہ وہ وائس آف امریکا میں کام کرتے ہیں۔ وائس آف امریکا کا نمبر تو دنیا کا ہر گدھا جانتا ہے۔"

"واقعی جیسے کہ تم بھی جانتے ہو!"

وہ گھور کر رہ گئے پھر بولے۔ "ہم نے وائس آف امریکا فون کر کے اکمل صاحب کے گھر کا فون نمبر لے لیا اور پھر آپ سے بات ہو گئی بالکل آسان بات ہے۔"

ہم تو انہیں مان گئے بلکہ ان کی اس دانشمندی پر ہمیں انگلستان کا مشہور کتابی کردار سراغرساں شرلاک ہومز اور ان کے دوست ڈاکٹر واٹسن یاد آ گئے جو مشکل سے مشکل مسائل کو منٹوں میں حل کر دیا کرتے تھے۔

اب بٹ صاحب کے بولنے کی باری تھی، کہنے لگے۔ "آپ نے تو ہمیں یاد نہیں کیا مگر ہم نے یہاں آتے ہی آپ کو ڈھونڈ لیا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ تم لوگ کس سلسلے میں امریکا آ گئے اور وہ بھی میامی بیچ؟ آخر یہ قصہ کیا ہے؟"

"قصہ سنانے کے لیے ٹائم کی ضرورت ہوتی ہے جو اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ اتنے بے تاب نہ ہو جائیے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ کو بولنے اور سوالات کرنے کا اتنا شوق ہے کہ دوسرے کی بات سننے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔"

یکایک چلتے چلتے خان صاحب نے زیر لب "سبحان اللہ" کا نعرہ لگایا۔ ہم نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ دو آفت نما خواتین ہم سے چند گز آگے آگے جا رہی تھیں۔ انہوں نے بہت چھوٹی چھوٹی ٹرالیوں پر اپنے چھوٹے چھوٹے سے بیگ رکھے ہوئے تھے اور ایک ڈوری کی مدد سے ٹرالی کو یوں گھسیٹتی ہوئی چل رہی تھیں کہ پہلی نظر میں اس ٹرالی پر کتے کا گمان گزرتا تھا مگر خان صاحب کی زبان سے بے اختیار تعریفی

الفاظ نکلوانے کا سبب یہ کتا نما ٹرالی نہیں تھی بلکہ وہ دونوں خواتین تھیں جو اس ٹرالی کے آگے آگے جا رہی تھیں۔

دیکھیے صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ یورپ اور امریکا میں نہ حسن و جمال کی کمی ہے نہ عریانی اور بے لباسی کا قحط پڑا ہوا ہے۔ چار سو رنگین اور دیدہ فریب نظارے بکھرے ہوئے ہیں۔ اہل مشرق کا وہاں جا کر وہی عالم ہوتا ہے جو کسی بچے کا کھلونوں کے بہت بڑے اسٹور میں پہنچ کر ہوتا ہے۔ یعنی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا دیکھے' کیا نہ دیکھے اور کون سا کھلونا خریدے' کون سا نہ خریدے؟ اور خریدے تو کیوں کر؟ ظاہر ہے کہ خریداری کے لیے تو ڈھیر سارے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے حجابی اور خوبصورتی کی اس بہتات کے باوجود اگر کسی کو دیکھ کر بے اختیار زبان پر کلمہ توصیف جاری ہو جائے تو خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ وہ کیا چیز ہوتی ہو گی؟ مثال کے طور پر ان دونوں خواتین کو ہی ملاحظہ فرمائیے۔

انتہائی محتاط اور کنجوس الفاظ میں بھی انہیں "پری پیکر" کہا جا سکتا۔ سچ پوچھئے تو ہالی وڈ کی اداکارائیں بھی ان کے آگے ہیچ تھیں۔ اس قدر سبک چال اور ایسی شکل و صورت کی فرصت سے دیکھتے رہیے۔ اس پر ان کا لباس' ان کے جملہ لباس کا اسی فیصد حصہ ان بڑے بڑے ہیٹوں پر مشتمل تھا جو انہوں نے اپنے سروں پر پہن رکھے تھے۔ اتنے بڑے بڑے ہیٹ پہننے کے باوجود ان کی زلفوں کے پیچ و خم صاف نظر آ رہے تھے۔ سر کو ڈھانپنے کے لیے انہوں نے جو کوشش کی تھی اگر اس کا عشر عشیر بھی باقی جسم کو ڈھانپنے کے لیے کرتیں تو شاید کچھ بھلا ہو جاتا جو انوکھا لباس انہوں نے زیب تن کر رکھا تھا اس کی تفصیل بیان کرنا بھی خود کو سنسر کے سامنے پیش کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اسکا بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اس کے لباس کی بے حجابی کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ خان صاحب مسلسل زیر لب لاحول پڑھتے رہے۔ لیکن ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے ان کی بل کھاتی ہوئی چال پر سے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔ ادھر بٹ صاحب بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے۔ "یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ دیکھ لینا۔ قیامت آنے والی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "قیامت آ چکی ہے۔"

انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔ "اچھا' کہاں؟" گویا قیامت بھی کوئی سیلاب یا زلزلہ ہے جو دنیا کے کسی ایک حصے پر نازل ہو گی۔

ہم نے کہا۔ "قیامت تو آپ کے سامنے جا رہی ہے اور ایک بھی نہیں بلکہ دو ہیں۔"

جب تک قیامت کی یہ نشانیاں نظر آتی رہیں ہم ہی کیا' سب لوگ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ ٹرمینل کے باہر ایک نہایت شاندار' چمک دار' سیاہ کار ان کی منتظر تھی۔ ایک سفید وردی میں ملبوس ڈرائیور نے آگے بڑھ کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور دونوں خواتین گڑاپ سے کار کے اندر داخل ہو گئیں ایسا لگا جیسے ان کے غائب ہوتے ہی ائرپورٹ کا معمول کا کاروبار شروع ہو گیا جو وقتی طور پر معطل ہو کر رہ گیا تھا۔

ہم باہر نکلے تو یکے بعد دیگرے دو ٹیکسی والوں نے اپنی باری کے مطابق آگے بڑھ کر ہماری جانب دیکھا مگر خان صاحب نے ان دونوں کو اشارے سے رخصت کر دیا۔

ہم نے پوچھا۔ "بھلا ان ٹیکسی والوں میں کیا برائی دیکھی جو آپ نے انہیں رخصت کر دیا؟"

فلسفیانہ انداز میں بولے۔ "خوبصورتی یا برائی کسی چیز میں نہیں خود انسان کی آنکھ میں ہوتی ہے۔"

"آپ کی آنکھ میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے؟"

"آفاقی صاحب۔ بدذوقی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آپ نے ان ٹیکسی ڈرائیوروں کی صورت دیکھی تھی؟"

"ان کی صورت کو کیا ہوا؟"

"آپ کی قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ بھائی' ایک تو بڈھا کھوسٹ تھا اور دوسرا شکل سے جرائم پیشہ لگ رہا تھا۔ وہاں آگے جائیں گے تو کوئی معقول بندہ" مل جائے گا۔"

☆ ☆ ☆

بیس پچیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد واقعی ایک معقول بندہ مل گیا۔ دراصل یہ بندہ "بندی" تھی۔ نک سک سے درست' شگفتہ مزاج اور خاصی دلکش درمیانہ عمر کی عورت تھی۔ جب ہم نے اس طرف توجہ دلائی تو خان صاحب بگڑ گئے۔ "بلاوجہ کی باتیں نہ کیجئے کیا آپ نے اس کا برتھ سرٹیفکیٹ دیکھا ہے؟"

بٹ صاحب نے بھی رسان سے سمجھایا۔ "آفاقی صاحب، عمر کے چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تو سترہ سال سے ستر سال تک کی ہر عورت ایک ہی عمر کی نظر آتی ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے بلاوجہ سر کھپانے کی اور ہمیں کون سا رشتہ کرنا ہے؟"

خان صاحب کے اشارے پر ٹیکسی رک گئی۔ دوسرے اشارے پر بٹ صاحب نے ہمارا سوٹ کیس ڈکی میں رکھ دیا۔ تیسرے اشارے پر ہم بھی ٹیکسی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اگلی نشست خان صاحب نے اپنے لیے مخصوص کر لی تھی۔

ہم نے کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ مہمان کو عزت دینی چاہیے۔"

بولے۔ "بھائی اسے پتا وغیرہ سمجھانا ہے اور پھر کرایہ بھی طے کرنا ہے۔"

بٹ صاحب جل گئے۔ "یار وہ ٹیکسی چلاتی ہے اسے پتا سمجھانے کی کیا ضرورت ہے۔ کرایہ بھی یہاں مقرر ہوتا ہے یہ پاکستان تو نہیں ہے کہ کرائے کے لیے مول تول کرنا پڑے۔"

"بٹ صاحب آپ کو ابھی تک یہ احساس نہیں ہوا کہ آپ کی عقل بہت محدود ہے۔ ابتدائی عمر کی باکسنگ نے آپ کے دماغ کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ یار سمجھا کرو جو شخص کرایہ ادا کرے گا اس کا حق دوسرے سے زیادہ ہوتا ہے۔"

"ٹیکسی ڈرائیور خاتون خاموشی اور صبر و تحمل کے ساتھ اس گفتگو کو سن رہی تھیں اور اس انتظار میں تھیں کہ مسافر اپنی باتوں سے فراغت حاصل کریں تو انہیں بھی کچھ ہدایات جاری کریں۔

سب سے پہلے بٹ صاحب کو اس بات کا خیال آیا۔ انہوں نے خان صاحب سے کہا۔ "بھائی پہلے اسے اپنا پتا تو بتاؤ۔ بے چاری احمقوں کی طرح ہم سب کا منہ دیکھ رہی ہے۔ کچھ تو ملک و قوم کا خیال کرو۔ وہ پاکستان کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی؟"

خان صاحب نے فرمایا۔ "پاکستان کا جھنڈا اپنے منہ پر لگا رکھا ہے جو اس کو ہمارے پاکستانی ہونے کا علم ہو گیا؟"

پھر وہ ٹیکسی والی سے مخاطب ہوئے۔ "ایکسکیوزمی لیڈی۔ ہمیں اسٹار ہوٹل لے چلیں۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے اسٹار ہوٹل کا ایک کارڈ خاتون کے حوالے کر دیا۔ خان صاحب کی اس حرکت سے ہم پر دو باتوں کا انکشاف ہوا۔ ایک تو یہ کہ ان کی انگریزی

بولنے کی صلاحیت بہتر ہو گئی تھی اور دوسرے یہ کہ وہ موقع و محل کے لحاظ سے گفتگو کا ہنر سیکھ گئے تھے۔ "لیڈی کہنے کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ خاتون نے مسکرا کر ٹیکسی کو حرکت دی اور ہم کچھ دیر بعد خوبصورت اور پربہار سڑکوں سے گزرتے ہوئے اپنے ہوٹل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ راستے میں پاکستان کی باتیں ہوتی رہیں کیوں کہ خان صاحب نے اپنے حالیہ سفر کے بارے میں دریافت کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔

ہمیں ہوٹل پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ یہ ایک درمیانہ درجے کا تین منزلہ ہوٹل تھا۔ وعدے کے مطابق ٹیکسی کا کرایہ خان صاحب نے ادا کیا اور کچھ ٹپ بھی دی جس کی وجہ سے خاتون کا موڈ مزید خوشگوار ہو گیا۔ سوٹ کیس اٹھا کر ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ایک نیم دائرہ نما استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے ایک ادھیڑ عمر بزرگ تشریف فرما تھے۔ جنہوں نے بہت گرمجوشی سے مسکرا کر ہم لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ ہمارا کمرا پہلے ہی بک ہو چکا تھا۔ سرخ وردی میں ملبوس ایک نوعمر لڑکے نے سوٹ کیس اٹھایا اور کمرے کی چابی سنبھال کر ہمیں اپنے پیچھے آنے کی دعوت دی۔ ہمارا کمرا تیسری منزل پر تھا اس کے برابر ہی خان صاحب اور بٹ صاحب کے کمرے تھے۔ کمرا خاصا پرآسائش تھا کھڑکی سے کافی فاصلے پر سمندر کا ایک حصہ بھی نظر آرہا تھا۔ خان صاحب نے بتایا کہ اس شہر کے بیشتر ہوٹلوں کے کمروں سے سمندر کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور نظر آجاتا ہے جن کمروں سے پورا سمندر یا ساحل نظر آتا ہے۔ ان کے کرائے بہت زیادہ ہیں۔ گویا وہی بات تھی کہ جتنا گڑ ڈالیں گے، اتنا ہی میٹھا ہو گا۔ جتنا زیادہ کرایہ ادا کریں گے، اتنا ہی زیادہ سمندر کے نظارے سے لطف اندوز ہوں گے۔

ہمارے کمرے میں جاتے ہی خان صاحب بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم نہیں وہ سفر کر کے تشریف لائے ہیں اور سخت تھک گئے ہیں۔ بٹ صاحب نے ہمارے برابر ایک نرم و ملائم صوفے پر نشست سنبھال لی۔ ہم نے تو یہ محسوس کر لیا تھا کہ گزرے ہوئے وقت نے خان صاحب اور بٹ صاحب کو کافی تبدیل کر دیا ہے۔ مثلاً اب وہ انگریزی اور انگریزوں سے قطعاً خوف زدہ یا مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ان کی جھجک اور شرم بھی ختم ہو گئی تھی۔ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار وہ بلا تکلف اور بڑے دھڑلے سے کرنے لگے

تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سب اپنی جگہ بجا لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہو گئی تھی۔ کہ وہ ایک ایسے ہوٹل میں قیام پذیر تھے جہاں اب تک ہمیں کسی نازک اندام خاتون کی جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔

ہم نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”خان صاحب‘ پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ زنانہ اور مردانہ ڈبوں کے کب سے قائل ہو گئے؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ ایک خالص مردانہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شاید یہاں عورتوں کا داخلہ بالکل بند ہے؟“

خان صاحب کے جواب دینے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ خان صاحب کے ”یس کم اِن“ کہتے ہی دروازہ کھل گیا اور یکایک ویرانے میں بہار آ گئی۔ ایک انتہائی خوبصورت اور طرحدار خاتون مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے سفید مختصر اسکرٹ اور بلا آستینوں کا نیلا بلاؤز زیب تن کر رکھا تھا۔ شربتی بالوں کے گچھے ان کے چہرے کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھے۔ گورے رنگ پر شربتی آنکھیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی خان صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے ۔ وہ خاتون دروازے پر ہی رک گئیں اور معذرت طلب کرتے ہوئے بولیں۔ ”میں تو کمرا بنانے کے لیے آئی تھی۔ آپ اجازت دیں تو کچھ دیر بعد آ جاؤں گی۔“

خان صاحب نے فوراً کہا ”ٹھیک ہے ٹھیک“ (اوکے اوکے) تم کمرا بنا دو“

یہ سن کر وہ الٹے قدموں باہر چلی گئیں۔ دوسرے لمحے جب اندر داخل ہوئیں تو ان کے دست نازک میں چند تولیے‘ کچھ شیمپو کی شیشیاں کچھ صابن وغیرہ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے تو غسل خانے کا رخ کیا اور وہاں سے کھٹر پٹر کی آوازیں آتی رہیں جس سے ظاہر ہوا کہ وہ غسل خانے میں صفائی وغیرہ کر رہی ہیں۔ اس اثناء میں ہم تینوں دم سادھے خاموش بیٹھے رہے وہ باہر نکلیں تو استعمال شدہ تولیے ان کے ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے۔ یہ تولیے وہ کمرے سے باہر گیلری میں کھڑی ہوئی ٹرالی میں ڈال کر دوبارہ اندر آ گئیں۔ میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو ترتیب دی۔ کشادہ کھڑکی کے پردوں کو درست کیا اور پھر بیڈ کے سامنے آ کر مسکرانے لگیں۔

اچانک بٹ صاحب کی آواز آئی۔ ”اب بیڈ سے اٹھ بھی جاؤ۔ وہ بے چاری بستر ٹھیک کرنے کے لیے کھڑی ہے!“

بٹ صاحب کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ خان صاحب اٹھ کر ہمارے برابر والی ایک کرسی پر براجمان ہو گئے اور لیڈی نے بستر میں ضروری تبدیلیاں کر دیں۔ یہ سب کام کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر ہم سب کی طرف دیکھ کر مسکرائیں اور تیزی سے باہر چلی گئیں۔ اب لگا جیسے ہم سب نے ایک خوشگوار خواب دیکھا تھا۔ خواب کی تعبیر کی صورت میں ہلکی سی خوشبو ابھی تک کمرے میں بکھری ہوئی تھی۔ ہمیں اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔

ہم نے پوچھا۔ ”اب تو آپ دونوں حضرات یہ بتائیں کہ اچانک یہاں کیسے نمودار ہو گئے؟“

بٹ صاحب نے کہا۔ ”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اسے سنانے سے پہلے اگر چائے منگالی جائے تو بہتر ہو گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے فون کا ریسیور اٹھایا۔ ایک نمبر دبایا اور بڑے اعتماد سے انگریزی میں کہا۔ ”روم سروس؟ پلیز روم نمبر ۳۰۸ میں تین پیالی چائے بھیج دیجئے۔ شکریہ۔“

ہم بٹ صاحب کی بدلی ہوئی شخصیت دیکھ کر حیران رہ گئے۔

خان صاحب نے آغاز داستان یوں کیا۔ ”اصل میں ہم ایک کاروباری دورے پر جاپان آئے تھے۔“

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ ”جاپان آئے تھے اور میامی بیچ پہنچ گئے؟ یعنی غلطی سے دوسرے ہوائی جہاز میں بیٹھ گئے۔؟“

وہ ہنسنے لگے۔ ”بھائی ذرا صبر کرو۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ لو آپ کو اس کا خلاصہ سنا رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں نے اور بٹ صاحب نے ایک اور بٹ صاحب کے ساتھ مل کر الیکٹرانکس کی امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کیا ہے۔“

”ایک اور بٹ صاحب؟ گویا ایک بٹ صاحب کافی نہیں تھے کہ انہوں نے ایک اور بٹ صاحب بھی تلاش کر لیے۔“

”کاروبار کو بڑھانے کے لیے ہم نے جاپانی کمپنیوں سے بات چیت شروع کر دی اور پھر سلسلہ طے کرنے کے لیے خود جاپان چلے گئے۔“

"مگر یہاں کیسے پہنچ گئے؟" ہم نے بے صبری سے پوچھا۔ بٹ صاحب نے کہا۔ "ہوائی جہاز میں بیٹھ کر۔"

"یار' کیوں بلاوجہ پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ مجھے اس لیے یہاں بلایا ہے تم لوگوں نے؟"

"بھائی ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ بہت لمبا قصہ ہے۔ کچھ نہ کچھ وقت تو لگے گا سنانے میں۔"

"میرا خیال ہے تم اسے کیسٹ مین ریکارڈ کر لو۔ میں اطمینان سے سن لوں گا' فرصت کے وقت بیٹھ کر۔"

بٹ صاحب نے منہ پھاڑ کر ایک لمبی سی جماہی لی اور بولے۔ "پتا نہیں چائے کہاں رہ گئی۔ اتنی خراب سروس ہے ان کی۔ چائے منگواؤ تو لنچ کے وقت آتی ہے۔" اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "یس کم ان" اس بار بٹ صاحب نے آواز بلند کی۔ دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی جیسے گلستان کھل گیا۔ ایک باغ و بہار قسم کی خاتون ایک ہاتھ میں بڑی نزاکت سے ٹرے سنبھالے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔

"ہائی۔" وہ مسکرائیں۔ "چائے آپ نے منگائی ہے؟"

"جی ہاں۔" بٹ صاحب جلدی سے بول پڑے۔ "ہمیں نیند سی آرہی تھی۔"

"مجھے امید ہے یہ آپ کی نیند اڑا دے گی۔" اتنا کہہ کر اس نے بلاؤز کی جیب میں سے ایک بال پوائنٹ اور ٹرے میں سے ایک بل نکال کر میز پر رکھ دیا۔ "سائن کون کرے گا۔" وہ کمرا ہمارا تھا اس لیے ہم نے بل پر سائن کر دیے۔ وہ "شکریہ" کہہ کر لہراتی اور خوشبو بکھیرتی ہوئی چلی گئی۔ دروازہ بند ہوا تو بٹ صاحب بولے۔ "کتنی بد اخلاقی ہے۔ اسے جھوٹے منہ بھی چائے کے لیے نہیں پوچھا۔ وہ کیا سوچے گی!؟"

خان صاحب نے کہا۔ "بھائی جان۔ کبھی ہمارے سوچنے کے بارے میں بھی سوچ لیا کرو۔ یار تمہاری عقل داڑھ کب نکلے گی آخر؟ اس سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہمیں نیند آرہی تھی' اس لیے چائے منگائی ہے۔ وہ تمہاری افسر تو نہیں لگی ہوئی ہے جو تم اس کے سامنے صفائیاں پیش کرنے لگے۔ ذرا یہ سوچو کہ وہ تمہارے بارے میں کیا سوچے گی۔"

ہم نے کہا۔ "واقعی ٹھیک بات ہے اور آپ نے اس کا نام تک نہیں پوچھا۔ آخر

اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

کہنے لگے۔ "اس کا نام سینڈی ہے۔ کتنا اچھا نام ہے۔ یار ماننا پڑے گا کہ نام رکھنا تو ان لوگوں پر ختم ہے۔"

خان صاحب خاموش نہ رہ سکے۔ "واقعی کتنا اچھا نام ہے۔ سینڈی! سینڈ کہتے ہیں ریت کو اور سینڈی کا مطلب ہوا ریتیلی۔ لاحول ولا قوۃ یہ بھی بھلا کوئی نام ہوا؟!"

بٹ صاحب کچھ شرمندہ سے ہو کر چائے بنانے میں مصروف ہو گئے۔

خان صاحب نے جو داستان سنائی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انہوں نے جب الیکٹرانکس کی درآمد کے سلسلے میں مختلف جاپانی کمپنیوں سے رابطہ کیا اور اپنا اور بٹ صاحب کا حوالہ دیا تو ان سب نے انہیں جاپان آنے کی دعوت دے دی۔ جاپان پہنچے تو ہر کمپنی ان کی راہ میں پلکیں بچھانے لگی۔ خاطر مدارات کی انتہا کر دی۔

"بھائی ماننا پڑے گا کہ کاروبار تو ان جاپانیوں پر ختم ہے۔ ایک سو سنے مرے ہوں گے تو ایک جاپانی بزنس مین جنم لیتا ہے اور اخلاق ایسا کہ کیا کسی کا ہو گا۔ بات بات پر شکریہ۔ قدم قدم پر تعظیم۔ ایک تو بات بات پر جھک جاتے ہیں۔ جھک جھک کر میری تو کمر ہی آدھی رہ گئی۔ مجھے تو ڈر ہو گیا تھا کہ کہیں کبڑا ہی نہ ہو جاؤں۔"

"بھئی جھکنا ان کی تو روایت میں شامل ہے مگر آپ کو بار بار جھکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں' آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔" پھر کہنے لگے۔ "میری کمر تو چند دن کے اندر ہی ٹوٹنے کے قریب ہو گئی حیرت ہے کہ ان جاپانیوں کی کمر کیوں خراب نہیں ہوتی۔"

کہنے لگے۔ "ایک بات بتاؤں۔ آپ ہنسی میں تو نہیں اڑائیں گے؟"

ہم نے کہا۔ "ہنسنے کی بات ہو گی تو ضرور ہنسیں گے۔"

کہنے لگے۔ "اب تو ہم نے بھی دنیا کے بہت سے ملک دیکھ لیے ہیں مگر ایمان کی بات ہے کہ جاپانیوں والی بات کسی میں بھی نہیں دیکھی۔ ڈسپلن اتنا ہے کہ لگتا ہے جیسے انسان نہیں' مشین ہیں۔ ہر شخص چیونٹی کی طرح مسلسل اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ ان جاپانیوں کو کام کرنے کی بیماری ہے۔"

ہم نے کہا۔ "اور ترقی کرنے کے باوجود کتنے مشرقی ہیں۔ عورتیں کتنی شرمیلی ہیں۔"

بولے۔ "آپ سے کس نے کہا؟"

"سب یہی کہتے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "جھوٹ بولتے ہیں۔ بھائی ایمان کی بات یہ ہے کہ بے شرمی تو یورپ اور امریکا میں بھی کم نہیں ہے مگر جاپان والوں نے تو انتہا کر دی ہے۔"

ہم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بٹ صاحب کو کہنی ماری۔ "کیوں بٹ جی، بولتے کیوں نہیں۔"

بٹ صاحب نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے اور بولے۔ "توبہ توبہ"

"مگر ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ گے بھی۔"

"بھائی کیا بتائیں۔ وہ تو سب کے سب ننگے ہو کر ایک ہی سوئمنگ پول میں نہاتے ہیں۔ بڑے ہی بے شرم ہیں۔ عورت، مرد، بچے، ماں باپ، سب وہیں۔ میرے تو ہوش اڑ گئے یہ دیکھ کر۔"

"مطلب یہ کہ ایک حمام میں سبھی ننگے!!"

"میرا خیال ہے یہ محاورہ کسی نے جاپانیوں کو دیکھ کر ہی بنایا ہو گا۔" بٹ صاحب نے رائے ظاہر کی۔ "مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ صرف نہاتے وقت ہی تمام کپڑے اتارتے ہیں اس کے علاوہ ہر وقت کپڑے پہنے رہتے ہیں۔"

"یہ کیا بے تکی بات کر دی۔" خان صاحب نے فوراً ٹوک دیا۔ ظاہر ہے کہ سب لوگ نہاتے وقت ہی کپڑے اتارتے ہیں اور باقی وقت کپڑے پہنے رہتے ہیں۔ آپ نے کوئی ایسا بندہ دیکھا ہے جو نہاتے وقت کپڑے پہن لیتا ہو اور باقی وقت ننگا پھرتا ہو؟"

ہم نے فوراً مداخلت کی ورنہ یہ مباحثہ بہت طویل ہو سکتا تھا۔ "مگر ان کے حمام میں ننگے نہانے سے آپ کے یہاں آنے کا کیا تعلق ہے؟ آپ لوگوں نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اچانک یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"ہوا یہ کہ جس کمپنی سے ہماری بات چیت چل رہی تھی اس نے خوش کرنے کے لیے اپنے خرچ پر ہمیں لاس اینجلس اور میامی بیچ کی سیر کرانے کی پیشکش کی جو ہم نے قبول کر لی۔ اب ہم جاپانیوں کے خرچ پر یہاں آئے ہیں۔ رشوت کے طور پر۔"

"کاروبار کے معاملے میں یہ جاپانی بہت تیز ہوتے ہیں۔ بزنس حاصل کرنے کے لیے ہر طرح خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹوکیو میں بھی سیرِ تفریح، دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔"

"اصل بات کیوں گول کر گئے؟" بٹ صاحب نے لقمہ دیا۔

"وہ تم سنا دو۔"

"آفاقی صاحب، کیا بتاؤں۔ ہمارے ساتھ انہوں نے ایک انگریزی بولنے والی لڑکی نتھی کر دی تھی بالکل جاپانی گڑیا لگتی تھی۔ اس کی انگریزی بہت مشکل سے ہماری سمجھ میں آتی تھی۔"

"شاید آپ کی انگریزی کے بارے میں وہ بھی اپنے دوستوں سے یہی کہتی ہو گی۔"

"ایک بات ماننی پڑے گی۔ جنگ کے بعد امریکا کے کاروبار کا اور ان کی زبان کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔"

"یار، یہ بیڑے کی باتیں چھوڑو۔ اصل بات بتاؤ۔" خان صاحب نے کہا۔

"کیا بتائیں۔ وہ تو خوش کرنے کے لیے شام کو لڑکیاں بھی بھیج دیتے ہیں۔"

"خوب۔" ہم نے کہا۔ "تو اس طرح بزنس کر رہے ہیں آپ لوگ؟"

"نہیں، نہیں۔ بھائی ہم نے کچھ نہیں کیا۔ بس یہاں آنے کی آفر قبول کر لی۔ اس طرح آپ سے ملاقات ہو گئی اور اب ساتھ گھومیں گے۔"

"اور کھانے وانے کا کیا بندوبست ہے؟"

"سی فوڈ بہت اچھا ملتا ہے یہاں، اس میں حلال حرام کا چکر بھی نہیں ہے۔ مچھلی، جھینگے، کچھوے"

"بس بس۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم یہ چیزیں نہیں کھاتے۔ آپ لوگ بہت ترقی کر گئے ہیں۔ تھوڑے دن میں مینڈک وغیرہ بھی کھانے لگیں گے۔"

"بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو اب ہم پانی کے جانور نہیں کھائیں گے اپنا وہی پرانا کھانا کھا لیا کریں گے۔ آملیٹ زندہ باد۔"

"چلئے کھانے کی پرابلم تو حل ہو گئی۔"

☆ ☆ ☆

رات کو ہم میامی کی سیر کرنے کے ارادے سے کمرے سے نکلے۔ اس وقت استقبالیہ پر ایک نوجوان خاتون تشریف فرما تھیں۔ نزدیک گئے تو پتا چلا کہ اتنی نوجوان بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ حرکتیں سب کی سب نوجوانوں جیسی کر رہی تھیں۔

خان صاحب سیدھے ان کے پاس پہنچ گئے اور اتنی زور سے "ہائی" کہا کہ وہ کاغذات کا مطالعہ کرتے کرتے اچانک اچھل پڑیں مگر خان صاحب کو دیکھا تو مسکرائیں۔

"اوہ یہ تم ہو؟"

خان صاحب نے ہمارا تعارف کرایا۔ "یہ ہمارے دوست ہیں جن کے لیے ہم نے کمرا بک کرایا تھا۔"

انہوں نے فوراً مسکرا کر ہماری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ "میرا نام وینڈی ہے۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

بٹ صاحب نے سرگوشی کی۔ "ان لوگوں میں یہ خوبی ہے کہ خود ہی اپنا نام بتا دیتے ہیں۔"

وینڈی نے پوچھا۔ "آپ کا باقی یونٹ کب آئے گا؟"

"مناسب وقت پر۔" خان صاحب نے جواب دیا پھر بولے۔ "تم نے کچھ معلومات فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔"

وینڈی نے دراز میں سے ایک پمفلٹ نکالا اور خان صاحب کے حوالے کر دیا۔ "اس میں تمہیں ساری معلومات مل جائیں گی۔"

خان صاحب نے گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا۔ دوبارہ مصافحہ کیا اور پمفلٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے لاؤنج میں رکھے ہوئے ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔

"یونٹ کی کیا بات ہے؟" ہم نے پوچھا۔

خان صاحب مسکرائے' بولے۔ "میامی بیچ پر رہنے کے لیے کچھ تفریحیں بھی کرنی پڑتی ہیں۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں بے شمار لوگ فلموں کی شوٹنگ کرنے یا ماڈلز کی تصویریں بنانے کے لیے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ماڈلز کی آبادی دوسرے لوگوں سے بھی زیادہ

ہے۔ ماڈلز کی قدر بھی بہت ہوتی ہے۔ اب تو ہالی ووڈ کے فلم پروڈیوسرز بھی شوٹنگ کے لیے یہاں آنے لگے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر شوٹنگ سے ہمارا کیا تعلق ہے؟"

بٹ صاحب نے کہا۔ "بس ایسے ہی۔ ذرا شو مارنے کے لیے۔"

اچانک مختلف آوازوں کا شور سنائی دیا۔ لفٹ کا دروازہ کھل رہا تھا اور اس میں سے کچھ لوگ برآمد ہو رہے تھے زیادہ تعداد خواتین کی تھی جو قسم قسم کے ملبوسات میں تھیں اور ان میں سے ہر لباس ایسا تھا کہ اس پر لباس کی تہمت کا گمان گزرتا تھا۔ جینز ایسی کہ تمام پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ بالائی جسم کا لباس اس سے بھی زیادہ نرالا۔ ایک خاتون غالباً ٹینس کے نیٹ سے بنا ہوا لباس پہن کر تشریف لے آئی تھیں۔ دوسری کا لباس بھی کچھ کم عجیب نہ تھا۔ انہوں نے گہرے سرخ رنگ کا ایک جانگیا پہن رکھا تھا' جسم کے بالائی حصے پر جو سفید رنگ کا لباس تھا وہ انتہائی شریفانہ تھا۔ یعنی بند گلا' پوری آستین مگر یہ لباس اس جگہ پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا جس جگہ سے ان کا جانگیا شروع ہوتا تھا۔ گویا نچلا دھڑ قریب عریاں اور اوپر کا لباس ٹھیٹ مشرقی انداز کا۔ اسے مزید شریفانہ بنانے کے لیے انہوں نے گلے میں ایک بڑا سا سرخ اسکارف دوپٹے کے انداز میں ڈال رکھا تھا۔ پیروں سے وہ ننگی تھیں کیوں کہ سفید رنگ کے نازک سے جوتے انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے باقی ماندہ تین خواتین بھی انوکھے ملبوسات میں تھیں۔ وہ سب کی سب ہنستی اور باتیں کرتی ہوئی لفٹ سے برآمد ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ دو مرد بھی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں کیمرہ تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فوٹوگرافر قسم کی چیز ہے۔ دوسرا ایک ادھیڑ عمر سفید بالوں والا' باوقار آدمی تھا۔ اس نے سفید شارک اسکن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بار بار اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ یہ قافلہ باتیں کرتا ہوا ہوٹل کی لابی سے باہر چلا گیا۔

"یہ لوگ کسی میگزین کے لیے تصویریں بنا رہے ہیں۔ دو دن سے یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"لڑکیوں سمیت؟"

"ارے نہیں۔ یہ لڑکیاں تو ماڈل ہیں۔ یہاں بہت مل جاتی ہیں بڑے اسٹارز کے علاوہ باقی سب کچھ یہیں سے حاصل ہو جاتا ہے۔ ماڈلز کی یہاں کمی نہیں ہے مگر پھر بھی ماڈلز کی

بہت مانگ اور قدر ہے۔"

ایک صاحب لفٹ سے باہر نکلے اور کھوئے کھوئے انداز میں ہمارے پاس رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے بال لڑکیوں سے بھی زیادہ لمبے تھے۔ جنہیں وہ بار بار مروڑ رہے تھے۔ یکایک انہوں نے چٹکی بجائی جس کی آواز دور دور تک پہنچی ہو گی۔ چراغ الہ دین کے جن کی طرح اچانک ایک خوش اندام ویٹریس کہیں سے نمودار ہوئی۔ اس کا لباس مغربی معیار سے نہایت معقول قرار دیا جا سکتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے سر پر ایک کشتی نما سرخ رنگ کی ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ٹوپی اس کے سر اور بالوں کو ڈھانپنے میں ناکام رہی تھیں۔

"ایک وہسکی ڈبل۔" انہوں نے بال مروڑتے ہوئے آرڈر دیا۔

ویٹریس سر جھکا کر رخصت ہونے لگی۔ اس کی نظر ہم لوگوں پر پڑی تو مسکراتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ "آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے؟"

ہمارے بولنے سے پہلے ہی بٹ صاحب بول پڑے۔

"لیمن جوس۔ تین۔ ڈبل۔"

وہ ہنس پڑی۔ "آپ کا مطلب ہے تین گلاس جوس؟"

"تم انہیں ڈبل نہیں کر سکتیں؟"

"سوری سر۔ جوس تو ڈبل نہیں ہو سکتا۔ آپ کہیں تو دو دو گلاس لے آؤں؟"

خان صاحب بولے۔ "نہیں، ایک ایک ہی کافی ہو گا۔ شکریہ۔"

بٹ صاحب سنجیدہ ہو گئے۔ "ان ملکوں میں ہر کوئی وہسکی، بیئر، برانڈی، شیمپین نہ جانے کیا کیا پیتا ہے۔ ایسی جگہوں پر جب ہم جوس یا کوک کی فرمائش کرتے ہیں تو کتنا عجیب سا لگتا ہے۔"

"تو پھر کیا کریں؟" خان صاحب بولے۔ "کیا ہم بھی شراب پینے لگیں؟"

"توبہ توبہ۔" بٹ صاحب نے کان پکڑ لیے۔

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب۔ آپ لوگوں نے خاصی ترقی کر لی ہے۔ کم از کم شرابوں کے نام تو یاد ہو ہی گئے ہیں۔"

سامنے والی گیلری میں سے سفید لباس میں ایک اسمارٹ سی خاتون تیز تیز قدم اٹھاتی

ہوئی نمودار ہوئیں۔ وہ سفید نیکر اور سفید ہی مختصر سا بلاؤز پہنے ہوئے تھیں اتنا مختصر کہ ان کا پیٹ ننگا تھا، بلاؤز میں بٹن کی جگہ انہوں نے سفید ربن باندھ رکھا تھا، وہ سفید جوگر پہنے ہوئے تھیں۔ اور ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ ایک بال پین انہوں نے اپنے جوڑے نما بالوں میں اڑس رکھا تھا۔ ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ "کم آن بوائز۔ باہر ٹرانسپورٹ انتظار کر رہی ہے۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔"

یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے لابی سے باہر نکل گئی۔

بٹ صاحب خوش ہو کر بولے۔ "ہمیں بوائز کہہ رہی ہے بلاوا دے کر گئی ہے۔"

خان نے فوراً کہا۔ "یہاں اسی سال کے بوڑھے کو بھی بوائے یا ینگ مین کہا جاتا ہے اور ستر سالہ بڑی بی بھی "گرل" کہلاتی ہیں۔ آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں وہ آپ کو ماڈلز سمجھ رہی ہے۔"

ویٹریس ایک ٹرے میں بہت سلیقے سے چار گلاس لے کر آگئی۔ پہلے اس نے وہسکی کا گلاس بال مروڑنے والے صاحب کو پیش کیا اور پھر جوس کے گلاس ہمارے حوالے کر دیے، بولی۔ "اگر آپ کہیں تو کچھ دیر بعد ایک ایک گلاس اور لے آؤں؟"

"نہیں، شکریہ۔"

ہمارے برابر میں بیٹھے ہوئے صاحب نے دو تین گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کر دیا اور پھر اپنے بال مروڑنے شروع کر دیے۔ ایکا ایکی ان کی نظر ہم لوگوں پر پڑی تو مسکرا دیے اور بولے۔ "آپ لوگ ماڈلز ہیں؟ کسی کام کے سلسلے میں آئے ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "جی نہیں، ہم لوگ ٹورسٹ ہیں۔"

بولے۔ "حیرت کی بات ہے کیا یہاں ٹورسٹ بھی آتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "آپ کسی فلم کے سلسلے میں آئے ہیں شاید؟"

کہنے لگے۔ "اس شہر میں آپ کو جتنے بھی لوگ نظر آتے ہیں، مقامی آبادی کو چھوڑ کر، وہ سب کے سب فلموں کی شوٹنگ یا میگزینوں کے لیے تصویریں بنوانے کے لیے آئے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس شہر کا گزارہ ہی فلم والوں اور فوٹو گرافروں سے ہوتا ہے۔ اس میں اسکرپٹ رائٹر ہوں مگر تین مہینے میں ایک سطر بھی نہیں لکھ سکا ہوں۔"

خان صاحب نے پوچھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟"

"لکھنے کا طبیعت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ موڈ سے ہوتا ہے۔ ترنگ سے ہوتا ہے وجدان سے ہوتا ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی خود اپنے بس میں نہیں ہوتی۔" انہوں نے بالوں کو مروڑتے ہوئے ایک بار پھر چٹکی بجائی اور پھر وہی خوبصورت ویٹریس نمودار ہو گئی۔

"ایک وہسکی ڈبل۔"

"اوکے سر" پھر ویٹریس ہم سے مخاطب ہوئی۔ "آپ کے لیے بھی ایک ایک گلاس جوس؟"

اسکرپٹ رائٹر یکایک چونکے' بال مروڑتے ہوئے رک گئے اور ویٹریس سے مخاطب ہو کر بولے۔ "ان دوستوں کے لیے بھی ڈبل وہسکی میری طرف سے۔"

ہمارے کچھ بولنے سے پہلے ہی ویٹریس چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی۔

ہم نے کہا۔ "آپ نے بلاوجہ تکلف کیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ"

مگر وہ اتنی دیر میں ایک بار پھر اپنے خیالات میں کھو گئے تھے اور بہت تیزی سے اپنے بال مروڑ رہے تھے۔

خان صاحب بولے۔ "یہ بے وقوف تو تین مہینے سے کہانی سوچ رہا ہے اور اپنے بال مروڑ رہا ہے مگر ہم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"ٹھیک تو ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس کا شکریہ ادا کر دیں۔"

"شکریہ تو تب ادا کریں گے جب وہ ہماری بات سننے کے قابل ہو گا اسے تو بال مروڑنے کے سوا کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں ہے۔"

"یار لعنت بھیجو اس پر۔ مچھلی کی طرح شراب پی رہا ہے۔ اس کے پاس بیٹھ کر تو ہمیں بھی نشہ ہو جائے گا۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" خان صاحب نے بٹ صاحب کو ڈانٹ دیا۔ "پاس بیٹھنے سے نشہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"جب سگریٹ پینے والوں کے ساتھ بیٹھنے سے کینسر ہو سکتا ہے تو شرابیوں کے پاس بیٹھنے سے نشہ کیوں نہیں ہو سکتا!"

"سگریٹ میں تو دھواں ہوتا ہے۔" خان صاحب بولے۔

"اور شراب میں بو ہوتی ہے۔"

"تمہاری جرح پھر شروع ہو گئی۔" ہم نے کہا۔

اتنی دیر میں وہ شعلہ جوالہ ویٹرس ایک بار پھر نمودار ہو گئی۔ اس کی ٹرے میں اس بار بھی چار گلاس رکھے ہوئے تھے۔ فرق یہ تھا کہ اس بار چاروں کے چاروں وہسکی سے بھرے ہوئے تھے۔

"وہسکی سر۔" ویٹریس نے ان کے پاس جا کر کہا تو وہ چونک سے گئے اپنا گلاس اٹھایا اور پھر گلاس کو اونچا کر کے ہمیں بھی جام اٹھانے کا اشارہ کیا۔ ہم نے فوراً اس موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ "تھینک یو سر مگر ہم لوگ شراب نہیں پیتے۔"

"تم تینوں کے تینوں؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہم تینوں نے تصدیق کے لیے سر ہلا دیا۔

وہ رحم بھرے لہجے میں بولے۔ "میں تم لوگوں سے ہمدردی کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں!"

ویٹریس نے پوچھا۔ "سر ان تین گلاسوں کا کیا کروں؟"

بولے۔ "سامنے میز پر رکھ دو' میں باری باری پی لوں گا۔ اوکے۔"

"اوکے سر۔ ویٹریس تینوں گلاس ان کے سامنے رکھ کر رخصت ہو گئی مگر جاتے جاتے ہماری جانب ایک نگاہ پھینکنا نہ بھولی۔

اسکرپٹ رائٹر نے تین گھونٹوں میں اپنا گلاس خالی کر دیا پھر ہم لوگوں کی طرف یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ "آپ لوگ ماڈلز ہیں؟" اس نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

ہمیں ان کی اس حرکت پر نپولین بوناپارٹ کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ کہتے ہیں کہ نپولین کو بولنے کا بہت شوق تھا۔ حالت یہ تھی کہ اگر کسی سے کوئی سوال بھی کرتا تو اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی یا تو اس کی طرف سے خود ہی جواب دے دیتا یا پھر فوراً ہی ایک اور سوال داغ دیتا تھا۔ نپولین کی عادت یہ تھی کہ تقریبات میں جن لوگوں سے ملاقات ہوتی تھی ان کی باتیں کم سنتا تھا اور خود زیادہ بولتا تھا اور بار بار ان لوگوں کے نام پوچھتا رہتا تھا کیوں کہ نام سننے اور یاد رکھنے کا یارا اس میں نہیں تھا۔ ایک تقریب میں مشہور موسیقار گریزی کو اس کے حضور میں پیش کیا گیا۔ تھوڑی دیر کے اندر نپولین نے حسب عادت پانچ چھ مرتبہ اس کا

نام پوچھا۔ تقریب کے خاتمے پر جب نپولین محفل سے رخصت ہونے لگا تو حاضرین محفل نے شہنشاہ کو خدا حافظ کہا۔ نپولین نے بڑے غور سے گریزی کی جانب دیکھا اس سے پہلے کہ وہ اس سے نام پوچھتا۔ گریزی نے عرض کی۔ "عالی جاہ۔ میرا نام اب بھی گریزی ہے۔"

ان صاحب نے مختصر سے عرصے میں دوسری بار ہم پر ماڈل ہونے کا شبہ ظاہر کیا تھا اور اندیشہ تھا کہ وہ آئندہ بھی باز نہیں آئیں گے اس لیے ہم نے بہتری اسی میں سمجھی کہ ان کے پاس سے اٹھ جائیں۔ وہ حسب معمول اپنے بال مروڑنے میں مصروف تھے۔ ہم لوگ خاموشی سے اٹھے اور باہر کے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ صاحب اچانک خیالوں کے سمندر سے باہر نکلے اور اپنے سامنے میز پر رکھے ہوئے وہسکی کے تین گلاسوں کو دیکھے بغیر زور سے چٹکی بجائی اور ویٹرس کے نمودار ہونے پر وہی پرانا جملہ دہرا دیا۔

"ایک ڈبل وہسکی۔"

لڑکی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "سر وہسکی کے تین گلاس آپ کے سامنے میز پر رکھے ہوئے ہیں۔"

بولے۔ "رکھے ہوئے ہیں تو میں کیا کروں؟ تم میرے پینے کے لیے ایک ڈبل پیگ لے آؤ۔"

☆ ☆ ☆

اسکرپٹ رائٹر کو بال مروڑتے اور وہسکی کے جام پیتے ہوئے چھوڑ کر ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ تازہ ہوا کے جھونکوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ بٹ صاحب نے ایک لمبی سی سانس لی اور ڈھیر ساری تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں سمیٹ لی پھر بولے "ایمان سے' اس ہوا نے تو ہشاش بشاش کر دیا۔"

مایامی یا میامی میں ہوا بھی تازہ اور بھیگی بھیگی ہوتی ہے مگر اس کی ایک دلکشی یہاں کا موسم بھی ہے۔ نہ ساون سوکھا' نہ بھادوں ہرا۔ تمام سال موسم ایک ہی جیسا رہتا ہے۔ نہ بہت زیادہ گرمی' نہ کڑاکے کی سردی۔ ایک وضع دار انسان کی طرح ہر حال میں یکساں۔ میامی کی یہی خوبی ہے جو سیاحوں سے زیادہ شوٹنگ کرنے والوں کو یہاں کھینچ لاتی ہے۔ شوٹنگ یہاں ہر قسم کی ہوتی ہے یعنی فلموں کی شوٹنگ کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ٹی وی کے لیے کمرشل یا ڈرامائی فلمیں بنانے والوں کی بھی کمی نہیں ہوتی اور پھر اشتہاروں اور مختلف میگزینوں کے لیے تصاویر وغیرہ بنانے والے یونٹ بھی درجنوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

خان صاحب بولے "بس ایک ہی قسم کی شوٹنگ یہاں نہیں ہوتی۔"

"وہ کس قسم کی؟"

کہنے لگے "بندوقوں اور پستولوں والی۔"

دوسرے دن ہم نے اخبار میں پڑھا کہ ایک ساحلی ریستوران میں دو ڈاکو داخل ہو گئے ہوا میں گولیاں چلائیں اور سارے دن کی کمائی طلب کی۔ جب کیشیئر خاتون نے پس و پیش کی تو بے دریغ اس پر گولیاں برسا دیں۔ گویا اس قسم کی شوٹنگ بھی یہاں ہوتی رہتی ہے۔ ایک اور قسم کی شوٹنگ بھی ہوتی ہے اس کا نمونہ بھی کچھ دیر بعد ہی ہم نے دیکھ لیا۔

ہم تو سیر کی غرض سے باہر نکلے تھے۔ سڑکوں' عمارتوں اور روشنیوں کی خوب صورتی کے کیا کہنے! روشن روشن سڑکیں' جگمگاتی ہوئی عمارتیں اور زندگی سے بھرپور پارک سب سے بڑھ کر یہ حسین و جمیل عورتوں کی ریل پیل۔ اس پر مستزاد لمبے تڑنگے' مضبوط اور خوش شکل مردوں کی دھکم پیل۔ عورتوں سے ہم نے یورپ اور امریکا کا کوئی شہر خالی نہیں دیکھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر شہر کو حسینوں سے لبریز ہی پایا۔ شاید یہاں عورتوں کی آبادی مردوں سے زیادہ ہے یا پھر بٹ صاحب کے خیال کے مطابق یہاں کے مرد پردہ کرتے ہیں اور گھر گرہستی کے کاموں میں لگے رہتے ہیں اس لیے تو باہر صنف نازک کی فراوانی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خواتین کی فراوانی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس شہر میں ملک کے دور دراز حصوں سے بھی ماڈل لڑکیاں جوق در جوق آتی ہیں اور پھر یہیں کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دوسرے ملکوں سے آنے والیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ صرف لڑکیاں ہی نہیں' لڑکے بھی ماڈل بننے کے چاؤ میں یہاں کھنچے چلے آتے ہیں' یہ بات الگ ہے کہ لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ بھی آپ جانتے ہوں گے۔ دراصل اہل مغرب نے عورت کو ایک سجاوٹ اور تماشا بنا دیا ہے۔ تجارت کی جنس بنا کر رکھ دیا ہے۔ کوئی بھی چیز فروخت کرنے کے لیے عورت کے مختلف انداز اور زاویے ضرور دکھائے جاتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ مغرب کے مرد آخر عورت کے اتنے شیدائی کیوں ہیں؟ مشرق کی بات مختلف ہے۔ یہاں عورت پردوں میں رہتی ہے۔ میل ملاپ تو کیا اس کی شکل دیکھنا بھی بہت مشکل ہے۔ ترقی پسند ادیبوں اور دانش وروں کے الفاظ میں یہاں "جنسی گھٹن" ہے اسی لیے تو کسی نے کہا تھا کہ ہندوستان کے مردوں کے اعصاب پر عورت سوار رہتی ہے اور اس کے جواب میں سعادت حسن منٹو نے لکھا تھا کہ بھائی' مردوں کے اعصاب پر اگر عورت سوار نہ ہو گی تو کیا ہاتھی گھوڑے سوار ہوں گے؟ مراد یہ ہے کہ مغرب میں عورت ہر جگہ نظر آتی ہے' ہر جگہ دستیاب ہے' لڑکے ہوش سنبھالتے ہی صنف مخالف کی صحبت اور دوستی سے فیض یاب ہو جاتے ہیں۔ کون سی جگہ ہے جہاں عورت نظر نہیں آتی اور اس انداز میں کہ کچھ بھی تو ڈھانپ کر نہیں رکھتی۔ اس کے باوجود جسے دیکھیے عورت کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔ دکانوں پر عورت' بینکوں' اسٹوروں میں عورت۔ دفتروں میں عورت' سڑکوں بازاروں میں عورت۔ گلی گلی محلے محلے عورتوں کے میلے لگے

ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود جب تک کسی اشتہار میں عورت ماڈل نہ ہو وہ چیز مقبول نہیں ہوتی۔ عجیب ماجرا ہے!

ہم فٹ پاتھ پر چل رہے تھے اور ہمارے چاروں طرف رنگ و نور کا سمندر تھا۔ ب صورتی ہم نے دوسرے شہروں میں بھی دیکھی مگر یہ ورائٹی اور معیار کم کم ہی نظر یا۔ شاید اس لیے کہ ماڈل بننے کی خواہش میں صرف چیدہ چیدہ اور منتخب لڑکیاں ہی ادھر کا خ کرتی ہیں۔ خان صاحب کو بھی یہ منظر اور ماحول بہت پسند تھا۔ رہے بٹ صاحب تو ان ی پسندیدگی کا اندازہ اس "لاحول" سے لگایا جا سکتا تھا جو وہ مسلسل پڑھ رہے تھے۔ ہم نے نہیں بہت کوشش کر کے یہ سمجھایا تھا کہ اگر انہیں کسی پر لاحول بھیجنی ہے تو بہتر ہے کہ ر لب ایسا کریں۔ ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

کہنے لگے "مگر آپ نے دیکھا نہیں کہ چاروں طرف گناہوں کا بازار لگا ہوا ہے۔"

ہم نے کہا "لیکن آپ کو یہاں آنے کی دعوت کس نے دی تھی؟ ایسی خراب جگہ م رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

کہنے لگے "مجھے تو کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ کم بخت جاپانی خان صاحب کے کان میں نہ نے کیا کہہ گیا کہ ان کی ہر سانس کے ساتھ "میامی" کی آواز نکلتی تھی۔"

خان صاحب اس وقت تصدیق یا تردید کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے کیونکہ ان کا یان کسی اور طرف لگا ہوا تھا۔ یکایک انہوں نے بلند آواز سے ایک نعرہ مارا "لے گیا' لے یا' پکڑنا۔ پکڑنا۔"

سب آس پاس والوں نے رک رک کر اور مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تو نہیں یکایک احساس ہوا کہ وہ غلط زبان بول گئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اصلاح کر لی اور لے "تھیف' تھیف۔ کیچ ہم۔"

اس بار آس پاس والوں نے سنجیدگی سے ان کی جانب توجہ دی۔ خان صاحب کی نگاہیں ل شعلہ' جوالہ پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ خاتون سر سے پیر تک سرخ رنگ کے ملبوسات میں ٹی ہوئی تھیں بشرطیکہ اس کو ڈھانکنا کہا جا سکے۔ گھٹنوں سے کافی اوپر ان کے اسکرٹ کی ری حد ختم ہو گئی تھی۔ بالائی لباس بھی بس "یوں ہی" تھا لیکن جو کچھ بھی تھا' سرخ نگ کا تھا۔ لباس کی سرخی نے ان کے چہرے اور جسم کو آتشیں بنا دیا تھا۔ ان کے جسم پر

جتنا لباس تھا اس سے کہیں زیادہ کپڑا ان کے ہینڈ بیگ پر لگا ہو گا۔ ہینڈ بیگ بھی سرخ رنگ کا تھا جو شاید انہوں نے اپنے لال جوتوں کے ساتھ ہی خریدا ہو گا۔

ان خاتون کو دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ ہر طرف سے بے خبر اور ہر دیکھنے والی آنکھ سے بے نیاز اپنے ہی خیالوں میں گم تھیں اور ایک نازک سے سگریٹ ہولڈر میں اٹکی ہوئی سگریٹ کے کش پر کش لینے میں مصروف تھیں۔ بعد میں خان صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ منشیات کے نشے میں تھیں ورنہ ایک شخص اتنے آرام سے ان کے ہینڈ بیگ میں سے رقم لے کر غائب ہو جائے اور انہیں پتا بھی نہ چلے' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"مگر اتنی دور سے آپ کو کیسے پتا چل گیا؟" بٹ صاحب نے سوال کیا۔

خان صاحب کچھ گڑبڑا گئے' بولے "بس میں اس عورت کے لباس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔"

"ظاہر ہے" بٹ صاحب نے کہا "اور کیونکہ عورت اس لباس کے اندر ہی تھی اس لیے آپ نے عورت اور اس کے ہینڈ بیگ کو بھی دیکھ لیا۔"

"یار فضول باتیں نہ کرو" خان صاحب ناراض ہو گئے۔ "تمہیں معلوم ہے کہ مجھے عورتوں کو دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔"

"جی ہاں۔ آپ تو صرف ان کے لباس وغیرہ چیک کرتے رہتے ہیں۔"

اس اثناء میں آس پاس والوں کو بھی یہ پتا چل چکا تھا کہ ایک البیلی حسینہ کو کسی جیب کترے نے اپنا نشانہ بنایا ہے لیکن اگر پتا نہیں چلا تھا تو خود ان خاتون کو جو نشانہ' ستم بن چکی تھیں۔ کچھ لوگوں نے ان صاحبہ کے پاس جا کر انہیں حقیقت کی دنیا میں واپس لانے کی کوشش کی اور بتایا کہ ایک جیب کترا آپ کے ہینڈ بیگ میں سے کوئی چیز لے کر بھاگ گیا ہے۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" انہوں نے بھولپن سے پوچھا۔

اس سوال پر سب سٹپٹا گئے پھر ایک ادھیڑ عمر خاتون نے خان صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس ینگ مین نے دیکھا تھا۔"

اب سب کی نظریں خان صاحب کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ پہلے تو کچھ شرمائے اور پھر دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھے اور کہا "میں نے دیکھا تھا' ایک شخص آپ کے

ہینڈ بیگ میں سے کوئی چیز نکال کر بھاگا تھا۔"

اب ان صاحبہ نے اپنے ہینڈ بیگ پر نظر ڈالی۔ ہینڈ بیگ کو بند کرنے کے لیے کوئی زپ وغیرہ نہیں تھی۔ اس لیے اس کے اندر ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالنا مشکل کام نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ ہینڈ بیگ کے اندر ڈال کر ٹٹولا اور پھر بولیں "ہاں۔ ٹھیک ہے' وہ میرا والیٹ (پرس) لے گیا ہے۔"

سب نے ہمدردی سے انہیں دیکھا اور خان صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ اپنا سر اونچا کر لیا۔

"زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟" ایک موٹے تازے آدمی نے اظہار ہمدردی کے طور پر ان خاتون کے ننگے بازوؤں کو تھام کر پوچھا۔

بٹ صاحب نے ہمیں کہنی ماری اور زیر لب کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے' پوچھنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟"

ہم نے کہا "بھائی ہر جگہ کا اپنا دستور ہوتا ہے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہو گا۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔"

ادھر ان خاتون نے پہلے اپنے گورے گورے بازوؤں کو پھر ان صاحب کے موٹے موٹے ہاتھوں پر گھور کر ایک نظر ڈالی جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنے ہاتھ فوراً ان کے بازوؤں پر سے ہٹا لیے۔ مغرب کے لوگوں کا یہ دستور بھی اچھا ہے کہ آپ خواتین کی مرضی کے خلاف انہیں انگلی تک نہیں لگا سکتے اور اگر ایسا کر بھی لیں تو ان کی ایک "انتباہی نظر" کی صورت حال کو سدھارنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

یہ خاتون اب بھی لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن چکی تھیں اور خدا لگتی پوچھیے تو واقعی اس کی مستحق بھی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت کسی اور حوالے سے "مرکز نگاہ" تھیں۔

انہوں نے ایک تھکی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ سب کو دیکھا اور پھر بولیں "مجھے یہاں کے جیب کتروں کی عادت کا پتا ہے اس لیے میں اپنے پرس میں کچھ بھی نہیں رکھتی۔ سوائے لپ اسٹک کے اور یہ معمولی نقصان بہت آسانی سے برداشت کیا جا سکتا ہے۔"

اتنی دیر میں ان کے آس پاس ایک مجمع سا لگ گیا تھا۔ ان کی بات سن کر سب لوگوں

نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی اپنی راہ لی۔ انہوں نے بلند آواز میں پوچھا "چور کو کس نے دیکھا تھا؟"

خان صاحب نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا اور دو قدم آگے بڑھ کر ان کے نزدیک جا کھڑے ہوئے اور دانت نکال کر بولے "وہ میں تھا۔"

خاتون نے سر سے پیر تک ان کو نگاہوں میں جانچا اور پھر شاید مطمئن ہو کر مسکرائیں اور بولیں "تمہاری نظریں بہت تیز ہیں۔ کیا تم سراغ رساں ہو؟"

"نہیں۔ بس اتفاق سے میری نظر پڑ گئی تھی مگر تم کن خیالوں میں گم تھیں؟"

وہ پھر مسکرانے لگیں۔ بات بات پر مسکرانا ان کی عادت تھی اور سچی بات ہے کہ جب وہ مسکراتی تھیں تو ان کے رخساروں پر جو گڑھے پڑ جاتے تھے وہ بہت بھلے لگتے تھے۔ شاید یہ بات کسی نے انہیں بھی بتا دی تھی ورنہ بار بار مسکرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

وہ بولیں "مجھے ایک بہت اچھا کانٹریکٹ ملا ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پتا ہے' یہ کانٹریکٹ میری زندگی میں ایک سنگ میل بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" پھر انہوں نے اظہار مسرت کے طور پر اپنے شانے ہلائے اور دونوں ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے کہا "کتنا اچھا موقع ہے؟ ایسا موقع بار بار تو نہیں ملتا۔"

اب جب کہ ہم تینوں ان کے نزدیک پہنچ چکے تھے اور ان سے بات چیت کا آغاز بھی ہو چکا تھا بٹ صاحب نے بھی دخل در معقولات ضروری سمجھی اور ہمارے کان میں سرگوشی کی "اس کا نام تو پوچھئے۔"

ہم نے حسب دستور سنی ان سنی کر دی مگر قدرت اس روز خان صاحب اور بٹ صاحب دونوں بلکہ ہم تینوں پر مہربان تھی۔ ان خاتون کو خود بخود یہ احساس ہو گیا کہ انہوں نے ابھی تک ہم لوگوں کو بالکل نظرانداز کر رکھا ہے۔ بولیں "سوری۔ میں نے آپ سے یہ پوچھا ہی نہیں کہ آپ لوگ کون ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ٹورسٹ ہیں یا ماڈل؟"

اب گفتگو میں بٹ صاحب کا شریک ہونا ناگزیر ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے اپنی ٹانگ اڑانا ضروری سمجھا اور اپنی بہترین انگریزی میں کہا "میڈم۔ ہم لوگ ٹورسٹ ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ دراصل ابھی تو ہم جاپان سے آ رہے ہیں مگر اس سے پہلے پاکستان سے آئے تھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ پاکستان سے ہی جاپان گئے تھے اور پھر۔" وہ یکایک بولتے ہوئے

رہ گئے کیونکہ خان صاحب نے بہت زور سے ان کے پیر پر اپنا پیر رکھ دیا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے!" وہ بگڑ کر اردو میں خان صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"بھائی' اس نے غلطی سے اخلاقاً ایک سوال کر لیا ہے اور آپ نے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کر دی۔ وہ کیا سوچتی ہو گی؟" حالانکہ دیکھنے میں وہ سوچنے والی لڑکی نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ انگریزی میں ایسی لڑکیوں کے لیے "ڈمب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی دیکھنے میں بے حد حسین مگر انتہائی کند ذہن۔ ویسے بھی خوب صورتی اور ذہانت کا بہت کم ہی میل ہوتا ہے۔ آپ نے مشہور و معروف ڈراما نویس جارج برنارڈ شا کا وہ واقعہ سنا ہو گا کہ ایک بار ایک انتہائی خوب صورت خاتون نے برنارڈ شا سے کہا "اگر ہم دونوں کی شادی ہو جائے تو قیامت آ جائے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"اس طرح کہ ہمارے بچوں میں تمہاری جیسی ذہانت و صلاحیت اور میری جیسی خوبصورتی ہو گی تو بھلا دنیا میں کون ان کا مقابلہ کر سکے گا۔"

جارج برنارڈ شا نے کہا "لیکن میڈم اگر معاملہ اس کے الٹ ہو گیا تو کیا ہو گا؟""

اس طرح شادی کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

ان دونوں کی تکرار لڑکی بڑی حیرانی سے سن رہی تھی مگر ہم نے دیکھا کہ وہ خان صاحب کی دراز قد اور باوقار شخصیت کے علاوہ بٹ صاحب کے صحت مند' باکسر نما وجود سے بھی خاصی متاثر تھی۔ شاید یہ نکتہ خان صاحب بھی بھانپ گئے تھے۔ کہنے لگے "اگر آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہو تو کیوں نہ کسی ریستوران میں چلیں؟"

"شیور" لڑکی نے اپنے کندھے اچکا کر کہا۔

"تم ہماری مہمان ہو گی" خان صاحب نے فوراً وضاحت پیش کر دی۔

لڑکی کا چہرہ تمتمانے لگا مسکرا کر بولی "ہاؤ نائس! میں ایک بہت اچھے فیشن ایبل ریستوران میں لے چلتی ہوں' اوکے!"

خان صاحب نے فوراً "اوکے" کہہ کر مہر تصدیق ثبت کر دی پھر فوراً ہی انہیں خیال آیا کہ ابھی تک انہوں نے تعارف کی رسم ادا نہیں کی ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔

"اوہ۔ کھان! مسٹر کھان گلیڈ تو میٹ یو!" اس نے خان صاحب سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

بٹ صاحب کا نام سن کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی، پھر پوچھا۔

"کیا آپ اسلحے کے ڈیلر ہیں؟"

"آپ کو یہ خیال کیوں آیا' یہ تو بڑے صلح کل انسان ہیں۔"

"بٹ سن کر میرا ذہن بندوق کی طرف چلا گیا۔ اگر آپ "صلح پسند" ہیں تو پھر اپنا نام ایسا کیوں رکھا ہے؟"

ہم نے اسے بتایا کہ بٹ کا مطلب کیا ہے اور ہمارے بٹ صاحب کا بندوق کے بٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

"اوہ۔ کتنی دلچسپ بات ہے" اس نے بلا جھجک بٹ صاحب کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

خان صاحب بولے "ذرا احتیاط سے"

وہ چونک کر دیکھنے لگی "کیوں؟"

"یہ باکسر بھی ہیں۔"

لڑکی کو یہ سن کر اتنی خوشی ہوئی کہ اس نے بٹ صاحب کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "کتنی اچھی بات ہے مجھے کسی باکسر سے ملنے کا بہت شوق تھا' کیا آپ چیمپئن ہیں؟" اس کی نگاہوں میں عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔

بٹ صاحب کے جواب دینے سے پہلے ہی خان صاحب بول پڑے "یہ سرگودھا ڈویژن کے چیمپئن ہیں اس سے پہلے چنیوٹ کے چیمپئن بھی رہ چکے ہیں۔"

"اوہ۔ میری خوش نصیبی ہے کہ ان سے ملاقات ہو گئی۔" اس نے بٹ صاحب کے ہاتھ کو اور بھی مضبوطی سے تھام لیا "اب ہم مے گیو چلیں گے۔"

"مے گیو؟"

"ایک فیشن ایبل ریستوران ہے۔ بیشتر ماڈلز وہاں آتی ہیں۔ میرے ساتھ ایک ڈبل چیمپئن کو دیکھ کر وہ کتنا جلیں گی' کیوں؟" اس نے بٹ صاحب کو کہنی ماری "بٹ صاحب سٹپٹا کر رہ گئے' کچھ اور جواب نہ سوجھا تو بولے "میں آپ کو کس نام سے پکاروں؟"

"میرا نام نورا ہے" اس نے بڑی لگاوٹ سے کہا "نورا سوان۔"

"کتنا اچھا نام ہے" خان صاحب بولے "بہت اچھوتا نام ہے۔"

بٹ صاحب کو ان کی یہ تعریف پسند نہیں آئی "خاک اچھا نام ہے۔ اس میں کیا اچھوتا پن ہے بلکہ فضول سا نام ہے۔ نورا بھلا کیا نام ہوا۔ بالکل مردانہ نام ہے۔ ہمارے کشمیریوں کے کتنے اچھے نام ہوتے ہیں۔ نوری' رشماں' خدیجاں۔"

بٹ صاحب کی بڑبڑاہٹ جاری رہی۔ اس اثناء میں نورا اور خان صاحب ہم سے کافی آگے نکل چکے تھے۔ بٹ صاحب کی ناراضی کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ نورا خان صاحب کے ساتھ کافی بے تکلف ہو گئی تھی جو بٹ صاحب کو گوارا نہ تھا۔

کہنے لگے "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس جیب تراش کو خان صاحب ہی نے بھیجا ہو گا۔"

"وہ کس لیے؟"

"تاکہ اس بہانے اس سے دوستی کر لی جائے۔ آفاقی صاحب' آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ شخص کتنا بدل چکا ہے۔ اب یہ ہمارے کام کا نہیں رہا۔ اسے آپ یہیں کہیں کھپا دیں۔"

بٹ صاحب کی خفگی پورے عروج پر تھی۔ وہ اتنے برہم تھے کہ غصے کے مارے آس پاس کے ماحول پر بھی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ عین سامنے سے گزرنے والی ایک اسمارٹ سی خاتون کو بھی انہوں نے قابل توجہ نہ سمجھا جو ایک چمکدار سرخ اور سفید رنگ کے لباس میں خوب جگمگا رہی تھیں۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو بٹ صاحب اس کے بارے میں کوئی تبصرہ ضرور کرتے لیکن اس وقت وہ سخت تاؤ میں تھے۔ دنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر تھی۔ ان حالات میں بھلا کسی اور چیز پر وہ کیسے دھیان دے سکتے تھے۔ ہم نے ایک دوبار انہیں دوسری رنگینیوں اور دلچسپیوں کی جانب راغب کرنا بھی چاہا مگر ان کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ میامی بیچ سے آنے والی خنک ہوا اور جا بجا ہوا کے جھونکوں سے جھومتے ہوئے پام کے خوبصورت درخت بھی ان کے غصے میں کمی نہ کر سکے۔

☆ ☆ ☆

آخر کار ہم ایک جگہ پہنچ کر رک گئے۔ یہ ایک نہایت مرصع اور بارونق چوک تھا

چاروں طرف روشنیاں اور شیشے لگی ہوئی عمارتیں اور شوروم تھے۔ یہ تجارتی علاقہ تھا مگر رات گئے بھی دکانوں اور شورومز کے اندر روشنیاں جل رہی تھیں۔ ایسی جگہوں پر ریستوران بھی بکثرت ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ریستورانوں کی کمی نہ تھی۔ مغرب کے رواج کے مطابق ریستوران کے باہر فٹ پاتھ پر بھی خوشنما ہلکی پھلکی میزیں اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر رنگ برنگے چھاتے نصب تھے اور رنگین و خوشنما لباسوں میں ویٹریس لڑکیاں تتلیوں کی مانند اڑتی پھر رہی تھیں۔

سامنے والے ریستوران کے آگے کشادہ فٹ پاتھ پر جو سبز اور نیلے رنگ کے چھاتے لگے ہوئے تھے ان پر "مے گیو" درج تھا۔ گویا ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ "مے گیو" کے سامنے پہنچ کر خان صاحب اور نورا نے بھی بریک لگا دیے اور پہلی بار مڑ کر اپنے پیچھے آنے والوں کی جانب دیکھا۔ بٹ صاحب اور ہم بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔

نورا نے پوچھا "کیا خیال ہے۔ اندر چلیں یا یہیں باہر بیٹھیں؟"

ہم نے کہا "باہر ہی بیٹھتے ہیں، لوگوں کا تماشا دیکھتے رہیں گے۔"

"اور لوگ ہمارا" یہ بٹ صاحب تھے۔

"خان صاحب کو اندازہ ہو چکا تھا کہ بٹ صاحب ان سے ناراض ہیں اور ناراضگی کی وجہ بھی انہیں معلوم تھی مگر انہوں نے مصلحتاً اس بات کا نوٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہم لوگوں نے ایک سبز رنگ کے بڑے سے چھاتے کے نیچے جگہ سنبھال لی۔ نورا یہاں کافی مقبول تھی۔ ہر آنے جانے والا یا فٹ پاتھ پر سے گزرنے والا اسے "ہائی" کہہ کر ہاتھ ضرور ہلاتا تھا۔ ان میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی۔ کچھ لوگوں نے ہماری میز کے پاس رک کر اس سے بات چیت بھی کی۔

خان صاحب نے حق میزبانی ادا کرتے ہوئے ہر ایک سے اس کی پسند دریافت کی۔ یہ محض "ضابطے کی کارروائی" تھی جس کا مقصد نورا کو مرعوب کرنا تھا کیونکہ ہم لوگ سوائے کافی کے اور کیا پی سکتے تھے؟ مگر نورا نے بلا تامل شیمپین کی فرمائش کر دی جسے خان صاحب نے بلا پس و پیش منظور کر لیا۔ نورا نے کھانے کے لیے بھی ایک چیز کی فرمائش کر دی جس کا نام ہی کچھ عجیب سا تھا۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا مگر جب ویٹریس نے اس کے سامنے لا کر پلیٹ رکھی تو ہم نے دیکھا کہ یہ ایک آملیٹ اور پیزا کے بیچ کی کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔

اس کے اندر تو خدا جانے کیا تھا مگر باہر نہایت نزاکت اور خوب صورتی کے ساتھ سلاد کی آرائش کی گئی تھی۔ نورا نے یہ ڈش بہت مزے لے لے کر کھائی اور بتایا کہ یہ اس ریستوران کی خاص ڈش ہے۔

"مگر یہ ہے کیا؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"یہ وہیل مچھلی کے مغز سے بنائی جاتی ہے، بڑے بڑے آرٹسٹ اسے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہی ان کی اداکاری کا راز ہے۔"

یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ بھلا وہیل مچھلی کا اداکاری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے مگر کیونکہ نورا نے بتایا تھا اس لیے خان صاحب نے فوراً یقین کر لیا بلکہ اس بات پر تشویش کا اظہار بھی کیا کہ ہمارے ملک میں تو وہیل مچھلی زیادہ فراوانی سے دستیاب نہیں ہوتی تو پھر ہم اپنے اداکاروں کی صلاحیت بہتر بنانے کے لیے کیا ترکیب اختیار کریں؟

بٹ صاحب خاصے بیزار سے بیٹھے ہوئے تھے، بولے "اس کی تو ایک ہی ترکیب ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ دریائے راوی اور دریائے سندھ میں بھی وہیل مچھلیاں پالی جائیں۔"

خان صاحب بولے "یار کبھی تو کوئی عقل کی بات کر دیا کرو۔ پردیس میں تو اس قسم کی بیوقوفی نہ کرو۔ یہ کیا سوچے گی؟"

"میں نے اردو میں بات کی ہے۔ اس کے تو فرشتے بھی نہیں سمجھ سکتے تو پھر سوچنے کا کیا سوال ہے؟"

یہ رقیبانہ چشمک شاید کچھ دیر اور جاری رہتی مگر نورا کے ایک دوست نے آ کر اس میں خلل ڈال دیا۔

"ہائی ہنی" اس نے انگریزی میں کہا "کل شام کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، تم بتاؤ کیا پروگرام ہے؟" نورا کا چہرہ چمک اٹھا۔

"او کے۔ تم کل بارہ بجے مجھے فون کر لینا۔ بات بن جائے گی، او کے۔"

یہ کہا اور وہ صاحب اپنے لمبے لمبے ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اگر وہ نورا کا بوائے فرینڈ تھا تو نورا کے ذوق پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔ انتہائی لمبا قد، انتہائی دبلا جسم، اونٹ

میں بھی کوئی دلکشی ہوتی ہے مگران صاحب میں وہ بھی نہ تھی۔ چھوٹا سا چہرہ' چھوٹا سا سر' لمبے لمبے بال پیشانی پر پڑے ہوئے آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ' مختصر یہ کہ کوئی ڈھنگ کی چیزان کے وجود میں نہ تھی پھر بھی نورا کی شگفتگی اور مسکراہٹ دیکھ کر یہ خیال گزرا کہ ہو نہ ہو یہ "کچھ نہ کچھ" تو ضرور ہیں۔

بٹ صاحب نے ہمیں کہنی ماری اور نورا سے پوچھا "یہ تمہارے منگیتر ہیں؟"

"اوہ نو" اس نے اتنی زور سے کہا کہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی چونک اٹھے۔ پھر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگی "یہ چارلی ہے۔"

"کون چارلی؟ چارلی چیپلن کا کوئی رشتے دار ہے؟"

"ارے نہیں۔ یہ اسٹل فوٹو گرافر ہے۔ غضب کی تصویریں بناتا ہے اور بیٹھے بٹھائے معمولی لڑکیوں کو "اسٹار" بنا دیتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ شو بزنس میں یہ چیزیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔"

"کون سی چیزیں؟" بٹ صاحب نے حماقت آمیز سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ تصویریں' اچھی تصویریں میگزین بھی خرید لیتے ہیں اور انہیں دیکھ کر فلم والے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اچھا چانس مل جاتا ہے۔"

ہم نے کہا "ہاں' یہ تو ہے مثلاً مارلن منرو کو اس کی ایک تصویر نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا جس کا معاوضہ اس نے صرف پچاس ڈالر وصول کیا تھا۔"

نورا نے ناک بھوں چڑھائی "وہ زمانے لد گئے مسٹر۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ اس نے ایک عریاں تصویر بنوا کر شہرت حاصل کرلی تھی۔ کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔"

ہم نے کہا "مگراس کی عریانی میں بھی ایک خاص بات تھی ورنہ عریاں تصویروں کی فلم والوں کو کیا کمی ہوتی ہے۔ ہر لڑکی تو مارلن منرو نہیں بن سکتی۔"

"بن کیوں نہیں سکتی؟ چانس ملنے کی بات ہے۔ مارلن میں کون سی خاص بات تھی۔ صورت' شکل' جسم' ایسے تو یہاں گلی گلی مل جاتے ہیں۔ کسی ڈرگ اسٹور میں جائیں تو مارلن سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں نظر آجاتی ہیں۔ ایکٹنگ تو اسے مرتے مرتے بھی نہیں آئی۔ بس "سیکس کوئن" مشہور ہو گئی تھی۔ سیکس کی یہاں کیا کمی ہے۔ اپنے آس پاس دیکھیے کیسی کیسی لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس ویٹریس کو دیکھیے' کس غضب کی ہے اور کچھ

نہیں تو مجھ ہی کو دیکھ لیجے۔ میں کسی سے کم ہوں کیا؟" نورا خاصی جیلس ٹائپ لڑکی تھی۔ اس نے بلا جھجک اپنے دل کے پھپھولے ہمارے سامنے میز پر رکھ دیے تھے۔ خدا جانے غریب کب سے ٹھوکریں کھا رہی تھی اور کامیابی کی منزل سے ہنوز دور ہی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جب سے جیب تراش نے نورا کو اپنا نشانہ بنایا تھا وہ ہم سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی بڑھیا ٹھڑیا ہوتی تو شاید کوئی دوسری بار دیکھنے کی زحمت بھی نہ کرتا مگراس کا سراپا اور شعلہ صفت حسن ہی سب کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ یوں تو پہلے بھی سب اسے دیکھ ہی رہے تھے مگراب جو اس نے بطور خاص خود کو دیکھنے کی دعوت دی تو سب نے بطور خاص نگاہ مکرر ڈالنا ضروری خیال کیا اور بڑے غور و خوض سے اس کا معائنہ شروع کر دیا۔

"واقعی۔ کوئی کمی نہیں" یہ خان صاحب تھے۔

بٹ صاحب نے تبصرہ کیا "کمی تو کوئی نہیں' البتہ بیشی ہے" ان کا اشارہ غالباً اس کے ضرورت سے زیادہ صحت مند جسم کی طرف تھا اور پھر اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا کہ ہر چیز کی بہتات نظر آتی تھی مگر بٹ صاحب نے یہ فقرہ اردو میں کہا تھا اس لیے نورا اسے بھی تعریف ہی سمجھی ہو گی۔

ہم نے کہا "نورا۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ یہ سب قسمت کی باتیں ہیں واقعی امریکا میں نہ حسن کی کمی ہے نہ سیکس اپیل رکھنے والی لڑکیوں کی مگر شہرت اور دولت ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی۔"

نورا نے مسکرا کر ہم سب کو دیکھا پھر کہا۔ "ماڈل یا اداکارہ بننا کس قدر مشکل کام ہے' یہ تو وہی جانتے ہیں جو اس تجربے سے گزرتے ہیں۔ یقین کریں' یہ قرعہ اندازی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے' کوشش تو سبھی کرتے ہیں۔ کامیابی بس قسمت سے ہی ملتی ہے۔"

نورا سے رسمی تعارف تو پہلے ہی ہو چکا تھا مگر جب اس کے لیے شیمپئن کا دوسرا جام اور ہم سب کے لیے کافی کی دوسری پیالی منگائی گئی تو ذرا تفصیلی تعارف شروع ہوا۔ خان صاحب اس اثناء میں اسے ڈنر کی دعوت دے چکے تھے۔

"کس روز؟" اس نے پوچھا۔

"ایک دو روز میں کیونکہ پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

نورا نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک نوٹ بک نکالی۔ کچھ دیر اس کا مطالعہ کیا پھر کہا "دیکھیے' ایک دو راتیں خالی تو ہیں مگر کوئی پتہ نہیں کہ عین وقت پر کوئی سیشن شروع ہو جائے۔"

"رات کے وقت تو سیشن نہیں ہو گا۔"

"یہ آپ کو کس نے بتایا؟" وہ ہنسنے لگی "میامی دنیا سے نرالی جگہ ہے۔ یہاں تو سارے پروگرام رات کو ہی بنتے ہیں۔ رات کو تین بجے کسی ایجنسی سے فون آجاتا ہے کہ فوراً آجاؤ۔ صبح پانچ بجے شوٹنگ ہے۔ ایجنٹوں کے دفتر بھی ساری رات کھلے رہتے ہیں۔"

بٹ صاحب تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکے' بولے "یہ وہ جگہ ہے جہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔"

نورا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو خان صاحب نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں اور بٹ صاحب کے اس فقرے کا انگریزی میں لفظی ترجمہ کر دیا جو نورا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ بٹ صاحب بولے "خان صاحب۔ اردو' انگریزی ڈکشنری ساتھ رکھا کریں تو شاید کام بن جائے۔"

بٹ صاحب وقتاً فوقتاً اردو بول رہے تھے اس لیے نورا ان کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی اور یہ بات خان صاحب کے حق میں زہر قاتل تھی۔ وجہ یہ تھی کہ بٹ صاحب مردانہ وقار اور رعنائی کے معاملے میں خان صاحب سے کہیں زیادہ جاذب نظر تھے۔ لمبا قد' گورا رنگ' دلکش نقش و نگار' بھورے بال' مضبوط جسم یہ سب چیزیں قدرت نے انہیں بخشی تھیں۔ دیکھنے میں وہ کسی انگریز سے کم نہیں تھے۔ خان صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر یہ شخص خاموش بیٹھا رہے تو سب اسے انگریز ہی سمجھیں گے۔

"مگر میں انگریز کو کیا سمجھتا ہوں" بٹ صاحب جل کر کہتے "میں کشمیری ہوں' ان شلجم جیسے انگریزوں سے میرا کیا مقابلہ؟"

مختصر یہ کہ جب نورا کی نگاہیں بار بار بٹ صاحب کی جانب اٹھتی رہیں تو لا محالہ ان کی جسمانی خوبیاں بھی اس پر آشکارا ہونے لگیں۔ اس نے بٹ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مسٹر بٹ۔ تم بالکل ایتھلیٹ دکھائی دیتے ہو۔ تمہیں بہت آسانی سے یہاں ماڈلنگ کا کام مل سکتا ہے۔"

خان صاحب نے کہا "ہاں۔ اگر کوئی ہارنے والا ایتھلیٹ دکھانا ہو تو بٹ جی بہت موزوں ہیں۔"

نورا ہنس پڑی' بولی "معلوم ہوتا ہے کہ آپ دونوں بہت گہرے دوست ہیں۔"

"تم نے کیسے جانا؟" ہم نے پوچھا۔

"گہرے دوست ہی آپس میں اتنا زیادہ لڑتے ہیں۔"

خان صاحب مسکرانے لگے اور بٹ صاحب سے کہا "دیکھا۔ کتنی سمجھدار لڑکی ہے۔ بھئی میں تو مان گیا۔"

"آپ لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" نورا نے پوچھا۔

خان صاحب نے فوراً اپنے ہوٹل کا نام و نشان بتا دیا۔ پھر پوچھا "اور تم؟"

نورا نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور بولی "میں بھی ایک جوائنٹ میں رہتی ہوں۔"

لفظ "جوائنٹ" امریکا میں عمارت کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اچھے معنوں میں نہیں۔ بہت اچھی رہائش گاہ کو جوائنٹ نہیں کہا جاتا۔ عام طور پر یہ عمارتیں اچھی شہرت بھی نہیں رکھتیں۔ عموماً غیر شادی شدہ اور فن کار قسم کے لوگ ہی ان جگہوں پر رہتے ہیں۔

نورا نے خود ہی اپنے بیان کی وضاحت کر دی "اس جگہ میری جیسی لڑکیاں ہی رہتی ہیں۔ اکیلی' جوشیلی' بلند مستقبل کی خواہش مند۔ ہر ایک پر بس ایک ہی دھن سوار ہے کہ کامیاب ماڈل اور پھر فلم اسٹار بن جاؤں۔ یوں سمجھیں کہ سب نے لاٹری کے ٹکٹ خرید رکھے ہیں۔ دیکھیے کس کی لاٹری نکلتی ہے؟"

☆ ☆ ☆

یورپ اور امریکا میں اکثر لڑکیوں کے سر پر ماڈل اور فلم اسٹار بننے کا بھوت سوار رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نچلے اور متوسط طبقے کی لڑکیاں زیادہ تعلیم و تربیت حاصل نہیں کر سکتیں۔ نہ ہی کوئی ہنر یا آرٹ سیکھتی ہیں۔ ان کے لیے بہترین شارٹ کٹ یہی ہے کہ ماڈل گرل یا اسٹار بن جائیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اکثر نچلے گھرانوں کی ان پڑھ یا کم تعلیم یافتہ لڑکیاں فلم اسٹار بننے کے خواب دیکھتی رہتی ہیں۔ ان کے سامنے ایسی مثالیں بھی

موجود ہوتی ہیں کہ بہت غریب اور بے آسرا گھرانوں کی لڑکیاں جو تعلیم سے بھی محروم تھیں بہت بڑی ہیروئنیں بن گئیں۔ دولت، شہرت سبھی کچھ کمایا۔ برصغیر میں اداکارائیں پہلے تو بازار حسن سے آیا کرتی تھیں مگر بعد میں غریب اور پسماندہ گھرانوں کی لڑکیوں نے بھی یہ "شارٹ کٹ" تلاش کر لیا اور طوائفوں کی محتاجی کم ہو گئی۔ بھارت کی فلمی دنیا تو اب زنانِ بازاری کے وجود سے ایک حد تک پاک ہی ہو چکی ہے۔ اب وہاں اچھے گھرانوں کی ماڈرن اور پڑھی لکھی لڑکیاں بھی فلموں میں آ رہی ہیں۔ ان کی تربیت کے لیے ادارے قائم ہیں۔ لیکن زیادہ تر اداکارائیں اب بھی ان اداروں کے توسط کے بغیر ہی فلمی دنیا میں پہنچ جاتی ہیں۔ وہاں ناچ گانا اور اداکاری کو معاشرہ معیوب نہیں خیال کرتا اس لیے کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہے۔ ایک عام پاکستانی لڑکی تو اپنے گھر میں ناچ اور گانا سیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی مگر بھارت کے ہندو معاشرے میں یہ معمول میں داخل ہے۔ جنوبی ہند، بنگال اور دوسرے صوبوں کی گھریلو لڑکیاں بھی بہت اچھی ڈانسرز ہوتی ہیں۔ بے باک ہوتی ہیں اس لیے بلاجھجک اس فلمی ماحول میں شیر و شکر ہو جاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں پاکستان میں معاشرہ اداکاری اور رقص و نغمہ کو اپنانے کا قائل نہیں ہے۔

اداکاری کو گھٹیا کام سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فلمی صنعت آج تک طوائفوں سے محروم نہیں ہو سکی ہے بلکہ گزشتہ سالوں میں تو ان کی قریب قریب اجارہ داری ہو گئی ہے۔

ایک عام تاثر یہ بھی ہے کہ اداکارہ بننے کے لیے لڑکیوں کو شرم و حیا اور اکثر اوقات اپنی آبرو بھی قربان کرنی پڑتی ہے۔ کم از کم پاکستان کی حد تک درست نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری فلمی دنیا میں نئی لڑکیاں بہت کم داخل ہوتی ہیں اور فلم سازوں کو ہمیشہ نئے چہروں کی ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے وہ صرف بے حد مجبور لڑکیوں کی مجبوری ہی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جب کہ بھارت اور ہالی ووڈ میں معاملہ برعکس ہے۔ وہاں خوب صورت لڑکیوں کی بہتات ہے جو شوبزنس میں داخل ہونے کے لیے بے چین و بے قرار رہتی ہیں۔ شرم و حیا اور عصمت و آبرو کا بھی ان کے معاشرے میں وہ تصور موجود نہیں ہے۔ جو ہمارے ہاں پایا جاتا ہے۔ جو لڑکی تیرہ چودہ برس کی عمر میں ہی صنف مخالف سے میل جول کرنے میں آزاد ہو اور اس پر گھر اور معاشرے کی طرف سے پابندی بھی نہ ہو تو اس کے

نا میں عفت و عصمت کا کیا تصور ہو سکتا ہے؟ جب جسم کی حرمت کا آغاز ہی سے کوئی نہ ہو تو پھر اگر ماڈل یا اداکارہ بننے کے لیے ان چیزوں کی قربانی دینی پڑ جائے تو اس میں کیا ج ہے؟ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں "شوبزنس" کا ماحول ایک بے حیا اور گناہگار ماحول جہاں عورتوں کی عزت و عصمت کا تصور بھی موجود نہیں ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ چیزوں کو وہ لڑکیاں معیوب بھی نہیں خیال کرتیں۔

ہمارے ملک میں عام طور پر یہ رونا رویا جاتا ہے کہ شوبزنس میں تعلیم یافتہ اور اعلیٰ یم یافتہ لوگوں کی کمی ہے۔ خاص طور پر اداکاری کے میدان میں پڑھے لکھے لوگ خال ل ہی نظر آتے ہیں۔ یہ تصور بھی ایک لحاظ سے ہمارے احساس کمتری ہی کا اظہار ہے۔ ب میں اداکاروں کے لیے ایسی کوئی شرط ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ نہ ہی کوئی ان کے یم یافتہ نہ ہونے پر اعتراض کرتا ہے۔ ذرا ماضی کی طرف ذہن دوڑائیے اور سوچیے کہ ہالی ڈ کے جو سپر اسٹار ساری دنیا میں پوجے جاتے تھے ان میں سے کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ یا باقاعدہ یم یافتہ بھی تھے۔ لڑکیاں دکانوں، ریستورانوں، سڑکوں، شراب خانوں سے حاصل کی جاتی یں تو لڑکے چھوٹے موٹے ایکسٹرا کرداروں میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر کے ترقی پا لیتے ے۔ لڑکیوں کے انتخاب کے لیے آج بھی وہاں کم و بیش وہی طریقہ اپنایا جاتا ہے جو ہمیشہ ے اپنایا جاتا رہا ہے۔ ہم نے بڑی بڑی فلم اسٹارز کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا وہ ں طرح سپر اسٹار بن گئی ہیں۔ نورا سے ملاقات ہوئی تو ان تمام باتوں کی تصدیق ہو گئی۔

نورا کی ایک سہیلی نورما کو کسی فلم میں ایک کردار ملا تھا۔ مگر کس طرح؟ فلم اسٹار ڑز کی طرح وہ بھی بہت چست اور کئی سائز چھوٹا سوئٹر پہن کر ڈرگ اسٹور میں کھڑی ائیاں بیچ رہی تھی کہ ایک فلم والے کی نگاہ میں آ گئی۔

"ہائی شوگر۔ ایکٹریس بننا پسند کرو گی۔؟"

یہ وہ جادوئی الفاظ ہیں جو فلمی دنیا میں داخل ہونے کے لیے "کھل جا سم سم" کا اثر کھتے ہیں اور جنہیں سننے کے لیے ان لاکھوں لڑکیوں کے کان ترستے رہتے ہیں۔

نورما کے مارے خوشی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے "شیور، شیور" اس نے کہا "مجھے کیا کرنا گا؟"

جواب ملا "میرے ساتھ رہنا ہو گا۔ یہ نوکری بھی چھوڑنی پڑے گی کیونکہ تم جانتی ہو

کہ قربانی دیے بغیر کامیابی نہیں ملتی۔"

نورما نے کھڑے کھڑے نوکری چھوڑ دی اور جمی کے ساتھ چلی گئی۔ دھن تو اس کے پاس تھا ہی نہیں، تن اور من اس نے جمی کو سونپ دیا۔ جمی نے اسے مختلف بااثر لوگوں سے ملایا۔ اسے پارٹیوں میں شرکت کرنی پڑی، ڈیٹس پر جانا پڑا مگر یہ سب اس کاروبار کا حصہ تھا۔ اس دوران اسے کوئی معاوضہ نہیں ملا۔ معاوضہ کس بات کا؟ اور امریکا میں تو کام کیے بغیر کسی کو معاوضہ ملتا ہی نہیں ہے۔ اس نے جو تھوڑی بہت بچت کی تھی وہ اس کے کام آئی۔ یہاں تک کہ "صحیح آدمی" تک اس کی رسائی ہو گئی۔ اسے چھ ماہ کے لیے ایک اسٹوڈیو میں ملازم رکھ لیا گیا۔ ایک چھوٹا سا کردار بھی مل گیا۔ لیجئے، نورما کے فلمی سفر کا آغاز ہو گیا۔ اس کے آگے ترقی کرنا اس کی کوشش اور اس سے بڑھ کر اس کی قسمت پر منحصر تھا۔ شوبزنس کی آس میں مری جانے والی اور وہاں کام حاصل کرنے والی کم و بیش تمام لڑکیوں کی یہی کہانی ہے۔

نورا نے شیمپئن کے تین جام نوش جان فرما لیے تھے۔ پیٹ میں کچھ غذا بھی پہنچ گئی تھی۔ اس لیے اس کا چہرہ تاباں اور آنکھیں مزید روشن ہو چکی تھیں۔ اس نے خلوص دل سے ہمارا شکریہ ادا کیا اور پھر یہ کہہ کر اجازت طلب کی کہ اب اس کی "کاروباری مصروفیات" کا وقت ہو گیا ہے۔ ہم نے گھڑی دیکھی تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے مگر نورا پہلے ہی بتا چکی تھی کہ وہ جس کاروبار سے وابستہ تھی اس میں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اسے خان صاحب نے دریافت کیا تھا۔ وہی اسے ریستوران لے گئے تھے۔ خان صاحب ہی نے اس کی شیمپئن اور کھانے کا بل ادا کیا تھا مگر رخصت ہوتے وقت اس نے بٹ صاحب پر زیادہ "توجہ" دی۔ ان سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور دیر تک ملاتی رہی۔ چلتے چلتے اس نے بٹ صاحب کو ایک بار پھر مشورہ دیا کہ وہ ماڈلنگ کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں۔ اپنے "جوائنٹ" کا فون نمبر ہمیں دیا اور ہمارے ہوٹل کا نام پوچھ کر مٹکتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ "مٹکنے" کا ہم نے خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو لڑکیاں شوبزنس کی دنیا میں "کچھ" بننا چاہتی ہیں وہ عام طور پر اسی قسم کے طور طریقے اپناتی ہیں جو مشہور و معروف ہیروئنوں کے ساتھ منسوب ہوتے ہیں۔ الزبتھ ٹیلر کی مسکراہٹ، مارلن منرو کی چال، ایوا گارڈنز کا انداز گفتگو،

رز کے سگریٹ پینے کا انداز وغیرہ یہ سب چیزیں سکہ رائج الوقت سمجھی جاتی ہیں۔ چنانچہ میں ہمیں بیشتر لڑکیاں اسی انداز سے چلتی ہوئی نظر آئیں۔

نورا رخصت ہوئی تو یوں لگا کہ جیسے۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

کچھ دیر بعد جب روشنی واپس آئی تو ہمارا خیال تھا کہ خان صاحب اور بٹ صاحب کے شدید جنگ ہو گی مگر اس کے برعکس وہ دونوں بے حد خلوص اور محبت کا مظاہرہ کرتے نظر آئے۔ بٹ صاحب پر نورا کی نظر کرم کی وجہ سے خان صاحب قطعی ناراض نہیں بلکہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

"لو بٹ جی۔ تمہارا تو کام بن گیا۔ دو چار سال میں چھوٹے موٹے ایکٹر بھی بن جاؤ ہم بھی پاکستان میں اپنے دوستوں کو بتایا کریں گے کہ فلاں فلم میں جو ویٹر یا چوکیدار ہے را دوست ہے۔"

بٹ صاحب کچھ جھینپ سے گئے، بولے "یہ لڑکی تو پاگل ہے۔ تم کس کی باتوں میں ہو" پھر انہوں نے ایک لمبی سی جماہی لی اور کہا "بہت دیر ہو گئی۔ اب واپس چلنا ہے۔"

مگر بٹ صاحب کا خیال غلط نکلا۔ ہوٹل پہنچ کر ہم لوگ کپڑے تبدیل کر کے سونے کا ہی کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ہم نے فون اٹھایا تو لیڈی آپریٹر نے بڑے لہجے میں پوچھا "مسٹر بٹ سے بات ہو سکتی ہے؟"

ہم بہت حیران ہوئے کہ یا اللہ! اس دور دراز علاقے میں مسٹر بٹ کو فون کرنے والی ہے؟ اس لیے پوچھ لیا "کون بات کرے گا؟"

کہا "نورا" اور یہ کہہ کر نورا کو لائن دے دی۔

"ہائی ہنی۔" دوسری طرف سے نورا کی چہکتی ہوئی آواز آئی "میں نے تمہیں ڈسٹرب نا کیا؟"

ہم نے کہا "بالکل نہیں مگر ایک لمحہ رک جاؤ۔ ہم مسٹر بٹ کو فون دے رہے ہیں۔"

بٹ صاحب یہ گفتگو سن کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ بہرحال ریسیور لے کر انہوں نے حسب انگریزی بولنے کی کوشش کی اور کئی بار "پارڈن" بھی کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں

بات سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پھر "اوکے' اوکے" کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ ہم دونوں ان کی شکل دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکرائے اور بولے "نورا تھی۔"

ہم نے کہا "وہ تو ہمیں بھی معلوم ہے مگر اتنی رات گئے تم سے کیا کہہ رہی تھی؟"

وہ کچھ شرما سے گئے پھر کہا "یار تم لوگ بلاوجہ مذاق کرتے ہو۔"

"مگر ہوا کیا؟"

"کہہ رہی تھی کہ صبح سات بجے ایک ایجنٹ سے ملنا ہے۔ اسے ماڈلنگ کے لیے ضرورت ہے۔"

"صبح سات بجے؟" ہم نے پریشان ہو کر کہا' اتنی رات گزر چکی تھی اور ہم ابھی تک سونے کے لیے بستر پر لیٹے بھی نہیں تھے کہ صبح سات بجے تیار ہو کر پھر کہیں جانا تھا۔ ہم نے کہا "سوری بٹ صاحب میں تو سو رہا ہوں' آپ شوق سے چلے جائیں۔"

خان صاحب فوراً بول پڑے "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ بھائی اسے گھر بیٹھے ایک چانس مل رہا ہے اسے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیے۔ فکر نہ کرو بٹ۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

ہم تو مان گئے کہ دوست ہو تو ایسا ہو لیکن بٹ صاحب پریشان ہو گئے "مجھے کوئی شوق نہیں ہے ماڈل بننے کا اور پھر ان امریکیوں کی انگریزی تو سمجھ میں ہی نہیں آتی۔"

خان صاحب نے فوراً تائید کی۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ بڑی مشکل ہے انگریزوں کی انگریزی سمجھ میں آئی تھی تو اب امریکی انگریزی سے واسطہ پڑ گیا۔ عجیب و غریب زبان ہے یہ تو۔"

ہم نے کہا "بھائی' زبان وہی ہے' ذرا بولنے کا انداز الگ ہے۔"

"ایک تو سب کے سب ناک میں بولتے ہیں پھر ہر لفظ کو بالکل لٹا دیتے ہیں۔ کیا فضول طریقہ ہے!"

ہم نے کہا "مگر اس فضول طریقے کے باوجود انہوں نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ اب تو نے اور بہت سے ملک دیکھ لیے ہیں۔ امریکا ان سب سے آگے ہے یا نہیں؟"

خان صاحب ہار ماننے والے نہیں تھے' بولے "اللہ ہر ایک کی رسی دراز کر دیتا ہے کچھ عرصے کے لیے۔ دیکھ لینا' ایک دن کیا حشر ہو گا اس امریکا کا۔"

یہ ان کی حاسدانہ خواہش تھی جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہمیں اردو کا محاورہ

یاد آ گیا کہ۔ کوؤں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرتے ہیں۔

کچھ دیر کے بحث مباحثے کے بعد طے پایا کہ ہم سب چھ بجے اٹھ جائیں گے اور ساڑھے چھ بجے تیار ہو کر ہوٹل کے باہر پہنچ جائیں گے جہاں سے نورا ہمیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔ ہمیں تو مارے اشتیاق کے بالکل نیند نہیں آئی۔ خان صاحب نے بھی یہی بتایا کہ وہ خاصے ہیجان میں تھے اس لیے کروٹیں بدلتے رہے مگر سب سے زیادہ بے فکر بٹ صاحب نکلے۔ جب ہم نے چھ بجے ان کے کمرے پر دستک دی تو وہ بے خبر سو رہے تھے اور خراٹے بھی لے رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ بے نیازی اور خود اعتمادی ہو تو ایسی ہو۔

چھ بجے ہوٹل کے استقبالیہ سے موصول ہونے والی ایک خوابیدہ سی نقرئی آواز نے ہمیں بیدار کر دیا اور بستر سے اٹھتے ہی "جنگی بنیادوں" پر تیاری شروع ہو گئی۔ خان صاحب نے فوری طور پر کافی اور ڈونٹس کا آرڈر دے دیا اور بڑے اہتمام سے رگڑ رگڑ کر شیو بنانے میں مصروف ہو گئے۔ پھر انہوں نے ایک خوش رنگ پھولدار بش شرٹ اور سفید پتلون زیب تن فرمائی۔ بالوں کو کریم لگا کر چمکایا اور جما لیا' پرفیوم کی آدھی شیشی اپنے اوپر خالی کر لی۔ ہم نے پوچھا "اتنی فراوانی سے کون سی خوشبو لگا رہے ہو؟"

بتایا "مین اونلی۔"

ہم نے کہا "سوچ لیجئے خان صاحب یہ خوشبو تو مردانہ ہے۔ خواتین کو کیوں کر آپ کی جانب متوجہ کرے گی؟"

وہ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "یار بات تو بہت معقول کی ہے تم نے۔ اب میں کیا کروں؟ دوسری بش شرٹ پہن کر "چارلی" لگا لوں؟"

ہم نے کہا۔ "مگر یہ خوشبو تو تمہارے جسم میں بس گئی ہے۔"

کہنے لگے "تو پھر میں دوبارہ غسل کر لیتا ہوں۔"

بڑی مشکل سے ہم نے انہیں اس کام سے روکا اور پھر سمجھایا کہ آپ نے جو مردانہ خوشبو لگائی ہے یہ صنف مخالف کو لامحالہ آپ کی جانب کشاں کشاں کھینچ لائے گی۔

"ایمان سے؟" انہوں نے بے یقینی سے کہا "یار کہیں مروا نہ دینا۔"

اتنی دیر میں بٹ صاحب بھی دولہا بن کر تشریف لے آئے۔ مطلب یہ کہ سہرے اور شیروانی وغیرہ کے بغیر دولہا۔ شیو انہوں نے بھی بہت محنت مشقت سے بنائی تھی۔ بالوں کو

بھی کافی دل لگا کر سجایا تھا۔ لباس ان کا خالص جدید امریکی فیشن کے مطابق تھا۔ یہ کپڑے انہوں نے میامی پہنچتے ہی خرید لیے تھے۔ اس کی وضاحت میں انہوں نے کہا کہ بڑے فرما گئے ہیں کہ جیسا دیس، ویسا بھیس۔

ہم نے کہا "بٹ صاحب۔ یوں لگتا ہے کہ آپ دونوں کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی ہے۔ کہاں وہ یورپ کا پہلا سفر جب آپ لوگ خالص مشرقی اور شرفاء میں شمار کیے جانے کے قابل تھے اور کہاں یہ انقلاب واقعی آپ دونوں نے تو گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا ہے۔"

خان صاحب بولے "آپ نے سنا نہیں کہ ایک شاعر نے کیا کہا ہے؟"

"کیا کہا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "ایک شعر کہا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہوا کا رخ دیکھ کر چلنا چاہیے۔"

بٹ صاحب نے فوراً معلومات کا مظاہرہ کیا "اچھا وہ۔ ہوا میں اڑتا جائے۔"

ہم نے کہا "نہیں بھائی۔ وہ شعر یوں ہے کہ

چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی۔

بٹ صاحب بڑے غور سے خان صاحب کا جائزہ لیتے رہے پھر پوچھنے لگے "مجھے یہ بتائیں کہ ماڈلنگ کے لیے نورا نے مجھ سے کہا تھا یا خان صاحب سے؟"

ہم نے کہا "کہا تو تم ہی سے تھا۔"

کہنے لگے "پھر یہ کس خوشی میں بن سنور کر تیار ہو گئے ہیں؟"

ہم نے کہا "یہ ماڈلنگ کے لیے نہیں، نورا کے لیے تیار ہوئے ہیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ خان صاحب کے اجازت نامے پر دروازہ کھلا اور ایک انتہائی سبک اور ترو تازہ ویٹریس اندر داخل ہوئی۔ اتنے سویرے بھی وہ بالکل شگفتہ اور تازہ نظر آ رہی تھی۔ بقول خان صاحب کے بی پی کے تازہ ڈبل روٹی کی طرح" ہم لوگ تو یہ بھول ہی گئے تھے کہ خان صاحب نے کافی کے لیے آرڈر دیا ہے اور یہ بات تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ علی الصباح، منہ اندھیرے اس قدر غارت گر ہوش قسم کی ویٹریس یہ کافی لے کر آئے گی۔ خان صاحب کی یہ تحقیق تھی کہ خوب صورت لڑکیاں صبح سویرے بیدار نہیں ہوتیں اور اگر بیدار ہو بھی جائیں تو ایسے حلیے میں نظر آتی ہیں کہ آنکھیں موندنے کو

جی چاہتا ہے مگر اس ویٹریس نے خان صاحب کی ساری ریسرچ کا ستیاناس مار دیا تھا۔

کافی کے بل پر دستخط کروانے کے بعد جب ویٹریس مسکرا کر رخصت ہونے لگی تو خان صاحب نے جاتے جاتے فرمائش کر دی کہ اگر ممکن ہو تو ایک گلاس سیب کا جوس بھی لا دیں۔

"کیوں نہیں" کہہ کر لڑکی غڑاپ سے دروازے میں غائب ہو گئی۔

"یہ سیب کا جوس کون پیئے گا؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "بھائی، آپ نے ڈاکٹروں کی بات نہیں سنی ہے کہ ایک سیب روزانہ کھاؤ تو ڈاکٹر آپ کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔"

"مگر سیب اور جوس میں بہت فرق ہوتا ہے" یہ بٹ صاحب تھے۔

"رہے جاہل کے جاہل۔ ارے بے وقوف سیب کا جوس بھی تو سیب ہی سے بنتا ہے" یہ کہہ کر انہوں نے سر جھکایا اور بولے "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ہر روز صبح منہ اندھیرے اٹھنا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"کافی پینے کے لیے دیکھتے نہیں کتنی خوب صورت لڑکی کافی لے کر آئی ہے۔ ویسے بھی مجھے ڈاکٹر نے لو بلڈ پریشر کے لیے کافی بتائی ہے" پھر کچھ یاد کر کے بولے "ہاں۔ اس بار وہ آئے گی تو اس سے ابلا ہوا انڈا بھی منگا لیں گے۔"

لڑکی جوس لے کر آ تو گئی مگر ہم لوگ اتنی جلدی میں تھے کہ ابلے ہوئے انڈے کے لیے وقت ہی نہیں تھا مگر خان صاحب نے پیشگی آرڈر دے دیا اور کہا کہ کل صبح کافی کے ساتھ ابلے ہوئے انڈے لانا نہ بھولنا۔

لڑکی کو پورے چوبیس گھنٹے پیشگی آرڈر دینے کی منطق سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے حیران ہو کر اپنی دونوں آنکھیں چاروں طرف گھمائیں پھر دونوں شانے بڑے دلکش انداز میں ہلائے اور حیران حیران سی کمرے سے نکل گئی۔

خان صاحب نے کہا "اب ہمیں اسے حیران کر دینے والی باتیں بھی سوچ کر رکھنی ہوں گی۔"

"وہ کس لیے؟"

"تم نے دیکھا نہیں کہ وہ حیران ہو کر کتنی پیاری لگتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اسے کسی فلم کی ہیروئن ہونا چاہیے تھا' نورا تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔"

نورا کو برا بھلا کہنے کی وجہ ہم خوب سمجھ رہے تھے۔ دراصل جب سے اس کی توجہ بٹ صاحب کی جانب کچھ زیادہ ہوئی تھی وہ خان صاحب کی نظروں سے اور دل سے گر گئی تھی حالانکہ بٹ صاحب نے اس میں ذرا سی بھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ٹھیک ساڑھے چھ بجے ہم ہوٹل کی سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ ایک دم زوں سے ایک کار تیزی سے آئی اور نورا نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ہمیں اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا ملک ہوتا تو ہارن بجا بجا کر وہ سارے محلے کو جگا دیتی۔ مگر امریکا میں ہارن بجانا کسی انسان کو قتل کرنے سے بھی زیادہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ دن دہاڑے سڑک پر کسی کو گولی مار دیں تو دیکھنے والے بڑے اطمینان سے یوں گزر جائیں گے جیسے کوئی سائیکل سے گر گیا ہے لیکن اگر آپ نے سڑک پر کار کا ہارن بجا دیا تو ہر شخص مڑ مڑ کر اس طرح گھورے گا کہ آپ توبہ توبہ کرنے لگیں گے۔

نورا کی کار کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کے برابر ایک عدد پیلے بالوں اور سرخ و سفید چہرے والی طرح دار لڑکی بھی تشریف فرما ہے۔ اس خلاف توقع مہمان کو دیکھ کر ہم سب ٹھٹھک کر رہ گئے۔

نورا نے کہا "اوہ۔ کم آن' گیٹ ان۔"

اب ہم تینوں کی یہ کوشش تھی کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں مگر نورا نے ٹوک دیا "مسٹر بوٹ۔ تم اگلی سیٹ پر آجاؤ۔"

بٹ صاحب کان دبا کر چپکے سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دل میں خواہ کتنے ہی لڈو پھوٹ رہے ہوں مگر ہماری مشرقی فطرت اور مشرقی روایات نے ہمارے پیروں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ ماحول اور تربیت لازمی طور پر بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

نورا کی کار باقاعدہ خوشبو کی دکان بنی ہوئی تھی اور مہک رہی تھی۔ جب اس خوشبو میں خان صاحب اور بٹ صاحب کے پرفیوم کی خوشبو بھی شامل ہو گئی تو خوشبوؤں کی یہ

"کاک ٹیل" کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گئی۔

"ان سے ملو۔ یہ ہے کلارا' میری روم میٹ" نورا نے اپنے ساتھ والی لڑکی کا تعارف کرایا۔ بٹ صاحب نے تو وہیں بیٹھے ہاتھ ملا لیا مگر ہمیں اور خان صاحب کو خاصی تگ و دو کرنی پڑی۔ ہم سب نے اپنا اپنا نام بتا دیا۔

"کلارا کو چھ سات مہینے کے بعد کام ملا تھا مگر بوٹ کتنا خوش قسمت ہے کہ بیٹھے بٹھائے ماڈل بن گیا۔"

اس خوش قسمتی پر ہم دونوں نے بھی بٹ صاحب کو مبارک باد پیش کی اور وہ مزید شرما سے گئے۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" ہم نے سوال کیا۔

"ہم سیدھے ساحل پر جائیں گے جہاں شوٹنگ ہو رہی ہے۔"

"مگر بٹ کو تو ماڈلنگ کرنی ہے" ہم نے نکتہ اٹھایا۔

"وہاں سب کام بیک وقت ہو جاتے ہیں۔ ساحل پر پہنچ کر آپ کو بھی پتہ چل جائے گا۔"

راستے میں اور کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ بٹ صاحب کافی نروس ہو رہے تھے اور وہ دونوں خواتین باہمی بات چیت میں مصروف ہو گئی تھیں۔ جس کا بیشتر حصہ بٹ صاحب اور خان صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں انسان عام طور پر صبر ہی کرتا ہے۔

میامی کے ساحل کا آپ کو کیا احوال سنائیں؟ موسم بہت اچھا تھا جو کہ میامی میں اکثر ہوا کرتا ہے اور طویل ساحل پر ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ ساحل کا ایک بہت بڑا حصہ ویسا ہے جیسا کہ ہر ساحل کا ہوا کرتا ہے یعنی ایک گولائی میں کشادہ اور خوبصورت سڑک تھی جس کے ساتھ ساتھ بہت کشادہ فٹ پاتھ اور دکانوں اور ریستورانوں وغیرہ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ ہر وہ چیز اس جگہ موجود تھی جو کہ ساحل پر ہوا کرتی ہے۔ کھیل تماشے' رنگ برنگے ملبوسات۔ مختلف قسم کا سووینئرز' آئس کریم اور مختلف انواع و اقسام کی اشیاء۔ ان کے علاوہ انتہائی خوب صورت اور دلکش ہجوم گویا اکثریت خواتین کی تھی۔ موسم یہاں بارہ مہینے قریب قریب خوش گوار اور خوب صورت رہتا ہے یعنی سردی کا دور دور تک نام و

نشان نہیں ہے اس لیے قیاس کر سکتے ہیں کہ کیسے کیسے ملبوسات خواتین نہ اپناتی ہوں گی۔ سب سے زیادہ مقبول اور مرغوب لباس تو "بکنی" ہے۔ ہم دیسی لوگ اسے غسل یا پیراکی کا لباس بھی کہتے ہیں مگر ان تینوں چیزوں میں بہت باریک سا ٹیکنیکل فرق ہے جو ہر ایک کو محسوس نہیں ہوتا۔ ہم بھی ان سب ملبوسات کو بشرطیکہ انہیں ملبوسات کہا جا سکتا ہو ایک ہی زمرے میں شمار کرتے تھے مگر نورا نے ہماری لاعلمی دور کرنے میں بہت مدد کی۔ اس کی وضاحت کے مطابق دراصل یہ تینوں اشیاء بنیادی طور پر ایک ہی مقصد کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ یعنی کم سے کم کپڑا استعمال کر کے دوسروں کی توجہ حاصل کرنا مگر بکنی ان میں سب سے زیادہ برائے نام کپڑا کا نام سمجھ لیجیے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس لباس میں اور بھی اصلاحات ہوئی ہیں اور یہ مختصر سے مختصر ترین ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک ڈوری کے ساتھ دو چار انچ کپڑا اگر بالائی جسم پر ہو اور قریب قریب اسی قدر پیمائش کا کپڑا زیریں، جسم کو ڈھانپنے کے لیے استعمال کیا گیا ہو تو اس بکنی کی جدید ترین شکل سمجھ لیجیے۔ خان صاحب کے خیال میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب محض دو ڈوریوں سے یہ مقصد حاصل کیا جائے گا اور وہ قرب قیامت کی نشانی ہو گی۔

بٹ صاحب نے تصحیح کی۔ "وہ تو سچ مچ کی قیامت ہو گی۔ قرب قیامت کی نشانیاں تو اس وقت بھی آپ کو نظر آ رہی ہیں" واقعی۔ ان کی بات بالکل درست تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ بٹ صاحب ہر سانس کے ساتھ "لاحول" پڑھنے میں مصروف تھے۔ باقی رہ گیا۔ سوئمنگ کاسٹیوم اور بیدنگ کاسٹیوم تو اسے بھی عام طور پر ایک یا دو دھجیوں کی صورت میں جسم کے ساتھ چسپاں یا آویزاں کر لیا جاتا ہے۔ ان میں کپڑے کی خاصی فضول خرچی کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ دو چار گرہ کپڑا اس لباس پر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ان ملبوسات کے انداز ڈیزائن اور تراش خراش کی باریکیوں پر کون کافر نظر ڈالتا ہے۔ زیادہ دھیان صاحب لباس پر دیا جاتا ہے۔

یہ تو تھا مقبول عام لباس۔ اس کے علاوہ بھی یہاں مختلف قسم کے ملبوسات کی نمائش جاری تھی اور لباس پہننے والی ہستیوں کے حسن و جمال کا ایک بازار سا لگا ہوا تھا مگر ایک وضع داری قابل ذکر ہے وہ یہ کہ لباس کے معاملے میں خواہ کتنی ہی کفایت برتی جائے، خوشبو اس کے استعمال میں خاصی دریا دلی سے کام لیا جاتا ہے۔ انگریزی میں خوشبو لگانے کے لیے ویسے

بھی "خوشبو پہننے" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر خواتین تو صرف "خوشبو پہننے" پر ہی اکتفا کر لیتی ہیں اور صبر و شکر کرتی ہیں۔

اب ساحل کے دوسرے حصے کی بھی سن لیجیے۔ یہ ایک نیم دائرے یا ہلال کی شکل میں ہے اور بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں تجارتی مراکز اور دکانیں وغیرہ نہیں ہیں گویا سمندر اور ساحل اپنی اصلی اور خالص شکل میں موجود ہے۔ ساحل کی خوب صورتی اور صفائی میں کوئی کلام نہیں ہے۔ بلامبالغہ ہزاروں انسانوں کی آمدورفت کے باوجود کیا مجال ہے جو کہیں کوڑا کرکٹ نظر آ جائے۔ یہ ساحل کا وہ حصہ ہے جو فلموں کی شوٹنگ اور تصویر کشی کے لیے مخصوص تھا۔ دنیا کے مختلف حصوں سے فلم والے یہاں شوٹنگ کرنے کے لیے آتے ہیں۔ فیچر فلم، دستاویزی فلم، سائنسی فلم، بچوں کی فلم، ٹیلی ویژن کی فلم غرضیکہ ہر قسم کی فلموں کی یہاں شوٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میگزینوں اور پبلسٹی پوسٹروں کے لیے ماڈلز کی تصاویر بنانے والے بھی بہت بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اول تو میامی ایک مقبول جگہ ہے جہاں فلم والوں اور تصاویر بنانے والوں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ ہر قسم کے ماڈل نہایت مناسب معاوضوں پر یہاں دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ہوٹل اگر بے حد مہنگے ہیں تو درمیانہ درجے کے اور سستے قسم کے اچھے آرام دہ ہوٹل بھی یہاں موجود ہیں۔ ہر کوئی اپنے بجٹ کے مطابق اخراجات کر کے اچھے نتائج حاصل کر سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ بہت رونق والی جگہ ہے۔ پیشہ ور فلم بنانے والوں، اداکاروں اور ماڈلز کے علاوہ یہاں سیاحوں کی رونق بھی خوب نظر آتی ہے اور یہ بھی فلم بنانے والوں اور تصویر کشی کرنے والوں کے لیے ایک پر کشش بات ہے۔

میامی کو اب فلموں کی شوٹنگ کے معاملے میں امریکا میں لاس اینجلس اور نیویارک کے بعد تیسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے، ہالی ووڈ والے بھی رفتہ رفتہ ادھر کا رخ کرنے لگے ہیں اور جب ہالی ووڈ کے فلم ساز کسی جگہ کو پسند کر لیں تو سمجھئے کہ وہ ساری دنیا کی پسندیدہ جگہ ہو گئی۔

ساحل پر ہماری ملاقات ایک امریکی سے ہوئی۔ ان کا نام ریلان تھا اور ان کا بیان تھا کہ وہ میامی کے بارے میں جاننے اور نہ جاننے والی تمام باتیں جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میامی وہ جگہ ہے جسے امریکا کا "خلاصہ" بھی کہا جا سکتا ہے۔

"وہ کس طرح؟"

"اس طرح کہ اس چھوٹے سے خطہ زمین پر وہ تمام چیزیں بہ افراط موجود ہیں جن کے لیے امریکا مشہور ہے مثلاً خوب صورت ساحل' مصروف اور بارونق بازار' خوب صورت لڑکیاں' شاندار ہوٹل' پرشکوہ تجارتی مراکز۔ ان کے علاوہ جرائم پیشہ لوگوں کی ٹولیاں' منشیات فروشوں کے جمگھٹے' شراب خانے' جوا خانے' جسم فروشی کے اڈے۔ ان کے علاوہ یہاں باقاعدگی سے ساحلی طوفان بھی آتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر چیز جس کے لیے امریکا مشہور ہے وہ یہاں دیکھ لیجیے۔ میامی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا تجارتی اور فلمی مرکز بنتا جا رہا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں یہ ایک سویا سویا چھوٹا سا ساحلی قصبہ تھا۔ دولت مند لوگ یہاں سکون کی تلاش میں آیا کرتے تھے اور انہوں نے ساحلی علاقوں میں اپنے "ریسٹ ہاؤس" بنا رکھے تھے۔ جب یہ شہر پھیلنے لگا اور لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تو پھر وہی سیدھے سادے سے رہائشی مکان جو آرام گاہوں کے طور پر بنائے گئے تھے مسمار کر دیے گئے اور ان کی جگہ خوب صورت' شاندار اور مہنگے ہوٹل تعمیر کر لیے گئے۔ جب تجارت اور صنعت کو فروغ حاصل ہوا تو لوگ جوق در جوق یہاں آباد ہونے کے لیے آنے لگے۔ میامی کی مقامی بلدیہ نے اپنے شہر کی ترقی کے لیے زیادہ منصوبہ بندی بھی نہیں کی۔ جو لوگ پیسہ لے کر یہاں آئے تھے انہوں نے خود ہی اپنی سہولت کے مطابق آبادیاں بنالیں۔ میامی کو شوبزنس والے اس لیے بھی پسند کرتے ہیں کہ یہاں کسی چیز پر پابندی نہیں ہے اور نہ ہی انتظامیہ سے کسی چیز کے لیے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہاں ہر چیز مفت ہے۔ ہاں اگر آپ اپنی حفاظت کے لیے پرائیویٹ پولیس کی خدمات حاصل کرنا چاہیں تو اس کے لیے ضرور فیس ادا کرنی ہوتی ہے یا پھر پارکنگ کے لیے رقم دینی ضروری ہے۔ باقی ہر چیز آپ کے لیے حاضر ہے۔"

نورا کی قیادت میں ہمارا قافلہ ساحل پر پہنچ گیا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس ساحل پر شوٹنگ کے سوا کوئی اور مصروفیت نہیں تھی۔ حد نگاہ تک ساحل پھیلا ہوا تھا اور جہاں تک نظر پڑتی تھی وہاں کیمرا مین' ہدایت کار اور اداکار پھیلے ہوئے تھے۔ ساحل کا ہے کو تھا' شوٹنگ کا میدان کارزار تھا۔ جس طرف دیکھیے کیمرا مین کیمرے لیے کھڑے تھے۔ کچھ نے نیکر اور جانگیے پہن رکھے تھے تو کسی نے پتلون کے پائنچے اونچے کر لیے تھے۔ یہ سب کام

پانی میں ہو رہے تھے اس لیے قریب قریب سبھی لوگ ننگے پاؤں تھے اور اپنی اپنی ہمت کے مطابق ننگے بدن بھی۔

کسی جگہ فلم کا یونٹ شوٹنگ میں مصروف تھا تو کہیں ماڈلز تصاویر بنوانے میں مصروف تھیں۔ تین ٹانگوں والے کیمرے ہر جگہ نظر آ رہے تھے۔ بیک وقت ایک ہی مقام پر اتنے بہت سے لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔ صرف اتنا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ کوئی دوسرے کے کام میں دخل انداز نہ ہو بلکہ ہر کوئی بڑے خلوص اور خوش دلی سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ مغرب کی معاشرت کا یہ رخ واقعی قابل تعریف ہے کہ ان لوگوں میں رواداری اور برداشت کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ ہماری طرح نہیں ہیں کہ بات بات پر منہ سے کف جاری ہو جاتا ہے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ دیکھی کہ کوئی بھی خواتین کو دیدے پھاڑ کر نہیں دیکھ رہا تھا حالانکہ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور طرح دار خاتون یہاں موجود تھی اور پھر اس پر مستزاد ان کے لباس۔ ہمارے ہاں تو اگر کوئی ایک عورت بھی ایسے لباس میں نظر آجائے تو سارا شہر دیوانہ ہو جائے مگر وہاں تمام ساحل "جل پریوں" سے بھرا ہوا تھا مگر کوئی ان آبی پرندوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ آپ کہیں گے کہ اس معاملے میں وہ لوگ پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔ قدم قدم پر نمائش جمال دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بھی ایک سبب ہو ان کی بے نیازی کا لیکن پھر بھی ان خوبیوں کا معترف ہونا ہی پڑتا ہے۔

ہمارے لیے تو یہ سب کچھ ایک انوکھا منظر تھا۔ اتنے بہت سے لوگ بیک وقت شوٹنگ اور تصویر کشی میں مصروف تھے۔ اتنی بہت سی خوش جمال خواتین اپنے بہترین انداز پیش کر رہی تھیں۔ کچھ پانی کے باہر ریت پر تھے تو کچھ پانی کے اندر جھاگ اڑاتی ہوئی لہروں کے درمیان کام کر رہے تھے۔ عجیب نظارہ تھا اور ہم تینوں محو نظارہ تھے۔ یہ بھی بھول گئے تھے کہ نورا ہمیں کسی خاص مقصد کے لیے وہاں لے کر گئی تھی۔

ہمارے عین سامنے ایک رومانی منظر فلمایا جا رہا تھا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی سمندر کے کنارے' ٹخنے ٹخنے پانی میں سر جوڑے کھڑے تھے یکایک ایک موج آئی اور وہ دونوں پانی میں گر گئے۔ کیمرا ان کو سمیٹے ہوئے سطح سمندر کی جانب مڑ گیا۔ سمندر کی چمک اور لہریں

آئیں اور ان دونوں کو شرابور کر گئیں۔ ان دونوں نے مضبوطی سے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا حالانکہ اتنے کم گہرے پانی میں ڈوبنے کا بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔

یکایک "کٹ کٹ" کی آواز گونجی اور ایک موٹے تازے آدمی نے خدا جانے کہاں سے نمودار ہو کر لڑکے اور لڑکی کو ہدایت دینی شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ یہ ڈائریکٹر صاحب تھے۔ وہ اداکاروں کو بتا رہے تھے کہ وہ بہت غلط وقت پر اور غلط انداز میں گرے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی کے کہنے پر گرے ہیں۔ حالانکہ فلم بینوں کو یہ محسوس ہونا چاہیے جیسے کہ وہ اچانک سمندر کی لہروں کے زور کی وجہ سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔

پھر انہوں نے ہیرو کو لتاڑنا شروع کر دیا "تم ہیرو سے زیادہ لفنگے معلوم ہو رہے تھے جو کسی بھی لڑکی کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ارے تم ہیرو ہو' اس لڑکی سے پیار کرتے ہو اور یہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔ اس لیے پیار کرنے کے لیے تمہیں سمندر کی موجوں کا بہانہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' کیا سمجھے؟"

"اوکے اوکے" لڑکے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "آئی گاٹ اٹ" اب ہدایت کار نے ہیروئن کی جانب رخ کیا "اور تم۔ لڑکی تم اس شخص سے محبت کرتی ہو' سمندر کے کنارے ڈیٹ پر آئی ہو۔ اگر لہروں کے زور میں آکر گر گئی ہو تو یہ سب ایک پر لطف اور رومانٹک بہانہ ہے۔ اپنے محبوب کے نزدیک ہونے کا۔ تمہیں اس رومانٹک لمحے سے فائدہ اٹھانا چاہیے مگر یوں لگتا ہے جیسے تم ڈوبنے لگی ہو اور بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مار رہی ہو' کیا سمجھیں۔"

"اوکے" لڑکی نے بھی ہینڈز اپ کر دیے۔ دراصل ہدایت کار کے اعتراضات اتنے معقول اور حقیقی تھے کہ کوئی ان سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خان صاحب تک جو امریکی لب و لہجہ پوری طرح نہیں سمجھتے تھے ہمارے کان میں کہنے لگے "کہتا تو ٹھیک ہے۔"

مگر ڈائریکٹر ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنا رخ کیمرا مین کی طرف پھیرا اور کہا "تمہارا کیمرا ان دونوں کے گرنے سے پہلے ہی پین ہو گیا تھا۔ ہم سمندر کی فلم بنانے نہیں آئے ہیں' ایک رومانٹک سین فلما رہے ہیں' اوکے؟"

کیمرا مین ایک اسمارٹ سا جوان آدمی تھا۔ چیونگم چباتے ہوئے مسکرایا اور بولا

"اوکے۔ یو آر دی باس۔"

"ٹھیک ہے" ہدایت کار نے اپنے موٹے موٹے ہاتھوں سے اٹلی بجاتے ہوئے کہا۔ "ہم ایک اور ٹیک کریں گے۔"

لڑکا اور لڑکی دوبارہ وہی پوز بنا کر سمندر کے دوسرے کنارے کی جانب منہ کر کے کھڑے ہو گئے اور کیمرا مین نے اپنے پہلے والی جگہ سنبھال لی۔

☆ ☆ ☆

کسی نے ہماری قمیص کھینچی۔ پلٹ کر دیکھا تو نورا کھڑی تھی اور غصے سے گھور رہی تھی "کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ارے نورا۔ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ ہم تو تمہیں تلاش کر رہے تھے۔"

وہ مسکرانے لگی "میں سمندری مخلوق نہیں ہوں کہ تم مجھے سمندر میں ڈھونڈ رہے تھے۔ چلو میرے ساتھ۔ برٹی انتظار کر رہا ہے۔"

خان صاحب نے واپس لوٹتے ہوئے پوچھا "کون برٹی؟"

"فوٹو گرافر۔ جس نے مسٹر بوٹ کو بلایا ہے۔"

بٹ صاحب اب تک خاموش تھے۔ یکایک اردو میں بولے "خان صاحب۔ اسے سمجھا لیجے کہ میرا نام نہ بگاڑے۔"

"یار خفا کیوں ہوتے ہو۔ اسے تمہارے نام سے شناسائی نہیں ہے۔ اور انگریزوں کا تلفظ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"تو پھر میں بھی اسے بورا کہوں گا" وہ ناراض ہو کر بولے۔

ریتیلے ساحل پر بھی فوٹو گرافی کا سلسلہ جاری تھا۔ کہیں ریت پر کوئی خاتون لباس غسل پہنے ہوئے لیٹی انگڑائیاں لے رہی تھیں تو کسی جگہ سمندر میں سے برآمد ہوتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

ہم نے نورا سے پوچھا "وہ تمہاری دوست کہاں چلی گئی؟"

"اس کا فوٹو سیشن ہے وہ میک اپ کرنے گئی ہے۔"

ایک صاحب ہم سے ٹکرائے اور پھر پلٹے بغیر ہی "سوری' معاف کرنا" کہہ کر الٹے

قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے دوبارہ ٹکرا گئے۔ ان بے چارے کا قصور بھی نہیں تھا۔ ان کا منہ سامنے کی طرف تھا جہاں ایک خاتون بڑی آب و تاب کے ساتھ اپنے لباس کی نمائش کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں اور یہ بے چارے ان کو فلماتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے کی طرف چل رہے تھے' یہ خاتون ایک تولیے کا گاؤن زیب تن فرمائے ہوئے تھیں۔ کہنے کو وہ گاؤن تھا جس کا مقصد جسم ڈھانپنا ہوتا ہے مگر انہوں نے کچھ ایسے انداز سے پہنا تھا کہ جسم کے بیشتر حصے کھلے ہوئے تھے۔ نورا نے اطلاع دی کہ یہ ایک کمرشل بنائی جا رہی ہے جس کا مقصد ایک ایسی کمپنی کی تشہیر ہے جو نہانے کا لباس اور اس سے متعلق دوسری چیزیں بناتی ہے۔

ہم ساحل سے قدرے ہٹ کر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں کھجوروں اور ناریل کے درخت ہوا سے جھوم رہے تھے۔ قدموں تلے ریت تھی' سر پہ آسمان تھا' سامنے بے پایاں سمندر تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہم بھول ہی گئے کہ میامی میں گھوم رہے ہیں۔ زمین کا یہ ٹکڑا کچھ اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا نیلے رنگ کا چھاتا نصب تھا۔ اس کے آس پاس کچھ اور رنگین چھاتے بھی تھے۔ نیلے چھاتے کے سائے میں چند پلاسٹک کی نازک سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک سرخ رنگ کی کرسی پر برٹی صاحب تشریف فرما تھے جن کی فرمائش پر بٹ صاحب اور ان کے طفیل ہم سب وہاں پہنچے تھے۔ نورا اپنی لچکیلی چال کے ساتھ ہمارے آگے آگے رواں دواں تھی۔ ہوا سے اس کے ترشے ہوئے بال بکھر گئے تھے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کی قیادت میں ہم سب چھاتے کے نزدیک پہنچ گئے۔

برٹی کے ہاتھ میں بیئر کا ایک ڈبا تھا اور سامنے ایک نوجوان' دراز قد لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ وہ صرف جانگیے میں ملبوس تھا۔ لگتا تھا جیسے ابھی سمندر سے غسل کر کے آیا ہے یا غسل کرنے جا رہا ہے۔ برٹی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا اور بیئر کا خالی ٹین ایک طرف پھینک دیا جسے فوراً ہی ایک نو عمر لڑکے نے اٹھا کر ایک بڑے سے پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال دیا۔ صفائی کا یہ نظام ہمیں بہت پسند آیا۔

نورا' برٹی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ برٹی نے اسے دیکھا اور کہا' "کیا ہوا؟ وہ تمہیں ملا' یا سمندر میں غرق ہو گیا؟"

"وہ یہ رہا" نورا نے بٹ صاحب کی جانب اشارہ کیا "ان سے ملو۔ یہ ہیں مسٹر بوٹ۔ ...تان سے آئے ہوئے ہیں اور وہاں باکسنگ چیمپئن ہیں۔"

بٹ صاحب تو کبھی اپنے محلے کے باکسنگ چیمپئن نہیں رہے تھے مگر خان صاحب نے ...اہی سیدھی ہانکی تھی اس کے پیش نظر نورا ان سے مرعوب ہو گئی تھی۔ اس میں شک ...یں کہ شخصی وجاہت اور مردانہ حسن کے اعتبار سے بٹ صاحب واقعی ایک پرکشش ہستی ...ہے۔

برٹی نے بٹ صاحب کو نگاہوں سے جانچا اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ...ئی' "ہائی باٹ! تم سے مل کر خوشی ہوئی" اس نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ...ٹ صاحب نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "میرا نام باٹ نہیں' بٹ ...ہے۔"

"اوکے اوکے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میری تلاش ختم ہو گئی۔ میں نورا کا شکر ...زار ہوں' کیا تم تیار ہو؟"

"کس کے لیے؟"

"شوٹنگ کے لیے اور کس کے لیے"

بٹ صاحب کچھ پریشان سے ہو گئے۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ فوراً ہی انہیں منتخب ...لیا جائے گا اور کام بھی شروع ہو جائے گا۔

نورا آگے بڑھ کر بٹ صاحب کے نزدیک کھڑی ہو گئی "فکر نہ کریں۔ یہ بالکل تیار ...ہے۔"

"اوکے" برٹی نے تالی بجائی اور ایک لڑکا نمودار ہو گیا "بوٹ کو لے جا کر میک اپ ...و۔"

بٹ صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پریشانی سے ہم لوگوں کی طرف دیکھنے لگے "کیا ...رہا ہے؟"

"تمہیں میک کرایا جائے گا۔"

"میں میک اپ نہیں کروں گا" وہ مچل گئے "ہمارے خاندان میں کبھی کسی مرد نے ...اپ نہیں کیا۔"

ہم نے کہا "تمہارے خاندان کے کسی مرد نے کبھی کسی فلم میں کام بھی تو نہیں کیا۔"

خان صاحب بولے "تمہارے خاندان والوں نے تو کبھی خواب میں بھی امریکا نہیں دیکھا ہو گا اور تم اس وقت امریکا میں کھڑے ہو۔"

"دیکھو میرے خاندان تک نہ پہنچنا" وہ سنجیدگی سے ناراض ہو گئے۔

"تم نے ہی تو خاندان کی بات چھیڑی ہے۔"

"ٹھیک ہے، لعنت بھیجو۔ میں کام وام نہیں کروں گا" وہ پلٹ کر جانے لگے۔

نورا نے لپک کر ان کا بازو تھام لیا "کیا بات ہے کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

ہم نے کہا "نورا۔ مسٹر بٹ میک اپ نہیں کریں گے۔ یہ ان کی خاندانی روایت کے خلاف ہے۔"

نورا ہنسنے لگی "کیا حماقت ہے؟ ارے کوئی سچ مچ کا میک اپ تھوڑا ہی ہو گا۔ یہ تو شوبزنس میں ایک اصطلاح ہے" پھر اس نے بٹ صاحب کے چہرے پر ایک والہانہ نگاہ ڈالی اور کہا "تمہیں میک اپ کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کس قدر بے داغ اور خوب صورت جلد ہے تمہاری مجھے تو تم پر رشک آرہا ہے۔"

بٹ صاحب پوری بات تو نہیں سمجھ سکے مگر جتنی سمجھے، اس پر بھی جھینپ سے گئے۔

نورا نے کوئی غلط بات بھی نہیں کی تھی یہ سچ ہے کہ گورے اور سرخ و سفید ہونے کے باوجود امریکیوں کی جلد پر مختلف قسم کے چھوٹے بڑے دھبے اور نشانات ہوتے ہیں۔ عورتیں تو ان دھبوں کو میک اپ کی مدد سے چھپا لیتی ہیں مگر مرد بے چارے مجبور ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں کے رہنے والوں اور کشمیریوں کو قدرت نے جو بے بہا رنگ و روپ دیا ہے وہ امریکا والوں کو کہاں نصیب ہے۔

برٹی جو اپنی کرسی سے اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا واپس آگیا۔ ہم لوگوں کو اسی جگہ موجود دیکھ کر وہ پریشان ہو کر بولا "وہاٹ دی ہیل۔ تم لوگ ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔"

نورا نے کہا۔ "برٹی مسٹر بوٹ نے پہلے کبھی کیمرے کا سامنا نہیں کیا۔ انہیں سمجھانا اور تسلی دینا بہت ضروری ہے۔"

"اوکے" اس نے ہاتھ ہلا کر کہا "یہ کام تم کرو مگر پندرہ منٹ کے اندر انہیں تیار کر کے ڈریس اپ کرا دو۔"

نورا بٹ صاحب کا بازو تھام کر چلی تو خان صاحب نے اور ہم نے ایک دوسرے کو ھا۔ مطلب یہ تھا کہ ہم کیا کریں؟ بٹ صاحب کے ساتھ جائیں یا وہیں انتظار کریں؟

ہم نے کہا "خان صاحب ہماری اس وقت وہی حیثیت ہے جو پاکستان میں ہیروئنوں کی ؤں، دادیوں اور سرپرستوں کی ہوتی ہے۔ دراصل ہمیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

خان صاحب ہنسنے لگے "ارے آفاقی صاحب۔ یہی تو زندگی ہے۔ انسان کو زندگی کا ہر گ دیکھنا چاہیے۔ اب یہاں آگئے ہیں تو تجربات سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ یہ بھی ری تفریح کا ایک حصہ ہے۔"

ہم خان صاحب کی ذہانت اور پختہ مزاجی سے بہت متاثر ہوئے گویا یورپ کی سیاحت بیرونی ملکوں کی آمد و رفت نے خان صاحب کے انداز فکر اور طرز زندگی کو خاصا متاثر کیا ۔ نیلے چھاتے کے نیچے پڑی ہوئی کرسیاں اب خالی ہو چکی تھیں اس لیے ہم دونوں نے بیٹھنا مناسب سمجھا۔ مشرق میں یہ دستور ہے کہ مہمانوں کی خاطرمدارات اور پذیرائی کی ہے۔ پھٹیچر سے پھٹیچر آدمی بھی مہمانوں کے سامنے خاطرداری میں بچھ جاتا ہے مگر اس وقت تک ہمیں کسی نے کوک کا ایک ڈبا یا چپس کا ایک پیکٹ بھی پیش نہیں کیا

"یار بڑے بد اخلاق لوگ ہیں" خان صاحب نے کرسی پر بیٹھ کر مخصوص پاکستانی انداز دسری کرسی پر اپنے پیر پھیلا دیے "جھوٹے منہ چائے پانی کو بھی نہیں پوچھا۔"

ہم نے کہا "حالانکہ ہم ہیرو کے ساتھ آئے ہیں۔ پاکستان میں ہوتے تو اب تک لنچ اور چرغا وغیرہ بھی آچکا ہوتا۔"

کی جانب سے ایک درمیانہ عمر کی خوش لباس خاتون نمودار ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں فائل تھی۔ ایک بال پنسل ان کے بالوں میں اڑسی ہوئی تھی۔ وہ معقول، شریفانہ ے میں ملبوس تھیں اور ان کا رخ ہماری ہی جانب تھا۔ میامی کے ساحل پر وہ پہلی نظر آئیں تھیں جو ڈھنگ کا لباس پہنے ہوئی تھیں۔ صورت شکل بھی مناسب تھی قد امریکی معیار سے قدرے چھوٹا تھا۔

ہم نے خان صاحب سے کہا "کرسی پر سے پیر ہٹا لیجئے۔" انہوں نے فوراً پیر ہٹا لیے مگر ر ہمیں دیکھا "کیوں؟"

"سامنے سے ایک خاتون آ رہی ہیں۔ اور ویسے بھی کرسی پر پیر رکھ کر بیٹھنا مہذب طریقہ نہیں ہے۔"

خاتون ہمارے پاس آ گئیں۔ "ہائی!" وہ مسکرائیں۔

"ہائی" ہم دونوں بھی مسکرانے لگے۔

"آپ میں سے کھان کون ہے؟"

"مسٹر خان ان کا نام ہے" ہم نے خان صاحب کی طرف اشارہ کر دیا۔

"مسٹر کھان۔ ایک ایمرجنسی پیدا ہو گئی ہے' کیا آپ میرے ساتھ آنا پسند کریں گے؟"

"مگر کہاں؟"

وہ سامنے میک اپ روم میں" اس نے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا' ہم دونوں فوراً مستعدی سے ان کے ہمراہ چل پڑے۔

"مگر مسئلہ کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"آپ کے دوست نے جھگڑا کھڑا کر دیا ہے۔ نورا بھی بہت پریشان ہے۔"

ہم سمجھ گئے کہ بٹ صاحب نے کوئی نیا گل کھلایا ہو گا۔

درختوں کے سائے میں دو تین ٹریلر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ چلتے پھرتے گھر ہوتے ہیں جن میں کچن' غسل خانہ' ڈرائینگ روم' بیڈ روم سبھی کچھ ہوتا ہے۔

ان ہی کو چلتے پھرتے میک اپ روم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ خاتون نے ایک ٹریلر کے دروازے پر دستک دی۔ اندر داخل ہوئے تو بٹ صاحب ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ نورا ان کے سامنے والی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک معمر خاتون کمر پر ہاتھ رکھے عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے بٹ صاحب کو گھور رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" ہم نے اندر پہنچ کر پوچھا۔

بڑی بی نے کہا "ہی از اے پرابلم چائلڈ" ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ بٹ صاحب کی طرف تھا۔

"یار مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں نہیں کرتا کام وام" بٹ صاحب سخت برہم نظر آ رہے تھے۔

"مگر بات کیا ہوئی؟"

"میرے بال وال ٹھیک کرنے کے بعد مجھ سے کہا کہ ڈریس اپ ہو جاؤ اور پتا ہے ڈریس مجھے کیا دے رہے ہیں؟"

"کیا؟" خان صاحب جلدی سے بولے۔

"نہیں' جانگیہ۔"

"جانگیہ؟ یعنی صرف جانگیہ اس کے علاوہ کچھ نہیں؟"

نورا نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا "آپ لوگ اپنے دوست کو سمجھائیں۔ خواہ مخواہ میری پوزیشن خراب کر رہا ہے۔"

ہم نے کہا "مگر نورا کیا اس کے لیے جانگیے کے سوا کوئی اور لباس نہیں مل سکتا؟ جانگیہ بھی کوئی لباس ہے ہمارے ہاں لوگ سب کے سامنے ایسے کپڑے پہننا پسند نہیں کرتے۔"

نورا بولی "دوسرا لباس کہاں سے آئے گا؟ یہ کمرشل فلم زیر جامے بنانے والی کمپنی کے لیے بنائی جا رہی ہے۔ انڈر ویئر' پیراکی کرنے کا جانگیہ' بنیان' یہ سب لباس پہنا کر شوٹنگ ہو گی۔"

"میں تماشا نہیں بنوں گا' کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا" بٹ صاحب نے صاف جواب دے دیا۔ نورا نے بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔

ہم نے اور خان صاحب نے اس صورت حال پر غور کیا قصور ہمارا ہی تھا کہ ہم نے نورا سے یہ نہیں دریافت کیا تھا کہ بٹ صاحب کو کس قسم کی ماڈلنگ کرنی ہو گی۔ یہ اعتراض کہ لباس نامناسب تھا بالکل فضول تھا کیونکہ وہاں مرد تو کیا عورتیں بھی اسی قسم کا لباس پہن کر گھومتی پھرتی ہیں۔ ادھر بٹ صاحب کا نکتہ بھی قابل غور تھا لیکن اگر کام نہ ہوا تو ساری ذمے داری نورا پر آ جاتی اس غریب نے تو بڑے خلوص کے ساتھ ہمارے ساتھ ایک بھلائی کی تھی کہ منٹوں میں بٹ صاحب کو ماڈل بنا دیا۔ ورنہ اس مقصد کے لیے وہاں ہزاروں لوگ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور پھر بھی کامیاب نہیں ہوتے۔

آخر ہم نے بٹ صاحب کے جذبہ حب الوطنی کو بیدار کرنے کا فیصلہ کیا۔

"بٹ جی۔ ذرا غور کرو کہ اگر تم نے عین وقت پر گڑ بڑ ڈال دی تو یہ بات سارے گیلی میں پھیل جائے گی اور پھر سارے امریکا میں اس کا چرچا ہو گا' اس کے بعد ساری دنیا کو

معلوم ہو جائے گا کہ ایک پاکستانی نے کس طرح عین وقت پر تنازعہ کھڑا کر کے ایک امریکی کمپنی کو نقصان پہنچایا ہے۔ ذرا سوچو کہ یہ سب لوگ پاکستان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟

خان صاحب نے مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا "اور جب یہ بات مشہور ہو جائے گی تو یہاں رہنے والے بھارتی' یہاں رہنے والے پاکستانیوں کا مذاق اڑائیں گے۔ انہیں طعنے دیں گے۔"

بٹ صاحب کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہونے لگیں جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ اس پہلو پر غور کر رہے ہیں۔

ہم نے کہا "اور ہم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ تم کشمیری ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو ان سب کی کشمیریوں کے بارے کتنی خراب رائے ہو گی؟"

خان صاحب نے گرم لوہے پر آخری ضرب لگائی "بٹ جی۔ اچھی طرح سوچ لو۔ کہیں تمہاری وجہ سے کشمیر کا مسئلہ خراب نہ ہو جائے۔"

حب الوطنی اور کشمیر' بٹ صاحب کے کمزور ترین پہلو ہیں۔ جس طرح پرانی داستانوں میں دیو کی جان مختلف جانوروں اور پرندوں میں ہوتی تھی' اسی طرح بٹ صاحب کی جان پاکستان اور کشمیر میں ہے۔ ان کے نام پر وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں احساس تھا کہ ہم ان کے قابل قدر جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

بٹ صاحب چند لمحے غور کرتے رہے پھر فیصلہ کن انداز میں کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے "دیکھیے بھائی صاحب' مجھے نہ امریکیوں کی پرواہ ہے نہ بھارتیوں کی۔ رہا کشمیر کا مسئلہ تو وہ میرے جانگیہ پہننے سے حل نہیں ہو سکتا۔ میں کسی قیمت پر بھی "ننگی تصویریں" نہیں بنواؤں گا۔"

خان صاحب نے کہا "بٹ جی۔ ذرا یہ بھی سوچئے کہ لوگ کیا سوچیں گے؟"

"لوگ گئے بھاڑ میں۔ میں لوگوں کی خاطر ننگا پھرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

ہم نے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس طرح تو لوگ آپ کو "ننگ وطن" کا طعنہ دیں گے۔"

"اور کیا!" انہوں نے فوری ہماری تائید کر دی۔

خان صاحب کو نورا کی فکر پڑی ہوئی تھی' کہنے لگے "بٹ صاحب۔ کوئی آپ کو ننگی تصویریں بنوانے کی تو نہیں کہہ رہا۔ یار تم مرد ہو۔ دیکھو کتنی بہت سی لڑکیاں یہی لباس پہنے پھر رہی ہیں۔"

"ان کا کیا ہے۔ انہیں تو بے شرمی کی عادت ہے۔"

"فکر کیوں کرتے ہو۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں بھی عادت ہو جائے گی۔ ذرا یہ بھی خیال کرو کہ اگر عین وقت پر تم نے صاف انکار کر دیا تو نورا کی پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ اس نے تو کسی لالچ کے بغیر ہی تمہیں یہ کام دلایا ہے۔"

بٹ صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ "خان صاحب۔ میں شریف آدمی ہوں۔ انڈر ویئر پہن کر تو میں اپنے غسل خانے سے باہر بھی قدم نہیں رکھتا۔ یہاں کھلے عام تصویریں کیسے بنوا سکتا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ' یہ بھی کوئی کام ہے" وہ تیزی سے میک اپ روم سے باہر چلے گئے۔

نورا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہ اندازہ اس نے ضرور لگا لیا تھا کہ بٹ صاحب کسی طور پر رضامند نہیں ہو رہے۔ ہم نے اسے بٹ صاحب کا پوائنٹ آف ویو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ تمہیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا کہ کس قسم کی ماڈلنگ کرنی ہو گی۔

"مگر اس میں حرج کیا ہے ساحل پر کتنے لوگ یہی لباس پہنے پھر رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر ہمارے ملک میں یہ بے شرمی سمجھی جاتی ہے۔ سوری نورا' اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ شاید بٹ صاحب کے انکار کی وجہ سے تمہیں اور برٹی کو پریشانی ہو گی۔"

وہ بولی "پریشانی کچھ نہیں ہو گی۔ ساحل ایسے آدمیوں سے بھرا پڑا ہے جو ایک اشارے پر یہ کام کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "تو پھر تم جا کر انہیں اشارہ کر دو۔ ہماری طرف سے برٹی سے بہت معذرت کر لینا۔"

اس طرح بٹ صاحب کی ماڈلنگ کا منصوبہ خاک میں مل کر رہ گیا۔

نورا نے ہمیں بتایا تھا کہ فوٹوگرافی میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا اور اس کا معاوضہ ایک ہزار ڈالر دیا جائے گا گویا سویرے سویرے ہمیں ایک ہزار ڈالر کا نقصان

ہو گیا۔ ہم نے دوبارہ برٹی کے چھاتے کا رخ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

☆ ☆ ☆

جب ہم نورا کو خدا حافظ کہہ کر واپس آ رہے تھے تو درجن بھر خوب صورت لڑکیوں کی ایک ٹولی برٹی کے چھاتے کی جانب گامزن تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سب ماڈلز ہیں اور غوطہ خوری کے لباس میں تصویریں بنوانے آئی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید خان صاحب یہ فوٹو گرافی دیکھنے کے لیے رک جائیں گے مگر خان صاحب نے ذرا سی بھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جو کہ حیرت انگیز بات تھی مگر کچھ دیر بعد اس کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ جب خان صاحب نے کہا "چھوڑو یار۔ غوطہ خوری کا لباس بھی کوئی لباس ہے۔ اچھی خاصی لڑکیاں کارٹون نظر آتی ہیں۔ موٹے ربڑ یا پلاسٹک کا لباس سر سے پیر تک منڈھ دیا جاتا ہے۔"

پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

بولے "فلموں میں دیکھا ہے۔"

ماڈلنگ اور فوٹو گرافی کا قصہ ختم ہو گیا تو بھوک چمکنے لگی۔ خیال آیا کہ ہم لوگ منہ اندھیرے برائے نام ناشتا کر کے ہوٹل سے چل پڑے تھے۔ چنانچہ اب لنچ کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ ساحل پر بے شمار ریستوران تھے جو "سی فوڈ" یعنی سمندری کھانوں کے لیے مشہور تھے مگر ہم میں سے کوئی بھی "سی فوڈ" کا شوقین نہیں تھا۔ خان صاحب کی رائے تھی کہ "سی فوڈ" خشکی پر رہنے والوں کی خوراک ہی نہیں ہے۔

کافی تحقیق و تلاش کے بعد خان صاحب نے ایک ریستوران پسند کر لیا۔ اس کے سامنے ایک کشادہ فٹ پاتھ پر رنگین کرسیاں اور میزیں سجی ہوئی تھیں۔

ہم نے پوچھا "اس ریستوران میں آپ کو وہ کیا خوبی نظر آ گئی ہے جو دوسروں میں نہیں؟"

بولے "آپ نے دیکھا نہیں کہ یہاں کتنی رونق ہے۔ کھانے کا کیا ہے' وہ تو ہر جگہ مل جاتا ہے مگر ایسے چہرے ہر جگہ میسر نہیں آتے۔"

ان کی بات بھی درست تھی۔ اس ریستوران میں ہر قسم اور ہر عمر کی خواتین کی ریل پیل تھی۔ ان میں ماڈلز اور اداکارائیں بھی ہوں گی مگر ہم جیسے سیاحوں کی بھی کمی نہیں تھی

جو بڑے اشتیاق سے اس رنگا رنگ ماحول کی تصویریں بنانے میں مصروف تھے۔ گو کہ ماڈلز اور سیاح خواتین میں امتیاز کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ سبھی کا حلیہ اور لباس قریب قریب ایک ہی جیسا تھا۔

جو ویٹریس ہمارے پاس آرڈر لینے آئی تھی اسے دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ وہ ایک خوش اندام لڑکی تھی اور مکمل لباس پہنے ہوئے تھی۔ گھٹنوں سے ذرا نیچا اسکرٹ' آدھی آستینوں والا بلاؤز' سلیقے سے بنے ہوئے بال' ہم تو اسے دیکھ کر بوکھلا سے گئے۔ وہ اس ماحول میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ وہ اس مغربی معاشرے کا ایک کردار لگ رہی تھی جو مغرب میں بھی اب دیکھنے کو نہیں ملتے۔

ویٹریس ہمیں دیکھ کر مسکرائی۔ ہم نے بھی مسکراہٹ میں جواب دیا اور پھر مینو کارڈ لانے کی فرمائش کر دی۔ وہ ایک بار پھر مسکرائی اور میز کی جانب اشارہ کر کے بولی "مینو آپ کے سامنے میز پر موجود ہے۔"

دیکھا تو واقعی میز پر رکھے ہوئے شیشے کے نیچے ایک تفصیلی قسم کا مینو موجود تھا۔ جس میں درجنوں کھانوں اور ان کی قیمتوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ ہم نے بڑے غور سے مینو کا مطالعہ شروع کر دیا۔

ویٹریس نے کہا "آپ لوگ ٹورسٹ ہیں؟"

ہم نے کہا "ہاں۔ مگر تم نے کیسے جانا؟"

بولی "صرف ٹورسٹ ہی اس جگہ آ کر اتنے حواس باختہ ہوتے ہیں ورنہ یہاں کے لوگ تو اس ماحول کے عادی ہیں۔"

مینو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ہمیں ان کھانوں سے مطلق واقفیت نہ تھی اور بہت سے کھانوں کے نام تو ہم سے پڑھے بھی نہیں جا رہے تھے۔ مزید شرمندگی سے بچنے کے لیے ہم نے پوچھا "اس ریستوران کی سب سے مشہور اور پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟"

اس نے جھک کر ایک نام پر انگلی رکھ دی۔ ہم سب نے بغور اس نام کو دیکھا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر پوچھ ہی لیا "یہ کیا چیز ہے؟"

اس نے برابر والی میز کی جانب انگلی سے اشارہ کر دیا' دیکھئے' آپ کے پڑوس میں بھی یہی ڈش منگائی گئی ہے۔"

برابر والی میز پر ایک موٹی تازی، لمبی تڑنگی خاتون اور ایک دراز قد مگر نہایت اسمارٹ نوجوان تشریف فرما تھے۔ ایک ویٹریس نے ان دونوں کے سامنے ایک ایک ٹرے لاکر رکھ دی تھی اور مسکرا کر رخصت ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنی قاب کے اوپر سے چمکدار ڈھکن ہٹایا اور پھر چھری کانٹا اٹھاکر سامنے رکھی ہوئی چیز میں کانٹا گاڑ کر چھری کو اس کے ایک جانب سے دوسری جانب پھیرا جس سے وہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اب انہوں نے اوپر والا ٹکڑا کانٹے اور چھری کی مدد سے اٹھا کر پلیٹ میں رکھا اور ایک چمچہ اٹھا کر اس کے اندر سے کھانا شروع کر دیا۔ پہلا چمچہ منہ میں رکھتے ہی انہوں نے ایسے منہ بنایا جیسے کہ بے حد لذیذ چیز کھا رہے ہوں۔

ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، پوچھا "بتا سکتی ہو کہ اس کھانے میں ہے کیا؟ یعنی کن چیزوں سے بنایا گیا ہے؟"

جواب ملا "چیزیں نہیں صرف ایک چیز ہے۔ یہ ایک خاص سائز کا ایک چھوٹا کچھوا ہوتا ہے جسے بھاپ میں پکایا جاتا ہے۔"

یہ تفصیل سن کر ہمارا تو دل خراب ہونے لگا۔ بٹ صاحب اور خان صاحب کا بھی قریب قریب یہی حال تھا۔

خان صاحب نے کہا "کس قدر فضول اور بلا نوش لوگ ہیں۔ اٹھو جی ہم یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔"

ہم نے بھی ان کی تائید کی مگر بٹ صاحب بول پڑے "آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔ اتنی دیر سے یہ لڑکی آرڈر لینے کے انتظار میں کھڑی ہوئی ہے۔ اب اگر ہم اٹھ کر چلے جائیں گے تو یہ کیا سوچے گی۔ پاکستان کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی؟"

ہم نے کہا "ہر وقت بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے کہ ہم پاکستانی ہیں۔ جو اس کے جی میں آئے سوچتی رہے۔"

خان صاحب کا یوں تو بٹ صاحب سے اینٹ کتے کا بیر رہتا ہے مگر ایسے معاملات میں وہ اکثر بٹ صاحب سے متفق ہو جاتے ہیں "خدا کا خوف کرو یار۔ آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ اتنی شریف لڑکی کو مایوس نہیں کرنا چاہیے۔"

"اس کو ہم ٹپ دے دیتے ہیں۔ خوش ہو جائے گی۔"

"لاحول ولا قوۃ" بٹ صاحب سچ مچ ناراض ہو گئے "وہ کوئی فقیرنی تو نہیں ہے، دیکھا نہیں یہاں لوگ بھیک مانگنا پسند نہیں کرتے ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر ان لوگوں کی موجودگی میں ہم سے کچھ کھایا نہیں جائے گا۔ دل خراب ہو رہا ہے۔"

"اس کی بھی ایک ترکیب ہے۔ ہم کسی دوسری میز پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سب کی طرف سے پیٹھ موڑ کر سمندر کی طرف اپنا رخ کر لیں گے۔"

ویٹریس اس اثناء میں خاموش کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی جو ظاہر ہے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ آخر بول پڑی "آپ لوگ ابھی کچھ اور بحث کرنا چاہتے ہیں تو میں دوبارہ آجاؤں گی۔"

"ارے نہیں، معاف کرنا ہم ایک سیریس بات کرنے لگے تھے۔ تم ایسا کرو کہ ہمارے لیے فنگر فش لے آؤ۔"

"تینوں کے لیے؟"

"ہاں۔"

"اور ڈرنکس؟"

"کوک یا سیون اپ۔"

وہ سر ہلا کر چلی گئی مگر کچھ زیادہ خوش نہیں لگتی تھی۔

خان صاحب بولے "کسی شریف گھر کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ کتنا شائستہ لباس پہنتی ہے۔"

ہم نے کہا "یہ لباس نہیں، یونیفارم ہے جو مالکوں کی طرف سے ملتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ اس ریستوران کی ہر ویٹریس یہی لباس پہنے ہوئے ہے۔"

خان صاحب لاجواب ہو گئے، کہنے لگے "خوشبو کتنی اچھی استعمال کی ہے اس نے۔"

بٹ صاحب بول پڑے "اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "جب دوبارہ آئے گی تو نام، پتا، خاندان سب کچھ پوچھ لینا۔ اتنی انگریزی تو اب آپ کو بھی آگئی ہے۔"

میز تو ہم نے نہیں بدلی مگر اپنے ہمسایوں کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھ گئے۔

"ہیلو" کسی نے مخاطب کیا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک ایشیائی صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک میم تھیں "آپ لوگ انڈیا سے آئے ہیں؟"

ہم نے کہا "جی نہیں۔ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔"

"بہت خوب" انہوں نے کہا اور پھر خاتون سے انگریزی میں مخاطب ہوئے "دیکھا' میں نے جو اندازہ لگایا تھا وہ بالکل درست نکلا۔"

میم صاحب مسکرانے لگیں "اوہ۔ تمہارا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔"

ان صاحب نے دوبارہ اردو میں ہم سے خطاب کیا "میرا نام بی ایل کھنہ ہے۔ بابو لال کھنہ۔ میں بمبئی سے آیا ہوں' فلمیں بناتا ہوں اور آپ؟"

ہم نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ ہم لوگ لاہور سے تفریح کے لیے آئے ہیں۔

"اوہ' لاہور" انہوں نے ایک سرد آہ بھری "میرا تعلق لاہور ہی سے ہے۔ میرے ڈیڈی وہیں پیدا ہوئے تھے۔ بہت باتیں کیا کرتے تھے لاہور کی۔ میں نے تو خیر کبھی دیکھا تک نہیں' سنائیے لاہور کا کیا حال ہے؟"

"بہت اچھا ہے" خان صاحب نے جواب دیا۔ ان کی نگاہیں میم صاحب پر لگی ہوئی تھیں جنہوں نے اس قدر برائے نام لباس پہنا ہوا تھا کہ اگر خفیف سی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی کہیں سے آجاتا تو انہیں فی الفور نمونیا ہو جاتا۔ میامی کو شاید لوگ اسی لیے پسند کرتے ہیں کہ یہاں سردی مطلق نہیں ہوتی اور بقول خان صاحب "ننگے پھرنے میں بہت آسانی ہے۔"

"اگر اعتراض نہ ہو تو ہم بھی آپ کی میز پر بیٹھ جائیں کافی دیر کے بعد کوئی ہم زبان ملا ہے" کھنہ صاحب نے درخواست کی۔

"ضرور۔ شوق سے' آپ کچھ کھانا پینا پسند کریں گے؟"

"نہیں شکریہ۔ ہم لوگ کھا چکے ہیں۔ ہاں اگر آپ کافی پئیں گے تو اس میں شریک ہو جائیں گے۔" پھر انہوں نے اپنی ہمراہی سے تعارف کرایا۔ "یہ گلوریا ہیں۔ گلوریا وینڈل۔ ابھرتی ہوئی فن کارہ ہیں۔"

بٹ صاحب بے اختیار بول پڑے "کیا سمندر میں سے نکلی ہیں؟" خان صاحب نے فوراً ان کو کہنی ماری۔

گلوریا وینڈل نے باری باری ہم سب سے ہاتھ ملایا اور بڑی لگاوٹ سے حال پوچھا۔ یوں تو وہ سراپا دلکش تھی مگر ان کا مسکرانے کا انداز بے حد دلاویز تھا۔ مسکراتے ہوئے ان کے دونوں رخساروں میں گڑھے پڑ جاتے تھے اور موتیوں جیسے دانت جگمگانے لگتے تھے۔

"گلوریا نے ابھی زیادہ کام نہیں کیا ہے۔" کھنہ صاحب نے انگریزی میں کہا "مگر میں انہیں اپنی فلم میں ہیروئن کا رول دے رہا ہوں۔"

"آپ انگلش فلم بنا رہے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ ہندی فلم ہوگی۔ ان کے مکالمے ہم ڈب کرلیں گے" انہوں نے کہا۔ پھر گلوریا کی طرف دیکھا اور مسکرائے "ویسے میں انہیں ہندی بھی سکھا رہا ہوں۔"

خان صاحب بولے "انہیں مکالمے بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"کیا مطلب!"

بٹ صاحب نے کہا "مطلب یہ ہے کہ انہیں ڈانس وانس سکھا دیجئے۔ سیکھنے میں آسانی رہے گی۔ ہندی تو بہت جناتی زبان ہے۔ کیوں اس بے چاری پر ظلم کرتے ہیں۔"

کھنہ صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئی مگر ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ویٹریس ہمارا آرڈر لے کر آگئی۔ مشرقی آداب کے مطابق ہم نے ایک بار پھر انہیں شریک طعام ہونے کی دعوت دی اور ان کے انکار پر کافی لانے کو کہہ دیا۔

"ارے۔ آپ فنگر فش کھا رہے ہیں؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیوں۔ اس میں کوئی حرج ہے کیا؟"

"ارے صاحب۔ میامی بیچ پر آکر فنگر فش کھانا تو میامی کی توہین ہے' یہ تو بہت عام سی فش ہے دنیا میں ہر جگہ مل جاتی ہے۔ آپ یہاں کی خاص ڈش کیوں نہیں کھاتے؟"

"وہ کیا ہے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"بولے "آکٹوپس۔"

اور سنئے ہم تو کچھوے پر ہی اعتراض کر رہے تھے' انہوں نے اس سے بڑھ کر آکٹوپس کھانے کا مشورہ دے ڈالا۔ انہوں نے مزید کہا "اگر میامی آئے ہیں تو پھر اس کا پورا فائدہ اٹھائیں" پھر انگریزی میں گلوریا سے کہا "کیوں ہنی۔ آکٹوپس والی ڈش کتنی لاجواب ہوتی ہے؟"

"بے حد مزے دار" گلوریا نے ان کی تائید کی۔

اس سے پہلے کہ وہ آکٹوپس کھانے کی مزید خوبیاں بیان کرتے ہم نے موضوع گفتگو بدل دیا۔

"کھنہ صاحب آپ اتنی دور فلم بنانے آگئے' اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"خاص وجہ کیا ہوگی' ارے صاحب فلم والے تو ہر جگہ جا کر فلمیں بناتے ہیں' اب تو آپ کے پاکستانی پروڈیوسر بھی باہر کے ملکوں میں فلمیں بنا رہے ہیں۔ مجھے میامی بہت پسند ہے۔ موسم کے لحاظ سے' خرچ کے لحاظ سے اور سہولتوں کے اعتبار سے۔ ہر چیز آسانی سے اور سستی مل جاتی ہے اور لڑکیاں۔ ان کا تو کچھ نہ پوچھئے۔ لڑکیاں تو یہاں تھوک کے بھاؤ ملتی ہیں۔ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ خود ہی آپ کو تلاش کر لیتی ہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے" خان صاحب نے رشک آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے تو یہاں آکر اندازہ ہوا کہ ہم انڈین پروڈیوسرز تو گھسیارے ہیں۔ یہاں شو بزنس سے تعلق رکھنے والا ہر شخص راجا اندر بنا بیٹھا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ راجا اندر بے چارے کے پاس تو درجن بھر پریاں ہوں گی۔ یہاں تو سینکڑوں' ہزاروں پریاں مل جاتی ہیں۔ بس عیش ہی عیش۔"

خان صاحب بولے "تو آپ عیش کے لیے یہاں فلم بنا رہے ہیں؟"

وہ جلدی سے انگریزی میں بولے "یہ بات نہیں ہے۔ یہاں اور بھی بہت آسانیاں ہیں۔ کسی جگہ شوٹنگ کرنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں چاہے کیمرا رکھ دو اور شوٹنگ شروع کر دو۔ قدرت کا حسن ہر طرف بکھرا ہوا ہے اسی لیے تو اب ساری دنیا سے فلم پروڈیوسرز یہاں فلمیں بنانے کے لیے آنے لگے ہیں۔ ہالی ووڈ اور نیویارک کے بعد اب میامی بھی فلم کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔"

اتنی دیر میں ویٹریس کافی لے کر آگئی۔ کھنہ صاحب نے ویٹریس کے لباس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر گلوریا سے مخاطب ہو کر بولے "کس قدر اولڈ فیشن کا لباس ہے۔ اس ماحول میں تو بالکل آؤٹ آف ڈیٹ معلوم ہوتا ہے۔ اب تو یہ لباس پرانے زمانے کی فلموں ہی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔"

گلوریا نے کہا "ہمیں ماضی سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہیے۔ آخر وہ لوگ ہمارے

آباؤ اجداد تھے۔ ذرا اولڈ فیشنڈ تھے تو کیا ہوا؟"

نئی نسل خواہ کہیں کی بھی ہو' اس کا پرانی نسل کے بارے میں قریب قریب ایسا ہی رویہ ہے۔

کھنہ صاحب شیخیاں ہانکنے میں مصروف تھے "پہلے میں ہانگ کانگ اور فار ایسٹ کے ملکوں میں جا کر فلمیں بنایا کرتا تھا مگر اب تو میامی کو ہی اپنا ہیڈ کوارٹر بناؤں گا۔ میری' فلوریڈا کی ایک پارٹی سے بات چیت ہو گئی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ انڈیا دنیا بھر میں سب سے زیادہ فلمیں بناتا ہے"

"جی ہاں۔ تعداد کے اعتبار سے۔"

انہوں نے بات کا رخ بدل دیا "میں تو حیران ہوں کہ پاکستان کے فلم ساز اس طرف کیوں نہیں آتے؟"

"کپڑوں کی وجہ سے" خان صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کھنہ صاحب نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ بات چیت انگریزی میں ہو رہی تھی اس لئے گلوریا نے بھی حیران ہو کر اپنے شانے ہلائے اور اس کی موٹی موٹی شربتی آنکھیں کچھ اور کشادہ ہو گئیں۔

"کپڑوں سے فلم کا کیا تعلق ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔

ہم نے کہا "مسٹر کھنہ۔ ہمارے ملک کی فلموں میں کپڑے پہننا بہت ضروری ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں کتنی عریانی ہے۔ پاکستانی فلموں میں یہ بالکل نہیں دکھائی جا سکتی۔ یہ ہمارے کلچر کے خلاف ہے۔"

کھنہ صاحب چپ رہ گئے مگر گلوریا نے ان سے کہا "بی ایل۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ ان کا اور تمہارا کلچر ایک جیسا ہے۔ زبان بھی ایک ہے؟"

بھارت کے لوگ کسی بھی جگہ اپنا پرچار کرنے سے باز نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ باہر کے ملکوں میں جا کر بھی یہی تاثر دیتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کا کلچر ایک ہے اور ان دونوں ملکوں میں "مصنوعی" لکیروں کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔

ہم نے کہا "مس گلوریا۔ مسٹر کھنہ نے آپ کو جو بتایا ہے وہ درست نہیں ہے۔ ہمارا کلچر' ہمارا مذہب اور ہماری تاریخ سب کچھ ان سے مختلف ہے۔ ان کا کلچر دیکھنا ہے تو آپ بھارت جا کر دیکھیے۔ عریانی ان کے مذہب کا حصہ ہے۔ وہاں کے مندروں کی دیواروں پر

بھی ننگی اور فحش تصویریں اور مجسمے بنائے گئے ہیں۔ حالانکہ مندر تو عبادت کی جگہ ہے۔ اس کے بعد آپ ایک چکر ہمارے ملک کا بھی لگالیں تو آپ کو دونوں ملکوں کا فرق معلوم ہو جائے گا۔"

گلوریا نے بے یقینی سے کھنہ صاحب کی طرف دیکھا "واقعی بی ایل۔ کیا یہ سچ کہہ رہے ہیں؟"

کھنہ صاحب کچھ سٹپٹا سے گئے "مگر گلوریا وہ پورنوگرافی نہیں ہے۔ آرٹ کے شاہکار میں جو ہزاروں سال پہلے تخلیق کیے گئے تھے۔"

بٹ صاحب خاموش نہ رہ سکے' بولے "یعنی ہزاروں سال پہلے بھی آپ لوگ بے شرم تھے؟"

"ڈونٹ بی اسٹوپڈ" کھنہ صاحب کو غصہ آگیا "ہزاروں سال پہلے بھی ہم زمانے سے بہت آگے تھے۔"

بٹ صاحب آہستہ سے کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور غصے سے ان کے ہونٹ پھڑک رہے تھے "کھنہ صاحب اس کے آگے آپ اپنی زبان بند ہی رکھیں ورنہ میں آپ کو بھی ہزاروں سال پہلے والوں کے پاس پہنچادوں گا۔"

کھنہ صاحب نے پریشانی سے بٹ صاحب کو اور پھر ہم دونوں کو دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے گلوریا کا بازو تھاما۔ "کم آن ہنی" کہا اور تیزی سے رخصت ہو گئے انہوں نے ایک بار بھی پلٹ کر ہماری طرف نہیں دیکھا۔ گلوریا البتہ پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔

عجیب اتفاق ہے کہ پردیس میں جب بھی کبھی کسی بھارتی سے ملاقات کا اتفاق ہوا' سوائے تلخی اور مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ خدا جانے یہ صورت حال کب بدلے گی؟ اور کبھی بدلے گی بھی یا نہیں؟

☆ ☆ ☆

دن کی روشنی میں میامی ایک زندگی کی حرارتوں سے بھرپور خطہ زمین کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ چمک دار دھوپ مغرب کے لوگوں کے لیے اس کی بہت بڑی خوبی ہے۔ ہم لوگوں کے

لیے یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے لیکن موسم کا اعتدال اور یکسانیت' نہ سرد' نہ گرم اور ہوا کے جھونکے کچھ دن کے لیے تو ہم لوگوں کے لیے بھی دلکشی کا سبب تھے۔ زیادہ عرصے رہنے کے بعد شاید موسم کی یکسانیت ہمارے لیے اکتاہٹ کا سبب بن جاتی کیونکہ ہم لوگ تو بدلتے ہوئے موسموں کے عادی ہیں۔ موسموں کی یہ تبدیلی ہمارے مزاجوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور ان میں بھی تغیر و تبدل پیدا ہوتا رہتا ہے۔

میامی کو یہاں کے لوگ "سورج کی سرزمین" کہتے ہیں۔ سورج' سمندر اور سمندری ہوا' یہ تینوں اگر یکجا ہو جائیں تو امریکیوں کے لیے جنت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کا میامی تو ایک جدید' جگمگاتا ہوا شہر ہے مگر ایک زمانے میں یہاں لوگ ستانے اور آرام کرنے کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ ساحل پر آرام دہ "گیسٹ ہاؤس" بنے ہوئے تھے۔ یہاں یہ دستور تھا کہ رات کو ساڑھے آٹھ بجے تک بہرصورت ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں واپس پہنچ جائیں۔ رات کو نو بجے روشنیاں بجھادی جاتی تھیں۔ کہاں تو یہ شریفانہ قسم کا اونگھتا ہوا میامی تھا اور کہاں آج کا چمکتا دمکتا ہوا میامی ہے جہاں شاید دن اور رات کے کسی پہر میں بھی لوگ سوتے نہیں ہیں۔ کم از کم ہمیں تو ایسا ہی لگا۔ دن میں تو خیر ہجوم اور چہل پہل رہتی ہی ہے۔ لیکن رات بھی جگمگاتی اور جاگتی رہتی ہے۔

"زمانہ ہی بدل گیا ہے" ایک بڑی بی نے لمبی سرد آہ بھرتے ہوئے بڑے سوگوار انداز میں کہا "پتا نہیں آج کی نسل کو کیا ہو گیا ہے؟"

ساحل پر گھومتے ہوئے ہماری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہمیں دو بڑے بڑے سوٹ کیس اٹھا کر لے جاتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ ساٹھ ستر سال کی بوڑھی عورت کے لیے یہ بہت زیادہ وزن تھا۔ وہ بار بار فٹ پاتھ پر دم لینے کے لیے رک جاتی تھی اور سوٹ کیس پر بیٹھ کر ستانے لگتی تھی۔ ان کے آس پاس انسانوں کا ایک ہجوم تھا مگر ہر ایک اپنی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں کھویا ہوا تھا۔ بٹ صاحب کی نظر پڑی تو فوراً مدد کے لیے پہنچ گئے اور ان کے ہاتھوں سے دونوں سوٹ کیس لے لیے۔ پہلے تو وہ بے چاری ڈر گئیں کہ شاید کوئی لٹیرا ہے مگر جب بٹ صاحب نے بتایا کہ وہ ان کا سامان منزل مقصود تک پہنچا دیں گے تو وہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔ ہمیں اپنے گھر کا راستہ دکھانے کی غرض سے وہ کسی نو عمر بچی کی طرح تیز تیز ہمارے آگے آگے چلنے لگیں۔ ان کا مکان زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ سمندر

کی بھیگی بھیگی ہوا میں شرابور ایک خوب صورت' پرانے انداز کا مکان تھا جس کے سامنے اور عقب میں لان بھی تھا۔ پچھلا حصہ سمندر کی جانب تھا جہاں سے کافی فاصلے پر سمندر بھی نظر آتا تھا۔ بٹ صاحب کے ہاتھ سے دوسرا سوٹ کیس خان صاحب نے لے لیا تھا اور ہم تینوں خاموشی سے بڑی بی کے پیچھے چل رہے تھے۔ وہ ہم سے چند قدم آگے تھیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پلٹ کر ہمیں دیکھ لیتی تھیں۔

مکان کے سامنے لکڑی کے ایک تختے پر "گیسٹ ہاؤس" لکھا ہوا تھا۔ خان صاحب یہ دیکھ کر بہت پچھتائے کہ ہوٹل کے بجائے یہاں کیوں نہ قیام کیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کرایہ ہوٹل سے زیادہ تھا اور کوئی ایک کمرہ بھی خالی نہیں تھا۔

بٹ صاحب بہت حیران ہوئے' بولے "اتنے پیسے والی عورت ہے مگر کتنی کنجوس ہے۔ سامان اٹھانے کے لیے کوئی مزدور کیوں نہیں کر لیا۔"

ہم نے کہا "بٹ صاحب۔ اب تو آپ نے کافی دنیا دیکھ لی ہے۔ آپ کو پتا چل جانا چاہیے کہ ان ملکوں میں سامان اٹھانے کے لیے مزدور نہیں ملتے۔"

"تو کیا ہوا۔ یہ کوئی نوکر بھی رکھ سکتی ہے۔"

بڑی بی نے اظہار تشکر کے طور پر ہم لوگوں کو کافی پلانے کے لیے روک لیا۔ ہم مکان کے سامنے والے برآمدے میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر میں وہ کافی سے بھرے ہوئے چار مگ لے کر برآمد ہوئیں۔ ہمیں یقین تھا کہ انہوں نے کافی میں چینی نہیں ڈالی ہو گی۔ دریافت کیا تو یہ اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ وہ دوبارہ گھر کے اندر گئیں اور شکردان لے کر آگئیں "معاف کرنا۔ میں خود چینی کے بغیر کافی پیتی ہوں اس لیے خیال نہیں آیا۔"

ہم نے پوچھا "آپ چینی سے پرہیز کرتی ہیں؟"

ہنس کر بولیں "کرنا ہی پڑتا ہے۔ آخر فیگر کا خیال رکھنا بھی تو ضروری ہے۔"

ہم نے انہیں غور سے دیکھا۔ خاصی عمر رسیدہ تھیں اگرچہ نک سک سے درست تھیں۔ میک اپ' ترشے ہوئے بال سلیقے سے بنے ہوئے' لباس بھی خاصا شوخ رنگوں کا تھا۔ زندہ دلی ہو تو ایسی ہو۔

"تم لوگ ٹورسٹ لگتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"پاکستان سے۔"

"اچھا اچھا' مجھے پتا ہے پاکستان کہاں ہے۔ صدر جانسن نے وہاں سے ایک اونٹ والے کو دعوت دے کر بلایا تھا۔ ہاؤ کیوٹ!" انہوں نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا۔

"آپ یہاں کب سے رہتی ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگیں "میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہیں رہتی ہوں۔ میرے ڈیڈی کینیڈا سے یہاں آئے تھے۔ میری شادی بھی یہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا" وہ گزرے ہوئے دنوں کے تصور میں کھو گئیں۔

"آپ کینیڈا واپس کیوں نہیں گئیں؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"بس۔ یہ جگہ پسند آگئی۔ کینیڈا میں تو بہت سردی پڑتی ہے۔ ڈیڈی بتاتے تھے کہ وہاں ہمارا گھر برف کے اندر دب جایا کرتا تھا اس لیے میامی کا موسم اور چمکتا ہوا سورج دیکھ کر یہیں کے ہو رہے۔ کیا تمہارے ملک میں بھی بہت سردی پڑتی ہے اور برف گرتی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں ہر قسم کا موسم پایا جاتا ہے' سرد' گرم' معتدل زیادہ تر دھوپ نکلی رہتی ہے۔"

"اف۔ وہ تو خوابوں کی سرزمین ہو گی مگر جب برف پڑتی ہے تو لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"گھروں کے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ یا پھر گرم موسم والے علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔"

"اوہ! کتنا رومانٹک لگتا ہو گا۔" وہ نوعمر لڑکیوں کی طرح خوش ہو کر بولیں۔

خان صاحب نے کہا "میڈم' ہمارے ملک میں ایک شہر ہے کوئٹہ۔ وہاں اتنی سخت سردی پڑتی ہے کہ جاڑے کے موسم میں پانی اور کھانا تو کیا آواز اور الفاظ تک جم جاتے ہیں" ہم نے اس گپ پر خان صاحب کو گھور کر دیکھا۔

"الفاظ بھی جم جاتے ہیں" وہ حیران ہو کر بولیں "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"پہلے مجھے بھی یقین نہیں آتا تھا مگر ایک بار جب میں سردی کے موسم میں کوئٹہ گیا تو میری کار کا پیٹرول تک جم گیا۔ بڑی مشکل سے آگ جلا کر میں نے اسے گرم کیا اور ہوٹل کے باہر کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیر تک کار کے ہارن بجائے' آوازیں دیں مگر نہ ہارن کی آواز آئی اور نہ ہی کوئی باہر نکلا۔ آخر میں نے کار سے باہر نکل کر کال بیل بجائی' پھر بھی کوئی آواز نہیں آئی۔ اتفاق سے ایک ویٹر نے مجھے دیکھ لیا اور کچن میں لے جا کر مجھے گرمی

پہنچائی۔ میں تو اتنا گھبرایا کہ دوسرے دن صبح سویرے ہی واپس چلا آیا۔ جب میں گرم علاقے میں پہنچا تو یکایک کار کے ہارن کی آوازیں آنے لگیں حالانکہ میں نے ہارن نہیں بجایا تھا۔"

بڑی بی ہکا بکا رہ گئی تھیں "تو پھر ہارن کی آواز کہاں سے آ رہی تھی؟"

"میری کار کے اندر سے۔ بات یہ تھی کہ کوئٹہ میں جب میں نے ہارن بجائے تھے تو اس کی آواز سردی سے جم گئی تھی، گرمی پا کر پگھل گئی۔"

ہم بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک رہے تھے مگر خان صاحب بالکل سنجیدہ تھے اور اپنے غلط سلط انگریزی میں گپیں ہانک رہے تھے۔

"میرے خدا۔ اتنی زیادہ سردی! اگر آواز بھی جم جاتی ہے تو پھر وہ لوگ آپس میں باتیں کیسے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی باتیں کیونکر سنتے ہیں؟"

"گرم کر کے" خان صاحب نے جواب دیا "منہ سے بولتے جاتے ہیں اور باتوں کو آگ سے گرم کرتے جاتے ہیں۔"

یہ ایک لطیفہ تھا جسے خان صاحب نے آپ بیتی بنا کر پیش کر دیا تھا۔

"میں تو قیامت تک کبھی کوئٹہ نہ جاؤں" بڑی بی سردی کے تصور ہی سے کانپنے لگیں۔

"آپ کے بچے کہاں رہتے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں رہتے۔ میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ میرے شوہر کو مرے ہوئے تیس سال گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد میں نے دوسری شادی نہیں کی۔"

یہ سن کر ہم سب بہت متاثر ہوئے اور عقیدت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگے۔ کون کہتا ہے کہ مغرب میں شوہر پرست عورتیں نہیں ہوتیں؟

ہم نے کہا "واقعی بڑی ہمت کی بات ہے۔ آپ نے اپنی ساری جوانی تنہا گزار دی اور شادی نہیں کی۔"

ہمیں ان کے چہرے کے اردگرد ایک نورانی ہالہ سا نظر آنے لگا۔ بٹ صاحب نے کہا "دیکھ لو، ایسی شوہر پرست نیک بی بیاں بھی ہیں یہاں۔"

"مگر شادی نہ کرنے کی وجہ کیا تھی؟" ہم نے پوچھا۔

"کہنے لگیں "وجہ..... وجہ پیٹر ہے۔"

"پیٹر! وہ کون ہے؟"

"میرا بوائے فرینڈ۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ شادی شدہ اور بچوں والا ہے اور اس کی بیوی اس سے طلاق لینے پر تیار نہیں ہوتی۔ تو پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی تھی؟"

ہم حیرت سے انہیں دیکھتے رہ گئے۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب۔ یہ کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے!

میامی میں ماڈلز دو قسم کے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جو ماڈل بننے کے جنون میں مبتلا ہوتے ہیں اور ہر قیمت پر ایک مناسب موقع حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ ان لڑکیوں اور لڑکوں کو چھوٹے موٹے کام مل بھی جاتے ہیں لیکن ہر ایک پر قسمت اتنی مہربان نہیں ہوتی۔ بے شمار اچھی شکل و صورت کی لڑکیاں ایک "چانس" کی آرزو میں ساری زندگی گزار دیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں ریستورانوں، دکانوں وغیرہ میں کام کر کے گزارا کرتی ہیں۔ کام حاصل کرنے کے لیے اپنے جسموں کی رشوت پیش کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتیں اور یہ وہ رشوت ہے جو انہیں اکثر و بیشتر پیش کرنی پڑتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گوہر مقصود پھر بھی ہاتھ نہیں آتا۔

دوسری قسم ان ماڈلز کی ہے جو کامیاب اور معروف ہیں۔ یہ بین الاقوامی شہرت رکھنے والی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں ان کی مانگ ہوتی ہے۔ آج پیرس میں ہیں تو کل نیویارک میں تصویریں بنوا رہی ہیں۔ کبھی لندن اور فرینکفرٹ میں نظر آتی ہیں تو کبھی روم اور جنیوا میں۔ یہ ماڈلز میامی میں اوشین ڈرائیو پر واقع پارک سینٹرل ہوٹل کی لابی میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ جس کسی پروڈیوسر یا فوٹو گرافر کو ضرورت ہوتی ہے وہ اسی جگہ جا کر ان سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ اور معاملات طے کر لیتا ہے۔ یہ معلومات ہمیں نورا نے فراہم کی تھیں اور جب سے خان صاحب نے یہ بات سنی تھی وہ اصرار کر رہے تھے کہ ہمیں ساؤتھ بیچ پر واقع پارک سینٹرل ہوٹل ضرور جانا چاہئے۔

"مگر ہم وہاں جا کر کیا کریں گے؟"

"کافی پی لیں گے۔ سنا ہے وہاں کافی بہت اچھی ہوتی ہے"

بٹ صاحب نے کہا "بہانے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہاں جا کر ماڈلز دیکھیں گے۔"

بولے "ماڈل تو ہم نے بہت دیکھ لیے ہیں مگر انٹرنیشنل ماڈلز دیکھنے کا بہت شوق ہے۔

ہم بھی واپس جاکر اپنے دوستوں کو بتائیں گے کہ ہم نے انٹرنیشنل ماڈلز دیکھے ہیں۔"

بٹ صاحب نے انہیں سمجھایا کہ ماڈل چاہے انٹرنیشنل ہو خواہ نیشنل ہو' سب ایک ہی جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لڑکیاں باقی لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت ہوتی ہیں۔ انداز و اطوار ان سب کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ساحل پر جو سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں جوتیاں چٹخاتی پھر رہی ہیں۔ ان سب میں سے بھی بعض ایک دن انٹرنیشنل ماڈل بن جائیں گی۔ فی الحال ان ہی پر گزارا کرو مگر خان صاحب کسی طرح نہیں مانے۔

"بھائی' وہاں تو صرف پروڈیوسر وغیرہ ہی جاتے ہیں" بٹ صاحب نے تنگ آکر کہا۔

"تو ہم بھی پروڈیوسر وغیرہ بن جائیں گے' کیا پروڈیوسر کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟"

ان کا مطلب تھا نقلی پروڈیوسر۔

"بڑے افسوس کی بات ہے" بٹ صاحب نے غصے میں آکر کہا "اب تم جعلسازی کرو گے! لوگ کیا سوچیں گے؟"

"یار' تم لوگوں کی اتنی فکر مت کیا کرو۔ جو چاہیں سوچتے رہیں۔"

"آپ ملک کا نام بدنام کریں گے؟"

"بٹ صاحب۔ اس سے زیادہ بے وقوفی کی باتیں کرنا آپ کی صحت کے لیے مضر ہوگا اس لیے خاموش رہنا بہتر ہے۔ بندہ خدا ہمارے ملک کا نام ہماری پیشانی پر تو نہیں لکھا ہوا' نہ ہی ہمارے سینے پر لیبل لگا ہوا ہے کہ خبردار' ہوشیار' ہم پاکستانی ہیں۔ جب انہیں پتا ہی نہیں چلے گا کہ ہم کون ہیں' کہاں سے آئے ہیں تو پھر ملک کی بدنامی کیسے ہوگی؟"

بٹ صاحب لاجواب سے ہو گئے' مضمحل آواز میں بولے "مگر ضمیر بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"ہم کسی کو دھوکا تو نہیں دے رہے' کوئی فراڈ نہیں کر رہے۔ یہ ضمیر صاحب بیچ میں کہاں سے آ گئے؟"

اس طرح بٹ صاحب کو راضی کرنے کے بعد ہم تینوں نے پارک سینٹرل ہوٹل کا رخ کیا۔ پہلے سوچا کہ بس سے چلیں مگر خان صاحب ٹیکسی کے حق میں تھے۔ بولے "اگر کسی ماڈل نے ہمیں بس سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ کبھی پروڈیوسر بھی بس میں بیٹھتے ہیں۔"

بٹ صاحب نے کہا "ہمارے ملک کے پروڈیوسر تو بس میں' رکشا میں' تانگے میں ہر سواری پر سفر کر لیتے ہیں بلکہ بہت سے تو پیدل بھی چلتے ہیں۔"

"اپنے ملک کے پروڈیوسروں کو چھوڑو۔ اس وقت ہم امریکا میں ہیں بلکہ میامی بیچ پر ہیں۔"

چنانچہ سامنے سے گزرتی ہوئی ایک سرخ رنگ کی لمبی سی ٹیکسی کو اشارہ کر کے روک لیا گیا "ہائی گائیز" ٹیکسی کے اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایک خاتون اندر براجمان تھیں۔ یہی اس کی ڈرائیور تھیں۔ لباس بھی خاصا معقول پہن رکھا تھا حالانکہ ہم نے اسی جگہ خاتون ٹیکسی ڈرائیوروں کو محض جانگیہ اور جمپر پہن کر ٹیکسی چلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ صورت شکل بھی واجبی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے چیونگم چبا رہی تھیں بلکہ چبانے سے زیادہ کھا رہی تھیں۔ لیکن بعد میں خان صاحب نے یہ تصحیح فرمائی کہ وہ چیونگم کی جگالی کر رہی تھیں۔ جگالی تو آپ سمجھتے ہوں گے یعنی جب کھانے کی کوئی چیز منہ میں رکھ کر جانور بہت زور و شور سے چبانے کی ایکٹنگ کرتے ہیں تو اسے "جگالی" کرنا کہتے ہیں۔

جگالی جانور کیوں کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے یا دوسرے جانوروں کو حسد میں مبتلا کرنے کے لیے؟ آج تک اس بات کا پتا نہیں چلا مگر اتنا ضرور ہوا کہ جانوروں کی دیکھا دیکھی اب انسانوں نے چیونگم ایجاد کر لیا ہے۔ اس کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ منہ چلتا رہتا ہے لیکن "کھایا پیا کچھ نہیں" والا حساب ہوتا ہے اور بعض لوگ تو اس قدر تندہی اور زور و شور سے چیونگم چباتے ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اتنی ہی مشقت انہوں نے اپنی غذا چبانے پر کی ہوتی تو ان کی صحت پر کتنا اچھا اثر پڑتا۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ خان صاحب نے اگلی سیٹ پر قبضہ جمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹیکسی کا بل وہی ادا کریں گے۔ یہ ہماری مشرقی روایات ہیں جن کا مغرب میں وجود ہی نہیں ہے۔

ٹیکسی میں سوار ہونے کے بعد بھی جب خان صاحب نے منزل کا نشان نہیں دیا تو ٹیکسی ڈرائیور نے چیونگم اپنے رخسار کے ایک گوشے میں سمیٹا اور پوچھا "کیا یہ ہولڈ اپ ہے؟" مطلب یہ کہ کیا مجھے لوٹنے کا ارادہ ہے۔

خان صاحب پریشان ہو گئے "جی نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"تو پھر بولتے کیوں نہیں کہ کہاں جانا ہے؟"

بات دراصل یہ تھی کہ خان صاحب اوشین ڈرائیو اور پارک سینٹرل ہوٹل بھول گئے تھے۔ ہم نے فوراً ان کی مدد کی "ہمیں پارک سینٹرل ہوٹل جانا ہے۔"

"اوکے" انہوں نے دوبارہ چیونگم چبانا شروع کر دیا اور ٹیکسی کا رخ ساؤتھ بیچ کی جانب کر دیا۔

☆ ☆ ☆

کمرشل ایریا سے نکل کر ہم ایک ایسی خوب صورت سڑک پر پہنچ گئے جس کی ایک جانب سمندر تھا اور دوسری جانب خوبصورت بلند و بالا عمارتیں۔ اس قسم کی سڑکوں کو عام طور پر "میرین ڈرائیو" کہا جاتا ہے یعنی سمندر کے کنارے سے ہوا خوری۔

یہاں اکثر عمارتیں سفید یا ہلکے رنگوں کی ہوتی ہیں اس لیے دھوپ میں چمکتی ہوئی بہت خوب صورت لگتی ہیں۔ سمندر کی جانب سمندر اور سڑک کو علیحدہ کرنے کے لیے ایک کشادہ فٹ پاتھ بنا ہوا تھا جس پر جا بجا خوب صورت درخت لگے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاں تو فٹ پاتھ عام طور پر تجاوزات کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں مگر مغربی ملکوں میں یہاں بچے اسکیٹنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ یہاں انہیں کسی قسم کی رکاوٹ یا حادثات کا خطرہ نہیں ہوتا۔

کچھ دیر ٹیکسی میں خاموشی رہی پھر خاتون ڈرائیور نے دریافت کیا "آپ لوگ ماڈل ہیں"

"نہیں" خان صاحب نے فوراً جواب دیا۔

"پروڈیوسر ہیں؟"

"ایک طرح سے کہہ سکتے ہیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک لمبی سی سانس لی اور کہا "پتا نہیں وہ کون ہیں جن پر تقدیر مہربان ہو جاتی ہے!"

ہم سب خاموش رہے۔

اس نے پھر کہا "یہاں تو جو آتا ہے بس ماڈل یا آرٹسٹ ہی بننے کے لیے آتا ہے میری طرف دیکھیے، میں بھی آٹھ سال پہلے اسی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ سوچا تھا کہ گریس کیلی بن جاؤں گی اور بن گئی، ٹیکسی ڈرائیور۔"

اب ہم نے اسے غور سے دیکھنا لازم جانا۔ اچھی خاصی لڑکی تھی مگر ایسی حسین بھی نہیں کہ اداکارہ بنا دی جائے۔ نہ جانے وہ کس غلط فہمی کا شکار تھی۔ وہ ہمارے خیالات بھانپ گئی۔ بولی ''اوکے۔ میں زیادہ خوب صورت نہیں ہوں۔ سیکسی نہیں ہوں' بم شیل نہیں ہوں' تو پھر کیا ہوا؟ جسم ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ ٹیلنٹ بھی کوئی چیز ہے۔ اداکاری کو بھی اہمیت دینی چاہیے۔''

ہم نے کہا ''مگر سب سے پہلے تو صورت شکل ہی دیکھی جاتی ہے۔''

''یہی تو رونا ہے۔ ٹیلنٹ کا تو اس وقت پتا چلے جب چانس ملے۔ خیر' کوئی پروا نہیں۔ کبھی تو مجھے چانس ملے گا۔ آخر فلموں میں دادی اور نانی کے کردار بھی تو ہوتے ہیں'' وہ آپ ہی آپ ہنس پڑی۔

بٹ صاحب سے نہ رہا گیا' کہنی مار کر بولے ''اس کا نام تو پوچھ لیں۔''

''آپ خود پوچھ لیں۔ آپ کے منہ میں بھی زبان ہے۔''

وہ ہمیں گھور کر رہ گئے مگر جب پارک سینٹرل ہوٹل کے سامنے ہی ٹیکسی سے باہر نکلے تو بٹ صاحب نہ رہ سکے ''سنو میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

وہ پیسے گنتے گنتے رک گئی۔ ایک امید بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی ''کیا مجھے چانس مل جائے گا؟''

بٹ صاحب گھبرا سے گئے۔ خان صاحب نے کہا ''اور پوچھو نام۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر لڑکی سے نام نہ پوچھا کرو۔ کسی دن مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔''

لڑکی سمجھی کہ شاید اس کے بارے میں تبادلہ خیالات ہو رہا ہے اور پروڈیوسر اسے چانس دینے کے متعلق سوچ رہا ہے۔ وہ سراپا نیاز بن گئی۔ فوراً ٹیکسی کے اگلے حصے میں سے ایک کارڈ نکالا اور خان صاحب کو پیش کر دیا ''یہ میرا پتا ہے سر۔ میں رات کے وقت کمرے پر ہی ہوتی ہوں۔ میری عدم موجودگی میں میرے لیے پیغام چھوڑا جا سکتا ہے۔ میں ہر طرح سے تعاون کروں گی' ٹرائی ضرور کریں' اوکے؟''

''اوکے'' خان صاحب نے کارڈ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ وہ بڑے خلوص اور گرم جوشی سے ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ جہاں تک اس کی ٹیکسی نظر آتی رہی وہاں تک اس کا کھڑکی سے باہر نکلا ہوا بازو بھی حرکت کرتا ہوا نظر آتا رہا۔

''دیکھا۔ یہ فائدے ہوتے ہیں پروڈیوسر بننے کے'' بٹ صاحب نے کہا ''میں تو سوچتا ہوں کہ اگلے جنم میں فلم پروڈیوسر ہی بن جاؤں۔''

''اس جنم میں کیوں نہیں؟''

''دونوں جنموں کو خراب کرنے کا کیا فائدہ۔ ایک میں ثواب' دوسرے میں عذاب۔''

پارک سینٹرل' ساحل پر ایک پرشکوہ اور خوب صورت ہوٹل تھا۔ اس کی لابی بہت لمبی چوڑی اور خوشنما تھی۔ لابی میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ ٹھیک ہی سنا تھا کہ یہاں چوبیس گھنٹے ایسی رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ ایک طرف استقبالیہ تھا جو کافی طویل تھا۔ دوسری جانب گول' بیضوی اور لمبے لمبے صوفے آراستہ تھے۔ اتنے آرام دہ کہ بیٹھتے ہی ایک فٹ اندر دھنس جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے کار کے پہیے یا کسی غبارے میں سے ہوا خارج ہو رہی ہے۔ آواز کا معما ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ لابی میں جگہ جگہ سرسبز اور خوشنما پودے بھی گملوں میں رکھے ہوئے تھے۔ بٹ صاحب نے چند پودوں کو چھو کر بھی دیکھ لیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' خان صاحب نے ڈانٹا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ اصلی ہیں یا نقلی۔''

''کس قدر بچکانہ حرکت ہے۔ بلکہ کوئی سمجھدار اور تمیزدار بچہ بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ آپ کو اصلی یا نقلی کا فرق معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہاں مالی کا کام کرنے کا ارادہ ہے؟''

لابی کے دونوں جانب بلند و بالا دروازے تھے جو ڈائننگ ہال یا بال روم کو جانے کے راستے تھے۔ نچلی منزل پر کاسینو بھی تھا۔ لابی کے ایک گوشے میں بار کاؤنٹر تھا۔ یہ نیم دائرے کی شکل میں تھا اور اتنا بڑا تھا کہ اس کے اندر ساقی گری کے فرائض سرانجام دینے کے لیے چار ساقی موجود تھے۔ ان میں سے ایک ساقی تھا اور باقی تین ساقین۔ بار مین اور بار گرلز مغربی تہذیب کا ایک لازمی حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہ کام آرٹ کے زمرے میں شامل ہے۔ بار والے کا محض یہی کام نہیں ہے کہ شراب کی بوتل اٹھائی اور ایک گلاس میں انڈیل دی۔ ناپ' تول بھی ایک اہم چیز ہے۔ پھر یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی شراب کس جام میں ڈال کر پیش کی جائے اور کس طرح انڈیلی جائے یہ بھی ایک طرح کا ٹیکنیکل کام ہے۔ اور

یہ ساقی کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ سائفن کے ذریعے جب شراب میں پانی یا سوڈا آمیزش کیا جاتا ہے تو اس کا بھی ایک دلکش انداز ہونا چاہیے۔ شرابوں کی قسمیں' ان کا استعمال کن مواقع پر اور کتنی مقدار میں کیا جاتا ہے؟ یہ تمام معلومات' بارگرل یا بارمین کے لیے ضروری بھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پابندی سے آنے والے ہر شخص کے مزاج اور پسند کا بھی خیال رکھے۔ کسی شخص کو کس وقت مزید شراب دینے سے پرہیز کرنا چاہیے اور اگر وہ بہک جائے تو اسے کس طرح بہلانا چاہیے کہ بدمزگی بھی نہ ہو اور وہ بہل بھی جائے یہ بھی ساقی کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔ ساقی کا حاضر جواب اور شگفتہ مزاج ہونا بھی ایک شرط ہے وغیرہ وغیرہ۔

نہ جانے کیوں' بار کاؤنٹر ہمیشہ ہماری کمزوری رہا ہے۔ بار کے پیچھے رنگ برنگی بوتلوں اور گلاسوں کی آرائش اور بار کے سامنے رنگین اور آرام دہ اسٹول دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اسٹول پر بیٹھیں اور وہاں سے بیٹھ کر دنیا کا نظارہ کریں مگر اس شوق کو پورا کرنے کی راہ میں ایک رکاوٹ یہ ہے کہ بار کاؤنٹر پر بیٹھنے کے لیے شراب سے شغل کرنا ضروری ہے۔ وہاں بیٹھ کر جوس یا کوک وغیرہ پینا آداب محفل کے خلاف ہی نہیں بدذوقی کی علامت بھی ہے اس لیے ہمیں بار کاؤنٹر کے سامنے والے اسٹول پر بیٹھ کر اسٹول پر گھومنے کا بہت کم موقع ملا ہے اس وقت بھی صورت حال کچھ اسی قسم کی تھی۔

ہمارے قدم بار کاؤنٹر کی جانب اٹھ رہے تھے اور خان صاحب اس گوشے کی طرف جانے کے خواہش مند تھے جہاں ماڈلز کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ فیصلہ بالآخر خان صاحب کے حق میں ہوا کیونکہ بٹ صاحب کا ووٹ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اگر اس طرف درجنوں خوب صورت چہروں کا ہجوم نہ ہوتا تو بٹ صاحب بھی بار کاؤنٹر کی فیور میں ووٹ دیتے لیکن تین اور تیرہ کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم "تیرہ" کی جانب چل پڑے۔ صوفوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے کسی ایک نے بھی ہمیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس میں ہمارے رنگ' نسل یا قومیت کا کوئی دخل نہ تھا۔ وہاں تو بازار اور خریدار والا معاملہ تھا یعنی ایک انار اور سو بیمار۔ انٹرنیشنل ماڈلز کی تعداد ضرورت مند پروڈیوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے اس لیے وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرنے میں حق بجانب تھیں۔ ادھر ہم لوگوں کا یہ معاملہ تھا کہ بقول غالب ؎

بازار میں نکلا ہوں' خریدار نہیں ہوں

ہم نے ایک ایسے صوفے پر قبضہ جمایا جو نیم گولائی میں تھا۔ اس طرح نہ صرف ہم تینوں بیک وقت اس میں سما گئے بلکہ یہ بھی آسانی تھی کہ ہم گردن گھمائے بغیر نہ صرف ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے بلکہ آس پاس کی چیزوں کا نظارہ بھی کر سکتے تھے۔ ایکٹریسوں کی بات اور ہے مگر جہاں تک ماڈلز کا تعلق ہے ان کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو ہمیں ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی۔ لمبے لمبے قد' سوکھے سوکھے جسم' ہنسلی اور پسلی کی ہڈیاں نکلی ہوئی' رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ گالوں میں گڑھے' لمبی لمبی پتلی پتلی گردنیں۔ عام طور پر ماڈلز کا ایسا ہی حلیہ ہوتا ہے اور ہمیں بتایا گیا تھا کہ ماڈل جتنی زیادہ سوکھی ہوئی ہوگی اس کی قدرو منزلت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ بہرحال اپنے اپنے ذوق اور معیار کی بات ہے لیکن بین الاقوامی ماڈلنگ کے میدان میں عموماً ایسی ہی خواتین سر آنکھوں پر بٹھائی جاتی ہیں جن کا نقشہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ ہم اس گوشے میں آکر بہت پچھتائے۔ اس لیے بھی کہ بار کاؤنٹر پر جو شگفتہ دہن اور شاداب بدن خواتین ساقی گری کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں وہ ان سے کہیں زیادہ جاذب نظر تھیں۔ خان صاحب اور بٹ صاحب کی رائے بھی ہم سے مختلف نہ تھی مگر اب جب کہ وہاں جا کر بیٹھ ہی گئے تھے تو فوری طور پر وہاں سے اٹھ جانا کچھ معیوب سا لگا۔

وقت گزاری کے لیے سوچا کہ ان دونوں حضرات سے ان کے حالیہ دورہ ہالی ووڈ کے بارے میں پوچھا جائے۔

ہم نے پوچھا "ہالی ووڈ آپ دونوں کو کیسا لگا؟"

"لاحول ولا قوۃ" یہ بٹ صاحب کا تبصرہ تھا۔ "خان صاحب نے اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے کچھ توقف فرمایا پھر بولے۔

"سچی بات بتائیں آپ کو؟"

"ہاں' بتائیے۔"

"ہمیں تو ہالی ووڈ کہیں نظر نہیں آیا۔"

"کیا مطلب!"

"مطلب یہ کہ بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔ ہمارے بھی کان پک گئے تھے ہالی

ووڈ کا نام سنتے اور پڑھتے ہوئے۔ بہت شوق سے وہاں گئے تھے۔ بس جی' دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ بندہ ہالی ووڈ کی کوئی فلم دیکھ لے۔"

"مگر بات کیا ہوئی؟"

"ہونا کیا تھا۔ بہت امیدیں لے کر گئے تھے۔ سوچا تھا پرستان ہو گا۔ کوہ قاف جیسا منظر ہو گا۔ ہر طرف پریوں کا میلہ لگا ہو گا۔ بڑے بڑے ایکٹروں اور ایکریسوں سے مُڈھ بھیڑ ہو گی۔ کسی دکان میں جائیں گے تو بڑے بڑے' ہالی ووڈ کے ہیرو سگریٹ خریدتے ہوئے نظر آئیں گے۔ آئس کریم کی دکان پر مشہور ہیروئنیں کون کھاتی ہوئی ملیں گی۔ ہوٹلوں میں سامنے والی میز پر کبھی مارلن برانڈو مل جائے گا تو کبھی چارلٹن ہسٹن لمبے لمبے دانت نکال کر "ہیلو ہیلو" کہے گا۔ فٹ پاتھ پر نکلیں گے تو برابر سے کوئی مشہور آرٹسٹ شانے سے شانہ ٹکرا کر نکل جائے گا اور ٹکر مارنے پر "سوری" کہے گا۔ سڑکوں پر پولیس کی کاریں سائرن بجاتی ہوئی اور گولیاں چلاتی ہوئی بدمعاشوں کی کاروں کے پیچھے دوڑ رہی ہوں گی مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ پریاں' نہ گلفام۔' نہ دیو' نہ جنات۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہر امریکی شہر میں ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ رونق تو یہاں نظر آ رہی ہے۔"

انہوں نے اپنے آس پاس نظریں دوڑانی شروع کر دیں۔

ہم نے بٹ صاحب سے پوچھا "بٹ صاحب آپ کیوں لاحول پڑھ رہے تھے' کیا عریانی بہت زیادہ تھی وہاں؟"

"ارے بھائی عریانی کہاں نہیں ہے۔ ان انگریزوں نے تو اپنے شہروں کو بھی "ننگے کلب" بنا دیا ہے۔ جاپانی سب کے سب ننگے ہو کر ایک حوض میں نہاتے ضرور ہیں مگر گھر کے باہر تو ڈھنگ کے کپڑے پہن کر نکلتے ہیں۔ ان انگریزوں نے تو شرم اور حیا سب بیچ کھائی ہے۔"

ہم نے کہا "ویسے یہ انگریز نہیں امریکی ہیں لیکن ٹھیک کہا آپ نے۔ اب یہ عریانی اور بے شرمی بھی ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔"

خان صاحب بولے "ہم تو سمجھے تھے کہ ہالی ووڈ ایکٹروں کی کوئی کالونی ہو گی۔ سب ہیرو اور ہیروئن وہاں اکٹھے رہتے ہوں گے مگر وہاں تو کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں ہے۔ بس نرا پروپیگنڈا ہی ہے "وہ سخت بے زار نظر آ رہے تھے۔

ہم نے کہا "خان صاحب۔ آپ دونوں مائنڈ نہ کریں تو ایک بات عرض کریں؟"

"کیوں نہیں!"

"معاف کرنا۔ ہم آپ کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتے تھے۔"

"کتنا؟"

"جتنا کہ آپ ظاہر ہو گئے ہیں۔ کسی اور کے سامنے یہ باتیں نہ کر دینا ورنہ مذاق بن جائے گا آپ کا۔"

"وہ کس لیے؟"

"ارے بھائی۔ ہالی ووڈ کسی بلڈنگ' شاپنگ سینٹر یا پارک کا نام تو نہیں ہے۔ نہ ہی لاس اینجلس کا کوئی محلہ ہے۔ وہ تو شہر کا ایک حصہ ہے جہاں فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ لاس اینجلس کا ایک حصہ ہالی ووڈ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ فلم انڈسٹری والوں نے وہاں بڑے بڑے اسٹوڈیو بنا لیے۔ اسٹوڈیو تو آپ نے دیکھے ہوں گے؟"

"اسٹوڈیو میں کون گھسنے دیتا ہے۔ بس باہر سے گیٹ کو دیکھ لیا۔"

ہم نے کہا "اندر کوئی کیوں گھسنے دے گا۔ اسٹوڈیو کوئی تفریح گاہ تو ہے نہیں کاروبار کی جگہ ہے۔"

وہ کچھ لاجواب سے ہو گئے۔

"رہی اداکاروں کے گھومنے پھرنے کی بات تو وہ کوئی چڑیا گھر کے جانور تو ہیں نہیں کہ آپ جیسے لوگوں کو تماشا دکھانے کے لیے ہر وقت اور ہر جگہ گھومتے پھریں۔ آپ کا کیا خیال تھا کہ ہوٹل کے لاؤنج میں آپ کی صوفیا لارین سے ملاقات ہو جائے گی اور بس اسٹینڈ پر الزبتھ ٹیلر آپ کو کھڑی ہوئی ہاتھ ہلاتی نظر آ جائے گی۔ چائے پینے جائیں گے تو کلنٹ ایسٹ ووڈ مل جائے گا اور آپ کا بل ادا کر دے گا۔ آپ نے ایسی شیخ چلی جیسی باتیں سوچی ہی کیوں تھیں؟"

"یار ہم تو ایکٹروں کو دیکھنے کے چکر میں وہاں گئے تھے"

"آپ یہ بتائیں کہ آپ لاہور میں رہتے ہیں جہاں اتنے بہت سے ایکٹر اور ایکٹریسیں رہتی ہیں۔ وہاں آپ کی ہر روز سڑک پر کتنے فن کاروں سے ملاقات ہوتی ہے؟"

"کچھ نہیں یار۔ نرا فراڈ ہے" بٹ صاحب نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔

ہم نے کہا۔ ”آپ وہاں سن سیٹ بولیورڈ پر گئے تھے؟؟“

”نہیں۔“

”سلور گرل ریستوران کا پھیرا لگایا تھا؟“

”نہیں تو۔“

”بندہ خدا۔ اپنے ہوٹل میں کسی سے پوچھ لیا ہوتا کہ ایکٹر وغیرہ کون سے ہوٹل یا ریستوران میں جاتے ہیں‘ وہاں چلے جاتے۔“

”وہاں وہ نظر آجاتے؟“

”نظر کیوں نہ آتے‘ وہ کوئی پردہ تو نہیں کرتے ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ ہالی ووڈ کی ایکٹریسیں بھی بے پردہ پھرتی ہیں۔“

دراز قد‘ تنومند‘ سرخ و سفید رنگت اور زرد بالوں والے ایک صاحب ہمارے سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ وہ سفید پتلون‘ بڑے بڑے پھولوں والی ریشمی بش شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک لمبا سا سگار ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا جسے پینے سے زیادہ وہ چبا رہے تھے۔

”ہائی“ ہماری نظریں ملیں تو انہوں نے سگار منہ سے نکال کر نعرہ مارا ”ٹورسٹ؟“

ہم نے سرہلا کر تائید کر دی۔ وہ اٹھ کر ہمارے برابر والے صوفے پر آگئے۔ ”شکر ہے کوئی سادہ آدمی بھی ملا۔“

”سادہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”مطلب یہ کہ ایسا آدمی جو نہ ماڈل ہے۔ نہ اداکار‘ نہ شوبزنس سے اس کا تعلق ہے اور نہ ہی وہ شوبزنس سے کوئی تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایسے نیچرل آدمی یہاں بہت مشکل سے نظر آتے ہیں میرے دوست۔“

”کیا آپ بھی ٹورسٹ ہیں؟“

وہ ہنسنے لگے ”میں دیکھنے میں آپ کو ٹورسٹ نظر آتا ہوں؟ مجھے تو کسی بزرگ نے بد دعا دی تھی جو شو بزنس کے چکر میں پڑ گیا۔ میرا نام جوناتھن ہے۔ لندن میں میری ایک ماڈل ایجنسی ہے۔ اب میں نے ساؤتھ بیچ پر بھی آفس بنا لیا ہے۔“

”آپ کا کام تو بہت دلچسپ ہے“ خان صاحب نے کہا۔

”دوسروں کو ایسا ہی نظر آتا ہے مگر کسی مصیبت سے کم نہیں ہے۔ شو بزنس میں نارمل لوگ نہیں ہوتے۔ ان کے کام سب سے نرالے ہوتے ہیں مگر یہاں میامی میں تو یوں لگتا ہے جیسے سب پاگل ہو گئے ہوں۔ اوگاڈ!“ انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور بدے گھمانے لگے ”دن رات میں ہر وقت نئے نئے یونٹ کام کرنے کے لیے یہاں آتے رہتے ہیں۔ ہر ایک جلدی میں نظر آتا ہے۔ رات کے بارہ بجے ماڈلز اور اداکاروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ رات کو تین بجے فون آجائے گا کہ اس قسم کے ماڈل کی ضرورت ہے پھر معاوضوں کی بات چیت چلتی ہے۔ ہم لوگ مختلف ماڈلز سے آدھی رات کو رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ماڈلز کے لیے لباس‘ میک اپ اور ہیئر اسٹائل کے بارے میں ہدایات لیتے ہیں اور انہیں سورج نکلنے سے پہلے تیار کرا دیتے ہیں۔ صبح سات بجے ساحل پر فوٹوگرافی شروع ہو جاتی ہے۔ فیشن میگزین‘ پوسٹرز اور ایڈز والے تو ایک ہی دن میں اپنا کام ختم کرنا چاہتے ہیں۔ صبح سات بجے ساحل پر آکر دیکھیں تو ایک ہی وقت میں پچاس پچاس یونٹ کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب فون آجائے گا۔ سچ ہے‘ موت اور گاہک کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔“

”مگر کیا اتنے بہت سے لوگوں کے لیے یہاں ساز و سامان اور سہولتیں موجود ہیں؟“

”اکثر لوگ تو اپنا سامان ساتھ ہی لاتے ہیں ورنہ نیویارک یہاں سے کتنی دور ہے۔ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کی دیر ہے۔ آنکھ جھپک اور نیویارک پہنچ گئے۔ ایک ٹیلی فون گھماؤ اور نیویارک سے جو چاہے منگوا لو‘ بہت آسانیاں ہیں یہاں۔“

ہم نے کہا ”آخر امریکی فلم ساز ہالی ووڈ کے خلاف کیوں ہو گئے ہیں۔ سب لوگ نئے نئے فلمی مرکز تلاش کر رہے ہیں‘ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

وہ ہنس پڑے‘ بولے ”دراصل دنیا اب پھیل رہی ہے۔ وہ زمانہ نہیں رہا کہ کسی ایک کام کے لیے کوئی خاص جگہ ہی مناسب سمجھی جائے۔ ویسے بھی جب سے ٹیلی ویژن مقبول ہوا ہے‘ فلم اسٹوڈیوز کی رونق کم ہو گئی ہے۔ ہالی ووڈ کے بڑے بڑے فلمی نگار خانوں میں ٹیلی ویژن کی فلمیں بنائی جا رہی ہیں اور یہ کام خود اسٹوڈیو کے مالک ہی کر رہے ہیں۔ کوئی بڑا فلم ساز ادارہ ایسا نہیں ہے جو ٹیلی ویژن کے لیے فلمیں نہ بناتا ہو پہلے گنتی کے چند اداکاروں کی‘ فلم انڈسٹری پر اجارہ داری تھی مگر اب بہت سے اور لوگ بھی اس میدان میں

آگئے ہیں اور انہیں ایسی کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ کہ ہالی ووڈ ہی میں فلمیں بنائیں۔ یہ سب فری لانس فلم پروڈیوسرز ہیں۔"

اچانک ٹک ٹک کی آواز سنائی دی اور خان صاحب کی گردن ایک دم آواز کی جانب گھوم گئی۔ ایک پختہ عمر' پختہ بدن خاتون نہایت اسمارٹ اور دیدہ زیب لباس پہنے ہوئے تیزی سے تشریف لا رہی تھیں۔ ان کا رخ ہماری ہی جانب تھا۔ یہ آواز ان کی اونچی ایڑی کے جوتے کے سبب پیدا ہو رہی تھی۔ جب وہ نزدیک آئیں تو خیال ہوا کہ انہیں اونچی ایڑی کی جوتی پہننے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اللہ نے انہیں خاصا دراز قد عطا فرمایا تھا مگر خان صاحب کے بقول بعض لوگوں کو ہر چیز کا ہوکا ہوتا ہے۔ اب جیسے انہیں قد بڑھانے کا ہوکا تھا۔ ان کا اپنا قد ساڑھے پانچ فٹ کے قریب ہو گا جو ان کے جسم کی مناسبت سے بالکل مناسب تھا مگر وہ مطمئن نہیں تھیں۔ اس میں مزید اضافہ کرنے کی خواہش مند تھیں۔ لالچ کسی چیز کا بھی ہو' بری بلا ہے۔

اتنی دیر میں وہ ہمارے صوفے کے پاس پہنچ کر رک گئیں۔ خان صاحب کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ شاید وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ ان ہی کی تلاش میں یہاں تک آن پہنچی ہیں لیکن جب انہوں نے ہمارے برابر بیٹھے ہوئے ایجنٹ کو مخاطب کیا تو خان صاحب کی ساری خوشی خاک میں مل کر رہ گئی۔ ان کے ہاتھ میں دو تین رنگین فائلیں تھیں۔ انہوں نے ایک فائل کھولی اور ہمارے ہم نشین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جان۔ ہمیں پانچ نئے آرڈر موصول ہوئے ہیں۔ صبح چھ بجے تک دو مرد اور بارہ خواتین ماڈلز درکار ہیں۔ میں نے ان ماڈلز سے رابطہ کر لیا ہے" یہ کہہ کر انہوں نے فائل جان کی طرف بڑھا دی۔

جان نے ایک نگاہ فائل پر ڈالی اور کہا "او کے۔ بارہ بجے کے بعد دوبارہ کنفرم کر دینا۔"

اب انہوں نے دوسری فائل ان کی جانب بڑھائی "انہیں دستاویزی فلم کی شوٹنگ کے لیے دو پیراک لڑکیوں کی ضرورت ہے جو انڈر واٹر مناظر میں حصہ لے سکیں مگر ان کا بجٹ زیادہ نہیں ہے۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر میں نے لیڈیا سے تو بات کر لی ہے۔ اسے ان دنوں بریک کی ضرورت ہے۔ یہ

کمپنی بہت اچھی ہے۔ ان کے پاس عام طور پر کام نکلتا رہتا ہے۔ میں نے اسے یہی بات سمجھائی تو وہ رضا مند ہو گئی۔ انہیں کل دوپہر تک ان لڑکیوں کی ضرورت ہے مگر اس بجٹ میں کوئی دوسری لڑکی دستیاب نہیں ہو رہی مگر میں چاہتی ہوں کہ ایک ایک اچھا ادارہ ہمارے ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔"

جان نے سگار کو دو تین بار چبایا اور پھر منہ سے باہر نکال کر اس کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہ شاید ان صاحب کا سوچنے کا انداز تھا۔

"تو پھر کیا مشورہ ہے؟ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

جان نے سگار کی راکھ انگلی ہلا کر جھاڑی' مسکرا کر خاتون کی طرف دیکھا اور پھر کہا "اس کی تو ایک ہی ترکیب ہے۔"

"وہ کیا؟"

"دوسری ماڈل کی جگہ تم چلی جاؤ۔"

"اوہ نو۔"

"کیوں نہیں۔ آخر تم بھی اچھی پیراک ہو۔ مقابلوں میں انعام حاصل کرتی رہی ہو۔"

"وہ تو پرانی باتیں ہو چکی ہیں جب میں لڑکی تھی۔"

"تم آج بھی لڑکی ہو۔ اسمارٹ' خوب صورت' دلکش۔ آج کی لڑکیاں تمہارے فیگر کو دیکھ کر رشک کرتی ہوں گی اور پھر میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے پرانے مداحوں کو کبھی کبھی اپنی جھلک بھی دکھا دینی چاہیے۔"

جان کے دلائل نے خاتون کو لاجواب کر دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک دلکش اور متناسب جسم کی مالک تھی۔ چہرہ بھی خوب صورت تھا۔ اس نے ذرا پس و پیش کرتے ہوئے جان کی طرف دیکھا' جان ایک آنکھ دبا کر مسکرایا اور بولا۔

"فکر نہ کرو' کر ہی ڈالو یہ کام۔"

اس نے دونوں شانے ہلائے "او کے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ یو آر دی بوس۔"

"گڈ گرل۔" جان نے سگار دوبارہ منہ میں رکھ لیا۔ خاتون جس رفتار سے آئی تھیں' اسی رفتار سے "ٹک ٹک" کرتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

بٹ صاحب نے ہم سے سرگوشی میں کہا "بس یہ زیادتی ہے تمہاری!"

ہم نے پوچھا "کیا؟"

"اس کا نام تک نہیں پوچھا۔"

خان صاحب تنک کر بولے "یار کیا بیماری ہے تمہیں۔ اپنا نفسیاتی علاج کیوں نہیں کراتے؟"

"مگر نام پوچھنے میں حرج ہی کیا ہے؟" بٹ صاحب نے کہا "معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے"

خان صاحب اور زیادہ برہم ہو گئے "مگر ان معلومات کا تم کیا کرو گے؟ کیا لڑکیوں کی انسائیکلو پیڈیا چھاپنی ہے؟" اتنی دیر سے یہ آدمی ہمارے پاس بیٹھا ہوا سگار کھا رہا ہے۔ اس کا نام تو پوچھا نہیں تم نے۔ وہ لڑکی ایک منٹ کے لیے آئی اور تمہیں معلومات میں اضافہ کرنے کی فکر پڑ گئی کچھ خدا کا خوف کرو۔"

جان ان دونوں کی نوک جھونک دیکھ رہا تھا۔ الفاظ تو نہیں سمجھ سکتا تھا مگر اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی مسئلے پر کٹا چھنی ہو رہی ہے۔

ایک ویٹر کی آمد نے ہم سب کی توجہ اس کی جانب مبذول کر دی۔ وہ ایک ٹرالی میں ٹیلی فون لے کر آیا تھا۔ اس نے فون جان کی طرف بڑھایا۔ "سر۔ آپ کی لانگ ڈسٹینس کال ہے۔ نیویارک سے۔"

جان نے ریسیور سنبھال کر اونچی آواز میں باتیں شروع کر دیں جن میں سے بیشتر ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔ آخر میں "اوکے اوکے" پر تان ٹوٹی۔ اس نے ریسیور ٹرالی پر رکھا اور جیب سے دو ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر ریسیور کے پاس رکھ دیا۔ ویٹر نے مودبانہ انداز میں شکریہ ادا کیا اور ٹرالی سمیت رخصت ہو گیا۔

جان نے سگار کو دو تین بار چبایا۔ پھر شانے اچکائے اور آسمان کی طرف دیکھ کر آنکھیں گھمائیں۔

ہم نے جھجکتے ہوئے پوچھا "ایکسکیوزمی۔ کیا کوئی پریشان کن خبر ہے؟"

"ارے نہیں" وہ ہنسنے لگا "نیویارک میں ایک پرابلم پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے ابھی وہاں جانا پڑے گا۔"

"ابھی!"

"ابھی۔ بلکہ اسی وقت۔ اوکے گائیز سی یو" وہ صوفے پر سے اٹھا اور پتلون سنبھالتا ہوا رخصت ہو گیا۔

بٹ صاحب نے بے چینی سے ہاتھوں کو حرکت دی اور کہا "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم لوگ یہاں بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہیں؟"

"بھئی سیر کر رہے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں۔ معلومات حاصل کر رہے ہیں"

"کیا ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں؟"

"اور کس لیے آئے ہیں۔ ماڈلنگ کرنے کے لیے؟ بہت شوق ہو رہا ہے ماڈلنگ کرنے کا؟ یاد رکھو' ابھی تو وہ جانگیہ پہنا کر تصویریں بنانے کو کہہ رہے تھے۔ دو چار دن بعد جانگیہ بھی اتار دیں گے" خان صاحب بولے۔

ہم نے کہا "یہاں بے لباس تصویریں بنوانے والوں کو بہت کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ مارلن منرو ایک عریاں پوسٹر کے لیے تصویریں بنوانے کے بعد ہی سپر اسٹار بن گئی تھی۔"

بٹ صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے "بند کرو یہ فضول باتیں۔ پارک سینٹرل ہوٹل دیکھ لیا۔ اب کہیں اور چلو۔ ایک دو دن کے بعد تو یہاں سے چلے ہی جانا ہے' کہیں اور چلتے ہیں"

"ماشاء اللہ" خان صاحب مسکرائے "لڑکا جوان ہو گیا ہے۔ بیچ پر جا کر بے شرم عورتوں کو دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ کوئی بات نہیں' ہم تو تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔"

"مگر یار ہم لوگ اتنی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں۔ کوک کا ایک گلاس تک نہیں پیا۔ کتنی بری بات ہے' یہ لوگ کیا سوچیں گے۔"

"یہی کہ انہوں نے کوک کا ایک گلاس تک نہیں پیا۔ بہت کنجوس لوگ ہیں۔ ٹھیک ہے' سوچا کریں۔ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے" خان صاحب بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

سینٹرل پارک ہوٹل کے اردگرد کا علاقہ اپنی رعنائی کی وجہ سے انتہائی خوبصورت اور دلکش ہے۔ دلچسپی اور دل بستگی کی ہر چیز یہاں موجود ہے۔ اس علاقے کو "ڈیکوڈسٹرکٹ" کہا

جاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ قریباً ایک مربع میل علاقہ ہے جسے اس قدر خوب صورتی اور دلجمعی سے آراستہ کیا گیا ہے کہ نظر حیران رہ جاتی ہے۔ میامی کے لوگوں نے اس علاقے میں رنگینی اور خوب صورتی کے تمام سامان اکٹھے کر دیے ہیں۔ رہی سہی کسر ساحل اور سمندر نے پوری کر دی ہے۔ اسے دنیا کا سب سے بڑا فیشن اسٹوڈیو کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ دن میں خوب دھوپ چمکتی رہتی ہے اور بے شمار فلم والے اور فوٹو گرافر یہاں شوٹنگ اور فوٹو گرافی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہم نے اس روز ساحل پر جو منظر دیکھا، آیئے آپ بھی اس کا نظارہ کیجئے!

سامنے حد نظر تک ساحل اور سمندر پھیلا ہوا ہے۔ لہریں جھاگ اڑاتی ہوئی آتی ہیں اور ساحل پر آکر دم توڑ دیتی ہیں۔ ساحل کی ریت پر اور گھٹنوں گھٹنوں پانی تک فلم کے کیمرا مین اپنے ماڈلز اور ایکٹریسوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ کسی کی ایک دوسرے کی جانب پشت ہے تو کچھ آمنے سامنے بھی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کیونکر محض اپنے فن کاروں کی تصویریں اتارتے ہیں، یہ بھی ان ہی کا فن اور تجربہ ہے۔ ورنہ اس ہنگامے میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک کیمرا دوسرے کے فن کار کو ایکسپوز کر لے۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور دلفریب چہرہ سمندر کے کنارے مصروف کار نظر آتا ہے۔ یقین مانئے کہ اتنی بہت سی خوب صورت اور طرح دار لڑکیاں، نئے نئے منظر و انداز میں جلوہ گری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں کسی اور جگہ دیکھنے کو نہیں ملیں۔ اس ہنگامہ داوگیر میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تماشائی اور سیاح ایک خاص حد سے آگے بڑھیں کیونکہ ہر طرف کیمرے تصویریں بنانے میں مصروف ہیں۔ اول تو سیر بینوں کو بھی اس بات کا علم ہوتا ہے، دوسرے فلم یونٹ سے متعلقہ لوگ بھی روک ٹوک کرتے رہتے ہیں۔

ایک جگہ کسی ہسپانوی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اگر کوئی ہمیں نہ بتاتا پھر بھی ہم شکلوں سے جان جاتے کیونکہ ہیروئن کا دمکتا ہوا میدے جیسا شہاب رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور سیاہ بال اس کے غیر یورپی ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ ہیرو بھی دیکھنے میں پاکستانی لگتا تھا۔ کھلتا ہوا رنگ، سیاہ بال، تیکھے نقوش اور سیاہ آنکھیں۔ منظر یہ تھا کہ ہیرو (غالباً ہیروئن کی تلاش میں) سمندر کے کنارے پہنچ گیا ہے اور سمندر کی جانب منہ کر کے، دونوں ہاتھ اٹھا کر مکالمے بول رہا ہے۔ یکایک سمندر میں سے ایک سر نمودار ہوتا ہے

اور پھر رفتہ رفتہ ایک حسین عورت کا چہرہ اور بالائی جسم پانی سے باہر آتا ہے۔

ہمیں برابر سے ایک آواز سنائی دیتی ہے، "لاحول ولا قوۃ" یہ آواز بٹ صاحب کی ہے۔ وہ ہیروئن کو دیکھ کر لاحول پڑھ رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا بالائی جسم لباس سے بے نیاز ہے۔ اس کی ترشی ہوئی سیاہ زلفیں اس کے شانے اور گردن کو جہاں تک ڈھانپ سکتی ہیں، اپنی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہیرو کی نظریں اس حسینہ پر جمی ہوئی ہیں اور وہ بے خودی کے عالم میں اپنے دونوں بازو پھیلا کر اس کی جانب بڑھنے لگتا ہے۔ ادھر ہیروئن بھی والہانہ انداز میں اپنے بازو پھیلائے ہوئے بے اختیار آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے جسم کا بقیہ حصہ بھی رفتہ رفتہ پانی سے باہر نکل آتا ہے۔ اس کا زیریں جسم جل پری جیسا ہے، پلاسٹک یا کسی کپڑے کی مدد سے کمر سے پیروں تک اس کے جسم کو خیالی جل پری کے جسم میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اس کا نچلا حصہ کیونکہ مچھلی جیسا ہے اور پیروں کی جگہ بھی مچھلی کی دم جیسی چیز لگی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ چلنے کے بجائے تیر رہی ہے۔ جیسے جیسے ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے ہیں اسی رفتار سے کیمرا مین بھی آگے بڑھ رہا ہے۔ دو لڑکے جو بہت تیز روشنیاں تھامے ہوئے ہیں وہ بھی مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ دراصل "فیس لائٹ" ہے۔ یعنی چہروں کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ ایک مقام پر پہنچ کر ہیرو اور جل پری ہم آغوش ہو جاتے ہیں اور سین کٹ ہو جاتا ہے۔ روشنیاں اور کیمرا آف ہوتے ہی ہیرو اور ہیروئن جو انتہائی جذباتی اور والہانہ انداز میں ایک دوسرے سے اظہار محبت کر رہے تھے، فوراً دور دور ہو جاتے ہیں۔ ہیروئن ہاتھ کے ایک جھٹکے سے زیریں لباس اتار کر پھینک دیتی ہے جسے ایک نو عمر لڑکی اٹھا لیتی ہے۔ جل پری کی کھال کے نیچے اس نے جانگیہ سا پہن رکھا ہے اور اس کی مرمریں ٹانگیں سورج کی کرنوں میں جگمگانے لگتی ہیں۔

بٹ صاحب جو آنکھیں اور منہ کھولے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے اچانک ایک لمبا سانس لیتے ہیں اور کہتے ہیں "اس کے بعد کیا ہو گا؟"

ہم نے کہا "اس کے بعد دوسرا سین ہو گا۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہیرو اب اس جل پری کا کیا کرے گا؟"

خان صاحب نے سنجیدگی سے کہا "اس کے کٹلس بنا کر کھائے گا یا پھر فنگر فش بنائے

گا۔" بٹ صاحب انہیں گھورنے لگے۔

ساحل پر ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دیدہ زیب خاتون کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی میک اپ وین سے نکل کر آتی ہیں اور کچھ فاصلے پر استادہ پام کے ایک خوب صورت درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان کے سامنے تین ٹانگوں والے ایک کیمرے سے مسلح فوٹوگرافر پہلے ہی منتظر ہے۔ ایک لائٹ والا لڑکا فیس لائٹ آن کر دیتا ہے اور ماڈل کا چہرہ اور جسم روشنی میں نہا کر دمکنے لگتا ہے۔

"کم آن بے بی" فوٹوگرافر کہتا ہے "تم بہت مایوس اور اداس ہو۔ تمہارا رونے کو جی چاہ رہا ہے۔"

ماڈل مطلوبہ تاثرات اپنے چہرے پر طاری کر لیتی ہے، چند سیکنڈ تک اس کے سوگوار چہرے کی تصویر کشی جاری رہتی ہے پھر اچانک فوٹوگرافر چلا کر کہتا ہے "اپنا سر پیچھے کر لو اور آسمان کی طرف چہرہ کر کے ہنسو۔ خوب زور زور سے ہنسو۔"

ماڈل فوراً اپنا موڈ تبدیل کر لیتی ہے اور سر پیچھے کی جانب ڈال کر ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔

"اوکے۔ دیٹ از آل۔"

ابھی ماڈل کا منہ بند نہیں ہونے پاتا کہ سامنے ایک اور فوٹوگرافر اپنے کیمرے کی تین ٹانگیں نصب کر دیتا ہے اور پکار کر کہتا ہے "اوکے ہنی۔ اپنی جگہ سنبھالو۔"

ایک طرف سے ایک اور ماڈل جو بالکل مختلف لباس میں ہے، نمودار ہو کر آگے بڑھتی ہے۔ پہلے والی مسکراتی ہوئی اٹھ جاتی ہے اور جسم سے ریت کے ذرے جھاڑتی ہے۔ اب نووارد خاتون اس کی جگہ تشریف فرما ہیں۔ اس کا لباس پہلے والی خاتون کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ اس طرح کہ ان کے سر پر ایک سرخ رنگ کا بہت بڑا سا ہیٹ رکھا ہوا ہے۔ اور گلے میں اسی رنگ کا اسکارف بندھا ہوا ہے ورنہ ان کے جسم پر بھی پہلے والی کی طرح نہانے کا مختصر لباس ہی موجود ہے۔

فوٹوگرافر انہیں ہدایات دیتا ہے۔ ماڈل کبھی دائیں، کبھی بائیں، کبھی اوپر، کبھی نیچے دیکھتی ہے پھر اپنے سر سے ہیٹ اتار کر کیمرے کی جانب دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس کے بعد فوٹوگرافر کی ہدایت پر گلے کا اسکارف کھولتی ہوئی کیمرے کی جانب قدم بڑھاتی ہے اور فوٹو

رانی ختم ہو جاتی ہے۔

اب اسی درخت کے نیچے دو اور ماڈلز براجمان ہو چکی ہیں۔ ہم نے پاس کھڑے ہوئے یک صاحب سے پوچھا "آخر سارا ساحل چھوڑ کر یہ سب اسی درخت کے پاس کیوں صویریں بنا رہے ہیں؟"

ان صاحب کا تعلق غالباً کسی یونٹ سے تھا۔ انہوں نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے ہیں دیکھا اور پوچھا "کیا آپ نووارد ہیں؟"

ہم نے کہا "جی ہاں۔"

"بولے بات یہ ہے کہ یہ پام کا درخت اس ساحل پر سب سے زیادہ خوب صورت پام ہے اس لیے فوٹوگرافر اس کے آس پاس شوٹنگ کرنا پسند کرتے ہیں۔"

بٹ صاحب نے فرمایا "واقعی۔ کتنا خوب صورت پام ہے۔"

خان صاحب کی آواز آئی "آپ تو شاید اتنی دیر سے پام کا درخت ہی دیکھ رہے تھے۔"

بٹ صاحب کچھ جھینپ سے گئے، کہنے لگے "سبھی دیکھ رہے تھے۔ میں نے دیکھ لیا تو کیا قیامت آ گئی۔"

میامی میں ہم جتنے دن بھی رہے یہی دیکھا کہ ہر طرف شوٹنگ ہو رہی ہے۔ مثلاً ایک کشادہ اور خوب صورت سڑک پر سے گزر رہے ہیں۔ یکایک سامنے سے ایک خوبرو اور خوش قامت لڑکی نمودار ہوئی۔ اس کا لباس دو حصوں میں منقسم ہے۔ بالائی حصہ غسل کا لباس تو نہیں لیکن اس سے مشابہ ہے اور اس میں کپڑا بھی اس کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی استعمال ہوا ہے۔ نیچے کا لباس گھٹنوں سے اوپر ایک اسکرٹ یا لہنگے کی طرح ہے۔ دونوں کا رنگ ایک ہی ہے گویا انہوں نے سوٹ زیب تن کر رکھا ہے۔ یہ صاحب زادی اپنی سنہری زلفوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی لہراتی ہوئی چال سے رواں دواں ہیں۔ موڑ سے ایک بہت لمبی سی کھلی چھت کی لال کار آہستگی سے آتی ہے اور لڑکی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ اس کھلی کار میں پانچ لڑکے سوار ہیں۔ ان میں سے ایک سیاہ فام ہے اور ایک گندمی رنگ کا ہے۔ باقی تین لڑکے گورے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر دھوپ کے چشمے لگے ہوئے ہیں اور وہ لڑکی سے کچھ چھیڑ خانی کر رہے ہیں۔ لڑکی بھی ان سے باتیں کرتی ہوئی چل رہی ہے۔ یہ

کوئی حقیقی منظر نہیں ہے جب کہ ایک ٹی وی کمرشل کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ یہ سب کے سب ماڈلز ہیں۔ اس شہر میں' خاص طور پر ڈیکو ڈسٹرکٹ میں' کچھ پتا نہیں چلتا کہ ماڈلز کون ہیں اور عام شہری کون ہیں۔ ہر چیز پر ماڈلز کا اور ہر نظارے پر شوٹنگ کا گمان گزرتا ہے۔

رات کو ہم گیارہ بجے کے قریب اپنے ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ مس نورا ہمیں تین بار فون کر چکی ہیں۔

"یہ اب ہمیں کیوں فون کر رہی ہے؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

"تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے" خان صاحب نے کہا۔

"کس بات کا شکریہ؟"

"اس بات کا کہ تمہاری وجہ سے وہ بے روزگار ہو گئی ہے۔"

ہم نے کہا "ویسے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ وہ بے چاری تو ہماری ہمدردی میں سب کچھ کر رہی تھی۔"

"ان گوروں کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ ان کی ہمدردی بھی خطرناک ہے" بٹ صاحب نے فلسفیانہ انداز میں خیال آرائی کی۔

ہوٹل کی کھڑکی کے بڑے شیشے سے باہر نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک کھلی چھت کی سرخ کار سامنے آکر رک گئی ہے۔ کار کے اندر پانچ چھ لڑکیاں سوار ہیں۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہے۔ دوسری اس کے برابر کی سیٹ پر نیم دراز ہے۔ ایک لڑکی پچھلی سیٹ پر ہے اور باقی دو سیٹوں پر چڑھی بیٹھی ہیں۔

"شاید شوٹنگ ہو رہی ہے" خان صاحب نے کہا۔

"چلو۔ باہر چل کر دیکھتے ہیں" یہ بٹ صاحب تھے۔

باہر نکلے تو ایک لڑکی کار سے کود کر ہوٹل کی طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ کافی خوش شکل اور نظر فریب لڑکی تھی۔ "شوٹنگ تو نہیں لگتی" خان صاحب نے رائے ظاہر کی۔

"کیسے پتا چلا؟"

خان صاحب نے کہا "دیکھا نہیں اس کا لباس خاصا شریفانہ ہے۔ شوٹنگ ہوتی تو اس سے آدھے کپڑے بھی نہ ہوتے۔"

وہ نزدیک آئی تو ہم اسے پہچان گئے' وہ نورا تھی۔

"ہائی" اس نے وہیں سے خوش ہو کر نعرہ لگایا اور قریب قریب دوڑتی ہوئی ہمارے [illegible]ں پہنچ گئی "شکر ہے کہ تم لوگ مل گئے۔"

"ہم ذرا گھومتے پھر رہے تھے۔"

"ظاہر ہے۔ ٹورسٹس کا اور کیا کام ہوتا ہے۔ میں تمہیں اپنی دوستوں سے ملانا چاہتی [illegible]ں" اس نے پلٹ کر دونوں ہاتھ ہلائے اور کار ایک زوردار آواز کے ساتھ سامنے کے [illegible]نگ لاٹ میں رک گئی۔ سب لڑکیاں بھاگتی ہوئی چلی آئیں اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔

"یہ کلارا ہے' یہ وینڈی ہے' یہ شیرن ہے' یہ گلوریا ہے۔"

پھر ہم لوگوں کا تعارف کرایا گیا۔

"مسٹر کھان۔ مسٹر ایفو کی' مسٹر بوٹ۔"

مصافحہ انہوں نے ہم سے بھی کیا تھا مگر "مسٹر بوٹ" سے مصافحے میں بہت زیادہ گرم [illegible]ں تھی۔

"گرلز' یہ مسٹر بوٹ ہیں جنھوں نے انڈر گارمنٹس کے لیے ماڈلنگ کرنے سے انکار کر [illegible]ا۔"

"بوٹ۔ کیا تم لوگ انڈر گارمنٹس نہیں پہنتے؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"پہنتے ہیں مگر لباس کے نیچے۔"

نورا نے کہا "یہ کہتے ہیں کہ سب کے سامنے جانگیہ پہن کر انہیں شرم آئے گی۔"

سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں "ہاؤ کیوٹ۔" وہ سب بٹ صاحب کے گرد ہو [illegible]ں۔ بٹ صاحب کچھ گھبرا سے گئے۔

ہم نے کہا "لو بٹ صاحب۔ آپ کا راجا اندر بننے کا خواب بھی پورا ہو گیا۔"

خان صاحب بولے "میرا خیال ہے کہ بٹ صاحب کو آرام سے ان کے حوالے کر دینا [illegible]ہیے۔ بلاوجہ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"ہرگز نہیں" بٹ صاحب پریشان ہو گئے "میں ان کے ساتھ اکیلا نہیں جاؤں گا' تم [illegible]ا کے بغیر۔"

مگر بٹ صاحب کی تشویش بلاوجہ تھی۔

"ہمیں ماڈلنگ کے لیے جانا تھا۔ سوچا تمہارے ہوٹل سے ہو کر جائیں۔"

"بہت بہت شکریہ"

"دو دن تک ہم مصروف رہیں گی۔ ہماری بکنگ ہو گئی ہے۔"

"دو دن بعد ہماری بھی بکنگ ہو جائے گی" ہم نے کہا۔

"اچھا؟ ماڈلنگ کرو گے؟"

"نہیں' یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔

"اوہ!" نورا کچھ مایوس سی ہو گئی "اوکے۔ پھر کبھی آؤ گے تو ملاقات ہو گی۔ اوکے' سی یو۔"

"اوکے!

وہ لڑکیوں کے ساتھ بھاگتی ہوئی کھلی چھت کی کار کی طرف چلی گئی۔ سب لڑکیاں کود کود کر کار میں چڑھ گئیں اور کار بہت شور کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے وہ ہاتھ ہلا کر بائی بائی کہتی رہیں۔

ہم لوگ تھوڑے سے اداس ہو گئے۔ یہ شاید ہمارے مشرقی مزاج کا خاصہ ہے کہ ذرا سی دیر کی ملاقات کے بعد بھی بچھڑنا پڑے تو اداس ہو جاتے ہیں۔ یورپ والے ان "آلائشوں" سے پاک ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے ہم سفر کے لیے تو کیا ان کے دلوں میں تو اپنے قریبی خون کے رشتوں کے لیے بھی گہرے اور پائیدار جذبات نہیں ہوتے۔ اس معاملے میں ان کی بعض عادتیں اچھی بھی لگتی ہیں۔ یہ لوگ جذباتی نہیں ہوتے نہ ہی شکوے شکایت کے قائل ہیں۔ مثال کے طور پر بٹ صاحب نے نورا کی پر زور سفارش کے باوجود عین وقت پر ماڈلنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کی جگہ کوئی پاکستانی ہوتا تو ملتے ہی شکوے شکایات کا دفتر کھول دیتا۔ بہت ممکن ہے کہ باہمی تعلقات بھی قطع ہو جاتے ورنہ کم از کم کچھ دن کے لیے بول چال تو لازماً بند ہو جاتی مگر نورا نے ملاقات ہونے پر اس واقعے کا ذکر تک نہیں کیا۔ خدا جانے یہ ان لوگوں کی حقیقت پسندی ہے یا جذبات سے عاری ہونے کے باعث ان کا ایسا طرزِ عمل ہے۔ یہ درست ہے کہ وہاں رشتے دار آپس میں زیادہ ملاقاتیں نہیں کرتے۔ میل جول نہ ہونے کے باعث وہ بہت سے گھریلو اور خاندانی جھگڑوں اور فسادات سے محفوظ رہتے ہیں جن میں ہم لوگ گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں۔ ذرا غور کیجئے تو آپ کو احساس ہو گا کہ ہمارے بیشتر ذہنی' جذباتی اور نفسیاتی مسائل کی بنیاد محض

گھریلو اور خاندانی ہے۔ یہی قدرے پھیل کر ہمارے معاشرتی مسائل بن جاتے ہیں بہرحال ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ کچھ فائدہ بخش اور کچھ نقصان دہ۔ ہمارے طرز معاشرت کی خوبیاں ان کے ہاں نہیں پائی جاتیں۔ مغربی معاشرے میں ذہنی افراتفری' انتشار' بے چینی' بے سکونی اور اس کے نتیجے میں معاشرتی بگاڑ کے اسباب کی بنیاد آپ کو ان کی ایک دوسرے سے بے تعلقی اور بے گانگی میں نظر آجائے گی۔ خون کے قدرتی رشتوں سے بے گانگی اور جذباتی تعلق سے بے نیازی کے باعث انہیں بچپن سے تنہائی اور بے نیازی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ تنہائی اور ایک دوسرے سے دوری' عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اس طرز زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انہیں قدرت نے جو فطری نظام بخشا ہے وہ ان کے تحت الشعور میں ہل چل پیدا نہیں کرتا۔ مذہب اور خون کے قریبی رشتے دو ایسے مضبوط اور ناقابل شکست جذبے ہیں جو مصیبت و آلام کے وقت انسان کو سکون پہنچاتے ہیں۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ مذہب کا دامن تھام لیتا ہے یا پھر ماں باپ' بہن بھائی' میاں بیوی' اولاد اور والدین کے رشتوں کی مضبوط پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان سہاروں سے اس کے اصل مسائل ختم نہیں ہوتے لیکن ذہنی اور روحانی طور پر وہ ایک ایسے سکون سے آشنا ہو جاتا ہے جو رفتہ رفتہ اس کے مسائل کے احساس کو بہت کم اور قابل برداشت کر دیتا ہے۔ مذہب اور رشتے دار ہی اس کے اندر مقابلے کا جذبہ بیدار کر دیتے ہیں اور وہ مایوسیوں پر قابو پا کر نئے سرے سے زندگی کی جنگ میں نبرد آزما ہونے کے لیے محاذ پر چلا جاتا ہے۔ مغرب کے لوگ اس احساس اور جذبے سے محروم ہیں۔ رشتے دار' جذباتی تعلق ان کے نزدیک ان کی دنیاوی ترقی میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے اور مذہب کو وہ ایک انفرادی اور میکانکی عمل سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسی بے شمار راحتوں سے محروم ہیں جو ہم مشرق والوں کو حاصل ہیں لیکن ہم جن آسائشوں سے محروم ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

اگلی صبح سویرے کے لیے خان صاحب نے کافی کا آرڈر پیشگی ہی دے دیا تھا۔ پہلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ صبح چھ بجے بیدار ہو کر کافی پینے کی کیا تک ہے۔ انہوں نے فرمایا "دراصل مجھے ایک ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے کہ صبح چھ بجے کافی پینا میری صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔"

صبح پانچ بجے انہوں نے ہمیں جگا دیا۔ ہم نے بہتیرا کہا کہ بھائی ہمیں کسی ڈاکٹر نے صبح چھ بجے کافی پینے کا مشورہ نہیں دیا ہے اور بٹ صاحب نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے تو ڈاکٹر نے سرے سے کافی پینے کی ہی ممانعت کر دی ہے مگر خان صاحب نے اتنا شور مچایا کہ آنکھ کھولتے ہی بنی۔ بڑی بے زاری سے اٹھے، شیو کیا، منہ ہاتھ دھویا، خان صاحب کے کمرے میں پہنچے تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ سمر سوٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر یوں بیٹھے تھے جیسے کسی تقریب میں جانے والے ہوں۔ پوچھا کہ بھائی کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ کیا کوئی اپائنٹ منٹ وغیرہ ہے؟" مگر وہ محض مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اسی روز ہمیں نیویارک روانہ ہو جانا تھا۔ خان صاحب اور بٹ صاحب کو ان کے جاپانی میزبانوں نے جو ٹکٹ دیا تھا وہ ایک طرح سے ساری دنیا کے گرد سفر کرنے کا اجازت نامہ تھا۔ پاکستان سے جاپان اور جاپان سے امریکا تو وہ پہنچ ہی چکے تھے۔ اب انہیں پاکستان واپس جانے کے لیے یا تو وہی راستہ اختیار کرنا تھا یا پھر یورپ کے راستے سفر کرنا تھا۔ انہوں نے یورپ کا راستہ منتخب کیا کیونکہ وہ چند روز کے لیے لندن میں بھی قیام کرنا چاہتے تھے۔

پوچھا "کیا لندن میں کوئی کام ہے؟"

بولے "کام تو نہیں ہے مگر کچھ عادت سی پڑ گئی ہے کہ اگر چند مہینے تک لندن نہ جاؤں تو بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔"

اللہ اللہ۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔ ہم نے سوچا کہ وقت کے ساتھ انسان کس طرح بدلتا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ خان صاحب اور بٹ صاحب یورپ کے سفر پر جانے کے لیے ہمارا سہارا تلاش کرتے تھے۔ ہم ان کے گائیڈ اور مترجم تھے۔ ہم ہی نے انہیں مغرب سے روشناس کرایا تھا مگر اب وہ ہم ہی سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے آنکھیں کھولتے ہی انہوں نے لندن، پیرس اور جنیوا کے سفر شروع کر دیے تھے۔

ہم نے کہا "خان صاحب، کبھی کبھی آپ نودولتیوں کی طرح چھچھوری باتیں کرتے ہیں تو بہت حیرانی ہوتی ہے۔"

بولے "حیرانی کی کیا بات ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہم نئے نئے دولت مند ہوئے ہیں تو پھر یہ باتیں تو چلیں گے۔"

طے یہ پایا تھا کہ ہم بھی دو روز کے لیے ان کے ساتھ نیویارک جائیں گے۔ وہاں سے

وہ براستہ لندن، کراچی اور ہم واپس واشنگٹن روانہ ہو جائیں گے۔

ٹھیک چھ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ خان صاحب نے ہاتھوں سے اپنے بال سنوارے، ٹائی کی گرہ درست کی اور مسکراتے ہوئے نہایت میوزیکل آواز میں کہا "یس۔ کم ان پلیز۔"

کمرے کا دروازہ کھلا، پہلے ایک ٹرے نمودار ہوئی جس پر زرد پھولدار سرپوش پڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد ٹرے بردار کی صورت نظر آئی۔ خان صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔ اندر داخل ہونے والی خاتون ادھیڑ عمر بلکہ عمر رسیدہ تھیں۔ جنہیں شاید میک اپ کی برکتوں نے ادھیڑ عمر بنا دیا تھا۔ انہوں نے مسکرا کر سب کو ہائی گڈ مارننگ کہا۔ کافی کی ٹرے میز پر رکھی اور بل ہاتھ میں لے کر اس انتظار میں کھڑی ہو گئیں کہ سائن کون کرے گا۔ خان صاحب کو بے تعلق پا کر بٹ صاحب نے بل ان کے ہاتھ سے لے کر سائن کر دیے اور اپنے کمرے کا نمبر بھی لکھ دیا۔

وہ خاتون مسکراتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔ خان صاحب کی مایوسی اور بے زاری دیدنی تھی۔ وہ کافی سے بھی خاصے بے خبر نظر آ رہے تھے۔

بٹ صاحب نے کافی بنائی اور خان صاحب کی طرف پیالی بڑھائی "لیجیے ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق جلدی سے کافی پی لیجیے ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

خان صاحب نے برا سا منہ بنایا اور بولے "یار ڈاکٹر کوئی خدا تو نہیں ہوتا کہ اس کا مشورہ ماننا لازم ہے۔"

دراصل وہ گزشتہ روز والی ویٹریس کے منتظر تھے۔ بعد میں انہوں نے ہمیں بتایا کہ اس کے لیے انہوں نے ایک پرفیوم بھی خرید کر رکھی تھی مگر افسوس کہ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے

شام کی فلائٹ سے ہم نیویارک روانہ ہو گئے۔

خاں صاحب اور بٹ صاحب یوں تو "پین ایم" کے ذریعے سفر کر رہے تھے لیکن میامی سے نیویارک جانے کے لیے انہیں ٹی ڈبلیو اے کا ٹکٹ فراہم کیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک بہت بڑی فضائی کمپنی ہے جس کا اصل نام "ٹرانس ورلڈ ائر لائنز" ہے ہم بھی ایک عرصے تک دوسرے لوگوں کی طرح یہی سمجھتے تھے کہ "پین ایم" ہی واحد اور سب سے بڑی امریکی فضائی کمپنی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں تو درجنوں چھوٹی بڑی فضائی کمپنیاں ہیں اور ٹرانس ورلڈ ائر لائنز ان میں کافی بڑی اور ممتاز کمپنی ہے۔ پین ایم کا ایک زمانے میں بہت شہرہ تھا اور دنیا بھر میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی مگر بعد میں رفتہ رفتہ یہ مالی مشکلات کا شکار ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک بار تو شہنشاہ ایران نے بھاری قرضہ دے کر اسے دیوالیہ ہونے سے بچایا تھا۔ اب یہ بھی بات پرانی ہوئی۔ شہنشاہ ایران فرش خاک ہوئے۔ دو تین سال پہلے پین ایم بھی بند ہو گئی۔ ٹی ڈبلیو اے کا جانا بھی ٹھہر چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ امریکا میں خالص سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے۔ اسے آپ "زر پرست" معاشرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہر کوئی پیسہ کمانے کے چکر میں ہے اور اس میں اضافہ کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔ اس میں جائز و ناجائز کا کوئی خیال نہیں کرتا انگریزی میں اسے "کٹ تھروٹ بزنس" کہتے ہیں۔ یعنی ہر شخص یا ادارہ دوسرے کا گلا کاٹنے کی تاک میں رہتا ہے۔ جس کا بس چلتا ہے وہ بے رحمی سے دوسروں کے گلے پر چھری پھیر دیتا ہے۔ کوئی لحاظ ملاحظہ' مروت' اخلاق و آداب یا تعلقات کا خیال نہیں رکھتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ایک جنگل ہے جس میں صرف طاقتور ہی کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ کمزور پستا چلا جاتا ہے' زور آور کمزور کو ہڑپ کر جاتا ہے جیسا کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو ہضم کر لیتی ہے۔ یہی امریکی نظام اور معاشرے کا خلاصہ ہے جس کا ثبوت وہاں ہر قدم پر مل جاتا ہے۔ جو لوگ امریکا سے باہر

ہیں وہ اس جنت ارضی میں رہنے والوں پر رشک کرتے ہیں اور ہر قیمت پر وہاں جانے کے لیے بے تاب و بے قرار نظر آتے ہیں مگر اس جنت کی حقیقت کیا ہے؟ یہ وہیں جا کر پتا چلتا ہے۔ یہ جنت طاقت ور' با اثر اور بارسوخ لوگوں کے لیے ہے اور یہ تمام چیزیں دولت سے حاصل ہو سکتی ہیں اس لیے امریکا کو آپ دولت مندوں کی جنت کہہ سکتے ہیں۔ باقی لوگ تو ان کے غلام ہیں' قانونی اور آئینی غلام جو دولت مندوں کے لیے شب و روز کام کرتے ہیں۔ امریکی عوام کی حیثیت جاگیردار کے مزارعوں کے مانند ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد محض دولت مندوں کے لیے کام کرتے رہنا ہے۔ ایک زمانے میں افریقہ سے کالوں کو غلامی کے لیے یہاں لایا جاتا تھا۔ اب گورے بھی اس نظام کے لیے کام کرتے تھے' یہ بھی اسی میں مصروف ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کالے غلاموں کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے جب کہ آج کے غلاموں کو شہری اور انسانی حقوق کے کھلونے دے کر بہلا دیا گیا ہے۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اس سفرنامے کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو جا بجا ایسے واقعات سے واسطہ پڑے گا اور نہایت کرب انگیز مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ میری ذاتی رائے میں امریکی نظام دنیا کا بدترین نظام ہے کیونکہ بادشاہت' آمریت اور جاگیرداری نظام میں عام لوگ مسلسل اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ اسے بدلنے کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں لیکن مغرب کے مکار ذہنوں نے کیپٹل ازم کے نام پر جو نظام قائم کیا ہے اس نے عوام کو اپنے سحر میں اس طرح جکڑا ہے کہ وہ اس کی خوبیوں کے گن گاتے رہتے ہیں اور اسے اپنے لیے ذریعہ نجات تصور کرتے ہیں۔ گویا یہ ان کی دائمی غلامی کا نشان ہے۔ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ آسائشوں اور آزادی کے نام پر انہیں کس طرح آلہ کار اور ایک مشین بنا دیا گیا ہے۔

بہرحال جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟

جب امریکیوں ہی کو اس بارے میں کوئی شکایت نہیں ہے تو پھر ہمیں ان کی وکالت کرنے کی کیا ضرورت ہے اس لیے آئیے ہم اپنا سفر شروع کرتے ہیں۔

میامی ائرپورٹ پر وہی منظر تھا جو کہ مغربی ملکوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ رنگ' چمک دمک' روشنیاں' حسن و جمال' نظم و ضبط' نہ شور نہ غل' ہر کوئی تیزی میں ہے لیکن دھکم پیل بالکل نہیں ہے۔ مغرب کی یہ خوبی واقعی قابل تعریف ہے کہ انہوں نے معاشرے کو

مہذب بنالیا ہے۔

بٹ صاحب کی سادگی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ سیدھے پین ایم کے کاؤنٹر پر پہنچ گئے اور وہاں ہم لوگوں کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر ہم چیک ان ہونے کے بعد بٹ صاحب کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اتنی پر رونق اور پرہجوم جگہ پر کسی ایک شخص کو تلاش کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔

خان صاحب خاص طور پر بہت فکر مند تھے "میں نے تو کہا تھا کہ اس کے گلے میں ایک تعویذ بنا کر ڈال دیں۔"

ہم نے پوچھا "تعویذ! وہ کس لیے؟"

"بھئی اس پر پتا نشان لکھ دیتے اور مطلع کر دیتے کہ جس کسی کو یہ صاحب ملیں انہیں ذیل کے پتے پر پہنچا دیا جائے۔"

ہم نے کہا "آپ خواہ مخواہ ان کے بارے میں غلط فہمی نہ پیدا کریں۔ بھائی اب تو وہ خود بھی انگریزی بولنے لگے ہیں۔ مطلب کی بات تو کر ہی سکتے ہیں۔"

"غلط خیال ہے آپ کا" انہوں نے پریشان ہو کر کہا "اگر اکیلے میں انگریزوں سے واسطہ پڑ گیا تو اس کی گھگھی بندھ جائے گی۔"

"اب ہم انہیں کہاں اور کیسے ڈھونڈیں۔ ان کے لیے اعلان نہ کرا دیں؟" ہم نے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس کی تو سمجھ میں ہی نہیں آئے گا۔"

"تو پھر کیا کریں؟ فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔ بھائی وہ آپ کا پرانا ساتھی ہے، کچھ تو سوچیں۔"

خان صاحب مراقبے میں چلے گئے۔ چند لمحے غور و فکر میں ڈوبے رہے پھر اچانک سر اٹھایا اور کہا "ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" ہم نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ بولے "ہمیں پین ایم کے کاؤنٹر پر تلاش کرنا چاہیے۔"

ہمارے خیال میں تو یہ نہایت فضول تجویز تھی مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ ہم نے اپنے بیگ اٹھا لیے اور پین ایم کے کاؤنٹر کی تلاش میں چل پڑے۔ امریکا کے ائرپورٹ

ہمارے ہوائی اڈوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ بڑی فضائی کمپنیوں کے لیے تو ٹرمینل بھی الگ الگ ہوتے ہیں مگر ہم پاکستانیوں کو خدا نے "پوچھنے" کی جو صلاحیت عطا فرمائی ہے وہ مشکل وقت میں کام آہی جاتی ہے۔ دو چار لوگوں سے پین ایم کے کاؤنٹر کا پتا دریافت کیا۔ کسی نے شانے اچکائے، کسی نے منہ بنایا اور ہاتھ ہلا دیے۔ وقت کم تھا اور اب ہمیں بھی گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ یکایک خان صاحب نے کہا "آیئے، اس سے پوچھتے ہیں۔"

سامنے دیکھا تو یونیفارم میں ملبوس ایک خاتون تیز رفتاری سے جا رہی تھیں۔ مغربی ملکوں میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ عملے کی وہ بہتات نہیں ہے جو ہمارے ہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ پہلی خاتون تھیں جو ہمیں یونیفارم میں نظر آئی تھیں اس لیے ان ہی سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ بعد میں خیال آیا کہ اگر ہم ٹی ڈبلیو اے کے کاؤنٹر پر ہی دریافت کر لیتے تو یہ خواری نہ ہوتی۔

خاتون بہت تیز رفتاری سے جا رہی تھیں۔ لگتا تھا عنقریب ٹیک آف کرنے والی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ انہیں کوئی ضروری کام ہو گا۔ بس یہ تیز رفتاری مغرب والوں کی عادت سی بن گئی ہے۔ بلاوجہ بھاگتے دوڑتے رہتے ہیں۔ آرام، سکون اور اطمینان سے کوئی کام کرنا تو ان کے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ خان صاحب نے ان تک پہنچنے کے لیے دوڑ لگا دی۔ آس پاس کے لوگ انہیں یوں دوڑتے دیکھ کر کچھ حیران ہوئے مگر انہوں نے یونیفارم پوش خاتون کو جا لیا اور ان کے برابر پہنچ کر ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ انہوں نے قدرے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ خان صاحب کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ چند لمحے تو اسے قابو کرنے کی کوشش میں رہے پھر جب بولنے کے قابل ہوئے تو انہوں نے اپنی بہترین انگریزی میں ان سے بات چیت کی۔

"ہائی!"

انہوں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور جواب میں کہا "ہائی!"

خان صاحب مناسب الفاظ کی تلاش میں لگ گئے مگر ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخر یہ کہ وہ بے چاری خود ہی رک گئیں اور کہا "کوئی پرابلم ہے؟"

یہ بولے "جی ہاں۔ ہمارا ایک ساتھی گم ہو گیا ہے۔"

"گم ہو گیا ہے؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا "کیا چھوٹا بچہ ہے؟"

"نہیں۔ ہے تو بڑا مگر یہاں اجنبی ہے۔"

اتنی دیر میں ہم بھی ان کے پاس پہنچ گئے تھے اور خان صاحب کی طولانی گفتگو سن رہے تھے۔ ہم نے کہا "معاف کیجئے۔ ہمیں پین ایم کے کاؤنٹر پر جانا ہے۔ آپ بتا سکتی ہیں' وہ کس طرف ہے؟"

انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور بولیں "میرے ساتھ آئیں۔"

اس کے بعد دوبارہ وہی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی کیونکہ انہوں نے فل اسپیڈ پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ ہماری سانس پھولنے لگی تھی کہ انہوں نے فرمایا "سامنے وہ سائن دیکھ رہے ہیں؟"

ہم نے ان کے اشارے کی سمت دیکھا اور کہا "جی ہاں۔"

بولیں "جی وہی پین ایم آفس ہے" یہ کہا اور یہ جا وہ جا۔

بہت ندامت ہوئی کہ آخر یہ سائن ہمیں کیوں نظر نہیں آیا تھا۔ شاید بوکھلاہٹ کی وجہ سے! کافی کشادہ اور خوب صورت جگہ تھی۔ پودوں کے گملے بڑی خوبصورتی سے رکھے ہوئے تھے۔ مسافروں کی آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایک جانب کاؤنٹر پر ایک خاتون بہت انہماک سے کاغذات کا معائنہ کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے سامنے کچھ فاصلے پر سامان والی ٹرالی پر بٹ صاحب بیٹھے انہیں دیکھنے میں مصروف تھے۔

ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی اور ان کے نزدیک پہنچ کر کہا "آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟"

وہ چونک پڑے "بھئی کہاں چلے گئے تھے آپ دونوں۔ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔"

ہم نے کہا "آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں۔ قیامت کا؟ اور آپ یہاں آئے کیوں ہیں؟"

"نیویارک جانے کے لیے اور کیوں؟"

ہم نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ ہمیں کسی اور ایرلائن کے ذریعے سفر کرنا ہے۔ جب یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی تو خان صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی "کیا ضرورت تھی ہم سے بچھڑنے کی؟ کیا بچے ہو کر ہماری انگلی پکڑ کر چلو

گے؟ شرم آنی چاہیے' آدھی دنیا گھوم لیے مگر رہے گھامڑ کے گھامڑ۔ پینڈو وغیرہ وغیرہ"

اس کے بعد ہم انہیں منزل مقصود پر یعنی ٹی ڈبلیو اے کے لاؤنج میں لے گئے جہاں ہماری فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔

ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے بعد ہوش ٹھکانے آئے تو ہم نے خان صاحب سے پوچھا "آپ نے کیسے جان لیا تھا کہ بٹ صاحب پین ایم کے لاؤنج میں ہوں گے؟"

بولے "ویسے ہی جس طرح اس شخص نے گھوڑا تلاش کر لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بٹ صاحب ہوتا اور گم ہو جاتا تو کہاں جاتا؟ بس یہ وہیں مل گئے۔"

"مگر یہ وہاں گئے کیوں تھے؟" ہم نے پوچھا۔

"بس۔ عورتوں کے پیچھے پیچھے لاحول پڑھتے ہوئے چلے گئے ہوں گے اور یہ بھول گئے کہ ہم پین ایم سے سفر ہی نہیں کر رہے۔"

بٹ صاحب اس بحث سے تنگ آ چکے تھے۔ "یار مٹی ڈالو اس بات پر' ذرا اس جہاز کو دیکھو۔"

"جہاز کو کیا دیکھیں۔ کیا پہلے کبھی ہوائی جہاز نہیں دیکھا؟"

"یہ ایک نئی کمپنی کا ہوائی جہاز ہے۔ ذرا غور سے دیکھو۔ مضبوط بھی ہے یا نہیں؟"

خان صاحب ہنسنے لگے "ارے بٹ۔ یہ سب ہوائی جہاز امریکا کے بنے ہوئے ہیں اور دنیا کی ساری کمپنیاں یہی جہاز استعمال کرتی ہیں۔ دیکھتے نہیں سب کچھ ویسا ہی ہے۔"

بولے "سب کچھ تو ویسا نہیں ہے۔ مسافر الگ ہیں اور وہ دیکھو ایک ائر ہوسٹس کالی بھی ہے۔ میں نے تو زندگی میں پہلی سیاہ فام ائر ہوسٹس دیکھی ہے۔ پتا نہیں اسے انگریزی آتی ہے یا نہیں۔"

"بندہ خدا۔ یہ امریکا میں پیدا ہوئی ہے۔ یہاں تو بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے۔ دیکھا نہیں سارے کالے لوگ بھی انگریزی ہی بولتے ہیں۔"

ائر ہوسٹس کا رنگ تو سیاہ تھا مگر اس میں بھی ایک دل آویزی تھی۔ قدو قامت اور جسم بھی مناسب تھا۔ سب سے اچھی چیز اس کی مسکراہٹ تھی۔

بٹ صاحب بولے "اسے بلا نہیں سکتے؟"

"مگر کیوں۔ اس سے کیا کہو گے؟"

"نیویارک پہنچنے کا ٹائم پوچھ لیں گے۔"

خان صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ائر ہوسٹس کی نظر پڑی تو تیر کی طرح آ گئی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے شیریں آواز میں پوچھا۔

خان صاحب بوکھلا گئے "جی' جی نہیں' جی ہاں۔ میں ذرا"

ہم نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور کہا "بات یہ ہے کہ انہوں نے بہت دیر سے کافی نہیں پی ہے اس لیے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"اوہ!" وہ تشویش سے بولی "میں ابھی کافی لا دیتی ہوں۔ کیا آپ لوگ بھی پینا پسند کریں گے؟"

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو۔"

وہ مسکرائی "مائنڈ کرنے کا کیا سوال ہے۔ یہ تو میرا فرض ہے" وہ ہوا کی رفتار سے غائب ہو گئی۔

"کتنی اچھی خوشبو لگا رکھی ہے اس نے" خان صاحب نے تبصرہ کیا "اور اخلاق بھی کتنا اچھا ہے۔"

"واقعی" بٹ صاحب بولے "بغیر بلائے ہی آ گئی۔ فرض شناسی تو ان لوگوں پر ختم ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے پی آئی اے کی ائر ہوسٹسز پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ نخرے کرتی ہیں' اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتی ہیں۔ اخلاق سے بات نہیں کرتیں۔ چائے پانی مانگو تو کہتی ہیں کہ جہاز کے اڑنے کا انتظار کریں اور ایک یہ ہے اتنی دیر میں وہ مجموعہ خوبی پھر مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی۔ ایک ٹرے میں کافی بھرے کاغذ کے گلاس رکھے ہوئے تھے جو اس نے ہم تینوں کے حوالے کر دیے پھر ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ڈبیا میں سے دو گولیاں نکال کر خان صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ سر درد کی گولیاں ہیں۔ ایک منٹ میں آرام آ جائے گا۔"

"مگر۔ مگر میں تو۔"

"بے پروائی مت کرو' منہ کھولو۔"

خان صاحب نے بے اختیار منہ کھول دیا۔ اس نے دونوں گولیاں ان کے منہ میں ڈال دیں "بس نگل لو آرام سے۔ اس کے بعد کافی کا ایک گھونٹ بھر لینا۔" یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئیں مگر خان صاحب دیر تک ہچکیاں اور ابکائیاں لیتے رہے۔

"بھئی کیا بات ہے' ہچکیاں کیوں لے رہے ہو؟"

"یار' میں نے تو آج تک کبھی گولی کھائی ہی نہیں ہے اور یہ ایک کی جگہ دو گولیاں کھلا گئی۔"

"بہت ناشکرے ہو" بٹ صاحب نے ڈانٹا "کتنے پیار سے کھلا کر گئی ہے۔ اتنے پیار سے تو کوئی زہر بھی کھلائے تو کھا لینا چاہیے" پھر کہا "مگر ہم لوگوں نے بہت بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"بد اخلاقی!"

"اور کیا۔ اس بے چاری کا نام تک نہیں پوچھا۔"

نیویارک تک اس بے چاری نے ہم لوگوں پر خاص توجہ رکھی۔ کھانے پینے کے علاوہ بار بار خان صاحب کی مزاج پرسی بھی کرتی رہی۔

خان صاحب بے حد متاثر ہوئے' کہنے لگے "سچ ہے' اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔"

"یہ آپ کی اپنی کیسے ہو گئی؟" ہم نے پوچھا۔

"یار کالی تو ہے نا۔ ورنہ ان گوری میموں کا تو خون بھی سفید ہوتا ہے۔ خلوص اور محبت تو شاید ان کے پاس سے ہو کر نہیں گزرے۔"

بٹ صاحب بولے "میرا خیال ہے کہ نیویارک پہنچ کر کوئی قاضی ڈھونڈنا پڑے گا۔ یہ رشتہ مجھے بھی پسند ہے" اس اثناء میں بٹ صاحب نے اس کا نام بھی پوچھ لیا تھا۔

"کیتھرین!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کس قدر شاہانہ نام ہے" خان صاحب نے تبصرہ کیا "پرانے زمانے میں ہر ملکہ کا نام کیتھرین ہوا کرتا تھا۔"

اس طرح نیویارک تک کا سفر اچھا گزر گیا۔ لیکن خان صاحب کو رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ انہوں نے نورا کا پتا دریافت نہیں کیا۔

نیویارک کا کینیڈی ائرپورٹ بہت دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی شان و شوکت

اور خوب صورتی میں بھی کوئی کلام نہیں ہے اور کیوں نہ ہو' آخر امریکا کے سب سے بڑے شہر کا ائرپورٹ ہے۔ لیکن یہ سب رعب داب اسی وقت تک ہے جب تک آپ ائرپورٹ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ ائرپورٹ کے باہر ایک نئی دنیا آپ کی منتظر ہے۔ ابھی ہوائی جہاز نے لینڈ بھی نہیں کیا تھا کہ بٹ صاحب نے کھڑکی میں سے جھانکنا شروع کر دیا۔ پہلے تو انہوں نے خان صاحب کو سیٹ بدلنے پر مجبور کیا اور پھر بار بار شیشے سے جھانک کر باہر دیکھتے رہے۔ جب کچھ نظر نہ آیا تو وہ اٹھ کر دوسری کھڑکی کے پاس پہنچ گئے اور جھک جھک کر باہر دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کھڑکی کے سامنے والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر خاتون اور ان کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے شوہر بھی ہو سکتے تھے۔ دراصل ان ملکوں میں آپ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کس مرد اور عورت میں کیا رشتہ ہے۔ وہ صاحب عورت کے بوائے فرینڈ بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ بھی نہ ہوں۔ بس پل دو پل کے ساتھی ہوں۔ جب بٹ صاحب کی بے تابی زیادہ بڑھی تو ان دونوں نے انہیں گھورنا شروع کر دیا۔ پھر بھی وہ باز نہ آئے تو انہوں نے ائر ہوسٹس کو بلانے کے لیے کال بیل دبا دی۔ خوش قسمتی سے کیتھرین ہی ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے اس کے کان میں کچھ کانا پھوسی کی۔ ظاہر ہے کہ بٹ صاحب کی شکایت ہی کی ہو گی۔ خان صاحب اپنی جگہ پر بیٹھے پیچ و تاب کھا رہے تھے "یار اس بندے کو کیا ہو گیا ہے؟ بیٹھے بٹھائے پاگل ہو گیا ہے' اب ہمیں بھی ذلیل کرائے گا۔"

کیتھرین نے پہلے تو بہت غور سے ان خاتون کی باتیں سنیں اور پھر بٹ صاحب کی طرف دھیان دیا۔ "سر' میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ اپنی سیٹ پر کیوں نہیں بیٹھتے؟؟"

بٹ صاحب بولے "وہاں سے کچھ نظر نہیں آتا۔"

اس نے کہا "سب کچھ تو نظر آرہا ہے نیلا آسمان' سفید سفید بادل' آپ کو اور کیا دیکھنا ہے؟؟"

بولے "آزادی کا مجسمہ!"

کیتھرین ہنسنے لگی' بولی "سر وہ تو بندرگاہ پر ہے۔ اگر آپ بحری جہاز سے نیویارک آتے تو سب سے پہلے وہی دیکھنے کو ملتا۔ آپ شاید بھول گئے کہ آپ پلین میں سفر کر رہے ہیں۔"

اب خان صاحب سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے جا کر بٹ صاحب کا ہاتھ تھام لیا اور اس طرح دانت پیس کر گھورا جیسے کچا ہی چبا جائیں گے "بس بٹ جی' بہت ہو چکی۔ اب اپنی جگہ پر آجاؤ۔ نیویارک پہنچ کر آپ کو آزادی کا مجسمہ بھی دکھادیں گے۔"

بٹ صاحب کو نیویارک میں دو چیزیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک آزادی کا مجسمہ اور دوسرا اقوام متحدہ کا صدر دفتر۔ باقی دوسری چیزوں سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ سارے راستے وہ فکر مند ہوتے رہے کہ نیویارک کی سیر کس طرح کریں گے۔ ہم نے کہا "پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ وہاں انڈر گراؤنڈ اور بس' ٹیکسی سب چیزیں مل جاتی ہیں۔"

"مگر وہاں تو جرائم بہت ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ بات بات پر تو لوگ گولی مار دیتے ہیں فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر لوٹ لیتے ہیں۔ کیا ہم ہوٹل کے اندر بند ہو کر بیٹھ جائیں گے؟؟ تو پھر نیویارک آنے کا فائدہ کیا ہوا؟؟"

خان صاحب نے انہیں سمجھایا "بٹ جی۔ اس شہر کی آبادی ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ وہ سب کے سب اندر بند ہو کر تو نہیں بیٹھے رہتے ہوں گے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ سب سے بڑا کاروباری مرکز ہے۔ یو این او کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ کوئی مذاق تو نہیں ہے۔"

مگر بٹ صاحب کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ بار بار کہتے رہے "بڑی غلطی ہو گئی۔ میں تو انشورنس کرا کے بھی نہیں آیا۔ مرگئے تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

"مر گئے تو کچھ ملے نہ ملے' آپ کو کیا فرق پڑے گا؟؟"

کہنے لگے "گھر والوں کو تو فرق پڑے گا۔ انسان کو دوسروں کے لیے زندہ رہنا چاہیے"

"اور دوسروں کے لیے ہی مرنا چاہیے" خان صاحب نے مشورہ دیا "تاکہ مرنے کے بعد دوسروں کو انشورنس کی رقم مل جائے۔"

☆ ☆ ☆

ہم جان ایف کینیڈی ائرپورٹ اترے۔ نیویارک میں تین ائرپورٹ ہیں- ایک کینیڈی ائرپورٹ جہاں قریب قریب سبھی انٹرنیشنل فلائٹس آتی ہیں۔ اندرون ملک آمدو رفت کے لیے عام طور پر دوسرے ائر پورٹ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک کا نام "لاگارڈیا" ہے اور دوسرے کا "نیو آرک" جب ہمیں کیتھرین نے ہوائی جہاز کے سفر کے دوران میں یہ

معلومات فراہم کی تھیں تو بٹ صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ جہاز سے باہر نکلتے وقت وہ بار بار پوچھتے رہے "پتا بھی ہے' یہ کون سا ائرپورٹ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم کسی غلط ائرپورٹ پر اتر جائیں۔"

کیتھرین نے ہم سے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ لوگوں نے ہوٹل میں پیشگی بکنگ کرالی ہے یا نہیں کیونکہ اس کے بغیر ہوٹل میں جگہ ملنی بہت مشکل ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں بٹ صاحب کے لیے کافی پریشان کن تھیں۔ ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلے تو وہ پوچھنے لگے "ہم نے تو ہوٹل میں بکنگ بھی نہیں کرائی' اب ہم کہاں ٹھہریں گے؟"

"پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی۔ نہیں ملی تو کسی پارک میں ڈیرا جمائیں گے۔" خان صاحب نے انہیں تسلی دی۔

ہم نے کہا "اور یہاں ہپی کیمپ بھی ہوتے ہیں۔ تھوڑے سے ڈالر دیں گے تو وہاں رہنے کی جگہ بھی مل جائے گی اور ہیروئن بھی۔"

"بہت خوب" وہ خوش ہو گئے "میرا خیال ہے ہپی کیمپ ہی چلتے ہیں۔ کافی سستا پڑے گا۔" ہمیں معلوم تھا کہ بڑے شہروں میں ہوٹلوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے اور کہیں نہ کہیں رہنے کی جگہ مل ہی جاتی ہے۔ بیرونی عمارت سے باہر نکل کر خان صاحب نے ٹیکسی کے لیے اشارہ دیا اور سامنے سے گزرتی ہوئی ایک پیلی ٹیکسی ہمارے پاس آکر رک گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور خاصا اسمارٹ نوجوان تھا۔ رنگ گورا تھا مگر دھوپ کی تمازت سے کچھ سانولا ہو گیا تھا۔ چہرے پر داڑھی مونچھیں بھی تھیں۔ جنوبی امریکا کے کسی ملک کا رہنے والا لگتا تھا۔ ٹیکسی روک کر وہ باہر نکلا اور خاموشی سے ہمارا سامان اٹھا کر ٹیکسی میں رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ ہماری طرف آیا اور ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولنے کے بعد اردو میں ہم سے مخاطب ہوا "قبلہ۔ کہاں جائیں گے؟"

اگر ہم پر ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ گر پڑتی تو شاید ہمیں اتنی حیرانی نہ ہوتی جتنی نیویارک کے اس ٹیکسی ڈرائیور کی زبان سے سلیس اردو سن کر ہوئی تھی۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ نیویارک میں درجنوں نہیں، سینکڑوں پاکستانی ٹیکسی چلاتے ہیں مگر یہ خیال نہ تھا کہ ائرپورٹ سے باہر قدم نکالتے ہی ہمارا واسطہ پاکستانی ٹیکسی والے سے پڑ جائے گا جس کے پاکستانی ہونے کا ہمیں مطلق گمان نہ تھا۔

بٹ صاحب تو اتنے بوکھلائے کہ بے اختیار اس کے گلے لگ گئے اور پوچھنے لگے "بھائی صاحب' کیا آپ پاکستانی ہیں؟"

وہ مسکرایا "جی ہاں۔ اللہ کے فضل سے"

کہنے لگے "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہمارے پیچھے ٹیکسیوں کی ایک لمبی قطار لگ گئی تھی۔ بولا "اندر تو بیٹھیے باقی باتیں ٹیکسی میں ہوں گی۔"

اگر ہمارا ملک ہوتا تو اب تک پیچھے رک جانے والے ٹیکسی ڈرائیوروں نے ہارن بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا ہوتا مگر امریکا میں ایسا نہیں ہوتا انتہا یہ ہے کہ نیویارک تک میں ایسا دستور نہیں ہے حالانکہ نیویارک ہمیں کئی لحاظ سے بہت اپنا اپنا سا لگا۔

ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی اسٹارٹ ہو گئی' ٹیکسی والے نے کہا "مجھے ابرار کہتے ہیں۔ ابرار دہلوی۔"

خان صاحب بولے "اچھا تو انڈین ہو؟"

"ارے نہیں صاحب۔ پاکستانی ہوں' خالص پاکستانی' کراچی میں پیدا ہوا تھا۔"

"تو پھر یہ دہلوی"

وہ بات کاٹ کر بولا "میرے والد صاحب دہلی سے آئے تھے اور دہلی پر تو ہمارا بہت حق ہے۔ سینکڑوں برس دہلی پر حکومت کی ہے ہمارے جد امجد نے' ویسے میں نے تو کبھی دیکھا تک نہیں دہلی۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور چپ ہو گیا۔

معلوم ہوا کہ سات برس سے نیویارک میں ہے۔ پہلے گیس اسٹیشن پر نوکری کی پھر ریستوران میں کام کیا اور اب دو سال سے ٹیکسی چلاتا ہے "بس قبلہ۔ زندگی کے دن گزار رہا ہوں۔"

"قبلہ کس کو کہہ رہے ہو؟" خان صاحب نے ڈانٹ کر پوچھا "بھائی ہم تو خود ابھی جوان ہیں۔ اتنے بزرگ نہیں ہوئے کہ قبلہ وبلہ کہلائیں۔"

اس کے بعد خان صاحب نے اپنا اور ہمارا تعارف کرایا اور بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملائے گئے۔ پتا نہیں اتنی دیر میں ہم کتنی دور آگے نکل آئے تھے۔ یکایک ابرار دہلوی کو خیال آیا کہ اس نے ہماری منزل کا پتا تو پوچھا ہی نہیں ہے۔ ویسے اس نے پوچھا تھا مگر ہم

لوگ کسی اور بحث میں پڑ گئے تھے۔

"قبلہ' یہ فرمائیں کہ جائیں گے کہاں؟" اس نے دریافت کیا۔

"پھر وہی قبلہ؟"

"ناراض نہ ہوں قبلہ۔ یہ میرا تکیہ کلام ہے۔"

"خیر ٹھیک ہے" خان صاحب نے اس کی معذرت قبول کر لی۔ یکایک بٹ صاحب بولے "اس سے کیوں نہ پوچھ لیں؟"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے" خان صاحب نے تائید کی اور پھر ابرار سے مخاطب ہوئے "قبلہ ہمیں کسی اچھے اور سستے ہوٹل میں قیام کرنا ہے۔ تم تو اب نیویارکوی ہو گئے ہو۔ سب جانتے ہو گے۔"

"آپ فکر ہی نہ کیجئے قبلہ۔ سمجھئے کہ آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ اب آپ لوگ اطمینان سے بیٹھ جائیں اور نیویارک کی گلیاں اور عمارتیں دیکھیے۔ کیا آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں؟"

خان صاحب کے اقرار پر اس نے نیویارک کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ ہم لوگ جن سڑکوں سے گزر رہے تھے ان کے بارے میں بتایا۔ عمارتوں' پارکوں اور شاپنگ سینٹرز کے بارے میں بتایا۔ نیویارک کے اٹھائی گیروں اور جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں بتایا اور خاص طور پر کالوں سے ہوشیار رہنے کی تائید کی۔

"تمہیں گھر تو یاد آتا ہو گا؟" بٹ صاحب نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھئے' بہت یاد آتا ہے اور نیویارک میں تو ہر قدم پر یاد آتا ہے۔ آپ بھی گھومیں پھریں گے تو آپ کو اپنا شہر یاد آ جائے گا۔"

ابرار نے ٹھیک ہی کہا تھا جب نیویارک کو ذرا تفصیل سے دیکھا تو قدم قدم پر لاہور کی یاد تازہ ہو گئی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ نیویارک ہے جس کی ساری دنیا میں اتنی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مثلاً سب سے پہلا دھچکا تو اس وقت لگا جب ٹیکسی نے اچھلنا شروع کر دیا۔

بٹ صاحب نے پوچھا "کیا بات ہے قبلہ۔ کیا گاڑی پنکچر ہو گئی ہے؟"

"جی نہیں۔ یہ نیویارک کی سڑکیں ہیں۔ ہر قدم پر گڑھوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ذرا سامنے والی سڑک پر نظر تو ڈالیے۔"

ہم سب نے سڑک پر نظر ڈالی۔ وہی لاہور اور کراچی والا نقشہ نظر آیا۔ یعنی جا بجا اکھڑی اور ادھڑی ہوئی' ناہموار اور گڑھوں سے پر۔

ہم نے پوچھا "بھائی ابرار۔ یہ کیا قصہ ہے؟"

وہ ہنسنے لگا "قبلہ امریکی اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ نیویارک وہ جگہ ہے جہاں ان کے غرور کا سر نیچا ہو جاتا ہے۔ ابھی تو آپ اور بہت کچھ دیکھیں گے" اس نے ایک چوڑی سی سڑک پر موڑ کاٹا اور ہم ایک مزید کشادہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ ایک ایکسپریس وے تھی جس کا نام اس وقت ہمیں یاد نہیں آ رہا مگر کیا ایکسپریس وے تھی؟ ہم نے امریکا اور کینیڈا میں بہت ایکسپریس ویز دیکھی ہیں۔ یہ بڑی شاہراہیں ہوتی ہیں جن پر بیک وقت چار پانچ کاریں تیز رفتاری سے دوڑ سکتی ہیں اور راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی مگر یہ ایکسپریس وے ان سے مختلف تھی۔ اول تو اس کا ایک حصہ ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ پلاسٹک کے سرخ رنگ کے لمبوترے ڈبے رکھے ہوئے تھے اور بجری' پتھر اور ملبا سا پڑا ہوا تھا۔

"قبلہ یہ کیا ہو رہا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"ایکسپریس وے کی مرمت ہو رہی ہے قبلہ۔ چھ مہینے سے تو میں دیکھ رہا ہوں' شاید میرے بوڑھے ہونے تک مکمل ہو جائے گی۔"

"یقین نہیں آیا کہ امریکا میں اور خاص طور پر نیویارک شہر میں بھی ایسا ہوتا ہے۔"

"یہاں کیا نہیں ہوتا قبلہ" ابرار ہنسا "یہاں بھی سڑکوں کی تعمیر اور مرمت کے منصوبے ہم سے کچھ کم نہیں ہوتے۔ میں نے تو کبھی اس شہر کی تمام سڑکیں بنی ہوئی نہیں دیکھیں۔ کہیں نہ کہیں کھدائی' مرمت اور تعمیر کا کام ہوتا ہی رہتا ہے۔ مین ہٹن سے بروکلین کو ملانے والا پل سن ۲۰۰۵ء میں مکمل ہو گا۔ اس وقت تک لوگوں کا تو کباڑہ ہو جائے گا۔ یہاں بروکلین' کوئنز ایکسپریس وے کو چوڑا کرنے کا سلسلہ ایک سال سے جاری ہے اور ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ ریسٹ ریور ڈرائیو تو ایسی سڑک ہے جس پر چھ لین ہیں مگر ان میں سے دو تین ہمیشہ مرمت کے لیے بند ہی رہتی ہیں۔ سڑک کے کسی نہ کسی حصے پر کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اور کچھ نہیں تو سڑک کے اوپر نئی کارپٹنگ ہوتی رہتی ہے اور نیچے سے اس کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے۔ یہ توفیق نہیں ہے کہ پوری سڑک کو اوپر

سے نیچے تک دوبارہ بنا دیں۔"

"دوبارہ کیوں نہیں بناتے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"دوبارہ بنائیں گے تو خرچ بہت ہو گا۔ دوبارہ کارپٹ کرنے پر تو فی میل پچاس ہزار ڈالر خرچہ ہوتا ہے لیکن سڑک کو نئے سرے سے بنانے پر دس لاکھ ڈالر فی میل خرچ ہوتے ہیں۔ اب اتنا خرچہ کون اٹھائے گا؟ میئر کہتا ہے کہ ہم تو پہلے ہی دیوالیے ہو گئے ہیں۔"

نہ جانے کیوں، نیویارک کا یہ حال زار سن کر ہمیں قدرے خوشی کا احساس ہوا مگر مزید سننے کے لیے کہا "ارے نہیں ابرار صاحب قبلہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ امریکی ہائی ویز تو ساری دنیا میں مشہور ہیں۔"

"جی ہاں مگر نیویارک کی ہائی ویز کی بھی بڑی شہرت ہے۔ سٹی ٹرانسپورٹ ڈیپارٹمنٹ بھی ہے جو بڑے بڑے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ پیدل چلنے والوں کو بڑی سڑکیں کراس کرنے سے روک دیں گے، رکاوٹیں کھڑی کر دیں گے۔ سڑکوں کے اندر ایسے آلات لگا دیں گے کہ ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں کا پتا چل جائے گا۔ تیز رفتار ڈرائیونگ کرنے والوں کی روک تھام کے لیے ویڈیو کیمرے لگا دیں گے۔ یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ بس جی، سب کھانے پینے کے طریقے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے مگر نئے نئے منصوبے بنتے رہتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کمشنر صاحب کہتے ہیں کہ کیا کریں۔ ہم ہائی ویز بناتے رہتے ہیں مگر وہ اس سے بھی زیادہ رفتار سے ٹوٹتی رہتی ہیں۔"

دو چار زوردار جھٹکے لگے اور ابرار کی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ جھٹکے لاہور کی سڑکوں پر بھی لگتے ہیں مگر برے نہیں لگتے کیونکہ ہم لوگ ان کے عادی ہو چکے ہیں اور پھر اپنے شہر کے جھٹکے ہیں مگر نیویارک کی سڑکوں پر کاروں کی اچھل کود کچھ عجیب ہی لگتی ہے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ ہم ایک بڑی اور آرام دہ ٹیکسی کار میں سفر کر رہے تھے ورنہ شاید انجر پنجر ڈھیلا ہو جاتا۔

"یار ان سڑکوں کا یہ حال کس نے بنایا ہے؟" خان صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"قبلہ یہاں بھی وہی چکر ہے جو اپنے کراچی اور لاہور میں ہے۔ کبھی پانی کے پائپ ڈالنے والے آجاتے ہیں اور سڑک کھود کر رخصت ہو جاتے ہیں، کبھی سیوریج والوں کی

کھدائی اور توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ بجلی، ٹیلی فون لائنز، گیس کے پائپ سب کے لیے سڑک کو کاٹنا اور کھودنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد کافی عرصے تک سڑک یوں ہی کھدی کھدائی پڑی رہتی ہے۔ ایک اخبار نے لکھا تھا کہ ہر بلاک پر ہر سڑک سال میں دو تین بار ضرور کھودی اور کاٹی جاتی ہے۔ تو پھر سڑکوں کا یہ حال کیوں نہ ہو گا قبلہ؟"

خان صاحب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی کی چھت کی جانب دیکھا اور کہا "یا اللہ تیرا شکر ہے کہ نیویارک میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ اب ہم امریکیوں کے سامنے سر نیچا کر کے نہیں چلیں گے۔ تھینک یو ابرار دہلوی۔ تم نے ہمارے احساس کمتری کو دور کر دیا ہے۔"

ابرار دہلوی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا "قبلہ۔ یہ امریکی بہت بڑھ چڑھ کر بولتے ہیں۔ آپ ذرا گھوم پھر کر نیویارک کو دیکھیں گے تو ان کا پول کھل جائے گا۔"

اور واقعی ابرار دہلوی کی یہ پیش گوئی بعد میں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ سارا نیویارک ہی ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا۔ بھئی، آخر نیویارک ہے کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کشادہ، خوب صورت سڑکیں، وسیع و عریض چوک۔ خوب صورتی سے ترشے ہوئے درخت، بلند و بالا اور شاندار عمارتیں، چہل پہل سبھی کچھ تھا۔ جو سڑکیں اچھی تھیں وہ بہت ہی اچھی تھیں اور جو شکستہ اور محتاج پیوند تھیں انہیں دیکھ کر آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ نیویارک اپنی اونچی اونچی عمارتوں کے لیے ہمیشہ سے مشہور ہے۔ ہم نے ہوش سنبھالا تھا تو وہاں کی عمارتوں کی شان و شوکت اور بلندی کے بارے میں سنا تھا۔ اس طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔

سوال "دنیا کی سب سے اونچی عمارت کون سی ہے؟"

جواب "نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ۔"

پھر نیویارک کو تصویروں اور فلموں میں دیکھا۔ ہالی ووڈ کی فلموں نے نیویارک کو اچھوتے رنگ میں پیش کیا۔ ایک زمانہ تھا جب دنیا کے چند شہروں کا نام ضرب المثل کے طور پر لیا جاتا تھا اور ان کی زیارت کرنا ہر شخص کی حسرت ہوا کرتی تھی۔ لندن، روم، پیرس اور نیویارک۔ ہر گفتگو کی تان یہیں جا کر ٹوٹا کرتی تھی۔ بعد میں تو جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی گئی، ملک خوشحال ہوتے گئے تو شہر بھی پھیلتے اور پھلتے پھولتے رہے۔ اب شہروں کی کیا کمی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شہر موجود ہے لیکن مذکورہ بالا چاروں شہر آج بھی عام شہروں کے

سرتاج سمجھے جاتے ہیں۔ نیویارک واقعی امریکا کے سر کا تاج ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعض پہلو سنگین بھی ہیں اور غمگین کرنے والے بھی، اطمینان رکھیے، ہم آپ کو نیویارک کے سبھی روپ دکھائیں گے۔

☆ ☆ ☆

ہماری ٹیکسی شاندار اور پرشکوہ علاقوں سے بھی گزری اور شکستہ حصوں کو بھی اس نے عبور کیا۔ ابرار دہلوی نیویارک کے بارے میں بتاتے رہے مگر زیادہ تر انہوں نے پاکستان کے بارے میں ہی گفتگو کی۔ نیویارک کی کسی عمارت یا خوبی کا بیان کرتے کرتے وہ اچانک پوچھ بیٹھتے۔ قبلہ یہ بتائیے کہ مال روڈ کے کیا حال ہیں؟ کبھی کلفٹن بھی جانا ہوتا ہے؟ زیب النساء اسٹریٹ کس حال میں ہے؟ آج بھی وہاں ویسی ہی رونق لگتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ! اس لیے ان کا تعارفی بیان کچھ بے ربط سا ہو کر رہ گیا تھا۔

"قبلہ، یہ سڑک دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ ریڈیو سٹی میوزک ہال کو جاتی ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا سینما گھر ہے۔ چھ ہزار سیٹیں ہیں اس کے اندر۔ ویسے اپنے بمبینو اور ریکس سنیما کا بھی جواب نہیں تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی انسان خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا تھا۔ ریکس کے سامنے والے چوک کے میوزیکل فوارے کی تو بات ہی اور ہے۔"

خان صاحب اور بٹ صاحب کافی دیر تک چپ بیٹھے رہے تھے۔ جب انہیں جماہیاں آنے لگیں تو خان صاحب بولے "قبلہ ابرار صاحب، آپ کہیں ہمیں واپس میامی تو نہیں لے جا رہے، بذریعہ سڑک؟"

"ارے نہیں قبلہ۔"

"تو پھر یہ راستہ کب ختم ہو گا۔ ان پتھریلی عمارتوں کو دیکھ دیکھ کر میری تو آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔"

ابرار دہلوی ہنس پڑے۔ "قبلہ، بے کل نہ ہوں، تسلیم کہ راستہ کچھ لمبا ہے لیکن میں آپ کو مڈ ٹاؤن لے کر جا رہا ہوں۔"

بٹ صاحب بھی آخر بول پڑے "بھائی جان۔ ہمیں کسی اور شہر لے جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں تو نیویارک دیکھنا ہے۔"

"قبلہ۔ یہ سبھی نیویارک ہے اور مڈ ٹاؤن کا علاقہ تو نیویارک کے دل، مین ہٹن کا دل

ہے۔ وہاں ہوٹلوں کی کمی نہیں ہے۔ کسی اور علاقے میں جگہ ملے نہ ملے، مڈ ٹاؤن کے ہوٹلوں میں جگہ ضرور مل جاتی ہے۔ آپ لوگ سیزن میں آئے ہیں اور وہ بھی بکنگ کے بغیر۔ سر چھپانے کو جگہ تو ملنی ہی چاہیے نا؟"

خان صاحب بولے "اب ہمیں اور کتنی دور لے جاؤ گے۔ بھائی کہیں ہمیں چکر تو نہیں دے رہے ہو؟"

"چکر۔ کیسا چکر قبلہ؟"

"ویسا ہی چکر جو ٹیکسی والے اجنبی مسافروں کو دیا کرتے ہیں، بلاوجہ سارے شہر کی سیر کرا کے برابر والے ہوٹل میں چھوڑ دیتے ہیں۔"

"بڑے افسوس کا مقام ہے قبلہ۔ ایک پاکستانی بھائی کے خلوص کا یہ صلہ دیا ہے آپ نے؟"

"ناراض نہ ہوں۔ میں نے تو ویسے ہی ایک مثال دی تھی۔"

"بس چند منٹ بعد آپ ہوٹل کے کمرے میں ہوں گے۔ وہ سامنے آسمان سے باتیں کرتی ہوئی بلڈنگیں دیکھ رہے ہیں نا؟"

"بھائی یہاں کون سی بلڈنگ ہے جو آسمان سے باتیں نہیں کرتی؟"

"یہ تو ٹھیک کہا آپ نے مگر یہ عمارتیں راک فیلر سینٹر کی ہیں۔ یہ کل ملا کر اکیس عمارتیں ہیں اور سب ایک دوسری سے بڑھ کر۔ یہ عمارتیں آٹھ سڑکوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ چھیالیس ویں اسٹریٹ سے لے کر ترپن ویں اسٹریٹ تک ان ہی کا راج ہے۔ ففتھ ایونیو اور ساؤتھ ایونیو کے درمیان کی جگہ راک فیلر سینٹر نے گھیری ہوئی ہے۔ اگر موقع ملا تو آپ کو چینل گارڈنز بھی دکھاؤں گا۔ ففتھ ایونیو کے بغل میں ہے۔"

"مطلب یہ کہ بغل میں بچہ، شہر میں ڈھنڈورا" خان صاحب نے محاورہ دانی کا مظاہرہ کیا۔

ابرار، دہلی کا رہنے والا تھا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ محاورے کے غلط استعمال پر اس نے ہم لوگوں کو ٹیکسی سے نہیں اتار دیا۔ لیکن چہرے پر انقباض کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ معاملہ رفع دفع کرنے کی غرض سے بولا "لیجیے قبلہ۔ ہم پہنچ گئے وہاں۔"

ایک بہت اونچی عمارت کے بازو میں اس نے ٹیکسی روک دی "آگئی ہوٹلوں کی

منڈی۔" اس نے خوش ہو کر کہا "ہوٹل ہی ہوٹل اور کمرے ہی کمرے جتنے مرضی آئے لے لیں۔"

اس نے ٹیکسی میں سے ہمارا سامان باہر نکالنا شروع کر دیا۔ "میری مانیں قبلہ تو یہ بازو والا رچمنڈ ہوٹل مناسب رہے گا۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں ہے اور آرام بڑے ہوٹلوں جیسا' آپ ذرا یہیں ٹھہریں۔ میں ٹیکسی پارک کر کے آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ٹیکسی سمیت غائب ہو گیا۔

"چلا گیا؟" خان صاحب نے بے اعتباری سے کہا "ٹیکسی کا کرایہ بھی نہیں لیا۔ میرا خیال ہے ناراض ہو گیا ہم سے۔"

بٹ صاحب بولے "آپ نے بات بھی تو بہت بے تکی کی تھی۔ وہ بے چارہ ہم سے مل کر خوشی سے مرا جا رہا ہے اور آپ اس پر بے اعتباری کر رہے ہیں اور بے ایمانی کا الزام لگا رہے ہیں۔"

"یار میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی تھی۔ ہم نے تو یہی سنا ہے بڑے شہروں کے ٹیکسی والوں کے بارے میں۔"

"پانچوں انگلیاں ایک برابر نہیں ہوتی ہیں خان صاحب" بٹ صاحب جذباتی ہو گئے۔

"یار غلطی ہو گئی۔ معاف کر دو۔ اگر وہ اللہ کا بندہ واپس آگیا تو اس سے بھی معافی مانگ لوں گا۔"

ہم نے کہا "بھائی۔ یہ معافی تلافی تو ہوتی رہے گی مگر اب ہم کیا کریں؟ کسی ہوٹل کی تلاش میں جائیں یا یہیں کھڑے رہیں؟"

"خان صاحب نے سوچا پھر بولے "پانچ سات منٹ انتظار کرنے میں کیا حرج ہے۔ اور یہ بھی تو سوچیں کہ ہمیں اس کا بل بھی ادا کرنا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ پاکستانی بھائی اس کا بل لے کر فرار ہو گئے۔"

تجویز نہایت معقول تھی اس لیے بٹ صاحب نے بھی فوراً تائید کر دی ورنہ خان صاحب کی پیش کردہ تجویز میں وہ عموماً کیڑے ہی نکالتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ہم نے آس پاس کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ بہت بارونق جگہ تھی۔ نیویارک کی سڑکوں کے بارے میں یہ تو کہنا پڑتا ہے کہ وہ کھدی پڑی ہوں یا گڑھوں سے پر ہوں۔ لیکن ہیں بہت

کشادہ' اکثر مقامات پر دو طرفہ ٹریفک ہے۔ چوک جنہیں وہاں بولیورڈ کہا جاتا ہے' اتنے کشادہ ہیں کہ وہاں فٹ بال کا میچ کھیلا جا سکتا ہے۔ ٹریفک سگنلز ہر جگہ ہوتے ہیں اور عام طور پر چلتے بھی رہتے ہیں لیکن ٹریفک نہایت بے ہنگم ہے۔ پیدل چلنے والوں کے لیے تو نیویارک کے ڈرائیوروں کے دل میں ذرا سا بھی رحم نہیں ہے۔ بس اندھا دھند کاریں دوڑاتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ پیدل چلنے والے کی ہمت اور قسمت پر منحصر ہے کہ وہ ان کی دست برد سے محفوظ ہو جائے۔ عام طور پر اس معاملے میں تقدیر کا زیادہ دخل دیکھا کیونکہ بولیورڈ بہت زیادہ چوڑے ہیں اور ٹریفک بھی مسلسل جاری رہتا ہے اس لیے سڑکیں عبور کرنے والوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن مقامات پر اختیاری کراسنگ ہے یعنی لکھا ہوا ہے کہ پیدل چلنے والے یہاں سے سڑک عبور کریں' مگر ٹریفک لائٹ موجود نہیں ہے' یہاں خاصی بھاگ دوڑ دیکھنے میں آتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ راہ گیر اس تاک میں ہے کہ ٹریفک کے تسلسل میں کوئی تعطل آئے تو وہ سڑک پار کرے۔ جب اسے ٹریفک دور دور تک نظر نہیں آتا تو وہ زیبرا کراسنگ پر قدم رکھ دیتا ہے۔ لیکن درمیان میں پہنچ کر اسے پتا چلتا ہے کہ ایک کار نمودار ہو چکی ہے اور اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد راہ گیر اپنی رفتار تیز کر دیتا ہے کہ سڑک کا باقی ماندہ حصہ بھی عبور کر لے۔ ادھر کار والا بھی کار کی رفتار تیز کر دیتا ہے۔ خدا جانے وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ بے حسی یا مردم آزاری کے سوا اور کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ اب منظر یہ ہے کہ پیدل راہ گیر سڑک کو عبور کرنے کے لیے بھاگ رہا ہے اور کار اس کی طرف بھاگ رہی ہے۔ ان چوراہوں پر حادثات بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل بعد میں بتائیں گے۔ فی الحال تو ہم وقت گزاری کے لیے نیویارک کے مڈ ٹاؤن کی ایک سڑک پر کھڑے ہیں اور بلند و بالا عمارتیں دیکھ رہے ہیں۔ نیویارک اس اعتبار سے بھی امریکا کا نرالا شہر ہے کہ یہاں ہر قوم' ہر نسل اور ہر رنگ کے لوگ کافی تعداد میں نظر آتے ہیں اور کالے تو خیر ہیں ہی۔ ان کے بارے میں خان صاحب کا تبصرہ یہ ہے کہ کالے تو امریکیوں کو جہیز میں ملے ہیں۔ ویسے کالوں کا طرز عمل بھی کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ لوگوں کا سمدھیانے میں یا داماد کا سسرال میں ہوتا ہے' یعنی تن آسانی۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ بالکل ہاتھ نہ ہلائیں اور سارے عیش و آرام حاصل کر لیں۔ ان کالوں کی اہمیت نیویارک میں اس لیے کم نظر آتی ہے کہ یہاں بے شمار دوسری اقوام بھی

موجود ہیں۔ مثلاً میکسیکو والے، ہسپانوی، جنوبی امریکن، ایشیائی، چینی، ویت نامی، ایرانی، افغانی اور اب تو جاپانی بھی جلوہ فرما نظر آتے ہیں۔ پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی بھی یہاں بہت بڑی آبادی ہے۔ یعنی صحیح معنوں میں یہ ایک کاسمو پولیٹین شہر ہے پھر بھی گورے گوریوں کی اکثریت ہے۔ خواتین یہاں بھی فیشن کرتی ہیں۔ خوشبو لگاتی ہیں، بال ترشواتی ہیں اور زلفیں اڑاتی پھرتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یورپ کی گوریوں کی طرح ہی ہیں۔ کالے کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ سفید امریکن ہو، براؤن ایشیائی ہو یا پیلا چینی جاپانی۔ وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔

فٹ پاتھ پر کافی آمد و رفت تھی اور ہر شخص اس طرح بھاگا جا رہا تھا جیسے فلائٹ پکڑنے کا ارادہ ہو۔ مرد تو مرد، عورتیں بھی اسی تیزی کا شکار نظر آتی ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ امریکی خواتین نے ایسی چال اپنا لی ہے جس کی وجہ سے وہ سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی بھی اچھی لگتی ہیں۔ ان کی تیز رفتاری میں بھی ایک وقار اور دلکشی ہوتی ہے۔ عموماً یہ کشیدہ قامت اور متناسب جسم کی ہوتی ہے۔ ترشے ہوئے بال ہوا میں لہراتے رہتے ہیں۔ شاید اس لیے بھی یوں چلتی پھرتی بھلی لگتی ہیں۔ سڑکوں پر ٹریفک بے پناہ تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون سی سڑک کے ٹریفک کے لیے کون سی لائٹ ہے۔ شاید ڈرائیوروں کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا اس لیے وہ بھی بس کار بھگانے سے سروکار رکھتے تھے۔ ایک چینی بزرگ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے فٹ پاتھ پر نمودار ہوئے پھر ہمارے پاس رک کر انہوں نے چینی زبان میں کچھ فرمایا جو ظاہر ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

ہم نے کہا "آئی اسپیک انگلش اونلی۔"

اس کے جواب میں انہوں نے پھر چینی زبان میں کچھ فرمایا اور کافی زور دے کر فرمایا۔ جب ہم نے لاعلمی ظاہر کی تو خاصے ناراض ہو گئے اور لگے ڈانٹ ڈپٹ کرنے۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگوں نے محض ایک نگاہ غلط انداز ڈالنے کے بعد کچھ اور پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی لیکن ایک بہت موٹی، اونچی اور نہایت کالی خاتون ہمارے پاس آکر ٹھہر گئیں۔ انہوں نے ایک لمحہ چینی بزرگ کی آواز سنی پھر ہم تینوں کے چہروں پر نظر ڈالی اور کمر پر (اپنی) ہاتھ رکھ کر خالص کالوں کے لہجے میں کہا "پوچھ سکتی ہوں کہ آپ لوگ اس اولڈ مین کو کیوں تنگ کر رہے ہیں؟"

ہم حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے، ہم نے کہا "ہم انہیں کیا تنگ کر رہے ہیں؟"

بولیں "تو پھر یہ شکایت کیوں کر رہے ہیں؟"

"شکایت۔ کس بات کی؟"

بولیں "کوئی بات تو ہو گی آخر جو یہ اتنے پریشان ہیں۔"

ہم نے کہا "آپ کو چینی زبان آتی ہے؟"

"فرمایا "نہیں۔"

"تو پھر آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ شکایت کر رہے ہیں؟"

وہ کچھ لاجواب سی ہو گئیں پھر کہا "ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ لیں۔ کافی مصیبت زدہ نظر آرہے ہیں۔"

ہم نے کہا "یہ جیسے بھی نظر آرہے ہیں ہمیں ویسے کے ویسے ہی ملے تھے۔ کیوں نہ آپ ہی ان کی مشکل حل کر دیں" یہ کہہ کر ہم نے بڑے میاں کو اشارے سے سمجھایا کہ آپ ان خاتون سے بات کریں۔ انہیں تو جیسے اشارے کی دیر تھی۔ وہ فوراً رواں ہو گئے مگر اس بار ان کی مخاطب وہ کالی خاتون تھیں اب ان خاتون کے گھبرانے کی باری تھی۔ انہوں نے شانے ہلا ہلا کر اور ہاتھ نچا نچا کر انہیں بتانا شروع کیا کہ میں چینی زبان نہیں جانتی۔ آپ انگریزی میں بات کریں مگر بڑے صاحب اپنی لن ترانی میں لگے رہے۔ اتنی دیر میں ابرار دہلوی صاحب کی صورت پھر نظر آگئی۔ لگتا تھا کہ کافی دور سے پیدل چل کر آئے ہیں۔

"معاف کرنا قبلہ" انہوں نے پھولی ہوئی سانسوں سے کہا "پارکنگ بہت دور ملی ہے۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی مگر یہ جھگڑا کیا ہے؟"

ہم نے مختصراً انہیں بتایا، وہ ہنسنے لگے "معلوم ہوتا ہے کہ بابا جی راستہ بھول گئے ہیں۔ دراصل یہ لوگ چائنا ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگوں کو تو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔"

ہم نے کہا "تو پھر ان بڑے میاں کا کیا ہو گا؟"

بولے "کچھ دیر اسی طرح رونق لگی رہے گی پھر زیادہ گڑبڑ ہو گی تو پولیس والا آجائے گا اور انہیں لے جا کر چائنا ٹاؤن چھوڑ آئے گا۔"

ہم نے کہا "یہ ٹیکسی کیوں نہیں لے لیتے؟"

کہا "یہ لوگ بہت کنجوس ہوتے ہیں۔ ٹیکسی میں تو کافی خرچہ ہو گا اس لیے پولیس کی کار سے فری میں چلے جائیں گے۔ چھوڑیے' آپ میرے ساتھ آئیے۔ ہوٹل کا بندوبست کرتے ہیں۔"

کالی عورت کو پیلے بڑے میاں کے ساتھ مصروف کلام چھوڑ کر ہم ابرار صاحب کی قیادت میں چل پڑے۔ وہاں صورت یہ تھی کہ خاتون تو ان بڑے میاں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھیں مگر وہ کمبل کی طرح لپٹ گئے تھے۔ جب وہ رخصت ہونے کا ارادہ کرتیں تو ان کا ہاتھ تھام لیتے اور بڑی دلدوز آواز میں کچھ اپیلیں کرتے۔

خان صاحب جو کافی دیر سے خاموش تھے' بٹ صاحب کو ٹھوکا دے کر پوچھنے لگے "بٹ جی۔ آپ نے ان خاتون کا نام نہیں پوچھا۔"

بٹ صاحب نے کہا "ان کا گمنام رہنا ہی بہتر ہے"

ابرار صاحب ہمیں پہلے ایک ہوٹل میں اور پھر دوسرے ہوٹل میں لے کر گئے۔ پہلے میں تو کرایہ مناسب تھا۔ لیکن جب ہوٹل کے استقبالیہ پر خاتون کلرک نے ہم چار پاکستانیوں کو دیکھا تو پیشگی کرایہ ادا کرنے کی شرط لگا دی۔

"مگر کس لیے؟" ابرار صاحب نے انگریزی میں پوچھا "کیا یہ آپ کے ہوٹل کا دستور ہے؟"

وہ بولیں "دستور تو نہیں ہے مگر یہ ہمارا حق اختیاری ہے"

اس کے بعد بحث شروع ہو گئی۔ ابرار صاحب کہتے تھے کہ آپ ہمارے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کر سکتیں ورنہ میں آپ کی شکایت کر دوں گا۔ عدالت میں چلا جاؤں گا وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے کہا "چھوڑو بھائی۔ کیا حرج ہے۔ پیشگی کرایہ دے دیتے ہیں۔ اول یا آخر' کرایہ تو دینا ہی ہے"

وہ بولے "لیکن یہ توہین ہے۔ آخر اصول بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

بٹ صاحب بول پڑے "اصول تو بس اصول ہوتے ہیں' ان پر عمل کرنا تو ضروری نہیں ہوتا۔"

ابرار نے پوچھا "آپ لوگ کتنے دن قیام کریں گے؟"

ہم نے کہا "دو دن . . . ."

خان صاحب نے فوراً بات کاٹ دی "بالکل نہیں۔ ہم پانچ چھ دن رہیں گے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "مگر تم نے تو دو دن ٹھہرنے کا پروگرام بنایا تھا۔"

بولے "وہ پروگرام بھی میں نے بنایا تھا اور یہ بھی میں ہی بنا رہا ہوں۔ آپ بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہیں۔"

ہمارے کچھ کہنے سے پیشتر ابرار نے کہا "تو پھر آپ کو پانچ چھ دن کا پیشگی کرایہ دینا ہو گا۔"

خان صاحب بولے "چھوڑو۔ اسے دو دن کا کرایہ دے دیتے ہیں' بعد میں بڑھوا لیں گے۔"

"اور جو اس نے کمرا کسی اور کو دے دیا تو کہاں جائیں گے؟"

استقبالیہ کلرک خاموشی اور بے زاری سے ہم لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ پلے تو اس کے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا مگر پھر بھی اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔ آخر بٹ صاحب نے مداخلت کی اور فرمایا "ہم لوگ اس ہوٹل میں نہیں ٹھہریں گے' کیا اتنے بڑے شہر میں کوئی دوسرا ہوٹل نہیں ہے؟"

خان صاحب بولے "یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ آپ ذرا اس عورت کو تو دیکھیں۔"

ہم سب نے عورت کو دیکھنا شروع کر دیا۔

"اس کی آنکھیں کتنی اچھی ہیں مگر نظریں کتنی خراب ہیں۔ یہ ہمیں ذلیل سمجھتی ہے۔ ایسی جگہ رہنے کا کیا فائدہ؟ اور کہیں چلتے ہیں۔"

ابرار نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ ہمارے سامنے والی خاتون سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "ہم خود ہی تمہارے ہوٹل میں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے مگر میں تمہاری شکایت ضرور کروں گا۔ تم جیسے لوگوں نے ہی امریکا کو بدنام کیا ہے۔"

عورت نے برا سا منہ بنا کر دیکھا اور بولی "اوکے۔ کون پروا کرتا ہے"

ہم لوگ اپنا سامان اٹھا کر چل پڑے۔ ہم نے کہا "یہ عورت تو کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔"

ابرار نے کہا "ڈرے کس لیے۔ اسے پتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ بس یہاں ایسے

ہی چلتا ہے۔"

اس طرح نیویارک کا ایک نیا پہلو ہم پر اجاگر ہو گیا۔

تیسرا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا اور ان دونوں سے بہتر تھا۔ یہ ایک چار منزلہ عمارت تھی۔ سو سے کم کمرے ہوں گے۔ کرایہ بھی پندرہ ڈالر تھا۔ یہاں استقبالیہ پر ایک نوجوان جلوہ فرما تھا۔ سفید فام لیکن اس کا خون سفید نہ تھا۔ بہت اخلاق سے پیش آیا۔ ہم نے بتایا کہ دو چار دن قیام کریں گے' قیام زیادہ بھی ہو سکتا ہے' اس نے مسکرا کر کہا "کوئی بات نہیں۔ میری طرف سے اوکے ہے۔"

ہمیں کمروں تک چھوڑنے کے لیے ایک نو عمر وردی پوش لڑکا ہمارے سپرد کیا گیا۔ تیسری منزل پر ہمارے کمرے تھے۔ گیلری میں پھولدار قالین بچھا ہوا تھا اور وہ خوشبو سے مہک رہی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ "

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

کمرے بھی آرام دہ تھے۔ خان صاحب تو فوراً بستر پر دراز ہو گئے اور اعلان کر دیا کہ یہ کمرا میرا ہے۔ باقی آپ لوگ خود ڈھونڈ لیں۔

جب ذرا جما جمی ہوئی تو ہم نے ابرار دہلوی کے لیے کمرے کے فریج میں سے کوک نکالا۔ بٹ صاحب نے چاکلیٹ کا پیکٹ کھولا۔ خان صاحب نے چپس کا ایک پیکٹ نکال کر شغل فرمانا شروع کر دیا۔

"ابرار صاحب۔ آپ کا بل کتنا بن گیا؟" ہم نے پوچھا۔

"اجی قبلہ۔ بل کی بات چھوڑیئے' آپ نیویارک میں ہمارے مہمان ہیں۔ اور یہ ہمارا شہر ہے۔"

خان صاحب فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "دیکھیے قبلہ یہ تکلف نہیں چلے گا۔ نیویارک آپ کا شہر کیسے ہو گیا۔ آپ تو خود یہاں مہمان ہیں۔"

ابرار صاحب نے کہا "مگر ہم تو بہت پرانے مہمان ہو چکے ہیں۔ یہ قصہ چھوڑیں' کوئی اور بات کریں۔"

اس سے پہلے کہ یہ بحث اور طول کھینچتی ہم نے مداخلت ضروری سمجھی۔ یہ ہم جان گئے تھے کہ قبلہ ابرار دہلوی کسی قیمت پر بھی ٹیکسی کا بل وصول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے

اس لیے مزید گفتگو محض وقت کا زیاں تھی "رہنے دیجئے قبلہ" ہم نے ابرار صاحب سے کہا "بل کی بات بھول جائیے' آپ کی محبت کو ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

وہ مسکرانے لگے' بولے "یقین کیجئے۔ وطن سے دور رہ کر وطن کی اور ہم وطنوں کی محبت عشق کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تو کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔"

خان صاحب نے اس جذباتی گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے کہا "دل کی بات چل نکلی ہے تو ذرا اپنے بارے میں بتایئے کہ دل سنبھال کر رکھا ہے یا کسی کو دے دیا ہے؟"

وہ بولے "محبت اور عشق دو ایسی چیزیں ہیں جن کا یہاں گزر ہی نہیں ہو سکتا۔ یوں سمجھئے کہ یہاں ہر قسم کی محبت منع ہے۔ ماں باپ کی محبت' اولاد کی محبت اور بھائی بہن کی محبت' دوستوں کی محبت' رشتے داروں کی محبت۔ جب خون کے رشتوں کی محبت نہیں ہے تو پھر عورت مرد اور میاں بیوی کی محبت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ بس قبلہ یہاں تو کام چلاؤ والی بات ہے جب محبت' پیار ہی نہیں ہے تو عشق کہاں سے آ جائے گا؟ یہ عجیب سرزمین ہے۔ انسانی جذبے اور احساسات سرے سے ناپید ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے لوگوں کے سینوں میں اصل دل کی جگہ پلاسٹک کے دل رکھے ہوئے ہیں۔ بس ہم بھی وقت گزار رہے ہیں۔ روزی یہاں کماتے ہیں' پیار محبت اپنے وطن میں جا کر کر لیتے ہیں۔"

"شادی ہو گئی ہے آپ کی؟"

"شادی تو نہیں ہوئی' عشق البتہ ہو گیا ہے۔"

"بہت خوب' یک طرفہ یا دو طرفہ ٹریفک ہے؟"

بولے "ٹریفک تو دو طرفہ ہے قبلہ مگر ٹریفک کانسٹیبل نے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں۔ لڑکی کے خاندان والے اسے امریکا بھیجنے کے سخت مخالف ہیں۔ انہوں نے امریکی شوہروں کے متعلق بہت کہانیاں سن رکھی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری اکلوتی بیٹی ہے' سات سمندر پار کیسے بھیج دیں۔"

"تو پھر؟"

"بس۔ تھوڑا پیسہ اکٹھا ہو جائے تو میں خود ہی پاکستان چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی یہ جگہ رہنے کے لائق تو نہیں ہے۔ بس روزی کماتے ہیں۔"

یکایک خان صاحب نے گھڑی دیکھی اور بولے "ابرار صاحب۔ بہت وقت لے لیا ہم

لوگوں نے۔ آپ کا تو نقصان ہو رہا ہو گا؟"

بولے "نفع نقصان ہر معاملے میں تو نہیں دیکھا جاتا۔ آپ لوگوں سے مل کر سچ مچ بہت خوشی ہوئی ہے۔ نیویارک میں پاکستانی بہت زیادہ ہیں' باہر سے بھی آتے رہتے ہیں۔ جب کبھی کوئی نیا پاکستانی ملتا ہے بالکل نئی خوشی ہوتی ہے۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔ ویسے یہ جگہ بہت اچھی ہے۔ ہر جگہ آپ پیدل جا سکتے ہیں۔ آپ آرام کیجئے۔ موقع نکال کر پھر فون کر کے آؤں گا' اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر قبلہ ابرار دہلوی رخصت ہو گئے مگر جانے سے پہلے ہمیں بہت سی معلومات بھی دے گئے۔

☆ ☆ ☆

خان صاحب کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے کہ نیویارک میں مردوں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔"

"آپ نے کیسے جانا؟"

بولے "دیکھا نہیں۔ اب تک اس ہوٹل کے عملے میں کوئی عورت نظر آئی۔"

بٹ صاحب جو بہت دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے' اچانک زور زور سے ہنسنے لگے۔

ہم دونوں نے حیران و پریشان ہو کر انہیں دیکھا کہ اچانک ان پر کیا افتاد آن پڑی کہ بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا اور وہ بھی بلا کسی وجہ کے۔

"خیر تو ہے بٹ جی" خان صاحب نے گھبرا کر کہا "کوئی خواب تو نہیں دیکھ لیا؟"

ہم نے کہا "خواب کا ہنسنے سے کیا تعلق ہے؟" پھر بٹ صاحب سے دریافت کیا کہ آخر وہ ہنسے کیوں؟

کہنے لگے "ایک لطیفہ یاد آ گیا' سردار جی والا۔"

ہم نے کہا "مگر یوں اچانک بیٹھے بٹھائے سردار جی کا خیال کیوں آیا آپ کو؟"

بولے "گڑھوں کی وجہ سے۔ آپ نے دیکھا نہیں نیویارک کی سڑکوں پر کتنے گڑھے ہیں' میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

خان صاحب یکایک بول پڑے "یار بلاوجہ کی باتیں مت کرو۔ لطیفہ سنا دو جلدی سے۔"

بٹ صاحب تو جیسے اشارے کے منتظر تھے۔ انہوں نے لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔ لطیفہ کافی پرانا تھا پھر بھی آپ سن لیجئے۔

ایک سردار جی کافی رئیس تھے۔ انہوں نے ایک موٹر کار خرید لی۔ اس زمانے میں موٹر کار بھی ایک عجوبہ سمجھی جاتی تھی۔ چھوٹے شہروں میں تو بس دو چار ہی موٹر کاریں ہوا کرتی تھیں۔ موٹر کمپنی والے نے سردار جی کو ایک ڈرائیور بھی فراہم کر دیا اور پھر ڈرائیور کو بتایا کہ موٹر میں ایک "بھونپو" بھی لگا ہوا ہے۔ اگر کوئی چیز سامنے آ جائے تو فوراً بھونپو بجا دو۔ ہارن سن کر راستہ بالکل صاف ہو جائے گا۔ بہرحال' سردار جی کار میں سوار ہوئے اور ڈرائیور نے کار چلانی شروع کی۔ جیسے ہی اس نے گیئر تبدیل کیا' سردار جی کو جھٹکا لگا۔

بگڑ کر بولے "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ گاڑی جھٹکے کیوں کھا رہی ہے۔؟"

ڈرائیور نے کہا "سردار جی میں نے گیئر بدلا ہے۔"

سردار صاحب آگ بگولا ہو گئے' کہنے لگے "ارے بے ایمان۔ میری آنکھوں کے سامنے نئی گاڑی میں چیزیں بدل رہا ہے۔ واپس چلو' میں تمہاری شکایت کروں گا۔"

ڈرائیور نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ کار چلاتے ہوئے گیئر بدلنا بہت ضروری ہے۔

کچھ دیر بعد گاڑی نے پھر جھٹکے کھانے شروع کر دیے۔ سردار جی نے کہا "اب کیا بات ہے؟"

اس نے کہا "سردار جی۔ سڑک پر سامنے گڑھے آ گئے ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" سردار جی نے کہا "بھونپو بجاؤ۔ آپ ہی آپ راستے سے ہٹ جائیں گے۔"

یہ لطیفہ سنا کر بٹ صاحب نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ خان صاحب کا غصے کے مارے برا حال تھا۔

جہاں تک سڑکوں کے گڑھوں کا تعلق ہے' سچ تو یہ ہے کہ نیویارک میں اتنے گڑھے دیکھ کر ہم بھی حیران رہ گئے تھے۔ یہ تو سنا تھا کہ نیویارک کی سڑکیں خراب ہیں مگر جو حال دیکھا' وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ سڑکیں ہمارے ہاں بھی کھدی پڑی رہتی ہیں۔ بے شمار گڑھے بھی نظر آتے ہیں مگر امریکیوں سے اس بات کی توقع نہ تھی۔ اتنے ترقی یافتہ

اور دنیا کے امیر ترین ملک کی سڑکوں کا یہ حال زار؟ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

کچھ دن نیویارک میں رہے اور جو کچھ دیکھا اور سنا اس نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ نیویارک ایک ترقی یافتہ شہر ہے اس لیے وہاں ہر چیز کا حساب کتاب رکھا جاتا ہے مثلاً ہم نے ایک اخبار میں پڑھا کہ نیویارک میں دو لاکھ گڑھے ہیں۔ برسات کے دنوں میں ان کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ نیویارک میں بارش کافی ہوتی ہے۔ سردی کے زمانے میں برف بھی پڑتی ہے اور یہ دونوں چیزیں سڑکوں کے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جب ہم نے یہ تذکرہ نیویارک میں ایک امریکی سے کیا تو شرمندہ ہونے کے بجائے وہ مسکرانے لگا' بولا "دیکھیے' گڑھے تو آپ نے اور شہروں اور ملکوں میں بھی دیکھے ہوں گے مگر ہم نیویارک والوں نے اسے بھی ایک تہذیبی اور ثقافتی حیثیت دے دی ہے؟"

"وہ کیسے؟" ہم نے پوچھا۔

"ہم نے ایک نیا کلچر بنایا ہے جسے آپ "پوٹ ہول کلچر" کہہ سکتے ہیں۔ ہم نیویارک والے اپنے شہر کے گڑھوں کو بن سجا کر خوب صورت کر دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض گڑھوں کے آس پاس ایسی خوبصورتی سے پودے سجائے جاتے ہیں کہ وہ سلاد کا پیالہ نظر آتے ہیں۔ کوئی گڑھا پرندے کا گھونسلا دکھائی دیتا ہے۔ ہم نیویارک والوں نے اس مقصد کے لیے سوسائٹیاں بنائی ہوئی ہیں۔ ایک فوٹو گرافر کا تو کام ہی یہ ہے کہ گڑھوں کو سجاتا رہے۔ کوئنز کے علاقے میں اکیانوے ایونیو پر ایک گڑھا تو اتنا بڑا اور لمبا چوڑا تھا کہ لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے اس میں محلے والوں نے ایک پودا لگا دیا تھا جو بہت بڑا اور گنجان درخت بن گیا اور سڑک کے بیچوں بیچ یہ درخت اتنا خوبصورت لگتا ہے کہ کیا بتاؤں۔"

دوسرے ملکوں کے لوگوں میں ہم نے ایک خاص بات یہ دیکھی ہے کہ وہ اپنی کسی کوتاہی یا خرابی پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ اب نیویارک والوں کو ہی دیکھ لیجیے۔ اپنی سڑکوں کی خستہ حالی اور ٹوٹ پھوٹ پر وہ بالکل شرم سار نہیں ہیں نہ ہی ان کا رونا روتے رہتے ہیں۔ ٹریفک خراب ہے تو کیا ہوا' کوئی اس کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ سب نے صبر کر لیا ہے۔ پولیس کا رویہ درست نہیں ہے تو پھر بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ لوگوں کو سڑکیں عبور کرنے میں دشواری ہے تو کیا حرج ہے؟ بہت سے علاقے گندے' غلیظ اور شکستہ ہیں تو ہوا کریں' شہر

میں غریبوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور وہ جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں تو یہ بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ نیویارک والے ان چیزوں کا تذکرہ نہیں کرتے۔ نہ ان کے لیے انتظامیہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ کہتے ہیں تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ جناب' کیا بتائیں' بلدیہ کے پاس پیسے ہی نہیں ہیں۔ آمدنی کم ہے۔ اخراجات زیادہ ہیں۔ حکومت کوئی امداد نہیں دیتی۔ پھر کریں تو کیا کریں؟

شکوہ شکایات کا ویسے بھی ہم نے یورپ اور امریکا میں رواج نہیں دیکھا۔ نقائص اور خرابیوں کا کبھی ان کی زبان سے تذکرہ نہیں سنا۔ نہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کا اتنا شائق پایا۔ یہ خوبی ہماری قوم میں بہت زیادہ ہے۔ ہر وقت شکایت' ہر ایک کے خلاف شکایت اور نکتہ چینی۔ عملاً کچھ بھی نہ کرنا۔ جس بات کے لیے دوسروں کو برا کہتے ہیں خود بھی وہی کچھ کرتے ہیں۔ اگر کوئی توجہ دلائے کہ بھائی آپ خود بھی تو یہی کر رہے ہیں تو فوراً جواب دیں گے' کیا کریں' مجبور ہیں۔ سبھی ایسا کر رہے ہیں تو پھر ہم کیا کریں؟

کوئی پوچھے کہ جناب' جب آپ خود بھی وہی کچھ کر رہے ہیں تو پھر شکایت اور نکتہ چینی کس بات کی؟

رخصت ہونے سے پہلے ابرار دہلوی صاحب ہمیں بہت سی مفید نصیحتیں بھی کر کے گئے تھے۔ یہ نہ کرنا' وہ نہ کرنا' ایسا ضرور کرنا وغیرہ وغیرہ۔ نہ کرنے والی چیزوں میں سرفہرست یہ ہدایت تھی کہ رات گئے ویران اور کم آباد سڑکوں پر نہ جانا۔ کالوں کے علاقوں سے نہ گزرنا۔ اپنے پاس زیادہ رقم نہ رکھنا مگر لٹیروں کے لیے دس بیس ڈالر رکھنا بھی نہ بھولنا۔ کوئی لوٹنے کی کوشش کرے تو مطلق مزاحمت نہ کرنا۔ چپکے سے جو کچھ بھی جیب میں موجود ہو نکال کر اس کے حوالے کر دینا۔ زیادہ رات گئے ہوٹل سے باہر رہنے کی کوشش نہ کرنا۔ وغیرہ وغیرہ زیادہ زور "نہ کرنا" پر تھا۔ ہم تو ان کی باتیں سن کر حیران رہ گئے۔ امریکا کے سب سے بڑے اور بارونق شہر کا یہ حال تھا کہ لوگوں کی جان و مال کو کوئی تحفظ نہیں تھا۔ ایسے خطرات تو ہمارے کسی شہر میں نہیں ہیں۔ لوگ آرام سے گھومتے پھرتے ہیں۔ جرائم نیویارک میں اتنے ہوتے ہیں کہ ہم تو سن کر ہی گھبرا گئے۔

خان صاحب نے تو فوراً فیصلہ سنا دیا "یہ شہر رہنے کے قابل نہیں ہے۔ فوراً چلو یہاں سے۔"

ہم نے کہا "اس کے باوجود یہاں ڈیڑھ کروڑ لوگ رہتے ہیں۔"

واقعی نیویارک میں رہنے والوں کو بہادری کا تمغہ دینا چاہیے کم از کم تمغۂ جرات تو ضرور ہی ملنا چاہیے کہ اتنے جان جوکھوں میں رہتے ہیں اور کیا مجال جو کبھی حرف شکایت زبان پر لائیں۔

اگلے ہی روز ہم نے "نیویارک ٹائمز" میں ایک خبر پڑھی کہ ایک بہت بڑی اداکارہ کے اپارٹمنٹ میں کسی نے نقب لگائی اور ان کے بیش قیمت ہیروں کے زیورات لے کر چلتا بنا۔ چھوٹی موٹی چوریاں، نقب زنی کی وارداتیں، لوٹ مار کی داستانیں، ہاتھوں سے پرس چھیننے کے واقعات تو ہر روز بے شمار ہوتے ہیں۔ لیکن اخباروں میں ان کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ قتل و غارت کے بھی وہی واقعات اخبار میں شائع کیے جاتے ہیں۔ جن کی کسی حوالے سے کوئی اہمیت ہو۔ ورنہ قتل کا کیا ہے وہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

"مگر اخبارات میں قتل کی خبر تو شائع ہونی چاہیے" ہم نے کہا۔

"تو پھر اخبار میں دوسری خبروں کے لیے جگہ باقی نہیں رہے گی۔ نیویارک کے جرائم کی خبروں کے لیے پھر نیویارک ٹائمز جیسا ایک اور اخبار شائع کرنا پڑے گا۔"

امیر، غریب، سفارت کار، مرد، عورت، بچے غرضیکہ نیویارک میں کوئی بھی مجرموں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ کسی سفارت کار کے گھر میں چوری، کار چھین لینا، گھر میں نقب لگانا، راہ چلتی عورتوں کے ہاتھوں سے پرس لے کر بھاگ جانا اور موقع ملے تو انہیں روک کر ان سے تمام زیورات اتروا لینا، عورتوں کی بے آبروئی، اکیلی دو اکیلی عورتوں کا سنسان علاقوں میں قتل، یہ سب "روزمرہ" میں داخل ہے۔

نیویارک پہنچ کر ہماری تو سچ مچ آنکھیں کھل گئیں اور کان کھڑے ہو گئے۔ وہاں کا احوال سنا تو پتا چلا کہ واقعی ہم تو ان کے مقابلے میں ابھی بہت پسماندہ ہیں۔

نیویارک کو دیکھنے کے بھی وہی طریقے ہیں جو دوسرے شہروں کو دیکھنے کے لیے داناؤں نے مقرر کیے ہیں۔ لیکن یہاں کچھ نئے طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں مثلاً ایک دن نیویارک میں گھومنے پھرنے کے بعد خان صاحب نے فرمایا "اس شہر کو دیکھنے کا بہترین طریقہ ایک ہی ہے۔"

پوچھا "وہ کیا؟"

بولے "اس شہر کو لیٹ کر دیکھنا چاہیے۔"

بٹ صاحب نے اختلاف کیا تو انہوں نے ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ فٹ پاتھ پر نصب بینچ کی جانب اشارہ کر کے انہوں نے بٹ صاحب کو ہدایت فرمائی کہ اس بینچ پر لیٹ جاؤ۔

بٹ صاحب فوراً لیٹ گئے۔ چند لمحے بعد وہ اٹھ کر بیٹھے اور کہا "خان جی، مان گئے آپ کو" پھر ہم سے کہا "آفاقی صاحب۔ اب آپ بھی ذرا بینچ پر لیٹیں۔"

پہلے تو ہم نے پس و پیش کیا مگر پھر ان کے اصرار پر لیٹ گئے۔ اب جو دیکھا تو نیویارک کی فلک بوس عمارتیں نیچے سے اوپر تک پوری نظر آنے لگیں۔ یہاں تک کہ آسمان بھی نظر آ رہا تھا جو کہ ہر جگہ سے نظر نہیں آتا۔

"دیکھا آپ نے یہ ہے نیویارک دیکھنے کا صحیح طریقہ۔ ورنہ اگر آپ سر اٹھا کر دیکھتے رہیں گے تو گردن کی ہڈی خراب ہو جائے گی اور پھر بھی آپ بہت سی چیزیں نہیں دیکھ سکیں گے۔"

بٹ صاحب نے بھی ایک حکمت کی بات کہی، کہنے لگے "نیویارک دیکھنے کے لیے تو آدمی کے سر پر آنکھیں ہونی ضروری ہیں۔"

یہ بات کافی حد تک درست بھی ہے۔ نیویارک میں جس بلڈنگ کو دیکھیے، آسمانوں سے باتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یوں سمجھئے شیشے، سیمنٹ اور لوہے سے تیار شدہ ایک گنجان جنگل ہے جس میں درختوں کی بجائے اونچی اونچی عمارتیں اگی ہوئی ہیں۔

یہ نہیں کہ عمارتوں میں خوب صورتی اور دلکشی کی کمی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاندار اور خوبصورت عمارت ہے اور رات کے وقت تو ان کا منظر کچھ اور بھی زیادہ نظر فریب ہو جاتا ہے لیکن کچھ دیر بعد یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ آپ ہر طرف سے سیمنٹ اور لوہے کی اونچی دیواروں کے درمیان محبوس ہو کر رہ گئے ہیں۔ جس طرح پرانے وقتوں میں شہر پناہ کی ناقابل شکست دیواریں ہوا کرتی تھیں اسی طرح نیویارک بھی ایک قلعہ کے مانند لگتا ہے۔ ہمیں تو واقعی گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

☆ ☆ ☆

نیویارک کی سیر کرنے سے پہلے ذرا اس کی مختصر تاریخ جان لیجیے۔

نیویارک کی داغ بیل ۱۶۲۶ء میں پڑی تھی۔ اس وقت اس جگہ کو اسٹیٹن آئی لینڈ کا نام

دیا گیا تھا جب کولمبس صاحب ہندوستان کی تلاش میں امریکا پہنچ گئے تھے۔ اسی زمانے میں یورپ کے مہم جو بحری جہازوں میں سوار ہو کر دنیا کو تلاش کرنے اور نئے علاقوں کو نو آبادیاں بنانے کی غرض سے نکل پڑے تھے۔ آج کا مین ہٹن اس وقت ایک غیر آباد جزیرہ تھا جہاں انڈین لوگوں کی آبادی تھی۔ فرانس کے ویرا زانو نے کچھ عرصے وہاں قیام کیا اور پھر آگے چل پڑا۔ کافی وقت گزر گیا اور بے چارے انڈین عافیت میں رہے مگر سولھویں صدی کے آغاز میں ہالینڈ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک انگریز مسٹر ہڈسن کو نئے بحری راستوں کی تلاش کے لیے روانہ کیا تو وہ دریا کے راستے ایک خوب صورت وادی میں جا پہنچا۔ دریائے ہڈسن اور نیویارک کی ہڈسن ویلی اسی شخص کے نام سے منسوب ہے۔ اس طرح ہالینڈ والوں نے یہاں تجارتی مرکز قائم کر لیا۔ انہوں نے وہاں ایک چھوٹا سا قصبہ بھی آباد کر لیا اور اس کا نام "نیو ایمسٹرڈیم" رکھا۔ کئی سال تک مین ہٹن پر ہالینڈ والوں کا قبضہ رہا جنھوں نے اس تمام علاقے کو صرف چوبیس ڈالر کے عوض انڈین لوگوں سے خرید لیا۔ ویسے تو یہاں ہالینڈ والوں کا تسلط تھا مگر یورپ کے سبھی ملکوں کے لوگ یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہ دراصل امریکا کا ابتدائی زمانہ تھا۔ بعد میں یہ بھی نیا ملک یورپ اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے کشش کا باعث بنا رہا۔ یہاں ہر ملک، ہر نسل اور قریب قریب ہر مذہب کے لوگ آباد تھے جن میں افریقی حبشی بھی تھے۔ اس وقت مین ہٹن کی آبادی صرف پندرہ سو تھی مگر اس وقت بھی وہاں اٹھارہ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ کچھ عرصے تو یہاں ہالینڈ کی بادشاہی رہی مگر آس پاس کے علاقوں پر برطانوی حکومت کا راج تھا اس لیے جب برطانوی ڈیوک آف یارک اپنی فوج کے ساتھ مین ہٹن پہنچا تو ہالینڈ والوں نے لڑائی جھگڑے کے بغیر ہی سب کچھ اس کے حوالے کر دیا اور اس طرح ڈیوک آف یارک کے نام پر اس جگہ کا نام نیویارک پڑ گیا۔ اٹھارھویں صدی تک یہاں برطانوی حکومت کا تسلط رہا اور یہ قصبہ ایک شہر بن گیا۔ جس کی آبادی پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ یہاں ایک برطانوی گورنر حکومت کرتا تھا مگر بعد میں جب جارج واشنگٹن نے آزادی کا اعلان کیا تو یہ علاقہ بھی نئی ریاست کا حصہ بن گیا۔ ۱۸۰۰ عیسوی میں نیویارک کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب تھی اور یہ ایک تجارتی مرکز بن چکا تھا۔ جب آبادی بڑھنے لگی تو اندازہ ہوا کہ شہریوں کے لیے سہولتوں کی کمی ہے۔ ایک صاحب نے یہ مزے دار بات بتائی کہ اس زمانے میں بھی نیویارک اسی قسم کے مسائل سے دو چار تھا۔

جیسے کہ آج کل درپیش ہیں مثلاً پولیس کم تھی، آگ بجھانے کے انتظامات ناکافی تھے۔ ٹرانسپورٹ کی سہولتیں ضرورت سے کم تھیں۔ صفائی اور حفظان صحت کا بندوبست درست نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے وبائی امراض پھیلتے رہتے تھے۔ بعض اوقات تو وبا اس قدر پھیل جاتی تھی کہ لوگ گھبرا کر آس پاس کے علاقوں میں چلے جاتے تھے۔ ۱۸۱۱ء میں نیویارک شہر کے لیے باقاعدہ اصول و ضوابط بنائے گئے جس کے مطابق شہر کو ایک نظم کے مطابق پھیلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ تمام سڑکوں کو ایک دوسرے کے متوازی بنانے کا نقشہ تیار کیا گیا تھا جن میں جگہ جگہ چوراہے اور کراسنگ رکھے گئے۔ یوں سمجھیے کہ موجودہ مین ہٹن کا سنگ بنیاد ۱۸۱۱ء میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ شہر تجارتی طور پر ترقی کرنے لگا۔ ہر طرف سے لوگ یہاں آرہے تھے مگر روزگار یہاں نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی کچی آبادیوں میں سیاہ فام، آئرش اور جرمن رہا کرتے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں ایسی آتش زدگی ہوئی کہ شہر کا تجارتی مرکز جل کر راکھ ہو گیا اور شہر کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ آج کی وال اسٹریٹ نے بھی اسی وقت جنم لیا تھا۔ اس زمانے کی تعمیر کی ہوئی پرانی عمارتیں آج بھی وال اسٹریٹ پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ جب تجارت اور کاروبار پھیلا، بینک قائم ہونے لگے، اخبارات شائع ہونے لگے تو اس شہر نے تیزی سے پھیلنا شروع کر دیا۔ آبادی کے ساتھ ہی لڑائی جھگڑے، ہنگامے اور فسادات بھی بڑھ گئے۔ مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگ یہاں آباد ہو رہے تھے اور ان کے باہمی اختلافات بڑھ کر جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ یورپ کے دور دراز ملکوں سے لوگ یہاں آکر آباد ہو رہے تھے۔ پولینڈ، ہنگری، روس، اٹلی، اسکینڈے نیویا کے ممالک اور یورپ کے ممالک کے علاوہ افریقی، ایشیائی، چینی اور جنوبی امریکا سے بھی لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ شہر تیزی سے پھیل رہا تھا مگر آبادی اس سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ تجارت عروج پر تھی۔ بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز اور اسٹورز تعمیر ہو رہے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں نیویارک اور بروکلین کو ملانے کے لیے ایک پل بنایا گیا اور یہ دونوں ایک ہی شہر بن گئے۔ جب ایلی ویٹر یا لفٹ ایجاد ہوئی تو اس سے فائدہ اٹھا کر دس بارہ منزلہ عمارتیں تعمیر ہونے لگیں یہاں تک کہ اسکائی اسکریپرز وجود میں آگئے۔ ٹیلی فون کے موجد الیگزینڈر گراہم بیل نے ۱۸۷۷ء میں ٹیلی فون بھی نیویارک کے لوگوں تک پہنچا دیا۔ امریکا کو دو عالمگیر جنگوں سے جو فائدے حاصل ہوئے وہ نیویارک کے حصے میں بھی آئے۔ بڑے بڑے اسٹورز اور

عمارتیں بن گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر کھیلوں' فیشن اور فنون لطیفہ کا مرکز بھی بن گیا۔
دولت کی ریل پیل ہوئی تو آبادی اور پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کے علاقے بھی
نیویارک نے نگل لیے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوام متحدہ کے صدر دفاتر بھی نیویارک
میں قائم ہو گئے۔ شہر کی وسعت' دولت اور اہمیت بڑھی تو مسائل بھی بڑھنے لگے اور
نیویارک آج بھی مسائل سے لبریز شہر ہے۔ آج بھی یہ باہر سے آنے والوں کی پسندیدہ جگہ
ہے جو ہر سال لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں اور امریکا کے دوسرے علاقوں میں جانے کے
بجائے ان کی اکثریت اسی غریب پرور شہر میں آباد ہو جاتی ہے۔

گزشتہ سالوں میں نیویارک میں پاکستانیوں کی آبادی میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔
شہری مسائل اپنی جگہ مگر اس شہر میں تجارت' صنعت اور کاروبار کی ریل پیل ہے اس لیے
باہر سے آنے والوں کو روزگار مل ہی جاتا ہے۔ پاکستانیوں نے بھی یہاں آکر نوکریاں کیں مگر
ان کی سب سے زیادہ توجہ ٹیکسی چلانے پر مرکوز رہی جس کی وجہ سے نیویارک میں پاکستانی
ٹیکسی ڈرائیور ہر جگہ نظر آجاتے ہیں۔ نیویارک میں ڈرائیونگ ایک عذاب ہے اور ٹیکسی
چلانا اس سے بھی بڑا عذاب لیکن اس کام میں آمدنی معقول ہو جاتی ہے اس لیے پاکستانیوں
نے ٹیکسی کے دھندے کو بڑے ذوق و شوق سے اپنا لیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق
نیویارک میں ڈیڑھ دو ہزار پاکستانی ٹیکسی چلا کر گزارا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ نیویارک
جانے والے پاکستانیوں کا ان سے واسطہ ضرور پڑ جاتا ہے۔

جب ہم نیویارک کی سیر کرنے کے ارادے سے ہوٹل کی لابی میں پہنچے تو خان صاحب
کی شکایت دور ہو گئی کیونکہ استقبالیہ پر ایک خاتون تشریف فرما تھیں۔ ان کا رنگ سیاہ تھا'
قد کافی لمبا تھا اور ڈیل ڈول بھی کم نہ تھا۔ وہ خالص سیاہ فاموں کے انداز میں انگریزی بولتی
تھیں جسے سن کر خان صاحب اور بٹ صاحب دونوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔

انہوں نے ہم سے پوچھا "یہ کون سی زبان بول رہی ہیں؟" ہم نے کہا "انگریزی۔"

کہنے لگے "انگریزی کا ان امریکنوں نے خوب بیڑا غرق کیا ہے۔"

استقبالیہ پر پہنچے تو خاتون نے مسکرا کر خیر مقدم کیا۔ ان کی عمر پچیس سے پچاس سال
تک کے درمیان تھی۔ چہرے کا رنگ سیاہ اور چمک دار تھا۔ آنکھیں بے حد روشن تھیں
اور دانت نہایت سفید تھے۔ چونکہ ان کا لب و لہجہ خان صاحب اور بٹ صاحب کے لیے

ناقابل فہم تھا اس لیے انہوں نے مترجم کے فرائض ہمیں سونپ دیے۔ ان کی گفتگو کو لفظ
بہ لفظ سمجھنا ہمارے لیے بھی ممکن نہ تھا لیکن مفہوم سمجھ جاتے تھے۔

ہم نے جب ان سے نیویارک کی سیر کرنے کا بہترین طریقہ دریافت کیا تو جواب میں
انہوں نے ایک پمفلٹ ہمارے حوالے کر دیا اور کہا "اس میں تمام ضروری اور غیر ضروری
معلومات موجود ہیں" اس کے بعد وہ ٹیلی فون کی جانب متوجہ ہو گئی۔

ہم نے بٹ صاحب سے پوچھا "ان کا نام نہیں دریافت کریں گے؟"

بولے "کیا فائدہ۔ سمجھ میں تو کچھ آئے گا نہیں۔"

پمفلٹ پر نظر ڈالی تو واقعی ہر قسم کی معلومات اس میں موجود تھیں۔ قابل ذکر مقامات'
وہاں تک جانے کے طریقے' سنیما' ہوٹل' تھیٹر' میوزیم سیر گاہیں' سبھی کی تفصیل موجود
تھی۔ وہاں تک جانے کے لیے یہ ترکیب درج تھی۔

۱۔ ہوٹل سے باہر نکل کر ٹیکسی والے کو اشارہ کریں اور اس میں سوار ہو جائیں پھر
جہاں جانا چاہیں اسے بتا دیں۔

۲۔ بس اسٹاپ پر تشریف لے جائیں ----- اور یہ بس آپ کو مطلوبہ مقام تک لے
جائے گی۔

۳۔ انڈر گراؤنڈ میں سفر کر سکتے ہیں۔ معلومات کے لیے تفصیل اور نقشہ وہیں سے
ل جائے گا۔ نہ ملے تو اسٹیشن پر لگے ہوئے نقشے سے مدد لیں۔

۴۔ اگر آس پاس کا علاقہ دیکھنا چاہیں تو پیدل چلنا زیادہ بہتر ہو گا۔

ان حالات میں بہترین طریقہ یہی تھا کہ پیدل چلیں۔ یہ ایسی سواری ہے جس کے لیے
کسی کی محتاجی نہیں ہے اور نہ ہی ٹکٹ وغیرہ خریدنا پڑتا ہے۔ کسی اسٹاپ یا اسٹیشن کی
پابندی بھی نہیں ہے۔ جہاں جی چاہے رک جاؤ' جب تک جی چاہے رکے رہو اور جب جی
میں آئے چل پڑو۔ یعنی وقت کی پابندی بھی نہیں ہے۔

خان صاحب بولے "مگر ہوٹل سے باہر نکلنے سے پہلے پیسے کمرے میں رکھ دینے
چاہئیں۔ اپنے ساتھ بہت کم ڈالر رکھے جائیں۔"

بٹ صاحب نے فرمایا "یہاں ہوٹلوں میں بھی چوری ہو جاتی ہے۔ یاد نہیں ابرار دہلوی
نے کیا کہا تھا؟"

ابرار دہلوی کی ہدایات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ نقدی ہوٹل کے کمرے میں نہ چھوڑی جائے۔

"بھائی یہ تو بہت مشکل بات ہے نہ تو پیسے کمرے میں رکھیں اور نہ ہی اپنے ساتھ رکھیں' تو پھر کہاں رکھیں؟ کسی بینک میں حساب کھولیں؟"

ہم نے کہا "خان صاحب۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے ہوٹل کے کمرے میں دروازے پر نصب نوٹس نہیں پڑھا ورنہ پریشان نہ ہوتے۔ ہوٹل والوں کا کہنا ہے کہ نقدی' زیورات اور قیمتی اشیاء ہوٹل کے استقبالیہ پر جمع کرادی جائیں۔"

"توبہ کیجئے میں اس عورت پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں ہوں" خان صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ "اس کی شکل نہیں دیکھی۔ کتنی خونخوار اور ڈراؤنی ہے۔"

"اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جیب کٹ جائے یا کوئی لٹیرا پستول دکھا کر سب کچھ چھین لے۔"

بٹ صاحب نے بھی سمجھایا کہ صورت شکل کا کیا ہے۔ عہدہ دیکھنا چاہیے۔ آخر ہوٹل والوں نے کچھ سوچ کر ہی اسے استقبالیہ پر بٹھایا ہے اور وہ ہمیں ہر چیز کی رسید دے گی۔"

دوبارہ استقبالیہ پر جا کر ہم نے ساری رقم گن کر ان خاتون کے حوالے کر دی جسے انہوں نے گن کر ایک تجوری میں رکھ دیا اور ہمیں رسید جاری کر دی۔ خان صاحب کا مشورہ تھا کہ ہم لوگ اپنی گھڑیاں بھی ان کے پاس جمع کرا دیں۔

"تو پھر وقت کیسے دیکھیں گے؟" بٹ صاحب نے دریافت کیا۔

خان صاحب بولے "یار ہر جگہ گھڑیاں لگے ہوتے ہیں اور کچھ نہیں تو کسی سے پوچھ لیں گے۔"

ہم نے کہا "خان صاحب' یہ نیویارک ہے' لاہور نہیں ہے کہ آپ ہر راستہ چلنے والے کو روک کر ٹائم پوچھتے رہیں۔ ایسا نہ ہو کوئی بگڑ کر گولی مار دے۔"

خان صاحب رونی شکل بنا کر بولے "بھائی' اتنا بھی نہ ڈراؤ کہ دم ہی نکل جائے۔ ہم یہاں سیرو تفریح کرنے آئے ہیں یا سہم سہم کر اپنا خون خشک کرنے؟ یہ تو واقعی بہت ڈراونا شہر ہے۔"

بٹ صاحب کہنے لگے "خان صاحب۔ یہ شہر ڈراؤنا نہیں ہے۔ دراصل آپ ہی ڈرپوک ہیں ورنہ اس شہر میں لاکھوں کروڑوں آدمی رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کتنی عورتیں رہتی ہیں اس شہر میں مگر وہ آپ کی طرح ڈرپوک نہیں ہیں۔ آپ اپنے نام کے ساتھ "خان" لکھنا چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔"

خان صاحب کو یہ بات اچھی نہیں لگی' بولے "بٹ صاحب' بس رہنے دیں۔ زیادہ باتیں نہ بنائیں' آپ خود کچھ کم ڈرپوک ہیں۔"

بٹ صاحب کہنے لگے "میں ڈرپوک ضرور ہوں مگر بہادر ڈرپوک ہوں۔ آپ کی طرح نرا ڈرپوک نہیں ہوں۔"

خان صاحب نے کہا "پہلے سے معلوم ہوتا تو کوئی تعویذ ساتھ لاتے یا امام ضامن بندھوا لاتے۔ ہم تو بس بے خبری میں مارے گئے۔"

ہم نے کہا "خان صاحب۔ اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ دن کا وقت ہے۔ باہر خوب رونق ہے اور چہل پہل ہے۔ ہم کسی سنسان جگہ پر جائیں گے ہی نہیں اور پھر ہمارے پاس چند ڈالرز کے سوا اور ہے بھی کیا پھر ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

اس طرح ہم خان صاحب اور بٹ صاحب کے ہمراہ نیویارک کی سیر کو نکلے۔

☆ ☆ ☆